شاہ حسین حقیقت

اول

اُن کا خاندان

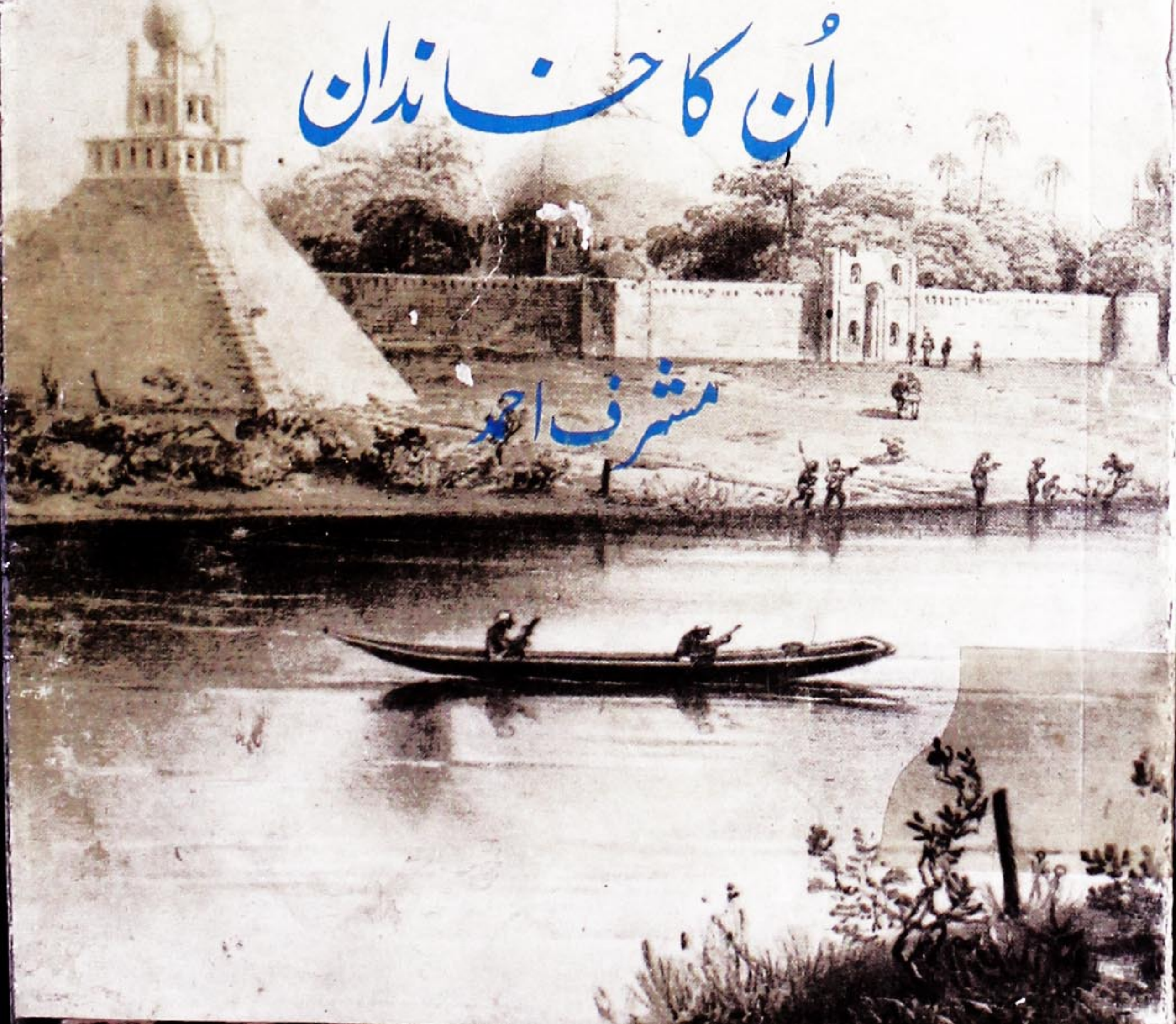

مشرف احمد

Collection of Prof. Muhammad Iqbal Mujaddidi Preserved in Punjab University Library.

پروفیسر محمد اقبال مجددی کا مجموعہ پنجاب یونیورسٹی لائبریری میں محفوظ شدہ

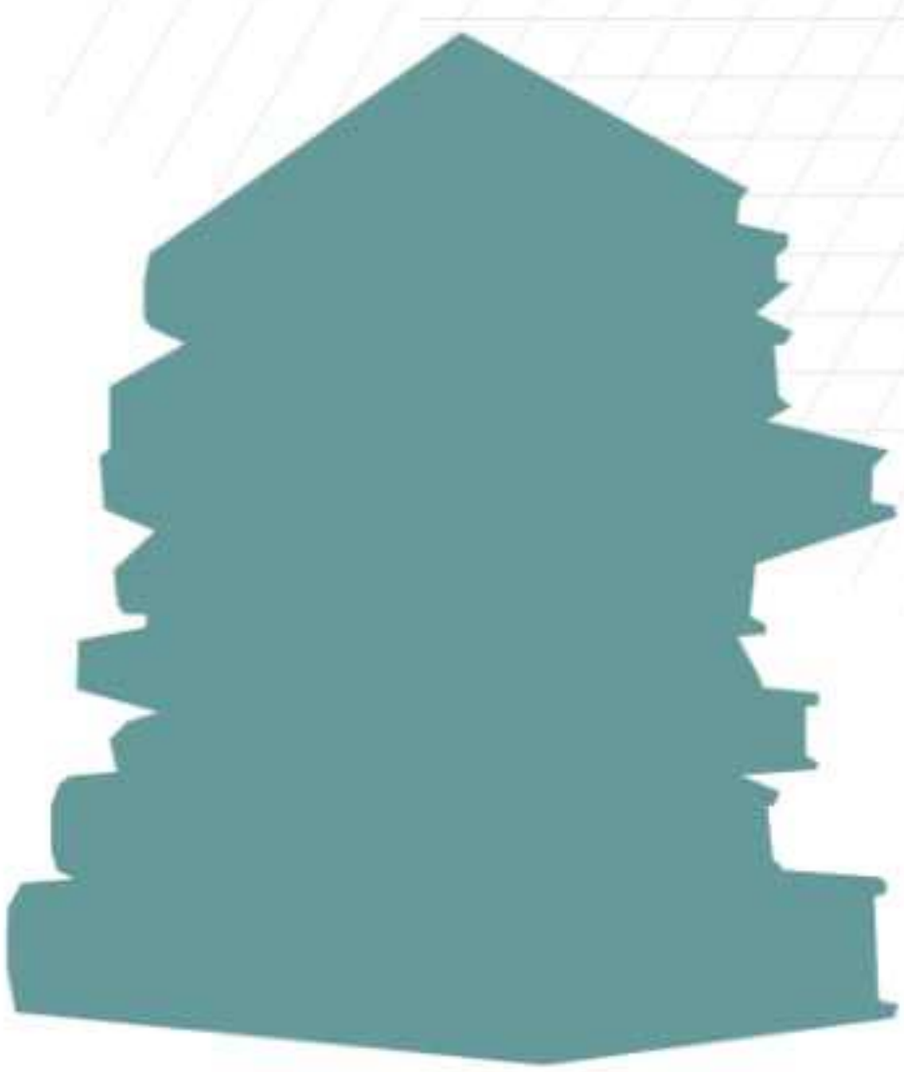

شاہ حسین حقیقت

اور

ان کا خاندان

مشرف احمد

To Mohammad Iqbal
Mujaddid
With best wishes
Shahid Hamid

ادارۂ ادبیات پاکستان، کراچی

پوسٹ بکس نمبر ۳۴۲۶ - کراچی - ۵

10 July 89

جملہ حقوق بحق مصنّف محفوظ ہیں

12901/8

سلسلہ مطبوعات ادارۂ ادبیات پاکستان (۱)

بار اوّل ، ۱۹۷۷ء

تعداد . . . . ایک ہزار

ناشر . . . . سیّد انیس احمد

ادارۂ ادبیات پاکستان کراچی

بہ اشتراک امیر کلال اکیڈیمی

پوسٹ بکس ۱۳۹ - راولپنڈی

مطبع . . ابن حسن آفسٹ پریس، کراچی

قیمت بائیس روپے

PRICE Rs. 25/

ملنے کا پتہ

ادارۂ ادبیات پاکستان، کراچی

پوسٹ بکس نمبر ۳۴۲۶ کراچی - ۵

فہرست

انتساب	۵
عرض مصنّف	۷
تعارف	۱۱
حضرت امیر کلالؒ	۱۷
ارشادات امیر کلالؒ	۵۳
شاہ حسین حقیقتؔ	۵۷
حقیقت کے فنی کارنامے	۸۰
جذب عشق	۹۱
ہشت گلزار	۱۲۴
ہیرامن طوطا	۱۶۷
خزینۃ الامثال	۲۰۱
صنم کدہ چین	۲۱۳
تحفۃ العجم	۲۱۸
دیوان حقیقت	۲۲۰
تذکرۂ احبّا	۲۳۲
شاہ حسن ضبطؔ	۲۳۳
نشتر	۲۳۷

ذخیرہ محمد اقبال مجددی لاہور

میر محسن لکھنوی	۲۷۹
تذکرۂ سراپا سخن	۲۸۶
مخزن نکات اور اس کا ترجمہ	۲۹۴
محسن کی شاعری	
خان بہادر سیّد جعفر حسین	۳۲۸
خان بہادر سیّد حامد حسین	۳۸۳
سیّد رفیق حسین	۴۲۲
سیّد رفیق حسین کی افسانہ نگاری	۴۲۹
ظفر عمر بی۔ اے	۴۳۹
نیلی چھتری	۴۴۲
لال کھٹور	۴۴۹
مستقبل اسلام	۴۵۶
میجر جنرل (ریٹائرڈ) سیّد شاہد حامد	۴۵۹
خاندان حقیقت کی چند دوسری شخصیات	۴۷۷
مولوی محمد حسین لندنی	۴۷۷
محمد فضل امین	۴۷۸
مولوی آفتاب عمر	۴۸۱
الطاف فاطمہ	۴۸۲
فضل قدیر	۴۸۳

میں ان اوراق کو خاندانِ شاہ حسین حقیقت
کے نامور فرزند میجر جنرل (ریٹائرڈ)
سیّد شاہد حامد صاحب
کے نام سے معنون
کرتا ہوں

مشرف احمد

میجر جنرل (ریٹائرڈ) سیّد شاہد حامد

عرضِ مصنّف

شاہ حسین حقیقت کے علمی و ادبی کارناموں کے بارے میں تحقیقی و تنقیدی نوعیت کا مقالہ لکھنے کا خیال مجھے میرے محترم دوست مشفق خواجہ صاحب نے دلایا تھا۔

جب اس سلسلے میں کام کا آغاز کیا گیا اور حقیقت کے حالات زندگی کی فراہمی کے سلسلے میں مختلف تذکروں اور ان پر لکھے جانے والے ایک آدھ مضمون کا مطالعہ کیا تو معلوم ہوا کہ اس خاندان کے اکثر و بیشتر لوگ ممتاز و مشہور مصنف ہو گزرے ہیں چنانچہ میں نے شاہ حقیقت کے علاوہ شاہ حسن غبطہ، محسن لکھنوی اور بعض دوسرے ادیبوں کے لیے بھی اس کتاب کا ایک حصہ وقف کر دیا۔

شاہ حسین حقیقت کی بعض تصانیف کے بارے میں اکثر محققین و ناقدین نے اپنی تحریروں میں یہ تاثر دیا ہے کہ وہ کبھی شائع ہی نہیں ہوئی تھیں لیکن مجھے کام کے دوران معلوم ہوا کہ بعض وہ کتابیں جن کے بارے میں عام خیال تھا کہ شائع نہیں ہوئیں۔ آج سے تقریباً ایک صدی قبل شائع ہو چکی تھیں۔ اسی طرح یہ بھی معلوم ہوا کہ قصہ "ہیر امن طوط" جسے اکثر محققین نے اپنے مضامین میں ایک علیحدہ تصنیف قرار دیا ہے، حقیقت کی طویل مثنوی "ہشت گلزار" ہی کا ایک حصہ ہے جس کو حقیقت نے علیحدہ صورت میں بھی شائع کرایا تھا۔

شاہ حسن ضبط کے ناول قصۂ حسن و عشق کے مشہور اردو ترجمے "نشتر" پر کئی پہلو سے بحث کی گئی ہے۔ اس ناول کے اولین ناقدین نے اسے ایک فرضی قصہ اور اس کے مصنف کا نام اس کے مترجم کی ذہنی اختراع قرار دیا ہے، راقم السطور نے اس ناول کے تاریخی پہلو کا جائزہ لیا ہے۔ اور اسے اردو کا اوّلین ناول قرار دیا جانے کے حق میں دلائل دیئے ہیں۔ اس ضمن میں شاہ حسن ضبط کو بھی ایک حقیقی فرد ثابت کیا ہے۔

راقم کا خیال ہے کہ نشتر کی ہیروئن خانم جان، مرزا رسوا کے ناول امراؤ جان ادا کا پیشرو کردار ہے، نیز خانم جان اور امراؤ جان ادا میں بعض حیرت ناک مشابہتیں پائی جاتی ہیں۔

محسن لکھنوی کے بارے میں کچھ زیادہ تحقیقی مواد نہیں ملتا۔ محسن کی شاعری اور تذکرہ سراپا سخن کے تنقیدی جائزے کے علاوہ مخزن نکات (از قائم چاندپوری) کے ترجمے کا بھی پہلی بار تفصیل سے جائزہ پیش کیا جا رہا ہے۔

سید رفیق حسین اردو کے منفرد افسانہ نگار ہیں۔ ان کی افسانہ نگاری کے بارے میں چند ایک مطبوعہ مضامین ملتے ہیں۔ اس کتاب میں ان کے فن کا اختصار کے ساتھ جائزہ لیا گیا ہے۔ تاہم میرا خیال ہے کہ سید رفیق حسین کے فن و شخصیت پر تفصیل سے لکھنے کی ضرورت ہے۔ اگر اس کتاب کا دوسرا ایڈیشن شائع ہونے کی نوبت آئی تو میں اس کمی کو ضرور پورا کروں گا۔

ظفر عمر بی۔ اے مصنف نیلی چھتری، بہرام کی گرفتاری وغیرہ اردو کے اوّلین جاسوسی ناول نگار ہیں۔ ان کی موت کو آج تیس برس کا عرصہ ہونے کو آیا لیکن ان کے تخلیقی کارناموں کے بارے میں آج تک کوئی مضمون شائع نہیں

ہوا ، ادھر جوں جوں وقت گزر رہا ہے ان کی تصانیف کی فراہمی بھی دشوار ہوتی جا رہی ہے ۔ تلاش بسیار کے بعد ادارہ یادگار غالب کی لائبریری میں ان کی تصنیف کردہ دو کتابیں لال کنھور اور نیلی چھتری ۔ حاصل ہو سکیں ۔ لہٰذا صرف انہی دو کتابوں کا تنقیدی ۔ جائزہ کتاب میں شامل ہے ۔

اس خاندان میں بعض ایسے اشخاص بھی موجود ہیں جن کی وجہ شہرت ادب و شعر نہیں ہے ۔ ان میں سے ایک خواجہ بہاء الدینؒ نقشبندی کے مرشد حضرت سید امیر کلالؒ روحانی شخصیت ہیں ۔

اس کے علاوہ سرسید احمد خان کے مشیر تعمیرات سید جعفر حسین ، اور ان کے بیٹے سید حامد حسین اور پوتے میجر جنرل شاہد حامد کے حالات زندگی بھی قاری کی دل چسپی کا باعث ہوں گے ۔ لہٰذا ان اصحاب کے حالات زندگی بھی شامل کتاب کر لیے گئے ہیں ۔

میجر جنرل شاہد حامد صاحب نے مواد کی فراہمی کے سلسلے میں جس شفقت اور کشادہ دلی سے تعاون کیا ہے ، اس کا شکریہ لفظوں میں ادا کرنا ممکن نہیں ۔ سید صاحب سے اوّلین ملاقات کے بعد سے روز بروز ان کی محبت و شرافت کا نقش اوّلین دل میں گہرا ہوتا چلا گیا ۔ وہ اپنے خاندان کی شاندار روایات کے پاسدار اور مشرقی وضع داری کا نمونہ ہیں ۔

جناب مشفق خواجہ اکم بامسمّٰی ہیں ۔ ان کی ذات گرامی بہت سے لوگوں کے لیے علمی و ادبی کاوشوں کا محرک بنتی ہے ۔ خوش قسمتی سے مجھ جیسے بے مایہ اور کم علم آدمی پر بھی ان کی نظر التفات رہتی ہے ۔ اور مختلف نوعیت کے علمی

و ادبی کاموں کی انجام دہی کے سلسلے میں میری ہمت بندھاتے رہتے ہیں۔ اگر خواجہ صاحب کی رہنمائی اور زیرِ تذکرہ مصنفین کی نگارشات، حوالہ جاتی کتب اور مخطوطات کی فراہمی کے سلسلے میں ان کی مدد شاملِ حال نہ ہوتی تو اس کتاب کو پایۂ تکمیل تک پہنچنا نہایت دشوار ہو جاتا۔

آخر میں اپنے چھوٹے بھائی سید سعید احمد استاد فارسی، گورنمنٹ کالج بہاول پور کا تذکرہ ضروری سمجھتا ہوں جن کا تعاون اس کتاب کی ترتیب و تیاری میں شامل رہا ہے۔

مشرف احمد

۵ جولائی ۱۹۷۷ء

تعارف

موجودہ صدی میں اردو کے ادبی تحقیق کے سرمائے میں جو قابل قدر اضافے ہوئے ہیں، ان کی اہمیت و افادیت سے انکار نہیں کیا جا سکتا لیکن یہ حقیقت ہے کہ ہماری ادبی تحقیق کا دائرہ بہت محدود رہا ہے گنتی کے چند شاعر ہیں جو ہمارے اہل تحقیق کی توجہ کا مرکز رہے ہیں۔ ہر محقق انہیں چند شاعروں پر زور تحقیق صرف کرتا ہے نتیجہ یہ ہے کہ ان چند شعرا کے بارے میں تو ہمیں ایسی معمولی معمولی باتیں بھی معلوم ہیں جن کے نہ جاننے سے کوئی فرق نہ پڑتا، لیکن بہت سے قدیم شعرا کے بارے میں ہمیں بنیادی معلومات بھی حاصل نہیں ہیں۔

اس بے اعتدالی کی کئی وجوہ ہیں۔ پہلی وجہ تو ہمارے اہل تحقیق کی تن آسانی ہے۔ وہ ہمیشہ ایسا موضوع انتخاب کرتے ہیں جس پر پہلے بہت کچھ لکھا جا چکا ہو یا لکھنے کے لیے بہت سا مواد موجود ہو۔ وہ کسی نئے موضوع کو ہاتھ لگاتے ہوئے ڈرتے ہیں کیونکہ ہر نیا موضوع اپنے ساتھ بہت سے تقاضے بھی لے کر آتا ہے جنھیں پورا کرنا خاصا مشکل کام ہے۔

تن آسانی کے اس رویّے کو ہماری یونیورسٹیوں نے خاصی تقویت پہنچائی ہے، جہاں تحقیق کا مقصد صرف سند لینا اور سند دینا ہے حقائق کی دریافت یا بازیافت نہیں ہے۔ اگر کوئی بُرا نہ مانے تو میں یہاں تک کہوں گا کہ یونیورسٹیوں سے باہر جو تحقیقی کام ہوئے ہیں، ان کا معیار یونیورسٹیوں

میں ہونے والے تحقیقی کاموں سے کہیں بہتر ہے۔ قاضی عبدالودود، امتیاز علی عرشی، مالک رام اردو تحقیق کے معتبر نام ہیں، اور ان میں سے کسی کا تعلق یونیورسٹیوں سے نہیں رہا۔

اردو ادب اور زبان کے عہد بہ عہد ارتقا سے صحیح طور پر آگاہ ہونے کے لیے ضروری ہے کہ اردو کے شاعروں اور نثر نگاروں کی تمام تحریروں کا متن ہمارے سامنے ہو۔ ان ادیبوں کے حالات زندگی بھی منظر عام پر آنے چاہئیں تاکہ ان کے زمانے کا صحیح تعین کیا جا سکے۔ یہاں صورت حال یہ ہے کہ اردو کے قدیم ادبی سرمائے کا بڑا حصہ شائع ہی نہیں ہوا۔ یہ سرمایہ مختلف کتب خانوں میں مخطوطات کی صورت میں اپنے محققوں اور پھر ان کے توسط سے قارئین کے انتظار میں ہے۔ ضرورت اس امر کی ہے کہ ہمارے محقق اپنے محدود دائرے سے باہر نکل کر ان شاعروں اور نثر نگاروں پر کام کریں جن پر کچھ نہیں لکھا گیا یا جن کا کلام منظر عام پر نہیں آیا۔

بعض لوگ یہ کہتے ہیں کہ چھوٹے اور کم رتبہ شاعروں پر کام کرنا محض تضیع اوقات ہے۔ یہ بات اس وقت درست ہو سکتی تھی جب تمام شاعروں کا کلام ہمارے سامنے ہوتا۔ جب ہمارے کسی شاعر کا کلام ہی نہ دیکھا ہو تو پھر اسے چھوٹا یا کم رتبہ کس طرح قرار دیا جا سکتا ہے۔ ہماری ادبی تاریخوں میں بیشتر شعرا کے بارے میں جو کچھ لکھا گیا ہے، اس کی حیثیت سماعی یا قیاسی ہے۔ ہمارے ادبی موضوعوں میں سے بیشتر کو ادب کا براہ راست مطالعہ کرنے کی توفیق ہی نہیں ہوئی۔ ایسی صورت میں اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ ہماری ادبی تاریخیں کہاں تک اپنے موضوع سے انصاف کرتی ہیں۔

اس ساری تمہید کا مقصد یہ ہے کہ اگر ہمیں اپنی ادبی روایات سے واقف ہونا ہے اور اپنے ادبی سرمائے کی قدر و قیمت سے آگاہی حاصل کرنا ہے تو اس کے لیے ضروری ہے کہ ہمارا ادبی سرمایہ ہمارے سامنے ہو۔ ہمیں اپنے تمام قدیم شاعروں کو پڑھ کر ان کے بارے میں کوئی رائے قائم کرنی چاہیے۔

یہی وجہ ہے کہ جب کسی قدیم شاعر پر پہلی مرتبہ کوئی تحقیقی کام سامنے آتا ہے تو میں اسے ادبی ماضی کی بازیافت ہی نہیں، ادب کے ماضی و حال میں ایک گہرا تعلق پیدا کرنے کی کوشش بھی سمجھتا ہوں۔ زیرِ نظر کتاب بھی اسی قسم کی ایک کوشش ہے۔ اس کے ذریعے ایک ادیب، اور اس کی ادبی کاوشوں ہی کا سراغ نہیں لگایا گیا بلکہ ادیبوں کے ایک پورے خاندان کی ادبی سرگرمیوں کا جائزہ لیا گیا ہے۔

شاہ حسین حقیقت، جرأت کے خاص الخاص شاگردوں میں سے تھے۔ غزل گو اور مثنوی نگار کی حیثیت سے اپنے عہد کے ممتاز شعرا میں شمار ہوتے تھے لیکن شاعری ہی ان کے لیے ذریعہ عزت نہیں تھی۔ وہ فارسی اور اردو کے نثر نگار بھی تھے۔ اور سب سے بڑی بات یہ ہے کہ ایک بڑے عالم بھی تھے جس کا اندازہ ان کی متنوع تصانیف سے ہوتا ہے۔ وہ شعرائے اُردو کے تذکرے "تذکرۂ اخبا" کے مولف تھے۔ یہ تذکرہ اگرچہ اب ناپید ہے، لیکن اس سے استفادہ کر کے جو تذکرے لکھے گئے ہیں، ان کے اعلیٰ معیار کے پیشِ نظر کہا جا سکتا ہے کہ اگر یہ ضائع نہ ہوتا تو اردو تذکرہ نگاری میں ایک اہم اضافہ ہوتا۔ شاہ حسین حقیقت کا سب سے بڑا علمی کارنامہ "تحفۃ العجم" ہے جو فارسی زبان کی صرف و نحو سے متعلق ہے۔ یہ کتاب ایک زمانے میں برصغیر اور ایران کے علمی حلقوں میں بہت مقبول تھی۔ "جذبِ عشق" اردو نثر میں ایک قصہ ہے۔ جو اٹھارویں صدی کے آخری چند برسوں میں لکھا گیا تھا۔ یہ اُردو کے نثری اسلوب کے ارتقا کی اہم کڑی ہے جو "نوطرزِ مرصع" اور "باغ و بہار" کی تخلیق کے درمیانی زمانے کی تصنیف ہے جس نے تحسین کے اسلوب میں سادگی کا عنصر شامل کر کے میر امن کے اسلوب کے لیے راہ ہموار کی

مشرف احمد صاحب نے زیرِ نظر کتاب میں شاہ حسین حقیقت کی ادبی و علمی کاوشوں پر تفصیل سے لکھا ہے جس سے اندازہ ہوگا کہ حقیقت کی ادبی تخلیقات نے اردو ادب کے ارتقائی سفر میں اہم تاریخی کردار ادا کیا ہے۔

شاد حسین حقیقت کے خاندان کے متعدد افراد نے ادبی دنیا میں نام پیدا کیا حقیقت کے بڑے بھائی شاہ حسن سنبط کا نام اردو کے مشہور ناول "نشتر" کی وجہ سے زندہ رہے گا۔ "نشتر" شاہ حسن سنبط کے "قصہ حسن و عشق" کا ترجمہ ہے حقیقت کے بیٹے میر محسن لکھنوی، خواجہ وزیر (شاگرد ناسخ) کے شاگرد تھے اور اپنے عہد کے مشہور شاعر تھے، لیکن ادبی تاریخ میں وہ شاعر سے زیادہ "سراپا سخن" کے مولف کی حیثیت سے یاد رکھے جائیں گے۔ اردو زبان میں یہ اپنی نوعیت کا منفرد تذکرہ شعرا ہے۔ جس میں موضوعات کے اعتبار سے شعرا کا کلام جمع کیا گیا ہے۔" سراپا سخن" کی ایک اہمیت یہ بھی ہے کہ متعدد شعرائے لکھنؤ کے سلسلے میں یہی اب تک واحد ماخذ ہے۔ محسن کے بڑے بیٹے سید جعفر حسین، بہت بڑے ماہر تعمیرات تھے وہ خود تو کوئی ادبی شخصیت نہیں تھے لیکن ادب میں ان کی یہ اہمیت کچھ کم نہیں ہے کہ وہ مرزا رسوا کے ناول "شریف زادہ" کے مرکزی کردار ہیں۔ محسن کے دوسرے بیٹے محمد حسین تھے، جن کے نام کا جزو آخر "لندنی" تھا۔ کیونکہ وہ ایک عرصے تک لندن میں رہے تھے۔ وہ شاعر تھے لیکن ان کی شہرت اس وجہ سے تھی کہ انہوں نے زراعت کے موضوع پر اردو میں سب سے پہلے متعدد کتابیں لکھیں۔

زمانہ حال کے کئی مشہور ادیب (ظفر عمر زیلی چھتری) سید رفیق حسین (گوری ہوگوری) اور الطاف فاطمہ (دستک نہ دو) بھی اسی خاندان سے تعلق رکھتے ہیں۔ مشرف احمد صاحب نے ان سب کے حالات بھی، بعض دوسرے افراد خاندان کے حالات کے ساتھ لکھے ہیں۔

مشرف احمد صاحب ادبی دنیا میں افسانہ نگار کی حیثیت سے معروف ہیں۔ ان کا شمار ہمارے ان جدید ترین افسانہ نگاروں میں ہوتا ہے جنھوں نے اپنی تخلیقی کاوشوں کے گہرے نقوش

ثبت کیے ہیں۔ پیشے کے اعتبار سے وہ ایک کالج میں استاد ہیں، اس لیے اردو ادب کی تاریخ ان کی دل چسپی کا خاص موضوع ہے۔ شاید ۱۹۷۲ء کی بات ہے کہ ایک روز مشرف احمد صاحب سے اردو کے قدیم شعرا پر گفتگو ہو رہی تھی۔ دوران گفتگو شاد حسین حقیقت اور ان کے بیٹے محسن کا بھی ذکر آیا اور میں نے مشرف صاحب سے گزارش کی کہ وہ ان باپ بیٹوں پر کام کریں تو بہت اچھا ہو۔ مشرف صاحب نے ہامی بھر لی۔ اور کام شروع کر دیا۔

خوش قسمتی سے اسی زمانے میں میجر جنرل سید شاہد حامد صاحب سے میری ملاقات ہوئی۔ موصوف سید جعفر حسین (ابن میر محسن لکھنوی) کے پوتے ہیں، وہ اپنے خاندان کے مصنفین کی کتابیں جمع کر رہے تھے۔ اور اسی سلسلے میں مجھ سے ملے تھے۔ میں نے انھیں بتایا کہ میرے ایک دوست حقیقت و محسن کے بارے میں کتاب لکھنے کا ارادہ کر رہے ہیں تو انھوں نے بڑی خوشی کا اظہار کیا، اور ہر ممکن مدد کا وعدہ کیا۔

مشرف احمد صاحب نے تقریباً چار برس کی ان تھک محنت کے بعد اس کام کو مکمل کیا ہے۔ انھوں نے جس طرح مواد کی فراہمی اور متعلقہ کتابوں کے حصول کے لیے دوڑ دھوپ کی ہے، وہ کچھ انھیں کے بس کا کام تھا۔ خاندانی حالات کے سلسلے میں میجر جنرل سید شاہد حامد کے خاندانی ذخیرۂ دستاویزات سے بہت سا مواد ملا ہے لیکن مصنفین کے ادبی کارناموں کے سلسلے میں مشرف احمد صاحب کو خود ہی ساری تگ و دو کرنی پڑی۔ انھوں نے بہت سی نایاب کتابوں کا سراغ لگایا، ناپید کتابوں کے بارے میں معلومات حاصل کیں، اور بعض ایسی کتابوں کے مطبوعہ نسخوں کی نشان دہی کی جن کے بارے میں اب تک سمجھا جاتا تھا کہ وہ شائع نہیں ہوئیں۔ اس سلسلے میں ایک مثال دوں گا۔ حقیقت کی تصنیف "جذب عشق" کے بارے میں اب تک عام خیال یہی تھا

کہ یہ کبھی شائع نہیں ہوئی۔ اہلِ تحقیق کی نظر میں اس کتاب کا صرف وہ قلمی نسخہ تھا۔ جو پروفیسر مسعود حسن رضوی ادیب کے کتب خانے میں تھا۔ سب نے اسی قلمی نسخے کے حوالے دیئے ہیں۔ مشرف احمد صاحب نے اس کا مطبوعہ نسخہ بھی ڈھونڈ نکالا ہے۔ اور یہ ایک بہت اہم دریافت ہے۔

مشرف احمد صاحب نے اس کتاب میں جہاں متعدد سوانحی و تاریخی مباحث پر مدلّل بحث کر کے عمدہ تحقیقی معیار پیش کیا ہے۔ وہیں یہ کتاب تنقیدی بصیرت سے بھی خالی نہیں ہے۔ حقیقت کی مثنویوں اور دیگر تصانیف نیز ضبط کے ناول کے ترجمے "نشتر" کے تنقیدی تجزیے سے ان تخلیقات کی قدر و قیمت متعین کرنے میں بڑی مدد ملتی ہے۔ اس کتاب میں تحقیق و تنقید کا جو خوش گوار توازن ملتا ہے، وہ اس قسم کی کتابوں میں عام طور پر نظر نہیں آتا۔ ہمارے اہلِ تحقیق عموماً تنقیدی بصیرت سے اور اہلِ تنقید تحقیقی بصارت سے کم کام لیتے ہیں۔ مشرف احمد صاحب نے اس روشِ عام کی پیروی نہ کر کے تنقیدی اور تحقیقی دونوں سطحوں پر اپنے موضوع کے ساتھ انصاف کیا ہے۔

مشفق خواجہ

امیر کلال

حضرت سید امیر کُلال رحمتہ اللہ علیہ ترکستان کے قصبہ سوخار میں پیدا ہوئے، جو راستین سے ایک میل اور بخارا سے نو میل کے فاصلے پر واقع ہے۔

القاب آپ کے القاب سلطان الطریقت، برہان الحقیقت، سید السادات، قطب زماں، وحید دوراں اور فرید دہر ہیں۔

جواہر علویہ میں آپ کا اسم مبارک امیر بیان کیا گیا ہے۔

امیر کلال کی وجہ تسمیہ امیر کلال کی وجہ تسمیہ یہ بیان کی گئی ہے کہ چونکہ آپ کا پیشہ کوزہ گری تھا اور بخارا میں اس فن سے متعلق شخص کو کلال کہا جاتا ہے لہذا آپ اس نام سے معروف ہوئے۔ حضرات القدس جلد اوّل میں مرقوم ہے "آپ کوزہ گری کا شغل رکھتے تھے، بخارا کی زبان میں کوزہ گری کا پیشہ کرنے والے کو کلال کہتے ہیں[1]۔ جواہر علویہ میں لفظ کلال کی تعبیر میں اختلاف پایا جاتا ہے۔ چنانچہ مولوی رؤف احمد نقشبندی، جواہر علویہ میں اس لفظ کی وضاحت کرتے ہوئے ایک جگہ لکھتے ہیں "کلال داس گر کو کہتے ہیں۔ آپ زراعت کیا کرتے تھے[2]۔"

غیاث اللغات اور فیروز اللغات[3] میں لفظ کلال کے معنی مٹی کے برتن بنانے والے کے بیان کئے گئے ہیں۔ آپ کا اصل نام خواجہ شمس الدین خاخوری ہے لیکن اصل نام کی بجائے آپ امیر کلال کے عرف سے معروف ہیں[5]۔

۱:۔ صفحات ۶۳۔۶۲ (۲) ۱۲۱ اردو ترجمہ ۲:۔ حضرات القدس [illegible]
۳:۔ غیاث اللغات و فیروز اللغات لغات فارسی | ۵:۔ اکثر تذکروں میں پیتے کی نسبت کے سبب سے آپ کے نام کے ساتھ خاخوای بھی لکھا ہوا ہے۔ اس لفظ کے معنی میں فارسی لغتوں میں مٹی کے برتن بنانے والے کے بیان ہوئے ہیں

آباواجداد آپ کا سلسلہ نسب، فخر موجودات، سرور کائنات، رسول رحمت آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے جا ملتا ہے جس کی تفصیل یوں ہے۔

(۱) حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم (۲) امیر المومنین حضرت علی کرم اللہ وجہ، حضرت فاطمہ الزہرہ (۳) حضرت امام حسین (۴) حضرت امام زین العابدین (۵) حضرت امام محمد باقر (۶) حضرت امام جعفر صادق (۷) حضرت امام موسیٰ کاظم (۸) حضرت سید ابراہیم رضا (۹) حضرت سید محمد جعفر موسوی (۱۰) حضرت سید محمد عزیز موسوی (۱۱) حضرت سید احمد موسوی (۱۲) حضرت سید محمد شہید موسوی (۱۳) حضرت سید عبداللہ الملقب بہ مظلوم (۱۴) حضرت سید امیر موسوی (۱۵) حضرت سید امیر حسین (۱۶) حضرت سید ابوالقاسم (۱۷) حضرت سید امیر عزیز (۱۸) حضرت سید امیر حمزہ (۱۹) حضرت سید امیر کلال رح

حضرت امیر کلال کے اجداد میں سے ہر بزرگ کی شخصیت اور ان کی صفات و کرامات کے بارے میں علیحدہ کتابیں لکھی جا سکتی ہیں۔ ان کی شخصیات، تاریخ میں مینارہ نور کی حیثیت رکھتی ہیں لہذا یہاں اصل موضوع سے گریز کرتے ہوئے علیحدہ علیحدہ ان کے بارے میں لکھنا تحصیل لاحاصل ہوگا۔ بس اس قدر کافی ہے کہ ان تمام بزرگوں نے اپنے اپنے عہد میں رشد و ہدایت کا سلسلہ جاری رکھا اور بندگان خدا کی رہنمائی کرتے رہے۔

امیر کلال کے بزرگوں کا ترک وطن اور ترکستان میں آمد حضرت امیر کلال کے بزرگوں نے عرب کو کب خیر باد کیا؟ اور ترک وطن کر کے ترکستان میں تشریف لائے؟

اس سلسلہ میں کافی تلاش و تحقیق اور جستجو کے بعد بھی ایسے شواہد دستیاب نہیں ہو سکے کہ جن کی بنا پر کسی حتمی رائے کا اظہار کیا جا سکے۔ البتہ بعض تاریخی روایات اور مختلف سلسلوں کی کڑیاں جوڑنے کے بعد ہم اس نتیجے پر پہنچتے ہیں کہ خلفائے بنی عباس کے عہد حکومت میں حضرت سید ابراہیم رضا

۱۔ آگاہی امیر کلال بزبان فارسی ص ۲

کے صاحبزادے حضرت سید عبداللہ الملقب بہ مظلوم بعض روایات کے بموجب جنوبی یمن میں مخفی طور پر سکونت پذیر تھے جہاں سے انھوں نے جور و ستم کے سبب، اپنے تبرکاتؔ خاندانی کو حرزِ جان بنائے ہوں ترکستان کی جانب ہجرت کی اور بلخ یا بخارا میں سکونت اختیار کی. آپ کے ہمراہ آپ کے قرابت دار، اعزّہ، عقیدت مند اور مخلص دوست بھی ترکِ وطن کر کے ترکستان میں آ گئے۔ چنانچہ ایک اور روایت میں بیان ہوا ہے کہ "حضرت سید محمد شہید موسوی کی شہادت کے بعد حضرت سید عبداللہ الملقب بہ مظلوم اپنے اعزّہ اور مخلص دوستوں کے ہمراہ حدودِ ترکستان میں قیام پذیر ہوئے۔" آلِ رسول ہونے کے سبب سے، حضرت امیر کلال کا خاندان ترکستان میں مرجع خلائق رہا ہوگا۔

حضرت امیر کلال کی بزرگی کے آثار ان کی پیدائش سے قبل ہی ظاہر ہونا شروع ہو گئے تھے چنانچہ جب وہ شکم مادر میں تھے، تو ان کی والدہ کو یہ احساس ہو گیا تھا کہ ان کی کوکھ میں پرورش پانے والا بچہ غیر معمولی بچہ ہے۔ چنانچہ آگاہی امیر کلال میں لکھا ہے۔" ابھی حضرت شکم مادر میں تھے اگر وہ (امیر کلال کی والدہ) کوئی ایسی چیز کھا لیتی تھیں کہ جس کے پاک ہونے یا حلال ہونے میں کسی قسم کا شک و شبہ ہوتا تو فوراً پیٹ میں درد شروع ہو جاتا اور بعض اوقات درد کی یہ شدت اور زیادہ ہو جاتی، کچھ عرصہ کے بعد انھوں نے محسوس کیا کہ شاید اس کا سبب شکم میں موجود نازایدہ بچہ ہے، لہٰذا اس دن کے بعد سے انھوں نے کھانے پینے میں احتیاط کو اپنی عادت بنا لیا۔

آگاہی امیر کلال کے مطالعے سے معلوم ہوتا ہے کہ بچپن ہی سے اہل اللہ اور صاحبان نظر امیر کلال کی جانب متوجہ ہو گئے تھے، اور انھوں نے امیر موصوف میں بزرگی کے آثار کو

پہچان لیا تھا۔ آگاہی امیر کلال میں بیان ہوا ہے کہ امیر کلال کے والد ماجد قریہ افشنہ میں مدینہ منورہ سے آنے کے بعد سکونت پذیر ہو گئے تھے۔ اس زمانے میں ایک اور بزرگ سید آتا نامی تھے جن کے امیر موصوف کے والد سے قریبی و مخلصانہ تعلقات تھے۔ چنانچہ بزرگ موصوف جب بھی قریہ افشنہ اور بخارا میں تشریف لاتے تو امیر کلال کے والد سے ملاقات کرتے تھے ایک بار جب سید آتا امیر کلال کے والد سے ملاقات کے لئے تشریف لائے تو ان سے کہا "اے بھائی اللہ تعالےٰ تمھیں ایک فرزند عطا کرے گا کہ جو تمام جہان کو اپنی خدمت میں لے گا اس کا نام امیر کلال رکھنا۔"

ایک دوسری روایت یہ ہے "ایک بار حضرت سید آتا کا گزر قریہ افشنہ سے ہوا۔ انھوں نے امیر کلال کے والد سے کہا "اے برادر فرزند کو ہمارے روبرو لاؤ"۔ جب امیر کلال کو ان کے سامنے لایا گیا تو انھوں نے کمال شفقت کا اظہار کرتے ہوئے امیر موصوف کو اپنے پہلو میں بٹھایا۔

ایک اور روایت میں ہے کہ امیر کلال بچوں میں کھڑے تھے، لیکن ان کے ساتھ کھیل نہیں رہے تھے۔ جب انھوں نے حضرت سید آتا کو دیکھا تو وہاں سے بھاگے اور ان کے پاس آئے۔ حضرت سید آتا انھیں اپنے گھر لے آئے اپنے پہلو میں بٹھایا اور اپنے عمامے کو دو حصہ کر کے تہائی حصہ خود باندھ لیا اور بقیہ امیر کلال کے سر پر باندھ دیا۔ اس کے بعد انھوں نے حاضرین سے مخاطب ہو کر فرمایا: "مشائخ طیبیہ کی ارواح وادر ہو رہی ہیں۔ اس کو تمام ولائتیں دے دی گئی ہیں۔ ہم نے اس کے عالی مرتبہ ہونے کا مشاہدہ کر لیا ہے اور

اس کا مرتبہ ہم سے زیادہ ہوگا"۔

حضرت امیر کلالؒ کے والد

حضرت امیر کلال کے والد کے حالاتِ زندگی زیادہ تفصیل سے دستیاب نہیں ہیں۔ ان کے اجداد کے عرب سے ترکِ وطن کر کے ترکستان میں آباد ہونے کا ذکر ہم گزشتہ صفحات میں کر آئے ہیں۔ البتہ آگاہی امیر کلال سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت امیر کے والد مدینہ جاتے رہتے تھے۔ اور جو واقعہ ہم حضرت سید اتا کے سلسلے میں آگاہی امیر کلال سے پچھلے صفحات میں رقم کر آئے ہیں۔ اس سے پتہ چلتا ہے کہ امیر کلال کے والد، ان کی پیدائش سے قبل مدینہ منوّرہ کے سفر سے واپس آئے تھے

امیر کلالؒ کے مرشد

حضرت امیر کلال کے مرشد اس وقت کے ایک معروف روحانی اور دینی شخصیت خواجہ بابا سماسی تھے۔ خواجہ بابا سماسی صاحب باطن بزرگ تھے اور ترکستان کے قصبہ سماس کے رہنے والے تھے چنانچہ اس نسبت سے سماسی مشہور ہوئے۔ سماس رامتین کا ایک گاؤں ہے جو بخارا سے نو میل کے فاصلے پر تھا۔ بابا سماسی کا مزار مبارک بھی وہیں ہے۔ خواجہ بابا سماسی، حضرت عزیزاں علیہ الرحمتہ کے افضل و اکمل اصحاب میں سے تھے۔ قصبہ سماس کے محل وقوع میں بھی اختلاف پایا جاتا ہے چنانچہ اخبار الاخیار میں لکھا ہے کہ سماس، طوس میں ایک قصبہ ہے جو اب مشہد کے نام سے مشہور ہے۔ بعض کہتے ہیں کہ بخارا میں ایک قصبہ ہے۔

جب حضرت عزیزاں علی رامتینی کی وصال کی گھڑی نزدیک آئی تو آپ نے اپنے تمام مریدوں اور اصحاب سے حضرت خواجہ محمد بابا سماسی کو منتخب کیا اور اپنی خلافت اور

نہایت برج حق شناسی کے اس روشن آفتاب کو سونپی اور سارے مریدوں کو ان کی تابعداری کا حکم دیا۔ آپ پر اکثر جذباتِ عشق اور وارداتِ الٰہی کا غلبہ طاری رہتا۔ اور اکثر از خود رفتہ اور عالم فراموشی میں رہتے۔ آپ کا ایک باغ تھا، جب اس سے انگور توڑتے تو حال اور کیفیت کے غلبے کی وجہ سے انگور آپ کے دستِ مبارک سے گر پڑتے، اور مدت تک آپ اسی غلبے کے عالم میں رہتے۔"

مرشد کی نگاہِ جوہر شناس

حضرت امیر کلال اور خواجہ محمد بابا سماسی کی ملاقات کے بارے میں یہ روایت بیان کی جاتی ہے کہ "قریۂ رامین میں امیر کلال کشتی کھیلنے میں مصروف تھے ایک شخص نے خواجہ محمد بابا سماسی سے کہا کہ اس شخص کو دیکھو کیسی بدعت میں مشغول ہے، انھوں نے جواب دیا: "یہ اس میدان کا ایسا مرد ہے اور اس دام گاہ کا ایسا صید ہے کہ تمام کامل اس کی صحبت سے بہرہ مند ہو جائیں گے اور ہم اس مرد کے منتظر ہیں کہ حق تعالےٰ اس مرد کو ہمارے دام میں پھنسا دے ہم نے اس کے مقامات بلند کا مشاہدہ کر لیا ہے۔ ابھی وہ یہ بات ہی کر رہے تھے کہ امیر کی نگاہِ خواجہ بابا پر پڑی اور ان کے دل کا صید کمند خواجہ میں گرفتار ہو گیا، اور عنانِ اختیار ان کے ہاتھ میں چلا گیا، اور اسی روز فرزندی قبول کر لی۔"

حضرت امیر کلال اور حضرت خواجہ محمد بابا سماسی کے درمیان ہونے والی اولین ملاقات کے سلسلے میں جواہر علویہ میں جو روایت بیان کی گئی ہے وہ مذکورہ بالا روایت سے کچھ مختلف ہے: "ایک روز محمد بابا سماسی رحمتہ اللہ علیہ اس اکھاڑے کے پاس سے گزر رہے تھے تو وہاں کھڑے

---

۱ :۔ تذکرۃ الکرام۔ تاریخ خلفائے عرب و اسلام

129018

ہوکر دیر تک دیکھتے رہے، بعض اصحاب نے جو ہمراہ تھے خیال کیا کہ کیا سبب ہے کہ خواجہ صاحب ان کی طرف متوجہ ہیں۔ خواجہ صاحب نے کشف کر کے معلوم فرمایا کہ اس اکھاڑے میں ایک ایسا مرد ہے کہ بہت سے مرد اس کی صحبت میں کمال کے درجے پر پہنچیں گے ہماری نگاہ اس پر ہے اور ہم اس کو شکار کرنا چاہتے ہیں اس اثنا میں امیر کلال کی نظر خواجہ صاحب پر پڑی تو کشش ہوئی چنانچہ جب خواجہ صاحب اپنے مکان پر چلے آئے تو امیر صاحب بھی اکھاڑہ چھوڑ حواس باختہ ہو کر خواجہ صاحب کے پیچھے روانہ ہوئے اور ان سے طریقہ اخذ کیا اور خواجہ صاحب نے آپ کو فرزندی میں قبول فرمایا۔

مرشد کامل سے تعلق خاطر پیدا ہو جانے کے بعد پھر امیر کلال کو کسی نے بازار یا اکھاڑے میں نہیں دیکھا۔ آپ بیس سال تک حضرت خواجہ محمد بابا سماسی کی خدمت میں حاضری دیتے رہے اور پابندی کے ساتھ ہفتے میں دو دن، سوموار اور جمعرات کو سوخار سے سماس حاضر ہوا کرتے تھے ان قصبوں کے درمیان پندرہ میل کا فاصلہ ہے۔

اسی مرشد کامل کی صحبت میں امیر کلال نے سلوک و طریقت کی منازل طے کیں، اور صاحب خوارق، کراماتِ ظاہری و باطنی سے آراستہ و پیراستہ اور کشوف حالات میں روشن نگاہ ہوئے۔"

حضرت امیر کلال کو ابتدائے عمری میں کشتی وغیرہ سے خاص شغف تھا۔ چنانچہ یہاں ایک واقعہ بیان کیا جاتا ہے جو اکثر تذکروں میں مرقوم ہے۔ پندرہ سال کی عمر میں وہ ایک جگہ کھڑے ہوئے کشتی دیکھ رہے تھے اور بعض روایتوں میں ہے کہ خود بھی اس کھیل میں شریک تھے۔ تماشائیوں میں سے ایک شخص نے انھیں دیکھکر اپنے دل میں سوچا کہ یہ ایک شریف اور نجیب الطرفین سیدزادہ ہے اور

۷:- آگاہی امیر کلال بزبان فارسی

اور ایسی بدعت میں مصروف ہے۔ اتفاق سے اس کھیل کو دیکھتے دیکھتے اس شخص کی آنکھ لگ گئی اور اس نے دیکھا کہ وہ دوزخ میں جا رہا ہے اور حضرت امیر اسے ہاتھ سے پکڑ کر واپس لا رہے ہیں بعدازاں اس سے کہتے ہیں کہ کسی کے ظاہر پر مت جاؤ وہ اعتراض کنندہ اس خواب سے چونک اٹھا اور بعد میں معذرت خواہ ہوا۔

جواہر علویہ میں لکھا ہے کہ" جب آپ جوان ہوئے تو کشتی لڑنا سیکھنے لگے آپ کے گرداگرد لوگوں کا ہجوم جمع ہو جایا کرتا تھا۔ ایک روز جب کہ آپ اکھاڑے میں کشتی لڑ رہے تھے تو ایک شخص نے خیال کیا کہ اس کے کیا معنی ہیں کہ ایک شریف سید زادہ کشتی لڑے اور زور آزمائی کرے اور اہل بدعت کا طریقہ اختیار کرے۔ اس اثنا میں اس شخص کو نیند آگئی تو خواب میں کیا دیکھتا ہے کہ قیامت کا دن ہے اور وہ کیچڑ میں سینے تک دھنس گیا ہے اور عاجز ہو گیا ہے اتنے میں امیر رحمتہ اللہ علیہ آئے اور اس کے دونوں بچے پکڑ کر آسانی سے اس کو کیچڑ میں سے نکال لائے جب وہ شخص جاگا تو امیر صاحبؒ نے اس کی طرف متوجہ ہو کر فرمایا کہ ہم ایسے ہی دن کے لئے زور آزمائی کرتے ہیں۔

خواجہ نقشبندی کی تربیت کا حکم

حضرت خواجہ بہاوالدین نقشبندی کی ذات، اہل علم اور اہلِ تصوف کے لئے کسی تعارف کی محتاج نہیں ہے۔ آپ سلسلۂ نقشبندی کے بانی ہیں اور آپ کا شمار اولیائے کبار میں ہوتا ہے اسی سلسلۂ نقشبندیہ میں دنیائے تصوف کے روشن آفتاب و ماہتاب شامل ہیں جن میں حضرت خواجہ باقی باللہ، حضرت مجدد الف ثانی، حضرت مرزا مظہر جان جاناں اور شاہ غلام علی جیسے جید بزرگان دین شامل ہیں۔

---

۸ :۔ جواہر علویہ، از مولوی رؤف احمد۔ ص ۶۲-۶۱

حضرت خواجہ بہاوالدین نقشبندی کے اولیّن مرشد حضرت سید امیر کلال ہی تھے۔ بعدازاں خود اپنے مرشد کے ارشاد پر بہاوالدین نقشبندی، حضرت عجدوانی رحمتہ اللہ علیہ کے پاس تشریف لے گئے اور ان کے سامنے زانوئے تلمذ طے کیا۔ جس کی تفصیل آئندہ سطور میں آئے گی۔

مختلف تذکروں میں مرقوم ہے کہ حضرت خواجہ محمد بابا سماسی، جب قصر ہندواں سے گزرتے تو فرمایا کرتے تھے کہ جلد ہی اس خاک سے ایک مرد پیدا ہوگا اور یہ قصر ہندواں، قصر عارفاں ہو جائے گا۔ اس سفر میں حضرت امیر کلال بھی ان کے ہمراہ ہوا کرتے تھے، ایک دفعہ جب قصر عارفاں سے بابا سماسی گزرے تو فرمایا کہ "اب وہ خوشبو زیادہ ہوگئی ہے، شاید وہ مرد پیدا ہوگیا ہے۔ چنانچہ جب آپ اتر کر قصر ہندواں پہنچے تو آپ کو بتایا گیا کہ قصر عارفاں میں آج ایک لڑکا پیدا ہوا ہے۔

چنانچہ حضرت خواجہ بہاوالدین نقشبندی کے دادا، نومولود کو لے کر آپ کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ بابا سماسی نے فرمایا" یہ ہمارا فرزند ہے ہم نے اسے قبول کیا۔ بعدازاں اپنے احباب کی طرف، جن میں حضرت امیر کلال بھی موجود تھے۔ متوجہ ہو کر کہا "یہی مرد ہے جس کی خوشبو ہمیں آیا کرتی تھی، یہ شخص جلد مقتدائے زمانہ میں سے ہوگا۔ اس کے بعد امیر کلال سے مخاطب ہو کر فرمایا۔" ہمارے فرزند بہاوالدین کے حق میں تربیت و شفقت کا فرق نہ کرنا۔ اگر تم نے اس میں قصور کیا تو میں معاف نہیں کروں گا۔" امیر نے فرمایا کہ "میں مرد نہ ہوں گا اگر آپ کی وصیت میں قصور کروں گا۔"

جب حضرت بہاوالدین نقشبندی من شعور کو پہنچے اور تربیت کے قابل ہوئے تو

حضرت خواجہ محمد بابا سماسی کا انتقال ہو چکا تھا۔ چنانچہ حضرت امیر کلال کے طلب کرنے پر یا از خود خواجہ مذکور کے اقارب، بابا محمد سماسی کی وصیت کے مطابق، انھیں حضرت امیر کلال کی خدمت میں لے کر حاضر ہو گئے۔ تذکرۃ الکرام تاریخ خلفائے عرب و اسلام میں مذکور ہے کہ "خواب میں حضرت خواجہ بابا سماسی نے آکر خواجہ بہاء الدین نقشبندی سے فرمایا تم امیر کلال کے پاس حاضر ہو کہ وہ ابدال سے ہیں۔ حضرت خواجہ بہاء الدین نقشبندی، بابا سماسی حکم کے مطابق اگلے روز امیر کلال کی خدمت میں پہنچے آپ نے اپنے مرشد کے روحانی فرزند کی بڑی خاطر داری کی اور ذکر اثبات کا یعنی لَآ اِلٰہَ اللّٰہُ مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللّٰہِ کا تعلیم کیا۔

حضرت خواجہ نقشبندی کا بیان ہے کہ" چنانچہ اس سے پہلے مجھ کو ذکر خفی کی تعلیم ہوتی تھی اس لئے میں نے ذکر جہر سے احتراز کیا۔ جب اہلِ طریقت نے اس طریقے میں سماع اور ذکرِ جہر اور خلوت یعنی چلہ کشی نہیں دیکھا ان لوگوں نے کہا کہ تمھارے اس طریقے میں اور طریقوں سے اختلاف ہے۔ آپ نے فرمایا کہ ہمارے یہاں خلوت در انجمن ہے اور ہمارا قول ہے۔

آشنا شوں از درول دو زبروق بیگانہ باش
کین چنیں زیبا روش کم مے بود اندر جہاں [1]

چنانچہ امیر کلال سے بیعت ہو کر، خواجہ بہاء الدین نقشبندی، سلوک و طریقت کی منازل طے کرنے لگے۔ جب امیر موصوف کی خدمت میں حاضری دیتے ہوئے خواجہ صاحب موصوف کو کافی عرصہ گزر گیا تو ایک دن امیر کلال نے خواجہ نقشبندی کو یاد فرمایا۔ جب آپ مرشد کی خدمت میں حاضر ہوئے تو اس وقت امیر موصوف کے اردگرد عقیدت مندوں اور مریدوں

۱:۔ تذکرۃ الکرام تاریخ خلفائے عرب و اسلام ص ۴۸۵

کا ہجوم تھا۔ آپ نے خواجہ نقشبندی کی طرف متوجہ ہوکر فرمایا۔" اے فرزند بہاءالدین، حضرت خواجہ محمد بابا سماسی کے نقش بر قدم ہوکر میں تمہارے حق کو پورا بجا لاؤں گا کیونکہ آپ نے فرمایا تھا کہ جیسے ہم نے تمہاری تربیت کا حق پورا کیا ہے ایسا ہی تم میرے فرزند بہاءالدین کے حق میں بجا لانا۔ اور فرق نہ کرنا۔ میں نے ایسا ہی کیا ہے۔ پھر اپنے سینے کی طرف اشارہ کیا اور فرمایا کہ میں نے اپنے پستان کو تمہارے لئے خشک کر ڈالا تاکہ تمہاری روحانیت کا مرغ بشریت کے انڈے سے باہر نکل آئے، لیکن تمہاری ہمت کا مرغ بلند پرواز ہوا ہے اب تم کو اجازت ہے جہاں کی تمہارے دماغ میں خوشبو پہنچے خواہ ترک ہو خواہ تاجیک ہو خوشی طلب کرو اور اپنی ہمت کے مطابق خدا کی طلب میں کوتاہی نہ کرو

حضرت خواجہ بہاءالدین نقشبندی نے اپنے مرشد کے ان احکامات کا کیا اثر قبول کیا اور وہ امیر موصوف کو کس درجے پر فائز سمجھتے تھے، اس کے بارے میں خواجہ بہاءالدین کے اپنے خیالات لکھے جاتے ہیں۔ جب امیر سے یہ نقش ظاہر ہوا وہی آزمائش کا سبب ہوگیا اگر کسی صورت پر ہم حضرت امیر کی متابعت کرتے تو ابتلا سے بہت دور رہتے سلامتی کے زیادہ نزدیک ہوتے۔"

امیر برہان خواجہ نقشبندی کی فرزندی میں

ایک دن حضرت امیر کلال نے خواجہ نقشبندی سے فرمایا کہ جب استاد اپنے کسی شاگرد کی تربیت کرتا ہے تو اس کے بعد یہ بھی چاہتا ہے کہ اس شاگرد میں اپنی تربیت کا اثر دیکھے تاکہ اس کو اعتبار آجائے اور اگر تربیت میں کسی صورت سے کوئی کمی دیکھے تو اس کی اصلاح کردے اس کے بعد فرمایا۔" میرا فرزند امیر برہان حاضر ہے کسی نے اس پر قبضہ کا ہاتھ نہیں رکھا اور معنوی تربیت نہیں کی، میرے خیال میں اس کی تربیت میں تم مشغول ہو جاؤ تاکہ اس کا اثر

ہم دیکھیں اور مجھ کو تمھاری صفت پر بھروسہ ہو جائے۔"

حضرت خواجہ بہاءالدین اس وقت مراقبے میں بیٹھے ہوئے تھے۔ اور امیر کلال کی جانب متوجہ تھے۔ آپ نے مرشد کی موجودگی اور ادب و تعظیم کا خیال کرتے ہوئے اس حکم کے ماننے میں تامل کیا حضرت امیر نے ان کے اس پس و پیش کو دیکھا تو فرمایا کہ اس میں توقف نہ کرنا چاہیئے۔ چنانچہ حضرت خواجہ مرشد کے حکم کو بجالانے پر آمادہ ہوئے اور" امیر برہان کے باطن کی طرف متوجہ ہوئے اور ان کے باطن کے تصرف میں مشغول ہوئے۔ اس وقت اس تصرف کی علامات امیر برہان کے ظاہر و باطن میں شروع ہوگئیں، اور بزرگ حال ان میں ظاہر ہوگیا اور سکر حقیقی کا اثر بھی ظاہر ہونے لگا۔

بعد ازاں اپنے مرشد کے حکم کے مطابق حضرت خواجہ بہاءالدین نقشبندی، حضرت فتح شیخ، خلیل آقا اور عبدالخالق غجدوانی علیہ رحمتہ کی جانب کسب فیض کے لئے بڑھے۔ آپ نے اس سلسلہ میں بھی پس و پیش کیا تھا اور حضرت امیر کلال کے در فیوض بخش سے ہی وابستہ رہنا چاہتے تھے لیکن حضرت امیر نے فرمایا "میں نے اپنے پیر بزرگوار کی وصیت کے مطابق تمھاری تربیت کی ہے۔ لیکن تمھاری استعداد اس سے بھی بہت اعلیٰ واقع ہوئی ہے اس واسطے جن سے تمھیں باطنی فیض حاصل ہو سکے کرلو۔" حضرت خواجہ یہ سن کر توقف میں پڑ گئے پھر حضرت سید امیر کلال نے فرمایا " کہ اللہ تعالےٰ کی مرضی اسی طرح ہے۔

ایک واقعہ

حضرت خواجہ بہاءالدین کے درجۂ کمال پر پہنچنے کے بارے میں ایک روایت بیان کی جاتی ہے۔" ایک دن حضرت امیر کلال نے خواجہ بہاءالدین سے کہا چونکہ تم مجھے نہیں چاہتے لہذا یہاں سے چلے جاؤ۔ خواجہ پر یہ بات ناگوار گزری اور وہاں سے چل دیئے۔ راستے میں سوچا کہ حضرت کے ایک بار کہنے سے میں کیوں چلا جاؤں۔

چنانچہ واپس آگئے۔ حضرت امیر نے دیکھا تو فرمایا۔" یہاں تیرا کوئی کام نہیں جا کوئی دوسرا دروازہ تلاش کر" خواجہ نے کہا میں جاتا ہوں۔ اور اب کبھی پھر نہ پلٹوں گا۔" چنانچہ وہ وہاں سے رخصت ہو کر شہر بخارا میں آگئے خواجہ کا گزر راستے میں ایک قمار خانے سے ہوا جہاں دو قمار باز کھیل رہے تھے ان میں سے ایک قمار باز سب کچھ ہار چکا تھا۔ پھر بھی دوسرے سے قرض مانگ کر کھیل جاری رکھنے پر اصرار کر رہا تھا۔ دوسرے قمار باز نے جواب دیا۔" تمہارے پاس کھیلنے کے لئے کیا رہ گیا ہے؟" ہارنے والے نے جواب دیا۔" اب جان کی بازی لگاؤں گا۔" خواجہ بہاوالدین اس قمار باز کا یہ جواب سن کر بے قرار ہو گئے اور ماہی بے آب کی طرح تڑپنے لگے اور پھر اپنے آپ سے مخاطب ہو کر کہنے لگے" بہاوالدین تو قمار باز سے بھی گیا گزرا ہے کہ اتنی جلدی میدان چھوڑ گیا۔ تجھے فوراً حضرت امیر کے آستانے پر لوٹ جانا چاہیئے۔

تا جان دارم در غمت آویزم ! تا اشک بود بر سر کویت ایزم
چو صبح قیامت بدمد باعشقت از خاک درت نعرہ زناں برخیزم

خواجہ بہاوالدین کا معمول تھا کہ حضرت امیر کے وضو کے لئے پانی کا اہتمام کرتے تھے چنانچہ معمول کے مطابق پانی کا آفتابہ بغل میں لئے ہوئے رات گئے آستان مرشد پر پہنچے رات بیحد سرد تھی اور برف گر رہی تھی۔ آپ پانی لئے دروازے میں کھڑے رہے حتیٰ کہ خواجہ بہاوالدین کا سارا جسم برف میں دب گیا جب امیر کلال صبح کو جب باہر آئے تو آپ کا پاؤں خواجہ بہاوالدین کے سر پر پڑا۔ فرمایا " بیٹے بہاوالدین اٹھ جا جس طرح ہمارا قدم تمہارے سر پر پڑا۔ تمہارا قدم لوگوں کی کثیر تعداد کے سر پر پڑے گا۔ حضرت امیر کی توجہ سے اسی رات خواجہ بہاوالدین درجہ کمال کو پہنچ گئے۔

امیر کلال اور تیمور گورگاں

صاحب قراں امیر تیمور گورگاں، حضرت امیر کلال کا خاص عقیدت مند تھا۔ اور ان کی ذات کو اپنے دنیوی و دینی معاملات میں ممد و معاون سمجھتا تھا۔" تیمور بار بار کہا کرتا تھا کہ مجھ کو جو کچھ سلطنت اور فتوحات حاصل ہوئیں وہ شیخ شمس الدین کی دعا کی تاثیر اور شیخ زین الدین خوافی کی صحبت کا اثر تھا اور جس قدر برکت ہے سید برکہ کا طفیل ہے۔

تیمور اور آل تیمور کی اہل اللہ اور مقدس لوگوں اور صاحبان علم و دانش سے عقیدت و مودت تاریخ کے لاذوال نقوش ہیں اس خاندان میں بزرگوں سے ربط و ضبط اور ان کے روبرو اظہار عقیدت و احترام کی رسم قدیم تھی جس پر ان کے خاندان کا ہر فرد عامل تھا۔ یہ شاہان کج کلاہ، بزرگوں اور اہل اللہ کی نظر التفات کو اپنے لئے دنیا میں کامیابی و کامرانی اور ان کی دعاؤں کو نجات اخروی کا باعث جانتے تھے۔ اس بات میں تو کوئی اختلاف رائے نہیں ہے کہ امیر تیمور، اپنی زندگی کے اوائل ہی سے حضرت امیر کلال کا عقیدت مند تھا البتہ اس بارے میں روایات میں اختلاف پایا جاتا ہے کہ تیمور کی اولین ملاقات حضرت امیر کلال سے کب اور کس طرح ہوئی۔" شہر کس میں حضرت شمس الدین فاخوری شیخ وقت اور معتقد بلاد تھے۔ ہر اک کا یہ گمان تھا کہ دین اور دنیاوی امورات میں ان کی دعا مقبول اور حضرت کا فرمودہ قابل اعتماد ہے۔ تیمور کی یہ حالت تھی کہ فقیر عاجز اپنے خیالات اور زعم میں عزت مند اور بہ اعتبار حالت موجودہ ذلیل و خوار، تیمور کے پاس سوا ایک کھادی کی چادر کے اور کچھ نہ تھا۔ تیمور نے اس کو بیچ کر ایک بکری کا بچہ خریدا اور شیخ کی خدمت میں اپنے مقصد دلی کی غرض سے حاضر ہوا۔ بایں طور کہ ایک رسّی میں ایک جانب اپنی گردن اور ایک جانب بکری کی گردن باندھ دی، اور لکڑی کے سہارے سے شیخ کی خدمت میں اس

وقت پہنچا کہ شیخ اپنے مریدوں کو توجہ دے رہے تھے۔ اور سب مریدین ذکر اللہ میں مشغول تھے۔ تیمور بہ حالت گدائی شیخ کے فارغ ہونے تک سامنے کھڑا رہا جب شیخ کی نظر پڑی فوراً دوڑ کر شیخ کے ہاتھوں کو بوسہ دیا اور قدموں پر گر گیا۔ شیخ نے مراقب ہو کر تیمور کے مافی الضمیر کو آل در یافت کیا۔ پھر سر اٹھا کر اپنے مریدوں سے فرمایا کہ اس شخص نے اپنی آبرو اور اپنی موجودہ دنیا ایسی چیز کی تمنا میں خرچ کی کہ جو اللہ کے نزدیک مچھر کے برابر بھی نہیں، ہم کو لائق ہے۔ ہم اس کی امداد کریں اور اس کو نامراد نہ لوٹائیں چنانچہ سبھوں نے مل کر دعا کی۔

ممکن ہے ناقادانہ نگاہیں اس بیان میں حد درجہ مبالغہ اور خوش اعتقادی کو تلاش کریں لیکن تیمور کی زندگی کے نشیب و فراز اور اس کی توزک سے اس بات کی گواہی ملتی ہے کہ وہ امیر موصوف کی خدمت میں دعا اور تائید کی درخواست لے کر حاضر ہوا تھا۔ اور اس وقت اس کا شاندار مستقبل، ابتدائی زندگی کی ناکامیوں کی دھند میں لپٹا ہوا تھا۔ دوسری طرف مندرجہ بالا بیان سے امیر کلال کی بے نیازی کا پتہ چلتا ہے اور یہ کہ وہ دنیاوی مال و دولت کے حصول کو کارزیاں سمجھتے اور بادشاہت کو پرکاہ سے زیادہ اہمیت نہ دیتے تھے۔

امیر کلال اور امیر تیمور کے مابین ملاقات کی ایک دوسری روایت بھی یہاں بیان کی جاتی ہے۔ اس روایت سے یہ تو طے نہیں کیا جا سکتا کہ ان دونوں کی یہ اولین ملاقات تھی یا اس سے قبل بھی تیمور، ان کی خدمت میں حاضر ہو چکا تھا۔ البتہ امیر موصوف اور امیر تیمور کے درمیان ربط و ضبط کا پتہ چلتا ہے اور اس امر پر روشنی پڑتی ہے کہ امیر تیمور اپنے دنیاوی کامیابیوں کے لئے حضرت امیر کی دعاؤں کا طالب ہوا تھا۔ اس حکایت کے راوی آگاہی امیر کلال کے حفف حضرت شہاب الدین ہیں جو خانوادہ امیر کلال کے ایک فرد اور خود بھی ایک

۱:۔ تذکرہ اکلوم تاریخ خلفائے عرب و اسلام ص ۸۸۴

بلند مرتبہ بزرگ تھے۔

"حضرت امیر کلال بخارا میں نماز پڑھ کر اپنے گھر جا رہے تھے انھوں نے دیکھا کہ فتح آباد اور کلا آباد کے درمیان ایک سبزہ زار میں کچھ لوگ بیٹھے ہوئے ہیں۔ ان کی صحبت شروع تھی مجلس میں اولیا اللہ کی کرامات بیان کی جا رہی تھیں۔ اس جماعت میں امیر تیمور بھی بیٹھے ہوئے تھے۔ حضرت امیر کلال اپنے حلقے کے ساتھ ادھر سے گزرے۔ جب امیر تیمور نے ان لوگوں کو دیکھا تو پوچھا کہ یہ جماعت کن لوگوں کی ہے۔" ان میں سے ایک نے کہا کہ یہ امیر کلال ہیں امیر تیمور یہ سن کر نہایت تیزی سے اٹھا اور حضرت امیر کلال کے نزدیک آیا اور سر نیاز خم کیا اور کہا اے بزرگوار دین و رہ نمایندہ یقین! میں اپنے دل میں آپ کی طرف سے ایک امید لے کر آیا ہوں کہ آپ میرے لئے کوئی ایسا کام فرمائیے کہ جو درویشوں کے لئے تسکین خاطر کا باعث ہوتا ہے۔"[1]

امیر کلال نے فرمایا کہ "سخنان درویش مخفی ہوتے ہیں ہمارا طریقہ یہ نہیں ہے کہ ہم خود کسی کو کچھ کہیں بلکہ جس وقت تک ہم خود کسی میں روحانیت نہیں دیکھتے تو خود کسی کو کچھ نہیں کہتے لیکن تم اس سے غافل نہ ہونا اور منتظر رہنا کہ تمہارے امور میں میں بہت ترقی دیکھ رہا ہوں اور تم اس تک پہنچو گے۔"

اس کے بعد حضرت امیر کلال واپس گھر پہنچے اور عشاء کی نماز سے فارغ ہو کر دیر تک مشائخ کی روحانیت کے بارے میں اپنے مریدوں اور عقیدتمند دل سے گفتگو کرتے رہے۔

امیر تیمور کو فتح خوارزم کی بشارت

امیر تیمور سے ملاقات کے بعد اسی رات حضرت امیر کلال نے اپنے جاننے والوں میں سے

۱۔ ص ۳۱

شیخ منصور ساکن قرلبان کو طلب کیا۔ اور اس سے کہا کہ جلدی جا اور امیر تیمور سے کہہ کر توقف کئے بغیر فوراً خوارزم کی طرف متوجہ ہو جائے، کوئی پس و پیش نہ کرے۔ اگر بیٹھا ہو تو فوراً کھڑا ہو جائے اور کھڑا ہو تو بیٹھ (غالباً گھوڑے کی پشت پر سوار ہونے کی طرف اشارہ ہے) جائے۔ مشائخ کرام کی ارواح طیبہ نے اشارہ کیا ہے کہ تمام مملکتوں کو انھوں نے تمھیں اور تمھارے فرزندوں کو عطا کیا۔ اور جب خوارزم تمھارے قبضے میں آ جائے تو پھر سمرقند کی طرف متوجہ ہو جانا۔

شیخ منصور جب امیر کلال کا پیغام لے کر پہنچا تو اس وقت امیر تیمور حضرت شیخ کے جواب کا منتظر تھا۔ چنانچہ پیغام ملتے ہی وہ بلا توقف اپنے ہمراہیوں کے ہمراہ خوارزم کو روانہ اور وہاں سے ظفر مند و کامران لوٹا۔

امیر تیمور اپنی تزک میں لکھتا ہے۔ "آخر یہ سوچا کہ بدخشاں جاؤں اور وہاں کے حکمرانوں کو اپنی امداد پر آمادہ کر دوں، چنانچہ میں بدخشاں روانہ ہوا۔ امیر کلال کی خدمت میں حاضر ہوا۔ اس نے خوارزم جانے کی رائے دی۔ میں نے امیر کو ایک سال کی آمدنی نذر کرنے کا وعدہ کیا بشرطیکہ میں اُزبکوں پر غالب آ جاؤں، اس نے دعائے فتح و ظفر دے کر مجھے رخصت کیا۔ امیر کلال سے رخصت ہوتے وقت میرے پاس بس ساٹھ سوار تھے۔

امیر تیمور کے بیان سے یہ اندازہ لگا لینا کوئی مشکل نہیں ہے کہ اس وقت تیمور کی، جہد کا آغاز تھا۔ اور ابھی اس کو وہ قوت و طاقت حاصل نہ تھی، جو بعد میں اس کا مقدر بن علاوہ ازیں آگاہی امیر کلال کی جس روایت کا سطور بالا میں تذکرہ کیا جا چکا ہے اس کی تصدیق امیر تیمور کے اس بیان سے ہوتی ہے۔ ایک جماعت کی جانب جو اشارہ اس روایت

یں ہے اس سے مراد تیمور کے اپنی قلیل تعداد (یعنی ساٹھ) سواروں کی تعداد کا پتہ چلتا ہے۔

دارا شکوہ امیر موصوف اور تیمور کے تعلق باہمی کے بارے میں لکھتا ہے:" امیر تیمور گورگان کو اپنی فرزندگی کا لقب عطا کیا اور ان کو سات ملکوں کی سلطنت اور فتحیابی اور کامرانی کی بشارت دی۔ اور یہ کہ وہ اپنے دشمنوں پر غالب آئیں گے اور ان سے انتقام لیں گے[1]"

امیر کلال کی بے نیازی

سفینۃ الاولیا اور تاریخ الاولیا کے مصنف شہزادہ دارا شکوہ نے حضرت امیر کلال کے بارے میں لکھا ہے کہ بعد ازاں وہ بخارا میں رہنے لگے تھے لیکن ہر محاذ پر امیر تیمور کے ہمراہ رہتے تھے دارا شکوہ کے اس بیان کی تائید کسی دوسرے تذکرے سے نہیں ہوتی۔ ممکن ہے دارا شکوہ کا مقصد یہاں یہ ہو کہ امیر کلال اس کے جد امجد امیر تیمور کے ہمراہ روحانی طور پر شریک رہتے تھے۔ حقیقت یہ ہے کہ امیر کلال کی درویشانہ بے نیازی اس بات کی روادار کیسے ہو سکتی تھی کہ وہ امیر تیمور کے دربار میں جاتے یا اس کے ساتھ مہمات میں شریک رہتے۔

امیر تیمور نے فتح خوارزم کے بعد سمرقند پہنچ کر حضرت امیر کلال کو سمرقند میں تشریف لانے کی درخواست کی تھی، لیکن امیر کلال نے تیمور کے پاس سمرقند جانا پسند نہ کیا اور اپنے صاحبزادے امیر عمر کو تیمور کے پاس اس پیغام کے ساتھ بھیجا:" اگر تم چاہتے ہو کہ تمھیں اللہ تعالےٰ کی راہ ملے تو تقویٰ اور عدل کو اپنا شعار بنانا اور دوسرے یہ کہ درویش مومنوں کے لئے ہر وقت دعاؤں میں مشغول ہیں اگر دنیا داری کریں تو ان کی دعا میں حجاب آتا ہے۔"

امیر تیمور اور امیر عمر کی گفتگو

حضرت امیر کے فرزند امیر عمر، اپنے والد کا پیغام لے کر امیر تیمور کے پاس پہنچے، اور چند دن

۱:۔ سفینۃ الاولیا۔ از دارا شکوہ

قیام کے بعد رخصت کے طالب ہوئے۔ امیر تیمور نے بہت بے نیازمندی کے ساتھ کہا کہ " تمام ولایت بخارا آپ کے لئے ہے۔"

امیر عمر نے جواب دیا۔"اجازت نہیں ہے۔"

امیر تیمور نے پھر کہا" صرف شہر بخارا کو قبول فرمالیں۔"

امیر عمر نے جواب دیا۔" اس کی بھی اجازت نہیں ہے۔"

امیر تیمور نے پھر با اصرار کہا" اچھا آپ جس قریے میں ساکن ہیں اس کو ہی قبول کر لیجئے۔"

امیر عمر نے اس کو بھی قبول کرنے سے معذوری کا اظہار کیا۔ اس کے بعد امیر تیمور نے پوچھا کہ" ہم کیا بھیجیں کہ جو حضرت کے لائق اور قربت کا باعث ہو۔"

یہ سن کر امیر عمر نے فرمایا کہ" ہمارے والد صاحب نے کہا ہے کہ اگر تم چاہتے ہو کہ اہل اللہ کے دل میں تمھاری جگہ ہو تو ان کا تقوی اور عدل شعار کرو کہ جو اللہ تعالی جل شانہ کے قرب کا بھی باعث ہے۔"

آپ کی اولاد میں سے حضرت سید امیر برہان، جن کا لقب امیر بزرگ تھا۔ امیر تیمور کی درخواست پر اس کے ہمراہ رہا کرتے تھے چنانچہ تذکرہ دل میں مرقوم ہے کہ تیمور جس وقت ہندوستان آیا تھا تو امیر برہان اس کے ہمراہ تھے۔ آخر عمر میں امیر برہان، تیمور سے اجازت لے کر بدخشاں واپس آ گئے تھے اور وہیں ان کا انتقال ہوا تھا۔ حضرت خواجہ امیر برہان، خواجہ بہاء الدین نقشبندی کے مرید خاص تھے اور حضرت امیر کلال کے حکم پر ہی خواجہ بہاء الدین نقشبندی نے انھیں اپنی تربیت میں لیا تھا۔

امیر کلال کی اولاد امیر کلال کے چار فرزند، امیر برہان، سید امیر شاہ، امیر حمزہ اور امیر عمر تھے۔ جن کے مختصر حالات پیش کئے جاتے ہیں۔

امیر برہان یہ خواجہ بہاوالدین نقشبندی کی زیر تربیت تھے اور امیر کلال کے سب سے بڑے فرزند تھے، لوگوں سے میل جول کو پسند نہ کرتے تھے اور نہ ہی کسی سے انس کا اظہار کرتے تھے۔ اکثر و بیشتر تنہا رہا کرتے تھے۔ حضرت امیر کلال اکثر و بیشتر ان کی تعریف و توصیف کیا کرتے تھے اور کہا کرتے تھے کہ "یہ فرزند میری برہان ہے۔"

سید امیر شاہ امیر کلال کے فرزند دوم تھے۔ یہ شیخ یادگار کے زیر نظر تھے کسب حلال سے روزی کماتے اور اسے مخلوق خدا پر صرف کرتے تھے۔ کبھی کسی سے تحفہ یا نذرانہ بھی وصول نہ کرتے تھے فرمایا کرتے تھے، جو لیتا ہے اسے دینا پڑتا ہے

قناعت کن بنان خشکی خویش چو کردی از بردت سفلہ پندیش

آپ کو درویشوں اور فقرا کی حاجت روائی کی بے حد فکر رہتی تھی۔ جب تک کسی سائل کی احتیاج پوری نہ فرماتے آپ کو چین نہ آتا۔ لوگ آپ کے گرویدہ ہو جاتے تھے اور خود غریبوں کی دعاؤں کے طالب رہتے تھے۔ نمک کی فروخت ان کا وسیلۂ معاش تھا۔

امیر حمزہ امیر کلال کے فرزند سوم تھے۔ آپ مولانا عارف کے مرید تھے۔ امیر کلال انہیں ان کے نام سے مخاطب کرنے کے بجائے امیر کلال کے نام سے ہی مخاطب کیا کرتے تھے۔ امیر حمزہ خود بھی بزرگ شخصیت تھے۔ حضرت امیر کلال کے ایک مرید مولانا شمس الدین خلیفہ کے مرید تھے۔ امیر حمزہ کے صاحب کمال ہونے کا ثبوت مانگنے پر

مولانا شمس الدین خلیفہ نے تین بار یا حمزہ کہا۔ چنانچہ آپ اس آواز پر پہنچ گئے اور فرمایا " مولانا خلیفہ تین بار پکارنے کی کیا ضرورت تھی صرف ایک ہی دفعہ نام لے لیا ہوتا۔

ایک اور روایت ہے کہ امیر حمزہ کے بعض مرید تجارت کی غرض سے ایک سفر پر روانہ ہوئے۔ راہ میں چوروں نے انھیں لوٹ لیا۔ مریدوں نے غائبانہ طور پر حضرت امیر سے استمداد کی، تھوڑی دیر کے بعد چور مال مسروقہ لوٹا گئے، اور ان لوگوں سے دریافت کیا تمھارا کوئی مرشد ہے انھوں نے اثبات میں جواب دیا پھر چوروں نے حلیہ بیان کیا جس کی تصدیق مریدوں نے کی، اس کے بعد چوروں کا یہ گروہ تائب ہو کر امیر موصوف کے حلقۂ ارادت مندان میں شامل ہو گیا تھا۔ واپسی پر امیر حمزہ نے ان مریدوں سے دریافت کیا کہ کیا تمھیں چوروں سے واسطہ پڑا تھا۔ مریدوں نے اقرار کیا۔ آپ نے فرمایا کہ اب وہ چور اس گھر کے ارادت مند بن گئے ہیں "

ایک دفعہ امیر حمزہ کے کچھ ارادت مند ایک کشتی میں جا رہے تھے۔ مخالف ہوا نے زور پکڑا اور کشتی ڈوبنے کے قریب ہو گئی ان مریدین نے حضرت امیر حمزہ سے استمداد کی اور ان کی خاطر نذرانہ دیا۔ کشتی صحیح سلامت کنارے پر پہنچ گئی۔ واپسی پر ان مریدوں نے امیر حمزہ سے ساری کیفیت بیان کی۔ امیر حمزہ نے انھیں اپنا کندھا دکھایا اور فرمایا " عزیزو ہم مفت خورے نہیں دیکھو ابھی تک کندھے پر رسیوں کے نشانات موجود ہیں "

ایک دن امیر حمزہ قصبہ سماس میں تشریف فرما تھے اور بحر معرفت میں غوطہ زن۔ یکایک چونک کر آپ نے عصا اٹھایا اور بظاہر ایک ارادت مند پر غصہ ظاہر کیا۔ لوگوں کو تعجب ہوا۔ امیر حمزہ نے فرمایا " دو ستو سو خار میں ایک بھیڑیا، ایک دیوانے پر حملہ آور ہو رہا تھا۔ میں نے اسے روک دیا الحمد اللہ بھیڑیئے کو ہلاک کر دیا ہے۔

ایک بار تین دن تین رات تک مسلسل بارش ہوتی رہی۔ لوگ بارش تھم جانے کی خواہش لے کر امیر کی خدمت میں حاضر ہوئے آپنے جواب دیا۔ "عزیزو بارش کو جب رکنا ہوگا تو خود بخود رک جائے گی۔ لوگوں نے پھر بارش کا ذکر کیا اور اصرار کیا۔ حضرت امیر حمزہ نے اپنے ایک خادم سے کہا باہر جاکر بارش سے کہو کہ اب رک جاؤ۔ خادم نے ایسا ہی کیا چنانچہ بارش رک گئی۔"

امیر سید عمر

امیر سید عمر بھی صاحب کمال بزرگ اور اپنے بھائیوں میں سب سے چھوٹے تھے۔ آپ کا پیشہ کاشت کاری تھا۔ شہر نصف میں آپ کی کچھ مزروعہ زمین تھی۔ جہاں کے کاشت کار اپنے کھیتوں کو پانی دینے سے قبل آپ کے کھیت کو پانی دیا کرتے تھے ایک بار پانی کی قلت تھی جب لوگوں کو پانی فراہم ہوا تو انھوں نے حسب روایت حضرت امیر عمر کے کھیت کو پانی دینا چاہا ایک شخص نے منع کیا اور کہا کہ پانی کا بھروسہ نہیں پہلے اپنے کھیتوں کو پانی دے لو۔ لوگوں نے اسے سمجھایا پر وہ نہ مانا امیر عمر نے فرمایا کہ ان باتوں سے پریشان نہ ہوں۔ پانی میں آگ آرہی ہے۔ اور جب پانی نہ رہے گا تو آگ اس کھیتی جلا ڈالے گی۔ وہ شخص تو اپنے گھر چلا گیا اور اس کی عدم موجودگی میں اس کے کھیت کو آگ لگ گئی۔ وہ آکر معافی کا خواستگار ہوا۔ آپنے فرمایا کتنے اولیا اللہ ہیں جن کی کرامات ظاہر ہیں۔ مگر یہ ناچیز اپنی کرامات چھپاتا ہے کیونکہ یہی بات باصواب ہے۔

ایک بار آپ کو اطلاع ملی کہ شہر کبش میں شیخ اسماعیل کے ترک مرید غیر شرعی حرکات کے مرتکب ہو رہے ہیں۔ آپ تشریف لے گئے اور انھیں سمجھایا۔ ان کے سردار نے حضرت امیر عمر کا گریبان پکڑ لیا لیکن اسی وقت اس کا ہاتھ پشت سے چپک گیا اس نے اور اس کے ساتھیوں نے معافی مانگی اور تین من بعد اس کا ہاتھ پشت سے جدا ہوا۔ آپنے قصبہ آہین میں ۸۰۳ ہجری میں انتقال کیا اور آپ کی لاش کو ایک سال کے بعد لاکر امیر کلال کے پہلو میں دفنایا گیا۔

امیر کلال کا انتقال

امیر موصوف کی تاریخ وفات کے بارے میں اختلاف پایا جاتا ہے۔ تذکرۃ الکرام تاریخ خلفائے عرب و اسلام میں لکھا ہے کہ ان کا انتقال ۱۱ جمادی الاخر ۷۷۲ ہجری کو سوخار میں ہوا۔ بعض روایات میں تاریخ وفات ۱۵ جمادی الاخر بیان ہوئی ہے اور بعض جگہ پنج شنبہ ۸ جمادی الاول ۷۷۲ ہجری لکھا گیا ہے۔ بہر حال ان کا سال وفات ۷۷۲ھ ہی ہے ؎

ہر کسے سالش بہ سلک نظم سفت — کرد رحلت چوں امیر اولیا
صاحب انوار عرفان بود گفت ۷۷۲ — ہاتف غیبی بتاریخ وصال

اس قطعے سے بھی مادہ تاریخ وفات ۷۷۲ ہجری ہی برآمد ہوتا ہے۔

امیر حمزہ کی جانشینی

وصال سے چند دن قبل آپ نے اپنے چاروں فرزندوں کو قریب بلایا اور فرمایا۔ "میرے بیٹو! تم میں سے کون اللہ کے بندوں کی خدمت کا کام سنبھالے گا۔" تمام بیٹوں نے جواب دیا کہ ہم میں اتنی استطاعت کہاں ہے مگر جسے آپ حکم دیں گے باقی دوسرے اس کا حکم مانیں گے۔"

اے دولت و سعادت ما گر قبول نست — خدمت بجان کنیم اگر باشدت قبول

یہ بات سن کر حضرت امیر نے مراقبہ کیا اور پھر حضرت امیر حمزہ کی طرف اشارہ کر کے فرمایا "مشائخ کی ارواح نے آپ ہی کا اشارہ کیا ہے۔"

امیر حمزہ نے اس بارگراں کو قبول کرنے سے معذرت کی اور عرض کیا کہ "میرے مخدوم مجھ میں اتنی طاقت کہاں اور اس قدر استعداد کیسے ہو سکتی ہے؟" آپ نے فرمایا بیٹا یہ کام تمہارا مقدر ہو چکا ہے مانو یا نہ مانو یار خلافت تمہیں سنبھالنا ہی پڑے گا۔

ما بدست یار دادیم اختیار خویش را

اس کے بعد امیر کلال پیر حمزہ کو اشارہ کر کے خلوت میں لے گئے اور تین دن تین رات تک وہیں رہے۔

امیر کلال کا مدفن

حضرت امیر کلال کی آخری آرام گاہ کے بارے میں اختلاف پایا جاتا ہے اکثر تذکرہ نویس میں مرقوم ہے کہ آپ کا مزار قریۂ سوخار میں ہے جو آپ کا مولد بھی ہے۔ تذکرۃ الکرام تاریخ خلفائے عرب و اسلام کے مولف امیر کلال کا مدفن سمرقند میں گورمیر بتاتا ہے۔ جو اصل میں تیمور کا مدفن ہے اور ان دنوں روسی ترکستان میں شامل ہے۔

"۸۰۵ ہجری میں گرجستان پنج کر سب کو زیر و زبر کیا اور کلیساؤں کو توڑ کر مسجد بنایا پھر وہاں سے سمرقند کو واپس گیا اور ملک چین کو فتح کرنے کا ارادہ کیا۔ چنانچہ ۸۰۷ ھ میں راہ میں ختن کو مسخر کیا۔ اور موضع انزار میں اقامت کی تھی۔ کہ امیر تیمور بیمار ہو کر شب چہار شنبہ ماہ شعبان کو ۸۰۷ ھ میں مطابق ۱۸ فروری ۱۴۰۵ء کے انتقال کیا۔ امیر کی وصیت کے بموجب اس کی نعش سمرقند میں لائے اور حضرت خواجہ سید امیر کلال کے گنبد میں کہ امیر تیمور کو جن سے عقیدت تھی اور جو حضرت خواجہ بہاؤالدین نقشبند کے پیر ہیں دفن کیا۔

گورمیر میں امیر تیمور کی قبر کے علاوہ ایک اور قبر بھی موجود ہے لیکن تذکرۃ الکرام کی رائے سے اتفاق نہیں کیا جا سکتا کیونکہ اکثر قدیم کتابوں اور تذکروں میں امیر کلال کا مدفن قریۂ سوخار بتایا گیا ہے خود امیر کلال کی درویشی ان کے زہد و اتقا اور بے نیازی سے بھی یہ بات بعید معلوم ہوتی ہے کہ انھوں نے شاہی مقبرے میں دفن ہونا پسند کیا ہو۔ اس سلسلے میں ایک مغربی مصنف کی رائے زیادہ قابلِ قدر اور وقیع ہے۔ تاریخ بخارا کا مصنف ایک طویل عرصے تک ترکستان میں قیام پذیر

۱۔ ص ۱۸۸ (۲) تاریخ بخارا از پروفیسر آرمینس وسمبرے اردو ترجمہ نفیس الدین ایم اے مطبوعہ مجلس ترقی ادب لاہور

رہا ہے۔ ترکوں اور منگولوں کی تاریخ کے بارے میں اس کی عالمانہ تحقیق و تلاش ایک عالم سے خراج تحسین وصول کر چکی ہیں۔ امیر تیمور کے مزار کا ذکر کرتے ہوئے وہ لکھتا ہے۔" شام کے وقت ۷ شعبان ۸۰۷ھ (۱۷ فروری ۱۴۰۵ء کو انتقال کر گیا اس کا جسدِ خاکی سمرقند لایا گیا اور شاندار مقبرے میں دفن ہوا جو اس نے اپنے پیر سید برکہ کے لئے بنوایا تھا۔ یہ سید برکہ ہی تھا جس نے اس کی اوائل جوانی میں پیش گوئی کی تھی کہ مستقبل میں اسے بہت عظمت حاصل ہوگی۔ اب ایک ہی تہہ خانے میں دونوں پاس پاس دفن ہیں" بیشتر تذکروں میں اتفاق رائے پاتے ہوئے یہی کہا جا سکتا ہے کہ امیر کلال کا مدفن سوخار ہی ہے۔ جو بخارا سے نو میل کے فاصلے پر ہے۔

سلسلہ نقشبندیہ

حضرت امیر کلال کے کئی نامور خلفاء میں سے ایک، خواجہ بہاءالدین نقشبندی ہیں جو شہرہ آفاق بزرگ ہیں۔ ان کے اور امیر کلال کے باہمی تعلق کے بارے میں گزشتہ صفحات میں تفصیل سے ذکر آچکا ہے۔ روحانی سلسلوں میں سلسلہ نقشبندیہ ایک ہمہ گیر اور عظیم سلسلہ ہے چونکہ خواجہ بہاءالدین نقشبندی کے نام سے معروف تھے لہذا یہ خیال عام ہے کہ غالباً خواجہ صاحب تصوف کے اپنے کسی علیحدہ سلسلے کے بانی ہیں یا ان کا طریقہ اپنے مرشد حضرت خواجہ امیر کلال سے مختلف ہے۔ ہمارے خیال میں خواجہ نقشبند، طریقت و سلوک میں اپنے مرشد اور ان کے مرشد خواجہ بابا محمد سماسی کے مسلک کے ہی پیروکار تھے۔ اور اس سلسلے کے نقشبندی مشہور ہو جانے کی کئی وجوہ ہو سکتی ہیں۔ طریقہ نقشبندیہ کی شرائط بیان سے کرنے سے پہلے۔ ہم لفظ نقشبند یا نقشبندی کی وضاحت کرتے چلیں۔

خواجہ بہاءالدین کے نقشبند مشہور ہونے کی ایک روایت تو یہ بیان کی جاتی ہے کہ آپ کے اجداد میں سے کوئی قالین بنا کرتا تھا اور اس میں نقش بنایا کرتا تھا۔

دوسری روایت یہ ہے کہ جب خواجہ بابا محمد سماسی نے آپ کی تربیت سید امیر کلال کے سپرد کی تو فرمایا کہ بہاوالدین کا نقش باندھ، اس واسطے آپ نقشبند مشہور ہوئے۔ تیسری روایت کے مطابق جو شخص امیر کلال کی خدمت میں جاتا تھا اس کے دل پر فیضانِ الٰہی کا نقش بندھ جاتا تھا اس واسطے آپ کو نقشبند کہتے تھے۔ بعض روایات میں آیا ہے کہ چونکہ طالب علموں کو آپ اسم اللہ کا تصورِ صنوبری دل پر تلقین فرماتے تھے اسی سبب سے نقشبند کے نام سے مشہور ہوئے۔

نقشبندی سلسلے میں آٹھ شرائط ہیں۔ جو ہشت شرائط خواجگان نقشبندیہ کہلاتی ہیں۔ یہ شرائط کب ضبط تحریر میں لائی گئیں، اس کے بارے میں کوئی بادثوق بات نہیں کہی جا سکتی۔ البتہ خیال یہ ہے کہ حضرت خواجہ بہاوالدین نے انہی تعلیمات روحانی کا سلسلہ اپنے مریدوں میں جاری رکھا ہوگا کہ جس کی تعلیم انھیں حضرت امیر کلال سے اور حضرت امیر کلال کو حضرت خواجہ بابا محمد سماسی سے ملی تھی۔ یعنی یہ سلسلۂ تصوف مرشد در مرشد پھیلا ہوا ہے لیکن چونکہ حضرت خواجہ بہاوالدین نقشبندی کے زمانے میں اس روحانی تعلیم کی شرائط کو ضبط تحریر میں لایا گیا لہذا یہ انہی کے نام سے موسوم ہوکر سلسلۂ نقشبندیہ کہلایا۔ ہم یہاں مختصراً ان شرائط کو بھی بیان کرتے ہیں۔ جو ہشت شرائط خواجگان نقشبند کے نام سے مشہور ہیں۔

شرطِ اوّل

نقشبندی سلسلے کی شرطِ اوّل ہوش در دم ہے جس کے معنی دو بتائے گئے ہیں۔ ایک یہ کہ جو دم اندر سے باہر آئے چاہیئے کہ حضور و آگاہی سے ہو۔ سالک کو چاہیئے کہ غفلت کو دخل نہ دے اور ہمیشہ ذکر میں مشغول رہے اور بار بار ذکر کرے تاکہ عذاب سے رہائی حاصل ہو۔

ہوش در دم کے دوسرے خاص معنی ہر ایک دم میں غیر کی نفی اور حق کا اثبات ہے

یا اپنی نفی کرنے سے جیسا کہ لا موجود الا ہو (نہیں موجود مگر وہی یعنی خدا) اس شرط کے مطابق ازل سے ابد تک کے وقفے کو ایک ساعت جاننا چاہیئے۔

شرط دوم نظر بر قدم

نظر بر قدم کے بھی دو معنی ہیں۔ ایک خاص ایک عام۔ عام شرط یہ ہے کہ سالک رستہ چلتے وقت اوپر نیچے دائیں اور بائیں نہ دیکھے اور اپنے پاؤں کی طرف دیکھتا رہے یعنی غیر حق کو اپنے پاؤں کے نیچے لائے اور تواضع، حلم، نرمی اور عاجزی سے راستہ طے کرے۔

نظر بر قدم کے خاص معنی یہ ہیں کہ سالک جب معرفت کے راستے کو طے کرنا چاہئے۔ تو معرفت گناہوں میں قدم مارے کیونکہ معرفت کی کوئی انتہا نہیں اور ترقی حاصل کرے چنانچہ حضرت رسالت پناہ صلی اللہ علیہ وسلم ہر روز ستر مرتبہ استغفار اور توبہ کیا کرتے تھے یعنی ہر روز ستر مقام طے کرتے اور قدم اٹھاتے تھے اور مقام گزشتہ سے توبہ کرتے۔ اسی طرح پیغمبر خدا کی تابعداری ہر فرد دبشر پر فرض ہے، اور ایک مقام سے دوسرے مقام میں قدم رکھے اور مقام گزشتہ سے توبہ کرے اور چونکہ سلوک میں عجیب و غریب چیزیں دیکھی جاتی اور معلوم ہوتی ہیں ان کی طرف نگاہ تک نہ کرے اور اصل مقصود کو جو خداوند تعالےٰ جل جلالہٗ ہے اور جو حضرت رسالت پناہ کی صفت ہے اس کو اپنا پیشہ اختیار کرے اور آں جناب کے حالات کی متابعت کرے۔

شرط سوم سفر در وطن

سفر در وطن کے بھی دو معنی ہیں۔ عام معنی یہ ہیں کہ سالک طبیعت بشری میں سفر کرے، یعنی چوپایوں کی خصلت سے انسانی خصلت میں، اور انسان سے فرشتوں کی خصلت میں اور بری خصلتوں سے نیک خصلتوں میں انتقال کرے۔ یعنی روح جو اس کا لطیفہ ہے اور اللہ تعالیٰ کی ذات و صفات کا مظہر ہے اور خدا کا خلیفہ ہے کہ

(تحقیق میں زمین میں اپنا خلیفہ بنانے والا ہوں)

اس کی ذات میں ہے۔ انسانی صفتوں سے روحانی صفتوں میں بدل جائے اور نفس عین روح بنائے اور روح کو عین مجروح کرے اور مجروح کو عین مفتوح کرے۔

اس شرط کے دوسرے خاص معنی یہ ہیں کہ سالک، ناسوت، ملکوت، جبروت اور لاہوت کا سفر کرے۔ یعنی ناسوت میں خلقت سے خدا کی طرف اور ملکوت میں خدا کی طرف سے خدا کے ساتھ اور جبروت میں خدا کے ساتھ خدا میں اور لاہوت میں خدا میں سے خدا کی طرف یعنی انسانیت سے ملکیت سے روحانیت میں اور روحانیت سے رحمانیت کی طرف انتقال کرے۔

شرط چہارم خلوت در انجمن

خلوت در انجمن کے بھی دو معنی ہیں۔ عام معنی یہ ہیں کہ سالک اپنے ظاہر کو خلق سے اور باطن کو خدا سے لگائے رکھے اور اپنے ظاہر کو فرائض اور سُنن کے نور سے منور کرے اور اپنے باطن کو خداوند تعالیٰ کے مشاہدے سے روشن کرے اور ذرہ بر غفلت کو بھی اپنے اندر نہ گھسنے دے اور فراغت و جماعت میں خداوند تعالےٰ کے ساتھ ہے۔ سالک کو چاہیئے کہ اپنے ظاہر کو حدود اللہ کے ادا کرنے اور حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی تابعداری میں رکھے اور اپنے باطن کو حضرت رسالت کے تابع بنائے۔ تاکہ اس کا ظاہر بدعت اور گمراہی میں مبتلا نہ ہو اور اس کا باطن گمراہی اور برے عقیدوں اور جھوٹے ارادوں کی طرف مائل نہ ہو اور ہر دم خداوند تعالےٰ کی محبت اور محمد مصطفےٰ صلی اللہ علیہ وسلم کی تابعداری سے افعال و اقوال اور احوال میں پختہ ہو جائے اور ذرّہ بھر بھی اس کی متابعت کے خلاف نہ کرے۔

اس کے خاص معنی یہ ہیں کہ چونکہ روح خدا کا خلیفہ ہے اور اس کی صفات کا عرش ہے اس لئے اس میں طرح طرح کے جنگل اور عجیب و غریب مجلسیں ہیں۔ ان کی طرف ہرگز خیال نہ

کرے۔ اور خداوند تعالےٰ کے مشاہدے سے باز نہ رہے۔ اور مشاہدہ کے عجائب و غرائب میں خوشحال رہے اور روح جو کہ حرم خدا ہے اور مظہر جمال اللہ ہے۔ حرم سے حریم کی طرف رستہ معلوم کرے۔ اور غیر کو حرم میں داخل نہ ہونے دے۔ چنانچہ حدیث نبوی ہے کہ مومن کا دل حرم خدا ہے اور یہ حرام ہے کہ خدا کے سوا کوئی اور اس میں آئے۔ اور مومن کا دل عرش خدا ہے اور مومن کا دل عرش و کرسی سے بھی بزرگ ہے اور خداوند تعالےٰ کی تمام مخلوقات سے افضل ہے اور حدیث نبوی ہے کہ مومن کا دل عرش سے بڑا ہے اور کرسی سے وسیع ہے اور جو کچھ اللہ تعالیٰ نے پیدا کیا ہے سب سے افضل ہے۔ نیز حدیث قدسی ہے کہ مجھے زمین و آسمان میں نہ ڈھونڈو بلکہ پرہیزگار اور شریف مومن کے دل میں ڈھونڈو۔ ایک اور حدیث قدسی ہے اے آدم کے فرزند میں نے جہاں کی چیزوں کو تو تیرے لئے پیدا کیا اور تجھ کو اپنے لئے، پس تجھے چاہیئے کہ دونوں جہاں کے عجائب و غرائب کی طرف تو مائل نہ ہو جائے۔ اور چشم ظاہری کو انجمن ظاہری سے کہ عالم صوری ہے بند کرے۔ اور چشم باطنی، انجمن باطنی سے جو کہ عالم معنوی ہے بند کرے۔

شرط پنجم یاد کرو یاد کرد سے مراد ذکر لسانی اور قلبی ہے۔ اس کے بھی دو معنی ہیں۔ عام معنی یہ ہیں کہ جو کچھ زبان سے کہا جائے اس کا اثر دل پر لے جائے اور اس کا حظ اٹھائے اور خاص معنی یہ ہیں کہ جو کچھ دل سے خدا کی یاد کرے زبان کو اس سے ناآشنا پائے اور اپنے اندر خیال کر کے صحرائے دل کی سیر کرے۔

شرط ششم بازگشت بازگشت سے مراد یہ ہے کہ ذکر سے مذکور کی جانب بازگشت ہو اس کے بھی دو معنی بیان کئے گئے ہیں۔ عام معنی یہ ہیں کہ اپنے پروردگار کے نام کو یاد کرے اور تمام مخلوقات سے پورے طور پر کنارہ کش ہو یعنی ہر حالت میں خدا کی طرف متوجہ

ہو۔ اور خاص معنی یہ ہیں کہ اپنے پروردگار کو اس وقت یاد کر کہ تو اپنے آپ کو بھلا دے۔ کیونکہ ذاکر کا مذکور میں فنا ہونا دوسری حقیقت ہے یعنی نفی ذات سے وجود بشری فنا ہو جائے گا۔ اور واجب الوجوب کے اثبات سے تو فنا حاصل کرے گا۔

شرط ہفتم نگہداشت نگہداشت یہ ہے کہ خطرات کی نفی کا مراقبہ کرے۔ اور خدا کے علاوہ تمام چیزوں سے دل کو نگاہ میں نہ رکھے۔ اس شرط کے عام معنی یہ ہیں کہ مراقبہ اس طرح کرے کہ اپنا تمام ظاہر و باطن خداوند تعالےٰ کی طرف لگائے۔ خاص معنی یہ ہیں کہ نہ ظاہر ہی رہے اور نہ ہی باطن اور نہ مراقبہ رہے اور نہ غیر۔

شرط ہشتم یادداشت یادداشت سے جو کہ تمام عبادتوں کا مقصود ہے از روئے ذوق کے آگاہی دوام ہے اس کے اوّل معنی یہ ہیں کہ ہمیشہ توحید اور معرفت میں مستغرق رہے اور ذوق دائمی حاصل کرے۔ اور بے عقل و بے ہوش نہ ہو جائے۔ اور اگر ہو جائے تو طریقت کا نقصان ہے اور آہ و بکا نہ کرے۔ اگر کرے گا تو گویا طریقت کا خون کرے گا۔

اس کے خاص معنی یہ ہیں کہ توحید اور معرفت کے استغراق میں جو اسرار الٰہی معلوم کرے انہی پر اکتفا نہ کرکے تازہ بتازہ اسرار حاصل کرے اور ان کو ظاہر نہ کرے اگر کرے گا تو دو وجہ سے گرفتار عتاب الٰہی ہوگا ایک تو اس وجہ سے کہ جو شخص بادشاہوں کے رازوں کو افشا کرے نزدیکی کے لائق نہیں ہوتا، اور دوسرے اس واسطے کہ دوسرے کے بھیدوں کو ظاہر نہیں کیا کرتے جیسا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے کہ خدا کے بھیدوں کو ظاہر کرنا کفر ہے۔

ان کے علاوہ تین اور باتوں وقوف زمانی، وقوف عددی اور وقوف قلبی کی تعلیم بھی دی جاتی تھی۔

وقوف زمان سے مراد یہ ہے کہ اپنی حالت کی طرف نگاہ کرے۔ اور یہ دیکھے کہ حالات میں

ترقی ہوئی ہے یا نہیں۔ اگر ہوئی ہے تو خداوند تعالےٰ کا شکر ہو۔ اور اگر نہیں تو اپنا ماتم کرے اور وقوف قلبی یہ ہے کہ نفس کو پاک کرنے اور دل کو صاف کرنے اور روح کو جلا دینے میں ہر روز زیادہ کوشش کرے۔

کرامات امیر کلال

حضرت امیر کلال کی کرامات بے شمار ہیں۔ یہاں ان میں سے چند پیش کی جا رہی ہیں۔

روایت ہے کہ ایک سال حضرت امیر کلال چند مریدوں کے ساتھ کسی دریا کے کنارے فرد کش ہوئے۔ آپ تقریباً ہر سال دریا کے کنارے جایا کرتے تھے۔ وہاں آپ دوستوں سے کسی قدر آگے نکل گئے۔ اور پھر کچھ سوچتے ہوئے لوٹ آئے، اور ارادت مندوں کو خطاب فرمایا۔ دوستو علی صوفی ابھی آجائے گا ارادت مند خاموش رہے مگر انھیں تعجب ہو رہا تھا کہ علی صوفی جسے حضرت امیر دور دراز مقام بخارا میں چھوڑ آئے ہیں کیسے آئے گا؟ اتنے میں دیکھا کہ علی صوفی ہوا کی مانند پانی پر سے دوڑتا ہوا آرہا ہے اور جب دریا سے نکل کر باہر آیا تو اس کا ایک بال بھی تر نہ تھا۔ حضرت امیر کلال نے علی صوفی کو جھڑکا کہ تو گھر سے کب باہر آیا تھا۔ اس نے جواب دیا میرے ممدوم وہاں آپ کے جمال کا اشتیاق اس قدر غالب آگیا کہ مجھے کوئی خبر نہ رہی اور آنکھ کھولی تو اپنے آپ کو یہاں دیکھا اور اس سے قبل میں آپ کے جمال میں مستغرق رہا ہوں۔ حضرت امیر بولے۔ جیسے آیا ہے ویسے ہی لوٹ جا اور جب تک ہم نہ لوٹیں اپنی جگہ پر موجود رہو۔ علی صوفی نے حضرت امیر کے اشارے سے پانی پر قدم رکھا اور ہوا کی مانند چل پڑا اور فوراً منزل مقصود کو جا پہنچا۔

آگاہی امیر کلال کے مصنف نے ایک اور واقعہ لکھا ہے: "حضرت امیر کلال ایک بار محفل میں مناسک حج بیان فرماتے ہوئے بعض مناسک کے ذکر میں علمائے اسلام کے بیان کردہ دقیق مسائل پر گفتگو فرما رہے تھے حاضرین محفل کو آپ کے مشاہدات پر تعجب ہو رہا تھا۔ محفل میں ایک

بے حقیقت وارادت شخص نے حضرت کی باتیں سن کر کہا کہ ایسی باتیں وہ کرے جس نے یہ سب کچھ دیکھا ہو۔ حضرت امیر کلال نے ایک گھڑی بعد اسے باہر بلا کر فرمایا کہ اپنے سر کے اوپر دیکھو۔ اس نے دیکھا کہ خانہ کعبہ امیر کلال کے سر پر گردش کر رہا ہے۔ یہ منظر دیکھکر وہ شخص قدموں پر گر پڑا اور معافی مانگی۔ حضرت امیر نے فرمایا کہ " اگر کسی کے پاس ایک درم بھی نہ ہو تو اسے یہ خیال تو نہیں کرنا چاہیئے کہ دنیا سے دولت ختم ہو گئی اور کسی دوسرے کے پاس بھی کچھ نہ ہوگا۔

ایک دن حضرت امیر کلال اپنے ارادت مندوں کے ساتھ حضرت جبرئیل آماؑ کے مزار کی زیارت کے لئے روانہ ہوئے، راہ میں ایک شیر نظر آیا آپ کے ہمراہی شیر کو دیکھ کر گھبرا گئے لیکن آپ نے آگے بڑھکر شیر کو گردن سے پکڑ لیا اور اسے راستے سے ہٹا دیا۔ شیر نے سر جھکا لیا اور آپ کے قدموں میں گر پڑا۔ ارادت مندوں کے تعجب پر آپ نے فرمایا کہ " دوستو جو اللہ سے ڈرے گا ماسوا اللہ کے ہر چیز اس سے ڈرے گی"۔ آپ نے اسی سلسلے میں مزید فرمایا۔ دنیا کی جملہ اشیا آدمی سے ڈرتی ہیں اللہ نے انھیں آدمی پر مسلط و غالب نہیں کیا۔ البتہ جب آدمی خدا سے نہ ڈرے تو اس کے دل میں ماسوا اللہ کا خوف داخل ہو جاتا ہے۔

ایک بار حضرت امیر کلال اپنے مرشد کے پاس قصبہ سماس میں تشریف فرما تھے۔ وہاں کے لوگوں میں آپس میں لڑائی ہوئی جس کے نتیجے میں ایک شخص کا دانت ٹوٹ گیا۔ وہ لوگ حاکم کے پاس اس کی شکایت لے کر جانا چاہتے تھے اور اس شخص سے دانت کی دیت مانگتے تھے۔ ایک شخص نے مشورہ دیا کہ پہلے حضرت خواجہ محمد بابا سماسی سے ملاقات کر لیں اور ان سے اجازت مانگ لیں۔ غرض وہ خواجہ بابا کے پاس پہنچے۔ خواجہ نے انھیں امیر کلال کے پاس تصفیے کے لئے بھیج دیا۔ حضرت امیر نے ان لوگوں کو باہم صلح و آشتی سے رہنے کی تلقین کی اور اس شخص کا ٹوٹا ہوا۔ دانت اسی جگہ رکھدیا

حاضرین یہ دیکھکر متعجب رہ گئے کہ دانت اس طرح بیٹھ گیا گویا کبھی ٹوٹا ہی نہ تھا۔

ایک دن حضرت امیر کلال "دوازدہ کلال" نامی ایک قصبے میں تشریف فرما تھے۔ اسی روز آپ کے ایک عقیدت مند کا انتقال ہوگیا اس کی وصیت تھی کہ حضرت امیر کلال ہی اس کا نماز جنازہ پڑھائیں۔ اس وقت وہاں کئی دوسرے مشائخین کرام جن میں حضرت امیر واشوی، مولانا شمس الدین اتکتوی اور مولانا تاج الدین عجدوانی بھی موجود تھے۔ ان بزرگوں نے کہا کہ کسی شخص کو حضرت امیر کو بلانے کی خاطر بھیجنا چاہیئے۔ حضرت شیخ صوفی نے یہ سن کر کہا کہ قاصد کی ضرورت نہیں حضرت امیر خود آجائیں گے کیونکہ اللہ تعالےٰ نے انھیں صفائے باطن سے نوازا ہے حاضرین میں سے ایک شخص، دوسرے سے کہنے لگا کہ حضرت امیر سے اس معاملے میں دریافت کریں گے۔ کہ آیا مرشد نے انھیں اس تصرّف کی اجازت دی ہے۔ ابھی وہ شخص یہ بات کہہ ہی رہا تھا کہ حضرت امیر آپہنچے۔ لوگوں نے آپ کے کمال کا مشاہدہ کیا اور استقبال کو حاضر ہوئے۔

جب حضرت امیر کلال کے اس عقیدت مند کی نماز جنازہ پڑھائی جاچکی اور تجہیز و تکفین سے فراغت پانے کے بعد حضرت امیر کلال مسجد میں تشریف لائے تو امیر واشوی اور مولانا شمس الدین نے متذکرہ بالا سوال دریافت کیا۔ حضرت امیر نے جواب دیا " مولانا شمس الدین اور امیر واشوی صادق القول اور عاقل ہیں۔ وہ دونوں آئینہ دل میں بے اجازت ایک دوسرے کو اور دیگر باتوں کو مشاہدہ کر رہے ہیں آنحضرت کا ارشاد ہے کہ دل، دل کا آئینہ ہے اور یہ کہ مومن، مومن کا آئینہ ہے۔ آپؐ کا ایک دوسرا دوسرا ارشاد ہے کوزے سے وہی ٹپکے گا جو اس میں ہے۔ اس اشاراتی گفتگو کے نتیجے میں سب امیر کلال کے معترف ہوگئے۔

ایک روز خواجہ بہاوالدین آپ کی ملاقات کو حاضر ہوئے۔ اس وقت امیر موصوف قصبہ خواجہ

مبارک میں تشریف فرما تھے۔ آپ کے سامنے آگ دہک رہی تھی۔ حضرت امیر خواجہ بہاءالدین کو دیکھ کر خوش ہوئے اور آگ کے اندر لکڑی ڈالی۔ خواجہ بہاءالدین پر اس وقت اضطراب کا عالم طاری تھا انھوں نے دہکتی ہوئی آگ میں اپنی پوستین اتار کر ڈال دی، اس پوستین کی جیبوں میں چند شکار کئے ہوئے پرندے تھے۔ حضرت امیر کلال نے اس بات پر خواجہ کو ملامت کی، اور حکم دیا کہ جاکر پوستین اٹھالاؤ خواجہ بہاءالدین نے عرض کیا حضرت پوستین جل کر خاک ہوچکی ہوگی۔ آپ نے فرمایا۔ بہاءالدین جو چیز سالہا سال تک درویشوں کے زیر استعمال رہی ہو اسے آگ کس طرح جلائے گی اسے تو آتش عشق نے پہلے ہی جلا رکھا ہے خواجہ بہاءالدین گئے اور اپنی پوستین کو وہاں سے صحیح وسالم باہر نکال لائے یہ کام آپ نے گہرے چولہے میں قدم رکھکر انجام دیا اور آگ نے انھیں کوئی گزند نہ پہنچائی۔

آگاہی امیر کلال میں مرقوم ہے کہ "حضرت امیر کلال کی خدمت میں مردان غیب بھی حاضر ہوا کرتے تھے ان کی حاضری کا وقت بعد از نماز مغرب ہوتا تھا۔ ایک مرید رات کے وقت حضرت امیر کلال کا نیاز حاصل کرنے کے لئے ان کے پاس گیا دیکھا تو امیر ایک بہت بڑی جماعت کے ساتھ وہاں موجود ہیں۔ اس مرید کے وہاں داخل ہونے پر وہ لوگ غائب ہوگئے اور امیر تنہا رہ گئے حضرت امیر نے فرمایا "تم نے اپنا مقصد پالیا مگر زنہار کسی اور کو خبر نہ ہو، یہ غیبی مرد تھے۔ پہلے حضرت خواجہ کلاں عبدالخالق غجدوانی کے پاس آتے تھے ان کے انتقال کے بعد اب میرے پاس آنے لگے ہیں۔

ایک دن حضرت امیر کلال اپنے مریدوں کی ایک جماعت کے ہمراہ خانقاہ میں تشریف فرما تھے۔ ایک خوبصورت نوجوان محفل میں آیا، اور بغیر سلام کئے بیٹھ گیا۔ اس نووارد پر حضرت امیر کے درمیان کوئی گفتگو نہ ہوئی تھوڑی دیر کے بعد امیر نے سر اٹھایا اور فرمایا "ختم ہوگیا" وہ نوجوان بولا "معمولی سا رہ گیا تھا وہ بھی ختم ہوگیا۔" اس کے بعد وہ نوجوان محفل میں تھوڑی دیر اور بیٹھا رہا اور پھر باہر آگیا۔

جب وہ باہر نکلا تو لوگوں نے اس سے اس کے تعجب انگیز رویّے کے بارے میں استفسار کیا۔

وہ نوجوان بولا: میں روم سے آیا ہوں چند دن قبل حضرت امیر ہمارے ساتھ ایک مسجد کی تعمیر کے کام میں مصروف تھے۔ میں اب اس مسجد کی تکمیل کی اطلاع دینے حاضر ہوا تھا، لوگوں نے یہ جواب سن کر تعجب کیا اور بولے "حضرت امیر تو کبھی روم نہیں گئے؟ اس نوجوان نے جواب دیا، حضرت امیر وہاں اکثر تشریف لایا کرتے تھے۔ ہم ان کی اقتدا میں نماز پڑھتے رہے ہیں۔ وہاں ان کے کئی مرید ہیں اور ہم سب ان کے ہاتھ پر بیعت ہیں۔ لوگوں نے پھر سوال کیا" جب آپ محفل میں آئے تو سلام کیوں نہ کیا۔ اس رومی نوجوان نے جواب دیا:" میں دل سے سلام کہتا اور دل کے ذریعہ سنتا ہوں۔ ہمیں زبان کی احتیاج نہیں۔ ہمیں جب کوئی مشکل درپیش آتی ہے تو حضرت امیر تشریف لاتے ہیں۔ اور وہ اس مشکل کو حل کر دیتے ہیں۔ یہاں کے مقابلے میں وہ وہاں زیادہ معروف ہیں، اور روم کے لوگ ان کے قدر شناس ہیں ؎

ولی و والی ملک ولا است میر کلال! یقین کہ دارۂ اولیا است میر کلال!

ولی است سالک مجذوب قطب ایں عالم مقرر ازلی بادشاہت میر کلال

اہل بخارا کا بیان

روایت ہے کہ ترکستان سے صوفیاء کی ایک جماعت بخارا آئی۔ وہ وہاں کے لوگوں سے امیر کلال کے مراتب روحانی بیان کر رہے تھے بخارا کے لوگوں نے اس گروہ صوفیا سے استفسار کیا کہ حضرت موصوف تو کبھی خود ترکستان تشریف نہیں لے گئے۔ اس پر ان ترکستانیوں نے جواب دیا:" امیر کلال ہمارے ہاں بے حد معروف ہیں۔ ہم سب ان کے مرید ہیں۔ اور ان کے ہاتھ پر بیعت ہیں۔ ہمیں کوئی مصیبت درپیش ہوتی ہے تو ان کے توسّط سے اللہ تعالیٰ سے دعا کرتے ہیں اور وہ مصیبت ٹل جاتی ہے۔

مولانا تاج الدین عجذوانی

حضرت امیر کلال کے مریدین بے شمار ہیں۔ جن میں خواجہ بہاوالدین نقشبندی کو بے پناہ شہرت ملی۔ علاوہ ازیں آپ کے بہت سے دوسرے مرید بھی نامور ہوئے۔ مولانا تاج الدین عجذوانی بھی ایسے ہی مریدین میں شامل ہیں۔ ایک بار انھوں نے حضرت امیر سے درخواست کی کہ یہ فقیر بھی اپنے ہاتھ کو آپ کے دامن سے وابستہ رکھنا چاہتا ہے۔ حضرت امیر نے جواب دیا: "ہمارا کام خدمت لینا نہیں ارادت کیشوں میں داخل کرنا ہے۔" اور آپ کو بھی شامل کرلیا۔

مولانا کشی

حضرت مولانا جلال الدین کشی بھی ایک نامور بزرگ گزرے ہیں جو حضرت امیر کلال کے ارادت مندوں میں شامل تھے۔ چنانچہ جب آپ نے امیر موصوف کے زمرہ مریدین میں شامل ہونے کی درخواست کی تو آپ نے اسے منظور فرمایا۔

ارشادات امیر کلال

۱ــــ عالم وہ ہے جس کی گفتار اس کے عمل سے بہتر ہو۔ اور عارف وہ ہے جس کا عمل اس کی گفتار سے احسن ہو۔ علم کا مقصد یہ ہے کہ عارف اپنی آگاہی کے مطابق عمل کرے۔

۲ــــ یاد رکھئے سودمند علم وہ ہے جو آدمی کو ماسوا سے دور رکھے اور ہوا و ہوس کیلئے ڈھال ثابت ہو۔

۳ــــ معرفت کی علامت یہ ہے کہ آدمی ظاہر و باطن میں خدا سے ڈرے کیونکہ خدا سے ڈرنا عرفان کی بنیاد ہے۔

۴ــــ جب تک تو دل کا رخ دنیا اور اہل دنیا سے پورے طور پر نہ پھیر دے مقصود حقیقی کا رخ تجھے نظر نہیں آئے گا۔

۵ــــ اگر آپ رات کی عبادت میں کمان کی طرح خم ہو جائیں۔ اور پیٹ کمان کے چلّے کی مانند پتلا ہو مجھے رب جلیل کی عزت کی قسم آپ اس وقت تک مقصد نہیں پا سکتے جب تک آنحضرت کی پیروی نہ کریں اور اپنے حلال کے خرچے اور پاک روزی کا خیال نہ رکھو اصل چیز شریعت کی متابعت ہے۔

۶ــــ حسن اخلاق ہر دوسرے کام سے بہتر ہے۔

۷ــــ خبردار دوستو، دردیشوں کی بددعا سے بچ کر رہو۔ یہ سینکڑوں سر کاٹ دیتے ہیں اور ان کا ہاتھ غائب رہتا ہے۔ البتہ ان کا ساتھ دو، ان لوگوں نے دنیا سے ہاتھ کھینچ رکھے ہیں اور

آسودگی دنیا سے چہرہ پاک کر رکھا ہے۔

۸ــــ طلب دنیا سے دور رہو اور آنحضرتؐ کی سنت کی پیروی سے سرمو انحراف نہ کرو۔ کیونکہ جملہ سعادتیں اسی عمل سے حاصل ہوتی ہیں۔

۹ ــــ عزیز دیقین جانو کہ دنیا دار دل کی دوستی اللہ تعالےٰ کے راستے کی بڑی رکاوٹ ہے ضروری ہے کہ خدا کو جانو، خدا کا ذکر کرو اور ہمیشہ اس کی یاد میں رہو تاکہ تمہارے دین و ایمان کا زیاں نہ ہو۔

۱۰ــــ خدا ترسی سے بڑھ کر کوئی عبادت نہیں ہے۔ جو شخص خدا سے نہ ڈرے اس سے مت ڈرو ہاں جو خدا سے ڈرتا ہو اُس سے تم بھی ڈرو۔

۱۱ ــــ جہاں تک ممکن ہو اللہ تعالےٰ کے ذکر پر زیادہ توجہ دو، ذکر ایسا کرو کہ اس سے نفی واثبات نمایاں ہوتی ہوں۔ لاالٰہ کہنے میں ماسوائے حق کی نفی کرو۔ اور اس کے بعد الّااللہ سے ذات واحد جو والدین، اولاد اور ہر قسم کی احتیاج و مدد سے پاک اور بے نیاز ہے کا اثبات کرو۔ اس وقت تم صحیح طور پر ذکر کرنے والے بنو گے۔

۱۲ ــــ یاد رکھو کپڑے پانی سے پاک ہوتے ہیں۔ زبان ذکر الٰہی سے اور جسم ادائے نماز سے مال و دولت زکوٰۃ دے کر پاک ہوتے ہیں اور تمہارا پورا وجود نفی ماسوا اللہ اور حقوق العباد کی ادائیگی سے پاک ہوتا ہے۔

۱۳ ــــ دل، زبان اور جسم کی پاکیزگی حلال کے لقمے سے حاصل ہوتی ہے۔ آدمی کے معدے کو پانی کا حوض جانیئے۔ حوض سے مختلف سمتوں میں پاک پانی اسی صورت میں نکل سکے گا جب کہ خود حوض پاک پانی کا مجموعہ ہو۔

۱۴ ــــ سالک کو تائب رہنا چاہیئے کیونکہ توبہ سب طاعتوں کا سرچشمہ ہے۔

۱۵ــــ توبہ یہ ہے کہ پہلے اپنے کئے پر شرمندہ ہو۔ پھر ترکِ گناہ کی نیت کرے۔ اس کے بعد ان گناہوں کا ارتکاب نہ کرے، اور ہمیشہ اللہ تعالےٰ سے ڈرتا رہے اور گناہوں کی معافی مانگے۔

۱۶ــــ دنیا کا غم دل سے نکال دو اور آخرت کے غم سے فکرمند رہو، عبادت کرتے رہو کیونکہ یہ بندہ ہونے کی علامت ہے۔

۱۷ــــ ہر حالت میں امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کے فرائض بجالاتے رہو۔ غیر شرعی باتوں اور بدعتوں سے بچتے رہو۔

۱۸ــــ اپنے اعمال کی کسوٹی سنت رسول کو بناؤ جو کام اس کسوٹی پر پورا اترے وہ مقبول ہے وگرنہ غلط اور گمراہی ہے۔

۱۹ــــ اللہ تعالےٰ کے ساتھ اپنے حقوق کا خیال رکھو۔ اس کی بشارتوں سے خوش رہو اور وعیدوں سے ڈرو، کھانے، پینے، اٹھنے، بیٹھنے اور ہر کام میں احکام خداوندی کا خیال رکھو۔

۲۰ــــ احتیاج سے جو بچے بچانے میں ہرج نہیں ہے مگر بھروسہ اس ذخیرے پر نہ ہو خدا پر ہو۔

۲۱ــــ اچھے اخلاق اور جوانمردی سے آدمی واقعی انسان بنتا ہے۔

۲۲ــــ لوگ وصال حق سے اس لئے محروم رہتے ہیں۔ کہ انھوں نے دنیائے دوں کو اپنا مقصود بنا رکھا ہے۔

۲۳ــــ علمائے دین کی خدمت کرنے میں پیش پیش رہو کیونکہ آنحضرتؐ نے انھیں "وارثان انبیاؑ" کہا ہے۔

۲۴ــــ جس نے علم اور علما کو چاہا اس نے زندگی بے خطا گزاری۔

۲۵ ـــــ بے دقوف کی صحبت آدمی کو خدا سے دور کر دیتی ہے۔

۲۶ ـــــ سماع در قص کرنے والوں کی محفل میں نہ جاؤ کیونکہ یہ لوگ دل کی صلاحیت کو خراب کر دیتے ہیں۔

۲۷ ـــــ اجازت و رعایت سے استفادہ نہ کرو تاکہ صاحبِ عزم بنو، رعایات سے مستفید ہونا کمزوروں کا شیوہ ہے۔

۲۸ ـــــ اخلاص کی دولت کبھی رد نہیں ہوتی۔ یاد رکھو اخلاص کے ساتھ معمولی عمل اللہ تعالےٰ کی نظر میں بہت ہے اور بے اخلاص اعمال کا طومار کسی کام کا نہیں۔

۲۹ ـــــ اپنے عمل پر ناز نہ کر عالمِ آخرت میں اس عمل کے باوزن اور مقبول ہونے کی فکر کر تجھے سوچنا چاہیئے کہ عالمِ دنیا سے کہاں جائے گا۔ اور اس بات کی فکر کر کہ وہاں شرمندگی و حسرت نہ اٹھانی پڑے۔

شاہ حُسین حقیقت

نام حقیقت کے نام کے بارے میں ادبی تذکروں میں اختلاف پایا جاتا ہے۔ مصحفی نے تذکرہ ہندی[1] میں ان کا نام "میر شاہ حسین المتخلص بہ حقیقت لکھا ہے"۔ دیگر تذکرہ نگاروں، قدرت اللہ قاسم[2]، عبدالغفور خاں نساخ[3]۔ نواب مصطفےٰ خاں شیفتہ[4]، سید حسن علیخاں[5]، نصر اللہ خاں خویشگی[6] اشپرنگر[7]، خوب چند ذکا[8]، قطب الدین باطن[9]، شاہ محمد کمال[10] اور اعظم الدولہ سرور[11] اور سعادت خاں ناصر[12] نے ان کا نام شاہ حسین ہی تحریر کیا تھا۔

حقیقت کی تصانیف، مثنوی ہشت گلزار[13] (جو دراصل شاہ بہرام گور کا قصہ ہے اور امیر خسرو کی ہشت بہشت کا آزاد ترجمہ ہے) ہیرامن طوطا[14]، اور جذب عشق[15] میں بھی ان کا نام شاہ حسین ہی لکھا ہوا ہے البتہ حقیقت کی دوسری تصانیف صنم کدہ چین[16]، خزینۃ الامثال[17]، تحفۃ العجم[18] اور ان کے دیوان[19] میں ان کا نام سید حسین شاہ تحریر ہے، میر محسن لکھنوی نے جو حقیقت کے بیٹے ہیں، اپنے تذکرے سراپا سخن میں کہیں ان کا نام شاہ حسین اور کہیں حسین شاہ لکھا ہے۔

حقیقت کے بڑے بھائی سید حسن شاہ ضبط[21] کے فارسی ناول "نشتر" میں بھی ان کا نام شاہ حسین تحریر

۱:۔ تذکرہ ہندی از مصحفی فارسی ص ۸۶ ۲:۔ مجموعہ نغز فارسی ص ۲۲-۲۱۹ مرتبہ حافظ محمود شیرانی لکچرار پنجاب یونیورسٹی مطبوعہ ۱۹۳۳

۳:۔ سخن شعرا اردو ص ۱۳۶ ۴:۔ گلشن بے خار فارسی ص ۶۱ ۵:۔ بزم سخن فارسی ص ۴۲ ۶:۔ گلشن بہار (تذکرہ شعرائے اردو) ص ۱۱۸، ۱۱۷ مرتبہ ڈاکٹر اسلم فرخی مطبوعہ انجمن ترقی اردو پاکستان کراچی ۷:۔ یادگار شعرا اردو ترجمہ از طفیل احمد مطبوعہ ہندوستان اکیڈمی صوبہ متحدہ الہ آباد ۱۹۴۲ء ۸:۔ تذکرہ عیار الشعرا۔ یہ تذکرہ فوٹو اسٹیٹ کی صورت میں انجمن ترقی اردو پاکستان کراچی کی ملکیت ہے ۹:۔ گلستان بے خزاں (تذکرہ باطن ص ۲۳۰، ۱۰:۔ مجمع الانتخاب ص ۷۸ تلخیص و مقدمہ خواجہ نثار احمد فاروقی ۱۱:۔ عمدہ نتیجہ ص ۲۳۷/۱۲:۔ خوش معرکہ زیبا جلد اول مرتبہ مشفق خواجہ مطبوعہ مجلس ترقی ادب لاہور ص ۲۷۱ ۱۳، ۱۴، ۱۵، ۱۶، ۱۷، ۱۸، ۱۹، ان تصانیف کے سرورق ۲۰:۔ تذکرہ سراپا سخن ص ۲۴، ۲۰۴، ۲۰۵، ۱۳۶، ۲۶۷ (۲۱:۔ نشتر ص ۸ سید حسن شاہ ضبط اردو ترجمہ منشی سجاد حسین انجم کسمنڈوی تعارف عشرت رحمانی مطبوعہ مجلس ترقی ادب۔ لاہور۔

ہے۔ منشی ولی اللہ فرخ آبادی[۲۲] نے اپنی تاریخ میں ان کا نام حسین شاہ حقیقت ہی لکھا ہے۔
آصفیہ جلد اوّل[۲۳] اور ارباب سخن[۲۴] میں بھی ان کا نام میر شاہ حسین ہی تحریر ہے۔
حقیقت نے ایک جگہ رباعی میں اپنا نام میر حسین شاہ بتایا ہے۔

پھرتا ہے جو یوں تباہ کیا تجھکو ہوا ہے کس سے جدا تو آہ کیا تجھکو ہوا
جو دیکھے ہے تیری شکل رو دیتا ہے میر حسین شاہ کیا تجھکو ہوا!

پروفیسر لطیف حسین کا یہ کہنا درست ہے کہ

"اگر حقیقت کے اہل خاندان کے ناموں کی ترکیب کو دیکھا جائے تو اس نتیجے پر پہنچنے میں کوئی دشواری نہیں ہوگی کہ ان کا نام سید حسین شاہ ہی تھا کیونکہ ان کے دادا کا نام میر کرک شاہ تھا۔ والد کا نام عرب شاہ، تایا و چچا کا نام سید محمد شاہ، سید اشرف شاہ، سید میر محمد شاہ، حقیقت کے بڑے بھائی کا نام سید حسن شاہ تھا، اور چھوٹے بھائی کا نام سید قاسم شاہ تھا۔ وہ خود منجھلے بھائی تھے۔"

حقیقت کے اجداد

سید حسن شاہ ضبط نے اپنے ناول نشتر کے دیباچے میں لکھا ہے کہ وہ حضرت سید عبداللہ ملقب بہ مظلوم کی اولاد میں سے ہیں جن کا سلسلۂ نسب گیارہ واسطوں سے حضرت سید الشہدا امام حسین علیہ اسلام سبط رسول مجتبیٰ صلی اللہ علیہ وسلم تک پہنچتا ہے[۲۵] عبداللہ ملقب بہ مظلوم ہی کے خاندان میں آگے چل کر حضرت سید امیر کلال پیدا ہوئے جن کا تفصیلی تذکرہ ہم باب اول میں کر چکے ہیں۔ سید حسن شاہ نے لکھا ہے۔

"حضرت سید عبداللہ ملقب بہ مظلوم جن کا سلسلہ گیارہ واسطوں سے حضرت سید الشہدا حضرت امام حسین علیہ السلام سبط رسول مجتبیٰ صلی اللہ علیہ وسلم تک پہنچتا ہے اپنے والد حضرت ابراہیم رضا کے

۲۲: تاریخ فرخ آباد مولفہ منشی ولی اللہ مترجمہ حکیم شریف الزماں اکبر آبادی ص ۲۷۷، ۲۷۸، ۲۷۹ (۲۳) مرتبہ نصیر الدین ہاشمی ص ۱۲۵
۲۴: حسرت موہانی طبع اول ۱۹۲۹ء ص ۲۸۷ (۱) نشتر از سید شاہ ضبط اردو ترجمہ منشی سجاد حسین ایم کمنڈی مرتبہ عشرت رحمانی ۱۲۔ تعارف دیوان حقیقت از پروفیسر لطیف حسین ادیب مطبوعہ مارچ نمبر ۱ جلد ۲-۱-۱ جمادی ۱۹۶۸ء ص ۵۱ (۲) نشتر ص ۶ (اردو ترجمہ) منشی سجاد حسین کمنڈیی مطبوعہ مجلس ترقی ادب لاہور

کے سامنے خلفائے بنوعباس کے جور و جفا سے حدود بلخ میں مخفی سکونت پذیر تھے۔ شدت ظلم اعدا کی وجہ سے مع تبرکات شریفہ جو نسلاً بعد نسل چلے آتے تھے بعد شہادت والد بزرگوار مع چند ہمراہیاں حدود ترکستان میں پہنچے۔ اور اقامت اختیار کی۔ ان کی اولاد سے جناب سید السادات قطب انام حضرت سید امیر کلاں عرف امیر کلال رحمتہ اللہ علیہ کا شہرہ عام ہوا حتی کہ صاحبقراں امیر تیمور گورگان کو آپ نے اپنا پسر خواندہ فرمایا اور بشارت سلطنت ہفت کشور کی دی۔"

مذکورہ بالا بیان میں سید حسن شاہ نے اپنے اجداد کو اوّل اول حدود بلخ میں مخفی طور پر سکونت پذیر بتایا ہے۔ اور بعد میں ان کا حدود ترکستان میں وارد ہونا بیان کیا ہے۔ لیکن بعض تاریخی روایتوں کے بموجب، حضرت امیر کلال کے خاندان کے بزرگ جو خلفائے بنوعباس کے ظلم و ستم سے محفوظ رہنے کے لئے حدود یمن میں سکونت پذیر ہوئے تھے۔ وہاں سے ترکِ وطن کر کے ترکستان چلے گئے[۲]۔ بلخ ترکستان کا ہی ایک حصہ ہے۔

حقیقت کے اجداد کا وطن

حقیقت کے اجداد کے وطن کے بارے میں بھی مختلف تذکرہ نویسوں میں اختلاف پایا جاتا ہے۔

تذکرہ مصحفی میں انھیں بلخی الاصل بیان کیا گیا ہے چنانچہ مصحفی لکھتے ہیں۔

"وطن اجدادش بلخ و خوست است[۱]۔"

اس کے علاوہ عیار الشعرا (قلمی نسخہ)[۲] گلشن بے خار[۳]، گلشن ہمیشہ بہار[۴]،

۱:۔ نشتر۔ اردو ترجمہ از منشی سجاد حسین انجم کسمنڈوی مرتبہ عشرت رحمانی مطبوعہ مجلس ترقی ادب لاہور ص ۶۷ (مترجم) ۲:۔ تاریخ سیاسیات عرب (مسلمانوں کی سیاسی تاریخ) جلد دوم مصنفہ ڈاکٹر حسن ابراہیم ایم اے پی ایچ ڈی۔ اردو مترجم از علیم اللہ صدیقی مطبوعہ مجلس ترقی ادب لاہور۔ (۳) تذکرہ ہندی از مصحفی ص ۸۶ (۱) خوب چند ذکا بزبان فارسی ص ۲۷۲ مخطوطہ مخزونہ انڈیا آفس لندن فوٹو اسٹیٹ مملوکہ انجمن ترقی اردو۔ (۲) مصطفےٰ خاں شیفتہ ص ۶۱ (۳) نصر اللہ خاں خویشگی ص ۱۱۷-۱۱۸ (۴) سید حسن علیخاں ص ۴۲

گلستان بے خزاں[۵]، نسخہ دلکشا[۶]، یادگار شعرا[۷]، مجموعہ نغز[۸]، عمدہ منتخبہ[۹] میں بھی حقیقت کو بلخی الاصل بتایا گیا ہے۔

محسن لکھنوی نے اپنے تذکرے سراپا سخن میں لکھا ہے کہ ان کے اجداد نے عربستان سے آکر خوست میں توطن اختیار کیا۔ تاریخ فرخ آباد[۱۰]، جلوہ خضر[۱۱]، ارباب سخن[۱۲]، شمیم سخن[۱۳] میں بھی حقیقت کا وطن خوست ہی لکھا گیا ہے۔

حقیقت کے والد نے حکیم میر محمد نواز کی لڑکی سے عقد کیا تھا۔ اور حکیم صاحب موصوف چونکہ حقیقت کے نانا تھے اور بلخی الاصل تھے۔ لہذا اکثر تذکرہ نویسوں نے بلا کسی تحقیق کے حقیقت کو بھی بلخی الاصل لکھ دیا۔

حقیقت کے اجداد کا ورود ہندوستان

حقیقت کے اجداد کے ورود ہندوستان کے بارے میں دو[۲] بیانات ملتے ہیں۔ صنم کدۂ چیں میں حقیقت لکھتے ہیں کہ اول ان کے بزرگ عرب سے شاہ جہاں آباد آئے۔ معلوم نہیں حقیقت نے اپنے اجداد کو براہ راست عرب سے شاہ جہاں آباد میں وارد کیوں بتایا ہے اور ترکستان میں ان کے توطن کا تذکرہ کیوں نہیں کیا۔ بظاہر یہ بات عجیب معلوم ہوتی ہے کہ انھیں اپنے آبا و اجداد کے ان تاریخی حالات سے کماحقہٗ واقفیت نہ ہو۔ جبکہ ان کے بڑے بھائی سید حسن شاہ ضبط کی تصنیف میں اس کا تذکرہ بھی موجود ہے۔ ممکن ہے حقیقت نے شعوری طور پر ایسا کیا ہو اور اپنے خاندان کی نقل مکانی کی طول طویل داستان کو بیان کرنا مناسب نہ سمجھتے ہوئے اختصار سے کام لیا ہو۔

۵:۔ قطب الدین باطن ص ۲۲ (۶) باب الفار ص ۱۵۱ مطبوعہ نسخہ ص ۸۸ (۷) اشیر نگر ص ۷۶ (۸) قدرت اللہ قاسم ص ۲۱۹-۲۲۰ (۹) اعظم الدولہ سرور ص ۲۳۷ (۱۰) مفتی دلی اللہ فرخ آبادی ص ۲۷۷-۲۷۸-۲۷۹

۱۱:۔ جلد پنجم ص ۱۳۶ (۱۲) حسرت موہانی طبع اول ۱۹۲۹ء ص ۲۸۷ (۳) ص ۲۰۴ تا ۲۰۵ (۱) صنم کدۂ چیں ص ۳۲ مصنفہ شاہ حسین حقیقت، مطبوعہ مطبع مجتبائی لکھنؤ (۲)

محسن لکھنوی کا بیان ہے:۔

"سید امیر کلال کی اولاد میں سے سید امیر برہان حسب الطلب فرخ سیر معہ تحائف خاندانی لاہور پہنچے، اور وہاں سے حقیقت کے دادا سید میرک شاہ بہ عہد۔ شاہ عالم دلی آئے[1]۔"

شاہ حسن ضبط کے بیان سے اس سلسلے میں کافی روشنی پڑتی ہے۔

"تا آنکہ نوبت سجادگی حضرت حاجی الحرمین سید میرک شاہ رحمتہ اللہ علیہ جد بزرگوار کاتب الحروف کو پہنچی، اور بموجب بشارت ازدواج طیبات بزرگان مع چند تبرکات شریفہ عازم ہندوستان ہوئے ۱۱۲۵ھ میں بیس قرابت داران کے ساتھ داخل کابل ہوئے صوبہ دار کابل کی استدعا سے چند مہینے اقامت کر کے بقصد شاہجہان آباد وارد لاہور ہوئے اور بوجہ اصرار عقیدت منداں شاہ جہاں آباد کا قصد ملتوی فرمایا۔ صرف ایک شخص مسمی گدا شاہ اپنے ہمراہی کو فرخ سیر بادشاہ ہندوستان کے پاس روانہ کیا۔ مگر سادات بارہہ کے تسلط اور غلو سے ملاقات نہ ہو سکی۔ سید موصوف کی معاودت بادشاہ کا بعد پلٹنے کے مطلع ہونا۔ عذر خواہی کے ساتھ نذر و نیاز کا اپنے خواص خاص کے ساتھ جناب حاجی صاحب کی خدمت میں بھیجنا اور متمنی تشریف آوری حضرت موصوف ہونا بموجب بشارت روح بزرگان جناب سید حقانی متوطن قصبہ بندگی متعلقہ چکلہ کوڑہ جہاں آباد کی صاحبزادی سے نکاح کیا۔ اور صرف ایک بار محمد شاہ بادشاہ کے عہد سلطنت میں شاہ جہاں آباد کو تشریف لے گئے ورنہ ہمیشہ اطراف لاہور اور سرہند میں بسر فرمائی، اور ایک عالم کو فیوض باطنی سے سرفراز فرمایا[2]۔"

سید حسن شاہ ضبط کے اس بیان سے یہ نتیجہ نکالا جا سکتا ہے کہ سید میرک شاہ نے ۱۱۲۵ھ

۱۔ محسن لکھنوی۔ دیباچہ تذکرہ سراپا سخن مطبوعہ مطبع مجتبائی لکھنؤ۔ (۲) نشتر ص ۲ اردو ترجمہ منشی سجاد حسین انجم کمنڈوی مطبوعہ مجلس ترقی ادب لاہور۔

بمطابق ۱۴-۱۷۱۳ کے اوائل میں ترکستان سے رخت سفر باندھا ہوگا۔ اور کابل پہنچے ہوں گے جہاں سے وہ لاہور وارد ہوئے۔ یہ زمانہ جیسا کہ ضبط نے لکھا ہے۔

فرخ سیر کا زمانہ تھا۔ فرخ سیر ۱۷۱۳ء سے ۱۷۱۹ء تک سریر آرائے سلطنت رہا۔ گویا اسی زمانے میں حقیقت کے دادا سید میرک شاہ لاہور پہنچ چکے تھے۔ سید میرک شاہ اپنے زمانے کے نامور بزرگ تھے۔ امرا و وزرا کو بطور خاص صوفیا اور بزرگان دین سے عقیدت و ارادت ہوتی ہے۔ حسن عقیدت کے علاوہ عین ممکن ہے کہ صوبیدار لاہور نے اس لئے بھی ان کے قیام لاہور پر اصرار کیا ہو کہ وہ امیر تیمور کے مرشد کے خاندان کے ایک فرد تھے۔ سادات بارہہ نے ان کی فرخ سیر سے ملاقات نہ ہونے دی۔ اس میں سادات بارہہ کی سیاسی مصلحتوں کو دخل ہوگا۔ اور سادات بارہہ نے دربار میں ان کے اثر و رسوخ کو اپنے لئے خطرناک سمجھتے ہوئے رکاوٹیں کھڑی کی ہوں گی۔

گویا حقیقت کے دادا جس وقت ہندوستان پہنچے تو مغلیہ سلطنت پر جانکنی کا عالم تھا اور آل تیمور کی بے سر و سامانی، عبرت کا مرقع پیش کر رہی تھی۔ سید میرک شاہ کے لاہور کے قیام کے دوران ہی سادات بارہہ کے ہاتھوں فرخ سیر کا قتل ہوا جس کی صدائے بازگشت ہندوستان کے طول و عرض میں سنی گئی۔ بیدل کا ایک مصرعہ اسی جانب اشارہ کرتا ہے ؎

سادات بوئے نمک حرامی کردند

سادات بارہہ نے فرخ سیر کے قتل کے بعد شہزادہ رفیع الدولہ کو قید خانے سے نکال کر محمد شاہ کے لقب سے تخت سلطنت پر بٹھایا۔ اس کے دور میں اہل دہلی کو اور خاندان مغلیہ کو سادات بارہہ کے ظلم و ستم سے نجات ملی۔ سید میرک شاہ بھی محمد شاہ کے عہد حکومت میں ایک بار شاہ جہاں آباد تشریف لے گئے۔ گو سید حسن شاہ ضبط، سید شاہ حسین حقیقت اور محسن لکھنوی کے بیانات میں اختلاف پایا جاتا ہے لیکن سید میرک شاہ کے سفر دہلی کے بارے میں سید حسن شاہ ضبط کا بیان ہی

صحیح معلوم ہوتا ہے۔

سید میرک شاہ ہمیشہ لاہور و سرہند اور اس کے اطراف و جوانب میں ہی قیام پذیر رہے البتہ ان کے انتقال کے بعد ان کی اولاد شمالی ہند کے اندرونی علاقوں میں پھیل گئی۔ اس سلسلے میں بھی شاہ حسین حقیقت، اور شاہ حسن ضبط کے بیانات میں اختلاف پایا جاتا ہے۔ حقیقت نے ضمن کدۂ چیں میں لکھا ہے کہ ان کے اجداد ہندوستان پہنچ کر کٹہیر میں متوطن ہوئے جو موجودہ روہیل کھنڈ کی حدود میں شامل ہے اس سے یہ نتیجہ نکالا جا سکتا ہے کہ ان کے اجداد کا تعلق بلخ و خوست سے تھا اور وہ خود (حقیقت) بریلی میں پیدا ہوئے۔

حقیقت کے بزرگوں کی بریلی میں آمد کے بارے میں زیادہ تفصیلی اور بنیادی معلومات ہمیں شاہ حسن ضبط سے ہی ملتی ہیں۔ ضبط نے اپنے ناول نشتر میں لکھا ہے۔

"حاجی صاحب موصوف (یعنی سید میرک شاہ) کے چار بیٹے اور دو[۲] بیٹیاں تھیں۔ سید محمد شاہ، سید اشرف شاہ، سید عرب شاہ والد مصنف، سید محمد میر شاہ، مگر ان چوتھے صاحبزادے نے مناصب شاہی اختیار کر لئے تھے اور نفع کثیر خلق اللہ کو پہنچایا۔ بالجملہ بعد انتقال حاجی صاحب (یعنی سید میرک شاہ) اور دست برد نادر شاہ اصفہانی و احمد شاہ دورانی اور تغیر سلطنت گورگانی، نواب نجیب خاں چچا صاحب کو اپنے ہمراہ شاہ جہاں آباد میں لایا۔ اور عموے موصوف نے بعد چندے نجیب آباد اور مدینہ دھام پور میں اقامت اختیار کی اور وہیں انتقال فرمایا۔ میرے والد ماجد (یعنی سید عرب شاہ) سکھوں کی زبردستیوں سے تنگ آکر اوائل بریلی میں تشریف لائے اور وہیں شادی بھی کی[۲]۔

ضبط کے اس بیان سے جن باتوں کی تصدیق ہوتی ہے۔ ان میں سے ایک تو یہ ہے کہ سید میرک شاہ ہمیشہ لاہور و سرہند کے اطراف میں مقیم رہے۔ دوم یہ کہ ان کے ایک لڑکے نے، جو حقیقت

۱:۔ تذکرۂ ہندی ص ۸۲۔ مصحفی (۲) نشتر از حسن شاہ ضبط ص ۵ مترجمہ منشی سجاد حسین کسمنڈوی مطبوعہ مجلس ترقی ادب لاہور۔

کے چچا بھی تھے۔ بادشاہی ملازمت اختیار کرلی تھی۔ اور یہ کہ وہ نادرشاہ و احمدشاہ کے حملوں کے وقت دربار شاہی سے وابستہ تھے۔ جہاں ان کے روابط نواب نجیب خاں سے ہوئے جس نے لال قلعے کو مرہٹوں کے قبضے سے پاک کیا تھا اور بادشاہ کو ان سے رہائی دلائی تھی۔ البتہ سید میر محمد شاہ کے بھائی یعنی حقیقت کے والد سید عرب شاہ کے بارے میں یہ پتہ نہیں چلتا کہ وہ خود کس سال لاہور و سرہند وغیرہ کی اقامت ترک کر کے نگینہ دھام پور، نجیب آباد وغیرہ میں پہنچ کر اقامت گزیں ہوئے تھے۔ بہرحال جب دہلی کی مرکزیت، انتشار کا شکار ہوگئی اور پنجاب میں سکھوں کی شورش نے سر اٹھایا تو مسلمانوں پر عرصہ حیات تنگ ہو جانے کے سبب، سید عرب شاہ بھی آنولہ بریلی پہنچے ہوں گے جہاں (روہیل کھنڈ) میں پٹھانوں نے چھوٹی چھوٹی ریاستیں قائم کرلی تھیں۔

سید عرب شاہ کے بارے میں یہ قیاس کیا جاسکتا ہے کہ ان کی بریلی میں آمد کا زمانہ ۱۷۶۱ء کے بعد کا ہے۔ یہاں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ انھوں نے اطراف لاہور و سرہند کی جائے سکونت ترک کرنے کے بعد دہلی کا رخ کیوں نہ کیا جہاں تیمور کے روحانی پیشوا کے خاندان کا ایک فرد ہونے کے سبب ان کی زیادہ آؤ بھگت ہوتی۔ اور بہتر ذریعہ معاش پیدا ہوتا۔ اس کی وجہ یہ ہو سکتی ہیں کہ چونکہ اس زمانے میں دہلی کی مرکزیت اور سیاسی قوت ختم ہو چکی تھی اور مرہٹوں نے تخت دہلی پر قبضہ کر کے بادشاہ کو بے یار و مددگار بنا دیا تھا اور نجیب الدولہ جس نے بادشاہ کو اس فتنے سے نجات دلائی تھی ایک نئی قوت بن کر ابھرا تھا۔ دوسرے اس زمانے میں ابدالی اور مرہٹوں کے درمیان جنگ ہو رہی تھی اور شمالی ہند کے لوگ دہلی کو امن و امان کی جگہ نہ پاتے ہوئے پورب کی جانب سفر کر رہے تھے چنانچہ اگر سید عرب شاہ بھی دہلی سے دور آنولہ بریلی روہیل کھنڈ میں پہنچے تو اس کی ایک وجہ تو مذکورہ بالا واقعات ہی تھے۔ دوسری اہم وجہ یہ رہی ہوگی کہ ان کے ایک بھائی نجیب الدولہ کی سرکار سے وابستہ ہو کر نگینہ دھام پور میں رہائش اختیار کر چکے تھے۔

سید عرب شاہ کی شادی

حقیقت کے والد سید عرب شاہ نے آنولہ بریلی میں حکیم میر محمد نواز کی دختر سے شادی کی۔ حکیم میر محمد نواز نجیب الطرفین سید تھے ان کے اجداد بلخ کے رہنے والے تھے جیسا کہ پہلے عرض کیا جا چکا ہے اس سبب سے شاید حقیقت کو اکثر تذکرہ نگاروں نے بلخی الاصل لکھا ہے حکیم میر محمد نواز کے بارے میں سید حسن شاہ ضبط لکھتے ہیں[1]۔

"میرے نانا صاحب قبلہ حکیم میر محمد نواز حضرت سید عطا موسوی کی اولاد ہیں۔ اور علم و فضل خصوصاً طب و حکمت میں یگانۂ وقت و فریدِ دہر کہنا چاہیئے۔ آپ کے والد شاہ مینا محمد شاہ بادشاہ کے وقت میں بلخ سے شاہ جہاں آباد کو تشریف لائے اور منصب داران شاہی میں شامل ہوئے۔ وہیں شادی بھی کی ۱۱۸۴ھ میں جب کہ والد مرحوم کی شادی ہوئی اس وقت حکیم صاحب موصوف نواب عنایت اللہ خاں پسر حافظ الملک حافظ رحمت خاں کی سرکار میں ملازم باامتیاز تھے اور شہر بریلی میں اقامت گزیں۔"

حقیقت کی پیدائش

حقیقت کے بڑے بھائی حسن شاہ ضبط کی ولادت شادی کے ایک سال بعد ہوئی۔ چنانچہ ضبط لکھتے ہیں۔

"۱۱۸۴ھ میں میری ولادت ہوئی اور دو چھوٹے بھائی بھی اسی شہر میں پیدا ہوئے ۱۱۹۴ھ میں جناب والد مغفور نے انتقال فرمایا۔ اور دونوں چھوٹے بھائی سید حسین شاہ و سید قاسم شاہ سلمہٗ جناب نانا صاحب قبلہ کے زیر تعلیم و تربیت اسی شہر میں رہے اور جو کچھ پڑھا لکھا ان ہی کی مزید شفقت کا نتیجہ ہے۔"[2]

۱:۔ نشتر ص۳ مطبوعہ مجلس ترقی ادب لاہور۔

۲:۔ نشتر ص۳ " " " " "

حقیقت کانپور میں

تقریباً چودہ برس کی عمر میں شاہ حسین حقیقت، اپنے بھائی حسن شاہ ضبط اور حکیم سید میر محمد نواز کے پاس بریلی سے کانپور پہنچے ۲۳ اپریل ۱۷۷۴ کو ایسٹ انڈیا کمپنی اور شاہ شجاع الدولہ کی مشترکہ افواج نے حافظ الملک نواب حافظ رحمت خاں کو شکست دے دی جس کے بعد روہیل کھنڈ میں روہیلوں کے اقتدار کا آفتاب ہمیشہ ہمیشہ کے لئے غروب ہو گیا۔ اس شکست کے نتیجے میں بریلی تباہ و برباد ہو گئی اور وہاں کے باشندوں نے اپنی جان و مال اور عزت و آبرو کی حفاظت کی خاطر بریلی سے رخلت سفر باندھا۔

ڈاکٹر لطیف حسین ادیب اس سلسلے میں لکھتے ہیں۔

"ایسا معلوم ہوتا ہے کہ حکیم میر محمد نواز نے اپنے داماد سید عرب شاہ کی وفات ۸۱-۱۷۸۰ء ۱۱۹۰ھ کے چند سال بعد بریلی سے سفر کیا۔ وہ بریلی سے کانپور پہنچے اور منگ صاحب کی سرکار میں عہدہ منشی گری پر مامور ہوئے۔"[1]

حافظ رحمت خاں کو ۱۷۷۴ء میں شکست ہوئی تھی جس کے بعد بریلی تباہ و برباد ہوئی۔ لیکن ۱۷۸۰ء تک یعنی آئندہ چھ برس تک حکیم میر محمد نواز، بریلی میں ہی سکونت پذیر رہے اور اس کے بعد کانپور پہنچے جہاں امن و امان کی فضا تھی۔ کانپور میں حکیم صاحب موصوف، منگ صاحب کی سرکار سے بہ عہدہ منشی گری وابستہ ہو گئے۔

ہر چند کہ حکیم صاحب موصوف انگریزوں کے جانی دشمن، حافظ رحمت خاں اور ان کے بیٹے کی ملازمت میں رہ چکے تھے لیکن ان کے علم و فضل کے سبب انگریزوں نے ان کی قدر و منزلت کی۔

منگ صاحب بقول حسن شاہ ضبط ایک شریف اور عالی نسب انگریز تھا اور جنرل کوٹ کا ہمشیرہ زادہ تھا۔ خود جنرل کوٹ بھی ایک عالی مرتبت انگریز تھا۔[2] شاہ حسن ضبط کے بیان سے معلوم

۱:۔ میر شاہ حسین حقیقت از لطیف حسین ادیب ص ۵۶ مطبوعہ معارف نمبر ۱ جلد ۲-۱ ماہ جولائی ۱۹۶۸ء

۲:۔ نشتر ص ۹ مترجمہ منشی سجاد حسین انجم کمبوہی مطبوعہ مجلس ترقی ادب لاہور۔

ہوتا ہے کہ مسٹر منگ نے حکیم میر محمد نواز کا تقرر اپنے خانگی منشی کی حیثیت سے کیا تھا اور ان سے پڑھا بھی تھا۔ غالباً فارسی و عربی اور ہندوستانی (اردو) زبانیں پڑھتا ہوگا جس کی تحصیل کا شوق اس زمانے کے اکثر انگریزوں کو ہوا کرتا تھا۔ درس و تدریس کا یہ سلسلہ مسٹر منگ کے کانپور کے زمانہ قیام کے اولین دور میں جاری رہا"۔ منگ صاحب جب کلکتہ سے دوبارہ کانپور میں آئے اور کرنل ہملیڈی صاحب کمانڈنگ آفیسر سے زیادہ رسم و راہ اور محبت کا اتفاق ہوا اور پڑھنا چھوڑ دیا۔

سید حسن شاہ ضبط نے منگ صاحب کے ہاں اپنے سلسلۂ ملازمت کا ذکر کرتے ہوئے اپنی عمر پندرہ، سولہ سال بیان کی ہے اس حساب سے یہ کہا جا سکتا ہے کہ ۱۲۰۰ھ مطابق ۸۶-۱۷۸۵ء میں حکیم میر محمد نواز اور سید حسن شاہ ضبط کانپور میں رہائش اختیار کر چکے تھے۔ سید حسن شاہ منگ صاحب کے خانگی، روپے پیسے کے حساب و کتاب کی خدمت پر مامور ہوئے تھے۔ حکیم میر محمد نواز نے فکر معاش سے آزاد ہو کر اپنے متعلقین کو قصبہ جاج میئو (کانپور) میں بلوا لیا تھا گویا اس طرح ۱۷۸۵ء میں حقیقت، بریلی سے کانپور پہنچے۔ اس وقت حقیقت کی عمر تیرہ برس تھی۔ سید حسن شاہ ضبط مسٹر منگ سے ملازمانہ تعلق پیدا ہونے کے بارے میں لکھتے ہیں۔

"صاحب نے نانا صاحب سے ذکر کیا کہ مجھے بوجہ عدیم الفرصتی اپنا خانگی کاروبار حساب و کتاب لکھنے کی مہلت نہیں ملتی اور اکثر میرا روپیہ مفت تلف ہوتا ہے اگر آپ اس کام کو بوجہ اس کے کہ بالفعل کوئی دوسرا کام آپ کے ذمے نہیں ہے، دیکھ بھال کریں تو بہتر ہے نانا صاحب نے انکار کیا اور کہا اگر حسن شاہ اس کام کو قبول کرے گا تو آپ کی غایت پوری ہو سکتی ہے چنانچہ منگ صاحب نے مجھ کو بلا کے اصرار کیا اور میں نے بعد چند شروط کے اس کو قبول کر لیا"۔

اپنے نانا کے ترک خدمت اور حقیقت کی کانپور میں رہائش کے بارے میں سید حسن شاہ ضبط

۱:۔ نشتر ص ۹ مرتبہ منشی سجاد حسین انجم کمنڈوی مطبوعہ مجلس ترقی ادب لاہور۔
۲:۔ نشتر ص ۱۳-۱۴

آگے لکھتے ہیں "میری عمر اس زمانے میں پندرہ سولہ برس کی تھی اور نانا صاحب نے بریلی سے متعلقین کو بلوا کر قصبہ جاج مئو میں جو کانپور سے ۲½ کوس پورب کی طرف ہے سکونت کر لی تھی اور چونکہ کوئی تعلق خدمت باقی نہیں رہا تھا اکثر خانہ نشین رہتے تھے۔ میں اور میرا چھوٹا بھائی میر حسین شاہ اور چچازاد بھائی میر محمد یوسف مع بعض قرابت داروں کے کیمپ میں رہتے تھے[1]۔

حقیقت لکھنؤ میں

حقیقت قصبہ جاج مئو (کانپور) میں تھوڑا عرصہ قیام کرنے کے بعد لکھنؤ پہنچے۔ مختلف تذکروں میں ان کے کانپور سے آنے یا بریلی میں پیدا ہونے اور لکھنؤ میں آنے کے بارے میں تو ذکر ملتا ہے لیکن لکھنؤ میں ان کی آمد کے صحیح سنہ کے بارے میں کچھ پتہ نہیں چلتا۔ ہم مختلف تذکروں کے حوالے یہاں پیش کرتے ہیں۔

عیار الشعراء میں لکھا ہے۔

"وہ (حقیقت) بریلی میں پیدا ہوئے۔ اور لکھنؤ میں رہے۔"

تذکرہ گلشن بے خار میں تحریر ہے:۔

"وہ (حقیقت) بریلی میں پیدا ہوئے لیکن نشو و نما لکھنؤ میں پائی[3]۔"

تذکرہ سراپا سخن میں لکھا ہے۔

"میر شاہ حسین اپنے نانا حکیم میر محمد نواز کے ہمراہ لکھنؤ آئے[4]۔"

مصحفی تذکرہ ہندی میں لکھتے ہیں۔ "لکھنؤ میں سن تمیز کو پہنچے[5]۔"

اس کے علاوہ حقیقت فرخ آباد بھی آتے جاتے رہتے تھے۔ چنانچہ مفتی اللہ فرخ آبادی لکھتے ہیں

"شاہ جہاں آباد کے بزرگ نامدے اور حکیم میر محمد نواز کے بھانجے ہیں۔ فرخ آباد میں آنے کے

۱۔ نشتر ص ۵ مترجمہ منشی سجاد حسین انجم کمنڈوی مطبوعہ مجلس ترقی ادب لاہور (۲) عیار الشعراء ص ۲۷۲ (۳) ص ۶۱ (۴) ص ۶ (۵) ص ۸۲

موقع پر اکثر راقم کے پاس تشریف لاتے تھے۔

حقیقت لکھنؤ میں کس سنہ میں پہنچے ان کا تعین کرتے ہوئے ڈاکٹر لطیف حسین ادیب اپنے مضمون[2] میں لکھتے ہیں۔

"حقیقت کانپور سے لکھنؤ پہنچے، مصحفی نے لکھا ہے۔ وبہ لکھنؤ بہ سن تمیز رسیدہ، (تذکرہ ہندی ص۸۶) حقیقت ۱۲۰۰ھ (مطابق ۸۶-۱۷۸۵) میں کانپور میں تھے۔ اس وقت ان کی عمر تیرہ سال تھی۔ مصحفی نے تذکرہ ہندی ۱۲۰۱ھ مطابق ۱۷۸۶ء عیسوی سے قبل لکھنا شروع کیا تھا سرِدست اگر یہ مان لیا جائے کہ انھوں نے حقیقت کا حال ۱۲۰۱ھ یا اس کے ایک دو سال بعد قلم بند کیا تو حقیقت چودہ پندرہ سال کی عمر میں لکھنؤ پہنچے۔[3]

جرأت کی شاگردی

لکھنؤ میں شاہ حسین حقیقت نے اس عہد کے نامور شاعر جرأت کے سامنے زانوئے تلمذ تہہ کیا۔ بعض ناقدین کی رائے یہ ہے کہ ان کے بڑے بھائی سید حسن شاہ ضبط بھی چونکہ جرات کے شاگرد تھے۔ لہذا انھوں نے بھی جرات کو اپنا استاد بنایا۔ ہمارے خیال میں جرات کی شہرت و ناموری کے سبب کسی نوجوان شاعر کا ان کی طرف رجوع ہونا عین فطری ہے۔

مصحفی اس سلسلہ میں لکھتے ہیں کہ" اکثر بہ کتابت ہائے غزلیات استاد مبالغہ کہ بہ سبب کوری از نوشتن معذور است مصروف می ماند[4]۔ "

ہمارے خیال میں استاد شاگرد کے تعلق کے سبب حقیقت، جرأت کی غزلوں کی کتابت کر دیا کرتے ہوں گے۔

۱۔ عہد مغلیہ کی سیاسی علمی تاریخ۔ مصنفہ مفتی ولی اللہ فرخ آبادی ص۳۷۷ (۲) میر شاہ حسین حقیقت) مطبوعہ معارف نمبر ۱ جلد ۲-۱، ماہ جولائی ۱۹۶۸ء ص۵۷ (۳) میر شاہ حسین حقیقت از ڈاکٹر لطیف حسین ادیب مطبوعہ معارف اعظم گڑھ ص۵۷ (۴) تذکرہ ہندی ص۸۶۔

حقیقت کا سلسلۂ معاش

حقیقت لکھنؤ میں اس عمر کو پہنچے کہ جب فکرِ معاش دامنگیر ہوتی ہے۔ تذکرہ مصحفی میں لکھا ہے کہ پہلے وہ ترک سواروں میں ملازم ہوئے اس کا مطلب یہ ہے کہ اس زمانے کے شرفا کی روایت کے مطابق وہ فن سپہ گری میں بھی کامل تھے۔ قدرت اللہ قاسم کا بیان ہے کہ حقیقت معلمی کرکے بسر اوقات کیا کرتے تھے۔ صاحب[۲] تاریخ فرخ آباد کے بیان کے مطابق اول ترک سواروں میں ملازم ہوئے اور جب یہ رسالہ برخواست ہوا تو جرأت کی سفارش پر امام بخش خاں کشمیری کے بچوں کی تعلیم پر ملازم ہو گئے۔ اس سے قدرت اللہ قاسم کے اس بیان کی بھی تائید ہوتی ہے کہ وہ معلمی کرکے گزر بسر کیا کرتے تھے۔

حقیقت سبزی منڈی لکھنؤ میں بھی کسی خدمت پر مامور تھے۔ چنانچہ ان کی ایک رباعی سے اس پر روشنی پڑتی ہے۔

کس منہ سے ادائے شکر ہم حق کا کریں
بندہ پرور نہ کیونکر پھر اس کو کہیں
یعنی ہم تھے جو عاشق سبز رنگ
خدمت بھی ملی تو سبزی منڈی کی ہمیں[۳]

مصحفی کا الزام

مصحفی کی روایت کے مطابق ترک سواروں کا رسالہ برہم ہو جانے کے بعد حقیقت کی ملازمت بھی ختم ہو گئی تھی۔ اتفاق سے اسی زمانے میں امام بخش خاں کشمیری کو جو کہ پڑھا لکھا نہیں تھا ایک تذکرۂ شعرا مرتب کرنے کا

۱۔ مجموعہ نغز ص ۲۱۹ مرتبہ حافظ محمود شیرانی لکچرار پنجاب یونیورسٹی لاہور مطبوعہ ۱۹۴۳ (۲) مفتی دلی اللہ فرخ آبادی مترجمہ حکیم شریف الزماں شریف اکبر آبادی مطبوعہ آل پاکستان ایجوکیشنل کانفرنس کراچی ص ۲۷۸ (۳) دیوانِ حقیقت از افسر امروہوی مطبوعہ قومی زبان کراچی ص ۱۵ فروری ۱۹۶۳ء

خیال آیا۔ اور اس کو کسی ایسے شخص کی تلاش ہوئی جو بچوں کو تعلیم دینے کے ساتھ ساتھ اس کا تذکرہ بھی لکھ دے۔ جرات کی سفارش پر حقیقت، جو اس وقت بے روزگار تھے۔ امام بخش کشمیری کے منشی مقرر ہوگئے۔ امام بخش کشمیری نے مصحفی سے، ان کا تذکرہ ہندی عارتیاً مانگا اور اس میں شعرائے دہلی کے حالات حقیقت سے نقل کرا لئے۔

جب مصحفی نے اپنے ایک ملنے والے کے ذریعے امام بخش کشمیری کے تذکرے کا جزو اول دیکھا اور اس میں آفتاب اور آصف تخلص پایا تو وہ جرات، امام بخش کشمیری اور شاہ حسین حقیقت پر برہم ہوئے۔ اس برہمی کے سبب ان کی ہجو لکھنا چاہتے تھے مگر جب تذکرے کو بہ نظر غور دیکھا اور اس کو غیر معیاری اور پست اشعار سے بھرا ہوا پایا تو ارادہ ترک کر دیا۔ اور نظامی کے ایک شعر[1] اپنا ایک قطعہ لکھنے پر اکتفا کیا۔

چنانچہ مصحفی لکھتے ہیں

"تخلّص آفتاب و آصف بطور تذکرۂ من در و نوشتہ است۔ بسیار برہم شدم و تفحص احوال کردم، مشار الیہ حقیقت تذکرہ نویسانیدن امام بخش خاں بگوش من رسانید اگرچہ مراد بلوی النظر از حرکت ایں اصحاب ثلاثہ آزردگی کمال بہمرسیدہ بود۔ قریب بود کہ ہجو از من سرزند اما چوں بعبارت پوچ و غلطی احوال و اشعار شعرا کہ در آں جریدہ سمت تحریر یافتہ نگاہ کردم آسودہ شدم و در گزشتم و بر ہمیں قطع طبع زاد و یک بیت مولانا نظامی اکتفا کردم۔" قطعہ

جانتے ہیں سب کہ اک مدت سے یہاں
مصحفی کے تذکرے کا شور ہے

تذکرہ یہ جو حقیقت نے لکھا
بے حقیقت مصحفی کا چور ہے

۱:۔ تذکرہ ہندی از مصحفی ص ۸۶۔

شعر:۔ اگر بہ فردزی چومہ صد چراغ
زخورشید باشد برو نام داغ!

مصحفی امام بخش کشمیری کے ساتھ جرأت اور حقیقت کو مجرم سمجھتے ہیں یہ درست نہیں ہے جرات و حقیقت کو اس سلسلے میں مورد الزام نہیں ٹھہرایا جاسکتا۔ حقیقت کی حیثیت ایک منشی کی سی تھی اور چونکہ وہ منشی گری اور معلمی کی خدمت پر مامور تھے۔ لہذا، امام بخش خاں کشمیری نے جو مسودہ انھیں نقل کرنے کو دیا ہوگا۔ انھوں نے اس کی نقل کر دی ہوگی۔ ڈاکٹر لطیف حسین ادیب لکھتے ہیں "اصل میں مصحفی کا دل جرأت کی طرف سے صاف نہیں تھا۔ (چنانچہ اس سلسلہ میں وہ مصحفی کے تذکرے میں سے وہ فقرہ نقل کرتے ہیں جس سے مصحفی کے دلی عناد کا پتہ چلتا ہے:" کور حوصلی کہ بمسری من میرود در باطن ہمیشہ تخم کینہ می کارد" (تذکرہ ہندی ص ۸۶) امام بخش کاشمیری اور جرأت کا تو مصحفی کچھ بگاڑ نہ سکتے تھے۔ حقیقت ایک تو ابھی نوجوان تھے۔ اور ادبی حلقوں میں ان کی حیثیت زیادہ مستحکم نہیں تھی۔ لہذا مصحفی نے استاد کا غصہ شاگرد پر نکالا۔" اس سرقے کے الزام کو رد کرتے ہوئے۔ ڈاکٹر اذیب مزید لکھتے ہیں"۔ حقیقت تعلیم و تربیت کی اعلیٰ روایات کے حامل تھے۔ ان پر سرقے کا الزام بے بنیاد ہے۔ اس وقت ان کی عمر چودہ پندرہ برس کی تھی۔ یہ عمر کم سے کم تذکرہ شعرا مرتب کرنے کی نہیں ہوتی۔ ان کی سب سے پہلی کتاب صنم کدۂ چین ۱۲۰۹ھ بمطابق ۱۷۹۴ء میں ضبط تحریر میں آئی جب کہ ان کی عمر بائیس برس کی تھی۔ امام بخش خاں کشمیری سے بھی ایک تذکرہ شعرا مسمی تذکرہ امام بخش کشمیری منسوب ہے۔ جو نزاعی تذکرہ ہو سکتا ہے اس لئے یہ رائے بھی کہ حقیقت کا "تذکرہ ماجبا" مصحفی کے خام مسودہ سے تیار کیا گیا اور جس کی بنیاد پر مصحفی نے حقیقت کو چور کہا صحیح نہیں معلوم ہوتی[2]۔

۱:۔ میر شاہ حسین حقیقت مطبوعہ رسالہ معارف اعظم گڑھ جلد ۲-۱ مطبوعہ ماہ جولائی ۱۹۶۸ء ص ۵۹
۲:۔ میر شاہ حسین حقیقت " " " " "

قیام کلکتہ و مدراس

لکھنؤ میں حقیقت کو اتنی آسودگی بھی میسّر نہ آسکی کہ وہ سفید پوشی کا بھرم رکھ سکتے لہٰذا مالی دشواریوں کے سبب، انھیں لکھنؤ کی سکونت ترک کرنی پڑی تاکہ کسی دوسری جگہ جاکر قسمت آزمائی کر سکیں۔

حقیقت بقول خود[۲] لکھنؤ سے کلکتہ پہنچے اور ریذیڈنٹ کے دفتر میں بہ عہدۂ میسر منشی ان کا تقرر ہوگیا۔ کلکتہ کے بعد وہ چینا پٹن (مدارس) میں بھی اس عہدے پر فائز رہے۔ چنانچہ تذکرہ خوش معرکہ زیبا کا مصنف لکھتا ہے "القصہ سید سابق الذکر (یعنی حقیقت) سرکار نواب چیناپٹن مندراس (مدارس) میں عہدہ منشی گری میں نوکر رہے اور وہیں وفات پائی[۳]۔"

محسن لکھنوی تذکرہ سراپا سخن میں اپنے والد میر شاہ حسین حقیقت کے بارے میں لکھتے ہیں "چیناپٹن مندراس (مدارس) میں ہمراہ کٹ صاحب بہادر کے میر منشی ہو کر گئے تھے[۴]۔ لیکن صحیح نام کٹ نہیں بلکہ کڈ ہے اور وہ کرنل کے عہدے پر فائز تھا۔ پروفیسر اقتدا حسن کٹ اور کڈ کی صراحت اپنے مضمون میں کرتے ہوئے لکھتے ہیں: "میجر جنرل شاہد حامد صاحب کے پاس جو خاندانی دستاویزات ہیں ان میں آگرہ کالج کے پروفیسر ٹامسن کا ایک خط محررہ یکم ستمبر ۱۸۹۳ بھی ہے اس میں لکھا ہے کہ شاہ حسین کرنل کڈ (COL KYDD) کے ہمراہ میر منشی کی حیثیت سے چیناپٹن (مدارس) گئے تھے۔ وہیں ان کا انتقال ہوا۔ محسن نے کڈ کو کٹ سمجھا ہے۔"

راقم الحروف نے بھی میجر جنرل سید شاہد حامد صاحب کی خاندانی دستاویزات میں شامل یہ خط دیکھا ہے۔ اس میں لفظ کڈ ہی تحریر ہے۔

لکھنؤ سے باہر نکل کر حقیقت نے کن کن شہروں میں کتنی مدت تک قیام کیا تھا اس سلسلے میں کافی الجھاؤ ہے۔ ڈاکٹر لطیف حسین ادیب لکھتے ہیں۔

۱۔ صنم کدہ چین ص ۳۲ (۲) تذکرہ خوش معرکہ زیبا جلد اول مرتبہ شفق خواجہ ص ۲۷۲ مطبوعہ مجلس ترقی ادب لاہور (۳) سراپا سخن ص ۱۵۵ (۴) مطبوعہ صحیفہ بابت ماہ جنوری ۱۹۶۸

"حقیقت ۱۲۲۰ھ بمطابق ۱۸۱۰ء میں کرناٹک میں تھے۔اس وقت تک وہ بہت پریشان تھے اور انھوں نے تلاش معاش کی خاطر متعدد سفر کئے تھے۔انھوں نے اپنی پریشانیوں کا ذکر مثنوی ہشت گلزار میں کیا۔"

حقیقت مدارس سے بہ سلسلہ تلاش معاش کرناٹک گئے۔یہاں تذکرہ نویسوں کے اس بیان میں تضاد ملتا ہے کیونکہ مذکورہ حوالہ جات میں یہ بیان ہوا ہے کہ حقیقت کا انتقال چینا پٹن میں ہوا جہاں وہ عہدہ منشی گری پر فائز تھے۔یعنی انتقال کے وقت تک وہ برسر کار تھے اور اسی خدمت پر مامور تھے۔پھر انھوں نے کرناٹک کا سفر کیوں اختیار کیا تھا؟ یہ معاملات تحقیق طلب ہیں۔لیکن اس سلسلے میں ضروری مواد نہیں ملتا۔ان کی مثنوی ہشت گلزار سے ان کی مالی پریشانیوں کا پتہ چلتا ہے۔نیز یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ وہ نواب کرناٹک کی سرکار سے بھی وابستہ ہو گئے تھے۔مثنوی ہشت گلزار کے آغاز میں حقیقت نے عبدالقادر خاں بہادر ثابت جنگ ابن نواب والاجاہ مرحوم (نواب کرناٹک) کی مدح میں اشعار لکھے ہیں۔ان اشعار میں انھوں نے اپنی غربت، دربدری اور عسرت و تنگدستی کا گلہ کیا ہے ؎

یعنی میں مبتلائے درد و الم — چھوڑ اپنے وطن کو اے ہمدم
دہشت پیما ہوا اور کوہ نورد — دیکھی دنیا کی خوب گرم و سرد
پورب آیا کبھی گیا پچھم! — نہ گیا لیک دل کا درد و غم
گاہ اتر پھرا گہے دکھن!! — پر کرم کے گئے نہ بد لچھن!
دیکھا پھر آ کے ملک کرناٹک — کہتے دکھن کا ہیں جسے پھاٹک
گرچہ سب کچھ وہاں مہیا ہے — سیم کا اور نہ زر کا توڑا ہے!

۱۔ میر شاہ حسین حقیقت مطبوعہ معارف اعظم گڑھ ماہ جولائی ۱۹۶۸ء ص ۶۰

ایک شب گفتگو یہ دل سے تھی — لائی قسمت مجھے کہاں میری
یاں کسی سے نہیں شناسائی — یاں نہیں کوئی غیر تنہائی
کیا کروں جاؤں کس طرف کو نکل — دل کو بہلاؤں میں کہاں بیکل
گھر سے جانا کہیں نہ آنا ہے — خانہ کیا ہے کہ قید خانہ ہے
کب تلک کوہ اور بن دیکھوں — جلد پھر جا کے میں وطن دیکھوں[1]

حقیقت نے مثنوی ہشت گلزار اپنے کرناٹک کے زمانہ قیام میں لکھی تھی۔

حقیقت کے بیان کے مطابق انھوں نے امیر خسرو کی مثنوی ہشت بہشت کا آزاد منظوم اردو ترجمہ تین ماہ میں مکمل کر لیا تھا۔ مثنوی کی تاریخ اختتام ۱۱ ربیع الاول ۱۲۲۵ھ بمطابق ۱۱-۱۸۱۰ء ہے اس زمانے میں حقیقت کرناٹک میں تھے اور گردش روزگار نے انھیں فراغت اور آسودگی میسر نہیں آنے دی تھی۔

ڈاکٹر لطیف حسین ادیب نے حقیقت کی زندگی کے ان دس برسوں (۱۸۰۱ء تا ۱۸۱۰ء) اور ان میں سپرد قلم کی جانے والی تخلیقات کا جائزہ لیتے ہوئے لکھا ہے۔ "خزینۃ الامثال ۱۸۰۱ء اور مثنوی ہشت گلزار ۱۸۱۰ء کے درمیان حقیقت کی کوئی تصنیف نہیں ملتی۔ یہ بھی معلوم ہوا کہ سفر دکن سے پہلے (۱۸۱۰ء) حقیقت کی تصنیفات نثر میں تھیں۔ اس لئے ۱۸۰۱ء اور ۱۸۱۰ کے درمیانی زمانے میں انھوں نے ضرور کوئی کتاب لکھی ہوگی میری دانست میں وہ کتاب تذکرۂ احبا تھی[2]۔"

ممکن ہے تذکرۂ احبا بھی انہی دس برسوں کے درمیان لکھا گیا ہو۔ لیکن پروفیسر ٹامسن کے مکتوب محررہ یکم ستمبر ۱۸۹۳ء سے اس بات کا پتہ چلتا ہے کہ حقیقت نے امیر خسرو کی مثنوی

۱: مثنوی ہشت گلزار ص ۴ مطبوعہ مطبع مجتبائی لکھنؤ۔ (۲) میر شاہ حسین حقیقت رسالہ معارف اعظم گڑھ ماہ جولائی ۱۹۶۸ء ص ۱۲۳۔

ہشت بہشت کو پہلے نثر میں ترجمہ کیا تھا۔ ڈاکٹر مقتدا حسن بھی پروفیسر ٹامسن کے محولہ بالا خط کے مطالعہ کے بعد اس نتیجہ پر ہیں۔ مکتوب محولہ بالا میں پروفیسر موصوف لکھتے ہیں:" حقیقت نے چارل پیرون (CHARLES PERRON) کی فرمائش پر اس مثنوی کو اردو نثر کا جامہ پہنایا تھا (پیرون سندھیا کی ملازمت میں تھا اور جنرل پیرون کے نام سے مشہور رہے) یہ ترجمہ ۱۸۰۰ء بمطابق ۱۲۱۱ھ میں کیا گیا تھا[1]۔"

اس سے یہ پتہ چلتا ہے کہ اس عرصے میں حقیقت نے تذکرۂ اجنّا کے علاوہ امیر خسرو کی مثنوی ہشت بہشت کا فارسی نثر میں ترجمہ کیا تھا۔ یہ ترجمہ کہیں دستیاب نہیں ہے نہ ہی یہ وثوق سے کہا جا سکتا ہے کہ وہ طبع بھی ہوا تھا یا قلمی صورت میں رہا۔ حقیقت نے اس مثنوی کو کرناٹک میں ہی لکھا اور تین ماہ کی مختصر سی مدت میں لکھا۔ اس کا بھی امکان ہے کہ حقیقت تھوڑے عرصے کے لئے کرناٹک گئے ہوں اور ان کی ملازمت مدراس میں ہی باقی رہی ہو۔

حقیقت کی تاریخ پیدائش کے اعتبار سے ۱۸۱۰ء میں کرناٹک کے قیام کے دوران ان کی عمر چالیس برس کے لگ بھگ تھی۔ اس وقت بھی وہ کرنل کڈ سے متعلق تھے اور آخر عمر تک میر منشی کے عہدے پر مدارس میں ہی فائز رہے ممکن ہے انھوں نے شاعرانہ اقتاد مزاج کے پیش نظر اپنی عسرت اور گوناگوں مصائب کا ذکر کیا ہو۔ کیونکہ شخصی حکومت میں شاعر اس بات کا بھی خیال رکھتا تھا کہ وہ اپنے ممدوح کا ذکر کرتے ہوئے یہ بتائے کہ ان کے در دولت سے وابستہ ہونے سے قبل شاعر عسرت اور پریشانی میں زندگی گزار رہا تھا۔ مثنوی ہشت گلزار کے مطالعہ سے پتہ چلتا ہے کہ اس زمانہ میں حقیقت کو جسمانی عوارض بھی لاحق تھے۔

۱۔ پروفیسر ٹامسن کے خط کا عکس کتاب میں دیا جا رہا ہے۔

تھا پریشان اگرچہ دل میرا — لفظ و معنی کو کر جمع یک جا
اک تو تھا میں اسیر دام مرض — مجھکو انواع کے مرض تھے غرض
درد سر، سرقہ اور نفث الدم — نزلے سے ناک میں تھا پہنچا دم
تپ، بواسیر اور درد مراق — ان کے ہاتھوں سے بھی تھا جینا شاق
دمل و گلہ اور خارش و داد — کر رہے تھے جدے ہی یہ بیداد
اس سوا اور تھے بہت آلام! — لوں میں کس کس کا تیرے آگے نام
لاحق افکار دنیوی تس پر! — ان میں پھر فکر شعر کیوں کر ہو
تیرے روزگار کا عالم — تھا نہ کچھ اختیار کا عالم!
فرصت اس کے سبب نہ تھی دم بھر — دم بھی لے سکتا تھا نہ میں ضطر[1]

کرناٹک کے قیام کے دوران ہی بعض شعرا نے ان کی شاگردی اختیار کی ان کے تلامذہ میں سے نواب حشمت جنگ اور سید ابوالحسن حیرت نامور ہوئے۔

کرناٹک سے حقیقت واپس مدراس گئے۔ خزینۃ الامثال میں لکھا ہے۔ "ہمیشہ بہ عہدہ میر منشی ریاست مدراس سرفراز رہے اور ایسے کام ان سے نمایاں ظاہر ہوئے کہ آج تک اولاد ان کی سرکار سے تنخواہ پاتی ہے[2]۔

محسن کے تذکرہ سراپا سخن یا کسی دوسرے تذکرے سے یہ معلوم نہیں ہوتا کہ مدراس و کرناٹک جانے کے بعد حقیقت دوبارہ لکھنؤ آئے تھے یا نہیں۔ لیکن ان کے کلام کی بعض داخلی شہادتیں ایسی ملتی ہیں کہ جن سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ مدراس سے دوبارہ لکھنؤ آئے تھے۔ لیکن

۱:۔ اقتباس از ہشت گلزار مصنفہ میر شاہ حسین حقیقت (۲) دیوانِ حقیقت افسر امروہوی قومی زبان ص۱۶ یکم فروری ۱۹۶۳
(۳) خزینۃ الامثال از میر شاہ حسین حقیقت ص۲۔

لکھنؤ انھیں پسند نہ آیا۔ حقیقت کے زمانے میں لکھنؤ علم و فضل کا گہوارہ اور ادبا و شعرا کا مرکز اور تہذیبی شہر تھا۔ چنانچہ ایسے شہر کا پسند نہ آنا سمجھ میں نہیں آتا۔ غالباً اس کا بنیادی سبب یہ ہوگا کہ لکھنؤ میں انھیں وسائل معاش بہم نہ تھے۔

تفسیر ہیرامن طوطا سے بھی معلوم ہوتا ہے کہ وہ مدراس سے لکھنؤ آئے تھے۔

دیکھا پھر آ کے لکھنؤ جس آں کہتے ہیں ہند کی جسے سب جاں

ڈاکٹر لطیف حسین ادیب لکھتے ہیں۔" بگڑ (حقیقت) مایوس ہو کر لوٹ گئے انھیں لکھنؤ کے حالات پسند نہیں آئے[1]۔ ہمارے خیال میں ڈاکٹر صاحب موصوف کا اشارہ بھی لکھنؤ کے معاشی حالات کی جانب ہے۔

حقیقت کی بعض تصانیف اور ان کی خاندانی دستاویزات اور تذکروں کے مطابق (سراپا سخن بزم سخن صفحہ ۴۲۔ خوش معرکہ زیبا، مجموعہ نغز صفحہ ۲۱۹ تذکرہ ہندی صفحہ ۸۶) ان کا استقال مدراس میں ہوا۔ اور وہیں کی خاک میں آسودہ ہوئے[2]۔

سالِ وفات

حقیقت کے سالِ وفات کے بارے میں تذکرہ نویسوں میں اختلاف پایا جاتا ہے۔ شفیقہ نے گلشن بے خار صفحہ ۶۱ میں لکھا ہے کہ حقیقت ۱۲۶۰ھ میں فوت ہوئے۔ صنم کدۂ چین کے دیباچہ نویس کے مطابق ان کا سالِ وفات ۱۲۴۹ھ ہے[3]۔ ڈاکٹر لطیف حسین ادیب حقیقت کے سالِ وفات کا تعین کرتے ہوئے اپنے مضمون میں لکھتے ہیں۔" ہمارے خیال میں ان کی وفات ۱۲۴۹ھ مطابق ۱۸۲۳، ۱۸۲۴ میں ہوئی کیونکہ مالک مطبع محمدی (جس میں صنم کدۂ چین چھپی تھی) کا حقیقت سے بوجہ ہم وطن شفیقہ کے مقابلے میں زیادہ قریب کا تعلق ہے لہذا اس کی مطبوعہ کتاب کا بیان زیادہ معتبر ہے[4]۔

۱: میر شاہ حسین حقیقت مطبوعہ رسالہ معارف اعظم گڑھ ماہ جولائی ۱۹۶۸ء صفحہ ۶۲ (۲) محسن لکھنوی سراپا سخن بزم سخن سید حسن علیخاں سعادت خاں ناصر لکھنوی، قدرت اللہ قاسم (۲) صفحہ ۳۲ (۴) میر شاہ حسین حقیقت رسالہ معارف اعظم گڑھ جولائی ۱۹۶۰ء صفحہ ۶۲

ہمارے خیال میں ڈاکٹر صاحب کی رائے قابلِ قبول ہے۔

سعادت خاں ناصر نے بھی اپنے تذکرۂ خوش معرکہ زیبا[1] میں بھی ان کا سالِ وفات ۱۲۴۹ھ (۱۸۲۳-۱۸۳۴) ہی لکھا ہے۔ یہ بھی ایک اہم عصری شہادت ہے۔

۱:۔ تذکرہ خوش معرکہ زیبا از سعادت خاں ناصر مرتبہ مشفق خواجہ مطبوعہ مجلس ترقی ادب لاہور ص ۲۷۲

حقیقت کے فنی کارنامے

جذب عشق

جذبِ عشق شاہ حسین حقیقت کی تصنیف ہے۔ یہ داستان شمالی ہند میں فورٹ ولیم کالج کے مصنفین کی نثری تصانیف سے قبل تحریر کی جانے والی نثر میں امتیازی حیثیت رکھتی ہے۔

جذب عشق کا سال تصنیف ۱۲۱۲ھ ۹۸-۱۷۹۷ء ہے۔ اس کا مادۂ تاریخ "ہے یہ جذب عشق آہ" ہے۔ جس سے ۱۲۱۲ھ برآمد ہوتا ہے۔ پروفیسر لطیف حسین ادیب لکھتے ہیں۔"

جذب عشق طباعت سے محروم رہی اس کا قلمی نسخہ سید مسعود حسن رضوی ادیب (دین دیال روڈ لکھنؤ) کے کتب خانے میں محفوظ ہے[1]۔"

اسی طرح ڈاکٹر گیان چند لکھتے ہیں۔" جرات کے شاگرد شاہ حسین حقیقت بریلوی نے ایک داستان جذبِ عشق لکھی اس کا مخلوط مسعود حسن رضوی صاحب کے کتب خانے میں ہے[2]۔"

ڈاکٹر نیر مسعود رضوی نے اپنی تالیف "رجب علی بیگ سرور" میں بھی اس مخطوطے کا ذکر کیا ہے۔ جو ان کے والد کے کتب خانے میں موجود ہے[3]۔

لیکن یہ کتاب شائع ہو چکی ہے۔ مطبوعہ نسخہ انجمن ترقی اردو کے کتب خانے میں موجود ہے۔ مطبوعہ

۱۔ میر شاہ حسین حقیقت مطبوعہ رسالہ معارف نمبر ۲ جلد ۲-۱ ص ۱۳۸ اگست ۱۹۶۸ء (۲) اردو کی نثری داستانیں از ڈاکٹر گیان چند مطبوعہ انجمن ترقی اردو ص ۱۵۹ (۳) رجب علی بیگ سرور از ڈاکٹر نیر مسعود رضوی

نسخے کے صفحۂ اول کے مطابق یہ ۱۲۶۹ھ میں ۲۵ رجب المرجب کو بروز پنج شنبہ مطبع محمدی میں شیخ نوازش علی کے اہتمام سے شائع ہوئی تھی۔

جذب عشق نثری داستان ہے جس کو کثرت اشعار سے مزین کیا گیا ہے۔ یہ اشعار خود حقیقت، ان کے استاد جرأت، میر حسن دہلوی اور بعض دوسرے شعرا کے ہیں۔ اس داستان کی بنیادی خوبی یہ ہے کہ اس کا پلاٹ روایتی داستانوں کے برعکس حقیقت پر مبنی ہے۔ اس زمانے میں حقیقت نگاری کی اس کوشش کو ہم روش عام سے ہٹنے کی ایک مستحسن کوشش اور ایک انقلابی رویّے سے موسوم کر سکتے ہیں۔ حقیقت نے اپنے بڑے بھائی سید حسن شاہ ضبط کی فرمائش پر اس قصّے کو فارسی سے اردو میں منتقل کیا تھا۔ چنانچہ وہ لکھتے ہیں۔

"۱۲۰۴ھ نبوی میں در میان سمیری کے جو مضافات پرگنہ بندرابن سے متصل قصبہ چھاتا ہے واقع ہوا اور مفصلاً اخویصا حب دقبلہ جامع المعقول والمنقول حاوی الفروع والاصول حقائق و معارف آگاہ سید محمد حسن شاہ دام ظلہٗ جو لمعہ طور افاضت ادسکی سے چراغ دانش و فرہنگ کا روشن ہے اور شمۂ سحاب افادت سے ادسکی باغ فضل و ہنر کا سرسبز اور مزّین، اس قصّے کی معشوقہ کو برسانہ پیرایۂ الفاظ رنگین فارسی کی برہنت کر کے مجلس ظہور میں جلوہ افروز ناز کا کیا۔"

اب اگر کچھ خوبی رنگینی عبارت اور درست نشستنی فقرات اوس کتاب مستطاب سے لکھوں تو مقصد سے باز رہتا ہوں اور اوس پر بھی کما حقہ تعریف اور توصیف ادسکی کو کب پہنچتا ہوں الغرض یہ فقرۂ ناقص کٹی جو طبع نارسا اس ہیچدان سے سرزد ہوئے ہیں فقط فیض تعلیمات امن حضرت کا ہے وگرنہ مجھ پست لیاقت عاجز بیان میں یہ قدرت اور استعداد کہاں تھی جو ساتھ اوعائے تالیف کتاب کے حضور سرفرازوں ( ) سخن کی گردن بلند کرتا ایک روز کمال سرفرازی اور مہر سے جو بزرگوں کو خوردوں کے حال پر ہمیشہ مبذول ہے اس کمترین عقیدت گزیں کو زبان معجز بیان سے

فرمایا کہ چہرہ معشوقہ زیبا نگار اس مضمون عبرت مشحون کو ساتھ حلیہ اور زیورِ عبارت نثر زبان اردو کی آراستہ کر کے تحفہ مجلس احباب کا کرے سو بنا بر فرمان واجب الاذعان اور عین انفاس متبرک ..... سے جناب کی مصرع

دُر فکر سے گوندھ لڑیاں کئی

ساتھ عبارت سلیس رنگین اور دلچسپ کے ترتیب دے کے سات جذبِ عشق کے موسوم کیا یہ (ص ۳)[1]

پروفیسر لطیف حسین لکھتے ہیں۔

"حقیقت کے بڑے بھائی سید محمد حسن شاہ ضبط نے فارسی زبان میں ایک کہانی ۱۲۰۴ھ (۱۷۹۰ء) میں لکھی تھی۔ حقیقت نے محمد حسن شاہ کے ارشاد کے مطابق اس کہانی کو ۱۲۱۲ھ (۱۷۹۷ء) میں اردو میں منتقل کیا۔"[2]

حقیقت کے بیان سے معلوم ہوتا ہے کہ شاہ حسن ضبط نے فارسی میں ایک قصہ لکھا تھا جس کو حقیقت نے اردو میں منتقل کیا۔ یہاں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ شاہ حسن ضبط کا وہ کونسا فارسی قصہ تھا جس کو حقیقت نے اردو میں منتقل کیا؟ شاہ حسن ضبط کا صرف ایک ناول نشتر موجود ہے یہ ناول بھی فارسی میں لکھا گیا تھا۔ لیکن جذب عشق اور اس ناول کے پلاٹ بالکل مختلف ہیں۔

شاہ حسن ضبط نے نشتر کے علاوہ اور بھی کچھ لکھا ہوگا یا کم از کم وہ داستان تو ضرور لکھی ہوگی جس کا اردو ترجمہ جذب عشق ہے لیکن ضبط کی دوسری کوئی تصنیف شائع نہ ہو سکی۔ ممکن ہے کہ ان کی کوئی تصنیف قلمی نسخے کی صورت میں کہیں موجود ہو۔ ضبط کے ناول نشتر کا موضوع جذبِ

۱:۔ جذبِ عشق مطبوعہ مطبع محمدی کانپور ۲۵ رجب ۱۲۶۹ھ ص ۴۰۲ (۲) میر شاہ حسین حقیقت مطبوعہ رسالہ معارف اعظم گڑھ۔ قسط دوم اگست ۱۹۶۸ء ص ۱۳۶۔

عشق کی طرح عشقیہ ہے لیکن اس کے باوجود دونوں کے قصے مختلف ہیں۔

جذبِ عشق کی کہانی

مرہٹوں کے لشکر میں ایک جوان رعنا تھا۔ یہ اپنی خوبصورتی میں بے مثال، اور انگریزوں کا رفیقِ کار تھا۔ حسن کی دولت سے مالا مال ہونے کے باوجود یار و دیار کی جدائی کے سبب اور ناجنس لوگوں کی صحبت میں رہنے کی وجہ سے ہر دم رنجیدہ رہا کرتا تھا۔ اس نوجوان کا طریقہ یہ تھا کہ جس جگہ لشکر پڑاؤ کرتا وہ اپنے افسران سے رخصت لے کر اس علاقے کی سیر کیا کرتا۔ جب وہ اپنے لشکر کے ہمراہ بندرابن سے کوچ کر کے قصبہ جھانا کے قریب آیا۔ تو اسے ۲۹ جمادی الثانی کو سمیری کے باغ میں ہونے والے بھوانی میلے کی خبر ملی۔ میلے کی خبر پاکر اس نے اپنے سرداروں سے دوپہر کی رخصت لی اور چند رفیقوں کو ہمراہ لے کر جو اس علاقے سے واقف تھے تیز رفتار گھوڑے پر سوار ہو کر منزلِ مقصود کو روانہ ہوا۔ سمیری گاؤں کے بیچ میں پہنچکر اس نے ایک قطعۂ رشک فردوس بریں دیکھا۔ گلی کوچوں کی سیر کرنے کے بعد وہ نوجوان بھوانی باغ میں پہنچا جو اپنی خوبصورتی میں لاجواب تھا۔ اس باغ میں سیر کرتا ہوا وہ تالاب کے کنارے پہنچا جہاں بھوانی کا ایک دیہرہ نصب تھا چاردیواری کے چاروں جانب عورتیں اور مرد خوبصورت لباسوں میں عمارات اور سیر و تفریح میں مصروف تھے اس باغ میں گھومتے ہوئے اس جوان نے ایک درخت کے نیچے چار عورتوں کو بیٹھا ہوا دیکھا۔ یوں تو ان چاروں میں سے ہر ایک بے حد حسین تھی۔ لیکن دو عورتیں تو خاص طور پر حسن میں بے مثال تھیں یہ دونوں غالباً خواہر حقیقی تھیں۔ یہ جوان رعنا ان میں سے ایک کی نگاہ کا گھائل ہوگیا اور ایک جگہ حیران و ششدر کھڑا ہو کر ان کو دیکھنے لگا۔ ادھر وہ رشک ماہ بھی اس کی خوبصورتی کو دیکھکر دل دے بیٹھی۔ دونوں کے درمیان ایک ایک دو باتیں کنایہ آمیز ہوئیں۔

اتنے میں ناگاہ ایک جوگی جو یادِ حق میں برہنہ بنا ہوا تھا۔ سر پر بھبوت ملے، لٹیں چھوڑے

اکتارہ بجاتا ہوا اس طرف آنکلا جدھر وہ جوان رعنا کھڑا ہوا تھا اس جوگی کے اردگرد ایک ہجوم جمع ہوگیا اس جوان نے بھی کچھ رقم بطور نذر کے اس جوگی کو دی۔ یہاں سے جوگی ان چاروں عورتوں کے پاس پہنچا ان چاروں میں سے اس نازنین نے جو اپنا دل اس اجنبی جوان پہ قربان کر چکی تھی اس جوگی کو کچھ زر نقد اور چار تباشے دیئے اور اشارے سے ان تباشوں کو اس جوان کو دینے کے لئے کہا۔ ان چار تباشوں میں سے ایک ٹوٹا ہوا اور باقی تین ثابت تھے۔ اس جوگی نے اس نوجوان کو یہ بھی بتایا کہ تباشے کس کی طرف سے بھیجے گئے ہیں اس نے ٹوٹا ہوا تباشہ تو کھالیا اور باقی تین تباشوں کو الگ باندھ لیا۔ اس اثنا میں ان چاروں کے عزیز آپہنچے اور انھیں گھر لے گئے وہ نازنین بھی چار و ناچار گھر کو روانہ ہوئی ادھر یہ جوان اس کا سراغ لگانے کے لئے اس کے پیچھے پیچھے روانہ ہوا۔

اپنے رفیقوں اور پیغامبر کے سبب عاشق نے محبوبہ سے اس کے گھر جاتے ہوئے راہ میں ملاقات کی، دونوں کے درمیان شرم و حجاب مانع رہا۔ آخرکش جب اس جوان نے واپس لشکر جانے کے ارادے کا اظہار کیا تو معشوقہ نے اپنی بے قراری اور حال دل سنایا۔ اس اثنا میں جب اس نازنین کا گھر نزدیک آیا تو اس نے راز و نیاز کرتے ہوئے ، رخصت کیا اور رات کے وقت آنے کی دعوت دی تاکہ وہ اس کے کلبہ احزاں کو اپنے نور قدم سے شب ماہ میں روشن کرے۔

یہ نوجوان ہر چند کہ غم والم کے سبب قدم اٹھانے کی ہمت نہ رکھتا تھا لشکر کو واپس لوٹا ادھر وہ نازنین بام پر کھڑی ہو کر اپنے عاشق کو جاتا ہوا دیکھنے لگی جب وہ نظر دل سے اوجھل ہوا تو یہ خاک پر بے ہوش ہو کر گری۔ اتنے میں ادھر سے ایک شخص کا گزر ہوا۔ اس شخص کے ہاتھوں اس نازنین کی تینوں سہیلیوں نے یہ پیغام بھجوایا کہ میلے میں ابھی تین دن ہیں لہذا کسی وقت وہاں آکر اپنے دیدار سے نظروں کو سکون بخشے ، وہ اجنبی شخص ، اس عاشق کی تلاش میں نکلا اور چاہا کہ

ایسی پری جمال نازنین کو یوں والہ و شیدا کرنے والے کو دیکھے چنانچہ اس نے لشکر میں جاکر پیغام پہنچایا۔ اس جوان نے بھی قاصد کے ہاتھ پیغام کہلوایا کہ بشرط زندگی ضرور آؤں گا۔ اگلے دن کے انتظار میں اس جوان رعنا نے وہ رات بے قراری میں کاٹی۔

ادھر وہ نازنین جب ہوش میں آئی تو دوبارہ پچھاڑ لگاکر گر پڑی۔ اس کی سہیلیوں نے گلاب چھڑکا اور جب وہ ہوش میں آئی تو اس پر لعنت ملامت کی۔ اور کہا کہ کوئی یوں کمبار گی عشق میں اپنی حالت ایسی بناتا ہے اگر تیرے عزیز و اقارب کو خبر لگ جائے تو کیا حال کریں لہذا بہتر ہے کہ اس خیال کو دل سے نکال دے۔ لیکن ان کی نصیحتوں کا اثر برعکس ہوتا تھا اور اس کی آتش دل اور فزوں ہوتی تھی۔ اپنی سہیلیوں کے جواب میں اس نے کہا کیا خبر کہ اس یار وفادار کا بھی میرے عشق میں ایسا ہی حال ہو۔ غرض تمام رات اس کی بھی بے چینی میں کٹی اور صبح کو افشائے راز کے ڈر سے اس نے خود کو دوسرے کاموں میں مصروف کیا اور جب چار گھڑی دن چڑھا تو اپنی تینوں سہیلیوں کو لے کر باغ میں پہنچی اور مقام مقررہ پر پہنچکر نرگس کی طرح چشم کھول کر عاشق کے دیدار کی آرزو میں بیٹھ گئی۔ تھوڑی دیر میں اسے اپنا محبوب آتا نظر آیا وہ آکر تھوڑے فاصلے پر بیٹھ گیا اور نظروں سے جذبات کا تبادلہ ہونے لگا۔ اتنے میں وہی جوگی پھر ادھر آنکلا اس جوان نے دو تینوں تباشے جوگی کو دیئے کہ جاکر اس نازنین کو دے دے اور باآواز بلند کہا کہ یہ تباشے ناپائیدار ہیں ان کو کب تک سنبھال کر رکھوں براہ کرم کوئی ایسی چیز عطا کریں کہ پائیدار ہو۔ وہ شیریں دہن یہ سن کر مسکرائی اور فقیر کو پاس بلاکر کہا کہ یہ تباشے اس ناچیز نے تحفتہً نہیں دیئے تھے بلکہ تین ثابت اور ایک شگفتہ تباشے سے مراد تھی کہ جوانی کا میلہ چار دن رہتا ہے جس میں سے ایک دن تو ختم ہوگیا اور بقیہ تین دن تھے اور ان تین تباشوں سے تین دنوں کی ملاقات مقصود تھی۔

فقیر کو وہ تباشے دوبارہ دے کر وہ خود پیپل کے درخت کے پاس گئی۔ پیپل کے اس درخت

کے نیچے بت رکھے ہوئے تھے یہاں پہنچ کر بظاہر تو وہ پوجا کے لئے بیٹھی اور تھوڑا سا اسپند آگ پر ڈالا اور آم کے ایک پتے کو توڑ کر اس کو سیندور سے سرخ کیا اور اپنے سینے پر لگایا۔ گویا اس طرح اس نے اپنا حال دل ظاہر کیا ادھر اس نوجوان نے جواباً حجام سے ایک آئینہ اور شانہ لے کر اس پری چہرہ کی طرف کیا۔ بیڑہ چبا کر اس کی پیک زمین پر ڈالی اور آئینہ، اس آئینہ رو کو دکھا کر حجام کے حوالے کیا۔ واپسی میں وہ جوان اس نازنین کو گھر تک چھوڑنے آیا۔ راہ میں ایک بڑھیا ان کے راز عشق سے آگاہ ہو گئی بڑھیا کے بیان کے سبب، اس نازنین کے اہل خانہ بھی اس راز سے آگاہ ہوئے اور انھوں نے بھوانی کے باغ میں اپنے جاسوس ان دونوں کی نگرانی کے لئے مقرر کر دیئے۔

تیسرے دن وہ جوان کسی وجہ سے باغ میں نہ آسکا اور اس نے اپنے قاصد کے ہاتھوں اپنی معذوری کا اظہار کیا۔ جس کے سنتے ہی اس نازنین کا حال بُرا ہو گیا۔ سہیلیاں گھر لے کر آئیں کسی نے جنون، کسی نے مکر کسی نے جادو یا آسیب وغیرہ بتایا۔ کسی نے علاج کے طور پر اس کو باغ میں لے جانے کا مشورہ دیا جس کو سن کر اس کے اضطراب میں کچھ کمی واقع ہوئی۔ لیکن باغ میں لے جانے کے باوجود اس کے اضطراب میں کوئی کمی نہ آئی اور اہل خانہ اسے واپس گھر لے آئے غرض وہ سارا دن اور ساری رات اس کی روتے ہوئے کٹی۔

اگلی صبح بیدار ہو کر پوجا کے بہانے سے وہ دوبارہ بھوانی باغ کو روانہ ہوئی۔ اس دن بھی عاشق سے ملاقات نہ ہوئی۔ لیکن پوجا سے فارغ ہونے کے بعد جب وہ گھر کو لوٹی تو راستے میں عاشق سے ملاقات ہوئی اس شوخ نازنین نے نہ آنے کا شکوہ کیا غرض دونوں کے درمیان گلے شکوے ہوئے اور اس جوان نے بھی کہا کہ دو شب اور ایک دن کی جدائی میں میری حالت تباہ ہو گئی ہے۔

اس نازنین نے اپنے عاشق کو ایک تالاب پر ملنے کی دعوت دی ٹھیک دوپہر کو وہ جوان

تالاب کے قریب پہنچ کر ایک درخت کے نیچے محبوب کا انتظار کرنے لگا۔ ادھر وہ نازنین بھی غسل کا بہانہ کرکے تالاب پر پہنچی۔ یہاں آکر خلق کا ہجوم دیکھا لیکن اس ہجوم کی پرواہ نہ کرتے ہوئے دلیرانہ اپنے محبوب کے پاس آئی اور اس کی بے وفائی کی شکایت کی۔ اور ملنے میں مطلق ننگ و نام کی پرواہ نہ کی کیونکہ عاشقوں کو بدنامی سے نام آوری ہے اس نازنین نے اپنے عاشق سے یوں کہا کہ تیری محبت کے سبب ایک زمانہ میرا مخالف ہوا ہے اور میرے وارث مجھ سے بدگمان ہو گئے ہیں۔ لہذا اے خدا ناترس اب جلد وصل سے سرفراز کر اگر میں تیرے فراق میں مر گئی تو قیامت میں اس خون ناحق کا کیا جواب دے گا۔ غرض ایسی باتیں کی کہ پتھر کا دل بھی تڑپ اٹھتا۔ اس عاشق نامراد نے جواب دیا

" اے نازنین! جو کچھ تو نے کہا درست ہے لیکن وصل میں اس قدر عجلت درست نہیں ہے اگر تقدیر سے تدبیر لڑ جائے تو تا ابد دولت ملاقات یکدیگر سے بہرہ مند ہوں گے" ابھی ان دونوں کے درمیان یہ باتیں ہو ہی رہی تھیں کہ اس نازنین کے وارث، جو پہلے ہی بدگمان تھے، اور جن کو بڑھیا تمام حال بتا چکی تھی، اس جوان کو قتل کرنے کے لئے تقریباً پچاس مسلح افراد کے ہمراہ آ پہنچے یہ حال دیکھکر اس جوان نے اپنی محبوبہ کو یہ کہہ کر رخصت کیا کہ اگر اس بلائے ناگہانی سے زندہ بچ گیا تو خیر ورنہ سمجھنا کہ تجھ پر سے صدقہ ہو گیا۔ ہر چند کہ اپنے محبوب کو اس حالت میں دیکھکر اس نازنین کے قدم نہ اٹھتے تھے لیکن مجبوراً وہ وہاں سے رخصت ہوئی۔ اس جوان نے ان مسلح حملہ آوروں کو آتے دیکھکر اپنی تلوار نیام سے نکالی اور گرج کر حملہ آور ہوا۔ وہ ہجوم اس کے حملے سے کائی کے مانند پھٹ گیا۔ اس جوان کی تلوار جس کے سر پر لگتی تھی۔ صابن سے گزرتے ہوئے تار کی مانند مخالف کو دو نیم کر دیتی تھی۔ اس کی بہادری اور شجاعت کو دیکھکر دوست دشمن، سب کے لبوں سے کلماتِ تحسین نکل رہے تھے ایک شخص نے عقب سے آکر ایک لٹھ اس کے سر پر مارنا چاہا جو اتفاق سے سر پر لگنے کے بجائے اس کی شمشیر پر پڑا اور تلوار ہاتھ سے چھوٹ

کر پرے جا گری۔ یہ حالت دیکھکر وہ جوان مایوس ہوکر ایک اجل رسیدہ سے لپٹ گیا اور اس کی تلوار چھین کر جہنم واصل کرنا چاہتا تھا کہ وہ خوف کے مارے تالاب میں کود گیا۔ اس جوان نے بھی شکار کے نکل جانے کو غیرت سے بعید جانتے ہوئے خود بھی اس کے تعاقب میں تالاب میں چھلانگ لگا دی لیکن اس کو تیرنا نہ آتا تھا۔ دشمن تو ہاتھ پاؤں مارتا ہوا تالاب سے باہر نکل آیا لیکن وہ جوان ڈوب گیا۔ وہ نازنین بھی تالاب میں کود جانا چاہتی تھی۔ لیکن غش کھاکر گر پڑی اس کے اقربا زبردستی اسے گھر لے گئے محبوب کے غم میں اس کی حالت بری تھی لیکن مصلحت کے تحت اس نے اپنے غم کو دبائے رکھا اور گھر آکر اپنی سہیلیوں اور عزیز اقارب کے ہمراہ شاداں و فرحاں پھرتی رہی۔ چار پانچ دن کے بعد سہیلیوں کے ہمراہ پوجا پاٹ کے لئے پھر باغ کی طرف جانے کو گھر سے نکلی اور اس تالاب کے کنارے پہنچی۔ تالاب پر اس وقت بھی مرد و زن کا ہجوم تھا۔ یہ بھی ان لوگوں کے درمیان جاکر کھڑی ہوگئی اور دفعتاً تالاب میں چھلانگ لگا دی۔ کھڑے ہوئے لوگوں میں ایک شور برپا ہوگیا۔ تھوڑی دیر کے بعد ان دونوں کی لاشیں سطح آب پر اس طرح تیرتی ہوئی نمودار ہوئیں کہ عاشق و معشوق دونوں ہم آغوش تھے جب دونوں لاشیں کنارے پر پہنچیں تو دام داروں نے لاشوں کو باہر نکالنا چاہا لیکن وہ اپنی اس کوشش میں کامیاب نہ ہوسکے اور دونوں لاشیں دوبارہ زیر آب چلی گئیں اور پھر کبھی کسی نے انھیں نہ دیکھا۔"

جذبِ عشق کا موضوع

جذبِ عشق کا موضوع روایتی عشقیہ داستان ہے اردو کے روایتی عشقیہ قصوں میں محبت کا آغاز، عاشق معشوق کی نگاہوں کے ٹکرانے سے ہوتا ہے۔ اور اکثر ان کا انجام المناک ہوتا ہے۔ اس قسم کے عشقیہ قصوں میں عاشق اور معشوق کا وصالِ زندگی میں نہیں دکھایا جاتا۔ چنانچہ اس روایت کو جذبِ عشق میں پیش نظر رکھا گیا ہے۔ اس کا انجام حزنیہ ہے۔ ناقابلِ یقین اور غیر فطری ہے یعنی

مرنے کے بعد عاشق و معشوق کی لاشوں کا ہم آغوشی کی حالت میں سطح آب پر ظاہر ہونا۔ اور بعد ازاں دوبارہ زیر آب چلے جانا۔ داستان کے آغاز میں اس کا اظہار کیا گیا ہے کہ یہ واقعات سچے ہیں لیکن اگر مصنف کے اس دعوے کو صحیح تسلیم کر لیا جائے تو بھی یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ کیا یہ انجام جو اکثر مثنویوں میں بیان ہوا ہے فیر فطری ہے؟

میسر کی مثنوی دریائے عشق میں بھی عاشق و معشوق کا انجام یہی دکھایا گیا ہے اور اس قصے میں بھی دونوں کی لاشیں سطح آب پر باہم دگر ہم آغوشی کی حالت میں نمایاں ہوتی ہیں۔ اصل میں ایسے قصوں میں قصہ نگار کا مقصد اس سچی محبت کو نمایاں کرنا اور عاشق و معشوق کے کردار دں کی نیک نیتی، پاکدامنی اور مخلصانہ محبت کا نقش اہلِ دنیا کے دل پر بٹھانا مقصود ہوتا ہے۔ اس کے علاوہ یہ بات تو مشاہدے میں ہے کہ ڈوبنے کے بعد لاش ایک دفعہ ضرور سطح آب پر آتی ہے چنانچہ اس کا امکان ہے کہ یہ دو لاشیں اتفاق سے ایک دوسرے کے ساتھ ملی ہوئی سطح آب پر نمایاں ہوئی ہیں۔ تاہم معمولی سا فوق فطرت عنصر اس داستان میں موجود تسلیم کرنا پڑتا ہے۔

اور ہم کہہ سکتے ہیں کہ جذبِ عشق میں فوق فطرت عنصر موجود ہے اور اس کی موجودگی میں کہانی کی اس خوبی میں کہ اس میں حقیقت بیان کی گئی ہے کوئی فرق نہیں پڑتا۔ شاہ حسین حقیقت نے ہیرا من طوطا یا مثنوی ہشت گلزار میں جو واقعات منظوم کئے ہیں ان میں فوق فطرت عنصر موجود ہے۔ مثنویات ہوں یا داستانیں ان میں فوق فطرت عنصر کی موجودگی لازمی سمجھی جاتی تھی۔ اگر اس زمانے کی روایت کو مدِ نظر رکھا جائے جس کے تحت داستانوں کی بنیادی شرط اور اس کی مقبولیت کا اہم سبب فوق فطرت عنصر ہی ہوتا تھا۔ تو سوال پیدا ہوتا ہے کہ کیا حقیقت نے شعوری طور پر اس داستان میں فوق فطرت عنصر سے گریز کرتے ہوئے حقیقت نگاری کو اختیار کیا تھا۔ اس دور کی داستانوں کو مدِ نظر رکھتے ہوئے حقیقت کی اس کوشش کو ہم داستانوں کی روایت میں ایک اہم موڑ

اور تبدیلی قرار دے سکتے ہیں ڈاکٹر لطیف حسین ادیب اس سلسلے میں لکھتے ہیں۔

"دراصل اس کی اہمیت دو وجوہ سے ہے۔ یہ مختصر کہانی اردو کی ضخیم داستانوں اور انیسویں صدی کے ناولوں کے درمیانی عہد کی ہے[1]۔"

ہمارے خیال میں بھی اس داستان کی بنیادی اہمیت یہی ہے اس داستان یا اس نوع کی دوسری منثور و منظوم داستانوں نے اردو ناول کے ابتدائی دور میں یقیناً اثر ڈالا ہے۔ لیکن اس کے باوجود ہم اسے ایک داستان ہی کہیں گے کہ جس میں حقیقت پسندی سے کام لیا گیا ہے۔ اس میں جو کردار ہیں، وہ ناولوں کی طرح معاشرتی الجھنوں" کی علامت تو نہیں ہیں لیکن اپنے آغاز و انجام اور نفس قصہ کے اعتبار سے اسے اردو ناول کے ابتدائی نقوش کہا جا سکتا ہے۔ ڈاکٹر لطیف حسین ادیب نے جذبِ عشق کا تجزیہ کرتے ہوئے اور انیسویں صدی کے ناولوں پر اس کے اثرات کے امکان کے سلسلے میں لکھا ہے: "اس کے کردار معاشرتی الجھنوں کی علامت نہیں ہیں۔ اس کا مقصد نہ اصلاح ہے اور نہ معاشرہ پر تنقید، اس طرح یہ کہانی ناول سے مختلف ہے اور صرف کہانی ہے ناول نہیں ہے۔ البتہ ایک نظری عشق، خفیہ ملاقاتیں، اعزہ کی مسلح یورش، وصل بعد موت اور خانگی زندگی کے مشرقی آداب، مجبوریاں اور جرأتیں جو اس مختصر کہانی میں ملتی ہیں انیسویں صدی کے اواخر میں لکھے ہوئے اردو ناولوں میں مشترک ہیں۔ انگریزی ناول نے نیا شعور بخشا، نئی بلندیاں اور نئی پستیاں دکھائیں مگر مشرقی تصور عشق اور خانگی زندگی کے آداب کو ابتدا میں نہیں بدلا۔ جذبِ عشق سے جو ہر کشید ہو کر انیسویں صدی کے ناولوں میں بغیر عزم و ارادے کے داخل ہوا جو تاریخ کا نظری عمل تھا آج بھی مجبوری عشق اور وصل بعد موت میں زیادہ کشش محسوس کی جاتی ہے جو ہر فنا نہیں ہوا ہے خارجی اثرات کے تحت قالب بدلتا رہا ہے[2]۔"

۱:۔ میر شاہ حسین حقیقت۔ رسالہ معارف جلد ۲-۱۱ اعظم گڑھ ماہ اگست ۱۹۶۸ء، ص ۱۲۷

۲:۔ " " " " " " ص ۱۲۸

جذبِ عشق داستان یا کہانی

"یہ کہانی دوسری داستانوں سے مختلف ہے یہ صرف کہانی ہے داستان نہیں ہے۔" اس کی وجوہ بیان کرتے ہوئے ڈاکٹر لطیف نے جذبِ عشق میں فوق فطرت عنصر کی عدم موجودگی اس کے کرداروں کے عام انسانوں سے مشابہ ہوتے، اور داستان کا اختصار بیان کیا ہے۔ لہٰذا یہاں ضروری ہو جاتا ہے کہ داستان اور کہانی کے فرق کو بیان کیا جائے۔

عموماً داستانیں طویل ہوتی ہیں اور ان میں قصہ در قصہ واقعات کو بیان کر کے داستان کی دلچسپی، تحیّر، اور آئندہ پیش آنے والے حالات کے بارے میں تجسّس پیدا کیا جاتا ہے۔ جذبِ عشق نہ تو طویل ہے اور نہ ہی اس میں قصہ در قصہ بیان ہوا ہے اس لحاظ سے اس کو داستان نہیں کہنا چاہیئے۔ لیکن ہمارے خیال میں صرف ان وجوہ کی بیان پر اسے داستان قرار نہ دینا صحیح نہیں ہے۔ اردو میں ایسی بہت سی داستانیں موجود ہیں جو طویل ہونے کے بجائے حکایت کی طرح مختصر ہیں لیکن اس میں داستان کے تمام امکانات اور لوازم موجود ہیں۔ ڈاکٹر گیان چند کے الفاظ میں داستان بھی حکایت کی طرح کوزے میں بند کی جا سکتی ہے۔ اس سلسلے میں انھوں نے تو تا کہانی کی چوبیسویں کہانی کو بطور مثال پیش کیا ہے جو ہے تو مختصر لیکن اپنے خصائص کے اعتبار سے داستان کہلائے جانے کی مستحق ہے[1]۔

اگر جذبِ عشق کے انجام سے قطع نظر کر لیا جائے تو یہ کہا جا سکتا ہے کہ اس داستان میں فوق فطرت عنصر بالکل بھی موجود نہیں ہے بعض لوگ تو اس انجام کو (جس میں مرنے کے بعد عاشق و معشوق کی لاشوں کو ہم آغوش دکھایا گیا ہے[2]) بھی غیر فطری تسلیم نہیں کرتے۔ اور لاشوں کے تہہ سے سطحِ آب پر آ جانے اور ہم آغوشی کی حالت میں ہونے کے اتفاق کے منکر نہیں ہیں۔ ڈاکٹر لطیف حسین ادیب

۱۔ اردو کی نثری داستانیں از ڈاکٹر گیان چند مطبوعہ انجمن ترقی اردو پاکستان ص ۴۸ (۲) میر کی مثنویوں میں بھی یہی انجام ہے۔

کے نزدیک اس داستان میں فوق فطرت عنصر نہ ہونے کی وجہ سے اسے داستان کے بجائے کہانی کہنا زیادہ صحیح ہے۔ اس سلسلے میں بھی بعض ایسی داستانوں کی مثالیں پیش کی جاسکتی ہیں کہ جن میں فوق فطرت عنصر سرے سے موجود ہی نہیں ہے ان میں الف لیلہٰ کی "سوتے جاگتے کی کہانی" کی مثال موجود ہے جس کو ناقدین نے اعلیٰ درجے کی داستان قرار دیا ہے۔ لیکن اس میں نہ تو کوئی فوقِ فطرت واقعہ ہے اور نہ ہی کسی فوق فطرت مخلوق کا تذکرہ ہے۔ اسی طرح توتا کہانی کی بیسویں کہانی، جس کا اوپر بھی تذکرہ آچکا ہے، ایک مختصر داستان ہے اس میں بھی نہ تو کوئی فوق فطرت عنصر موجود ہے اور نہ ہی اس کا ہیرو کوئی شہزادہ یا سوداگر وغیرہ ہے لیکن اس کے باوجود یہ بھی داستان کے زمرے میں آتی ہے

داستان اور کہانی کو اگر اس کے قدیم معنوں میں استعمال کیا جائے تو کہا جاسکتا ہے کہ کہانی میں بھی داستان کا عنصر موجود ہوتا ہے لیکن اس میں داستان کی سی طوالت نہیں ہوتی میرے خیال میں داستان اور کہانی کے درمیان حدِ فاصل کھینچنا مناسب نہیں ہے کیونکہ اپنی بیشتر خصوصیات میں یہ دونوں مشترک ہیں البتہ داستان اور حکایت میں فرق کیا جاسکتا ہے ان دونوں کے درمیان ایک نمایاں فرق پایا بھی جاتا ہے۔ داستان کے جو معنی متعین کئے گئے ہیں اس کے مطابق یہ انگریزی زبان کے لفظ رومانس کے معنوں میں اردو میں مستعمل ہے سب سے پہلے فرانس میں پھر دوسرے ممالک میں کسی بھی غیر معمولی واقعے کے نثری یا منظوم بیان کو رومانس کہا گیا۔" اس کے خاص اجزا محاربات، حسن و عشق اور ایمان و مذہب ہوتے ہیں[1]" مشرق و مغرب کی داستانوں کے نمایاں اور بنیادی موضوع بھی یہی ہیں۔ یہ تمام موضوع یعنی محاربات، حسن و عشق، ایمان و مذہب اور فوق فطرت عناصر کا بیان وغیرہ ان میں سے ہر ایک داستان کی اہم خصوصیت تو ہو سکتا ہے لیکن کسی ایک موضوع کے داستان میں نہ ہونے کے باوجود وہ داستان کہلائے جانے کی مستحق رہتی ہے۔

۱:- اردو کی نثری داستان از ڈاکٹر گیان چند مطبوعہ انجمن ترقی اردو کراچی۔

مثال کے طور پر داستانوں کے ایک اہم اور غالب ترین عنصر حسن و عشق کو لیجئے۔ اس کو بھی داستان کی نمایاں ترین خصوصیت قرار نہیں دیا جا سکتا۔ کیونکہ ایسی بہت سی داستانیں یا ضمنی کہانیاں ہیں جن میں حسن و عشق کا تذکرہ موجود نہیں ہے مثلاً الف لیلہٰ میں سندباد جہازی، سوتے جاگتے کی کہانی علی بابا چالیس چور وغیرہ، ان میں حسن و عشق کا کوئی تذکرہ موجود نہیں ہے۔ لیکن اس کے باوجود ان میں سے ہر ایک اپنی جگہ علیحدہ اور مکمل داستان تسلیم کی گئی ہے۔

پھر یہ بھی کہا جاتا ہے کہ داستان ہمیشہ رومانی اور غیر اصلی اور خیالی جذباتی قصہ پر مشتمل ہوتی ہے رومان کا عشق سے گہرا تعلق ہے لیکن اس تعلق سے آزاد رہ کر بھی رومانس لکھا جا سکتا ہے رومانوی واقعات میں چونکہ ساری کارفرمائی تخیل کی ہوتی ہے۔ لہذا اگر فوقِ فطرت عنصر موجود نہ بھی ہو تو بھی داستان میں دلچسپی کا عنصر باقی رہتا ہے۔

اگر داستان میں بیان کئے جانے والے قصے کو غیر اصلی اور خیالی جذباتی قصے کی موجودگی کو بنیادی شرط قرار دے دیا جائے تو جذبِ عشق کو داستان کے زمرے سے نکالنا پڑتا۔ کیونکہ مصنف کا دعویٰ یہ ہے کہ یہ واقعہ حقیقت پر مبنی ہے۔

ڈاکٹر گیان چند لکھتے ہیں "معلوم ہوتا ہے کہ ایسا کوئی رشتہ نہیں جو تمام داستانوں کو منسلک کرتا ہو ان میں یک رنگی نہیں بوقلمونی ہے پھر بھی ہم داستانوں کو حکایتوں یا جدید ناولوں سے الگ شناخت کر سکتے ہیں[1]۔"

حکایت کے لئے انگریزی میں لفظ فیبل FABLE استعمال ہوتا ہے۔

ڈاکٹر جانسن نے حکایت کی تعریف یوں کی ہے "یہ ایک بیانیہ ہے جس میں حیوان یا بے جان اشیاء اخلاقی تلقین کے لئے آدمی کی طرح بولتے چالتے ہیں اور انسانوں جیسا کام کرتے ہیں[2]۔"

۱۔ اردو کی نثری داستانیں (۲) حاشیہ منقول از اردو کی نثری داستان

اس تعریف کی روشنی میں کلیلہ دمنہ کو ہم حکایات کا مجموعہ کہہ سکتے ہیں جس میں جانوروں کو اخلاقی تلقین کے سلسلے میں انسانوں کی طرح گفتگو کرتے ہوئے بیان کیا گیا ہے۔ حکایت اور داستان کے فرق اور ان کے بیان کرنے والوں کے فرق اور تعریف میں ڈاکٹر گیان چند نے خوب لکھا ہے کہ " حکایت نویس ایک حکیم بزرگ ہوتا ہے داستان گو ایک رند خانہ سوز ہے[1]۔"

البتہ داستانوں کے لئے طوالت ہی زیادہ مناسب رہتی ہے کیونکہ اجمال میں داستان کا رنگ و روپ اور اس کی تحیر خیزی، سنسنی خیزی وغیرہ کو پورے طور پر بیان نہیں کیا جا سکتا لہذا، طوالت حسن و خوبی کے سلسلے میں ایک معیار ٹھہرا۔ ڈاکٹر گیان چند لکھتے ہیں " اجمال میں داستان کا رنگ روپ اجاگر نہیں ہونے پاتا، مہمات کا تواتر، پیچیدگی، کشش و پیچ، استعجاب اور اضطراب یہ بھی تو داستان کے اجزاء ہیں، اور یہ سب اطناب میں ہی رونما ہو سکتے ہیں اس لئے عرف عام میں داستان کا اطلاق محض طویل داستان پر ہوتا ہے رواج عام کو آسودہ کرنے کے لئے ہم مختصر داستانوں کو رومانی کہانیاں کہہ سکتے ہیں کہانی چونکہ کہی جاتی ہے اس لئے وہ شیطان کی آنت نہیں ہو سکتی۔ رومانی کی صفت لگا کر ہم ایک طرف ان کہانیوں کا داستان سے رشتہ اتحاد ظاہر کرتے ہیں تو دوسری طرف انھیں حکایات سے بھی ممیز کر دیتے ہیں[2]۔ "

جذب عشق داستان ہے یا رومانی کہانی

گزشتہ صفحات میں داستان اور رومانی کہانی کا فرق ظاہر کر دیا گیا ہے۔ اس سلسلے میں جو مباحث زیر بحث آئے اس کے نتیجے میں ہم جذب عشق کو مختصر داستان یا رومانی کہانی قرار دے سکتے ہیں۔

جذب عشق میں نہ تو طویل داستانوں کی طرح کا تواتر اور پیچیدگی پائی جاتی ہے اور نہ ہی

---

۱ اردو کی نثری داستانیں ص ۵۴ (۲) اردو کی نثری داستانیں ص ۵۵

اس میں قصہ در قصہ کوئی ایسا پھیلاؤ نہیں ہے، جو داستان کے بنیادی قصے کو بھی مربوط رکھتا ہو۔ اس کا قصہ اکہرا قصہ ہے جس میں کوئی ضمنی قصہ ساتھ ساتھ بیان نہیں ہوا ہے اس میں نہ تو طوالت ہے اور نہ ہی پیچیدگی یا مہمات کا تواتر، اس کا پلاٹ واحد ہے جس میں سیدھے سادے انداز میں عاشق و معشوق کا کردار، ان کی ملاقاتیں، ہجر و وصال وغیرہ کو مسلسل بیان کیا گیا ہے اور درمیان میں کوئی ذیلی قصہ نہ تو اس کو داستانوں کی طرح پھیلاتا ہے اور نہ ہی اس قصے کے تسلسل و تواتر میں کوئی انقطاع پیدا کرتا ہے اس فرق کو مزید واضح کرنے کے لئے یہ عرض کرتا چلوں کہ داستانوں میں واضح طور پر دو طرح کے پلاٹ ہوتے ہیں ایک تو واحد پلاٹ جس میں بغیر انقطلاع واقعات اور ذیلی کہانیوں کے اصل قصہ بیان کیا جاتا ہے۔ دوسری قسم کے پلاٹ میں بنیادی پلاٹ بہت نحیف اور کاہیدہ ہوتا ہے اصل دلچسپی کی حامل ضمنی کہانیاں ہوتی ہیں[1]۔"

جذبِ عشق کو نثر اور نظم کے امتزاج سے لکھا گیا ہے بلکہ اس میں اشعار کی اس قدر بھرمار ہے اور نثر میں ایک بات کہہ کر اس کو اشعار کے ذریعے بیان کیا گیا ہے کہ اگر کوشش کی جائے تو ان اشعار کو علیحدہ کر کے اس کو صرف مثنوی کی شکل بھی دی جا سکتی ہے۔

حقیقت نے نثر اور نظم کی آمیزش سے اس قصے کو مرتب کیا ہے۔ اس عہد میں ہم اس کو ایک تجربہ قرار دے سکتے ہیں۔ اودھ میں ایسی بہت سی داستانیں ملتی ہیں کہ جن میں کوئی کہانی وغیرہ بیان کر کے آخر میں مختلف اساتذہ کے چند اشعار دے دیئے جاتے ہیں۔ بعض حکایات کی کتابیں بھی ایسی ہیں کہ جن کے اخلاقی نتیجے کو حکایت بیان کرنے کے بعد، نظم میں پیش کیا گیا ہے مثلاً" جیمر کلا کرن کی جوہر اخلاق وغیرہ۔

حقیقت سے قبل داستانوں میں نظم و نثر کی آمیزش کے تجربات کربل کتھا گل بکاؤلی اور

---

[1] اردو کی نثری داستانیں ص ۵۹

وجہی کی سب رس وغیرہ میں بھی تھوڑے بہت ملتے ہیں۔ اس عہد میں شہادت ناموں، واقعات کربلا پر مبنی داستانوں میں بھی یہی انداز پایا جاتا تھا اور اب تک بھی اس قسم کی کتابوں کا انداز یہی ہے علاقائی ادب میں ملتانی زبان کے ذاکرین آج بھی بالکل اسی انداز میں پڑھتے ہیں۔ یعنی پہلے نثر میں واقعے کو بیان کرتے ہیں اور اس کے ساتھ ساتھ کثیر تعداد میں اشعار پڑھ کر اس واقعے کے تاثر میں شدت پیدا کرتے ہیں۔

جذب عشق کے پلاٹ کی انفرادیت

حقیقت نے آغاز داستان میں یہ کہا ہے کہ یہ داستان حقیقی ہے۔ ممکن ہے حقیقت نے اپنی داستان کی بنیاد کسی سچے واقعے پر رکھی ہو۔ لیکن اردو میں اس قسم کی کہانیاں مثنوی کی شکل میں موجود ہیں چنانچہ میر کی مثنوی "دریائے عشق" اور مصحفی کی مثنوی "بحر المحبت" کے نام پیش کئے جا سکتے ہیں۔ مصحفی نے تو خیر بحر المحبت، میر کی تقلید میں اس دعوے کے ساتھ لکھی ہے کہ وہ اس کہانی کو نیا حسن اور ندرت عطا کریں گے لیکن خود میر تقی میر کی مثنوی بھی طبعزاد نہیں ہے اور میر نے اس مثنوی کا خیال، مثنوی "قضا و قدر" سے لیا تھا جو ۱۱۱۲ھ میں تصنیف ہوئی تھی اور جسے تقریباً سو سال بعد میر نے اردو میں منتقل کیا تھا[1]۔ ڈاکٹر غلام مصطفےٰ خاں نے بھی میر کی مثنوی کا ماخذ "قضا و قدر" کو قرار دیا ہے اور بعض دوسرے محققین نے بھی اس سے اتفاق کیا ہے اس سلسلے میں ڈاکٹر خواجہ فاروقی لکھتے ہیں: "میر نے عشق کی واردات اور دایہ کے قصے کا اضافہ کیا ہے۔"

مذکورہ فارسی مثنوی کے علاوہ بھی قدیم دکھنی اردو میں ایسے کئی قصے موجود ہیں۔ جن کا پلاٹ اور انجام دریائے عشق اور حقیقت کی داستان "جذب عشق" سے مماثل ہیں۔ ان قدیم قصوں میں مقیمی کی چندر بدن و مہیار (۱۰۲۵ھ ۱۰۵۰ھ) اور دوالہ کی مثنوی "طالب و موہنی (۱۱۷۱ھ) وغیرہ

۱۔ رسالہ اردو اپریل ۱۹۵۱ء (۲)

ہیں۔ چندر ملن و مہیار میں بھی عاشق و معشوق کی لاشوں کو ہم آغوش دکھایا گیا ہے جو مرنے کے بعد بھی جدا نہیں ہوتے اور انھیں اسی صورت میں دفن کر دیا جاتا ہے اسی طرح دالہ کی مثنوی میں بھی عاشق و معشوق کا انجام یہی بیان ہوا ہے۔ میر کی مثنوی دریائے عشق اور حقیقت کی جذبِ عشق کا موازنہ آئندہ صفحات میں مناسب مقام پر آئے گا۔

جذب عشق اور مستعار اشعار

حقیقت نے اس داستان میں جا بجا اپنے اور مختلف اساتذہ کے فارسی اردو اشعار دیئے ہیں۔ اس سلسلے میں جو بات سب سے زیادہ کھٹکتی ہے وہ یہ ہے کہ انھوں نے بعض جگہ تو صاحبِ شعر کے نام دے دیئے ہیں۔ اور اکثر جگہ اس بات کی وضاحت نہیں کی کہ وہ کن شعرا کے ہیں۔ اور اکثر جگہ اگر قاری کا حافظہ ساتھ نہ دے تو یہ التباس ہوتا ہے کہ جن اشعار کے شاعروں کے نام چھوڑ دیئے گئے ہیں وہ خود حقیقت کے اپنے ہوں گے لیکن ایسا نہیں ہے۔ اکثر اشعار دوسرے اساتذہ کے ہیں البتہ کچھ اشعار حقیقت کے اپنے بھی ضرور ہوں گے۔ داستانوں میں نثر کے ساتھ ساتھ شدت تاثر کے لئے مختلف شاعروں کے اشعار دیئے جانے کی روایت عام ہے۔ چنانچہ اردو میں بکثرت ایسی داستانیں پائی جاتی ہیں کہ جن کے مولف یا مترجم نے مختلف اساتذہ کے اشعار سے داستان کو مزین کیا ہے مثلاً نہال چند لاہوری کی مذہب عشق الموسوم بہ گل بکاؤلی، لیکن" مذہب عشق" میں مولف نے اس بات کا خیال رکھا ہے کہ جہاں جہاں بھی اساتذہ کے اشعار استعمال ہوں وہاں ان کے نام ضرور دے دیئے جائیں۔ اس داستان میں بیشتر اشعار تو میر حسن کے ہی ہیں۔ مذہب عشق وغیرہ میں ترتیب و تزئین کے اس سلیقے کو دیکھتے ہوئے ہم کہہ سکتے ہیں کہ چونکہ مذہب عشق، فورٹ ولیم کالج کے زیر اثر لکھی گئی تھی۔ اور اس ادارے اور اس سے متعلق مصنفین کی ادبی رہنمائی انگریز عالم کر رہے تھے لہٰذا انگریزی ادب کی بعض روایات اور تحقیق و تنقید کا مزاج ضرور اثر انداز ہوتا ہوگا چنانچہ اس قسم کا التزام، اس

اثر کے تحت تھا البتہ عقیقت نے میر کے اشعار اور اپنے استاد جرأت کے اشعار جہاں جہاں بھی دیئے ہیں وہاں ان کے نام ضرور بیان کر دیئے ہیں۔

جذب عشق کا اسلوب اور انشائیہ

ڈاکٹر گیان چند نے داستانوں کی اہمیت کے دو پہلو بیان کئے ہیں۔ "ادبی اور افسانوی.... ادبی پہلو اسلوب، انشا، منظر نگاری اور تہذیبی بیانات پر مشتمل ہوتا ہے۔ افسانوی پہلو سے مراد قصہ پن ہے[1]۔" ہم یہاں جذب عشق کا ان دونوں پہلوؤں سے جائزہ لیں گے۔

جذب عشق میں کئی اسلوب یکجا ہیں۔ اس کا اسلوب فارسی آمیز اور دقیق رنگین نثر کا بھی ہے اور اس میں ایسا اسلوب بھی نظر آتا ہے جو سادگی سے عبارت ہے۔ اور سادگی میں اس داستان کے بعض ٹکڑے فورٹ ولیم کالج کے زیر اثر لکھی جانے والی سادہ و سلیس نثر کے برابر ہیں۔ اس کو روایتی انداز میں لکھی ہوئی پُر تکلف اور مقفیٰ طرز تحریر بھی قرار دی جا سکتی ہے کیونکہ اس کے بیشتر حصے کی امتیازی خصوصیت یہی ہے حقیقت کے اسلوب پر فارسی کا گہرا اثر ہے، جو اس زمانے میں ایک عام روش تھی اور اسی اندازِ بیان کو پسند کیا جاتا تھا اور ادبی معیار بھی یہی تھا۔ جذب عشق میں صفت و موصوف کی تبدیلی کے ساتھ فارسی مرکبات کا لہجہ اختیار کیا گیا ہے۔ شمالی ہند میں اس زمانے میں اردو نثر کے مزاج میں فارسی کے اسالیب اس حد تک رچے بسے تھے کہ وہ فطری طور پر اسی انداز کو اختیار کرتے تھے اور نثر میں اس قسم کی ترکیبیں عام طور پر لائی جاتی تھیں۔ یہاں جذب عشق سے فارسی مرکبات کی چند مثالیں دی جاتی ہیں۔ ان میں صفت، موصوف کے بعد لانے کا التزام ہے۔

"غم مفارقت یار و دیار کے۔"

۱:۔ اردو کی نثری داستانیں ص ۱۰۱

"گرفتاری اپنی سے لوگوں ناجنس میں۔"

"واسطے خالی کرنے دل پر اندوہ اور شگفتگی پانے غنچہ خاطر پژمردہ کے۔" وغیرہ وغیرہ

فنی نقطہ نظر سے سجع اور قافیے سے بے نیاز عبارت کو صرف رنگین نثر کہا جاتا ہے۔ جذب عشق کی نثر میں صرف رنگین نثر بھی ملتی ہے اور دقیق رنگین نثر بھی، رنگین نثر کی مثال ملاحظہ ہو۔

"الغرض بے یار دلنواز گلگشت باغ سے آتش اندوہ اور شعلہ زن ہوئی۔ بے اختیار بلبل زبان کو شاخسار بیان پر نغمہ سرا اس ترانے کا کیا۔" (جذب عشق ص۵)

"..... گرگل کو دیکھتا تھا گل رخسار کے غیرت گل کا یاد آتا تھا۔ اور اگر سرو پر نظر کرتا تھا۔ قد موزوں کسی رشک شمشاد کا جلوہ دکھاتا تھا۔ نظارے، نرگس نیم مست سے چشم کسی مے نوش کی آنکھوں تلے پھر جاتی تھی اور مشاہدہ سنبل سے ناگنی زلف تابعدار کسی عنبریں موئے کی دل پر لہراتی تھی ناچار دہ گل رخسار لالہ دار داغ بر دل ....." (جذب عشق ص۷)

مقفّیٰ نثر کی مثالیں :-

"..... کہتے ہیں کہ مرہٹے کے لشکر میں ایک جوان رعنا تھا۔ انگریز کا رفیق اور سراپا دہ درنایاب بحر حسن میں غریق، نہایت ہی حسین اور صاحب جمال، قیامت ہی لطیف طبع اور شیریں مقال سرو قد لالہ رخسار سراسر آفت اور قیامت رفتار، تیغ نگاہ، جلاد اور فتنہ انگیز خنجر ابرو سفاک اور خونریز ....."

(جذب عشق)

"..... کیا دیکھے کہ نیچے ایک درخت کے چار عورتیں پری صورت جو فی الحقیقت چار چمن گلستان رعنائی اور چار رکن قصر زیبائی کے تھیں چار بالش ناز و ادا پر جلوہ افروز دلبری اور دلربائی کی تھیں، اگرچہ ایک ایک اون چار دل میں عشوہ سنج اور کرشمہ ساز تھی لیکن وہ ماہ پیکران میں بلا اغراق کا ثانی تہہ آفاق نہیں ....."

(جذب عشق)

لفظی صفتوں کا استعمال

حقیقت نے اس داستان میں لفظی صفتوں سے بھی کام لیا ہے۔ لیکن ان لفظی صفتوں کا استعمال کثرت سے ان کے ہاں نہیں ملتا۔ لفظی صفتوں کے سلسلے میں سیاقۃ الاعداد کی مثال یہاں پیش کی جاتی ہے۔

"..... قضارا ایک جفاکار سیاہ باطن نے نہایت نامردی سے پیچھے سے آکر ایک لٹھ سر کو تاک کر مارا۔ پر وہ لٹھ خواہش الٰہی سے تلوار پر بیٹھا اور تلوار دو ٹکڑے ہوئی۔ نوجوان نامساعدتِ بخت واژوں اور نامددگاری چرخ بوقلموں سے لاچار ہو کر ششدر رہ گیا....." (جذب عشق ص۴۱)

کاف بیانیہ کا استعمال :۔ حقیقت نے جذب عشق میں کاف بیانیہ (کہ) کی جگہ لفظ "جو" کا استعمال کیا ہے۔ حقیقت نے جس جس جگہ لفظ "جو" کا استعمال کیا ہے۔ حقیقت کے پیشروؤں کے ہاں نثر میں اس جگہ کاف بیانیہ ہی ملتا ہے۔ اس سلسلے میں حقیقت کی نثر اور دوسرے مصنفین کی نثر سے مثالیں پیش کی جاتی ہیں۔

کربل کتھا فضلی :۔ "..... یہ گوہر گراں بہا..... کہ..... بتائید بحر رحمت الٰہی صدف امید سے سلک عبارت میں منسلک ہوا..... کہ..... مبرّا از کذب و گزاف۔"

سودا کے ہاں کاف بیانیہ کا استعمال :۔ "..... پس یہ چند مصرعے کہ از قبیل ریختہ..... تحریر پائے یا دروازہ رسوائی کے پاٹ ہیں..... کہ..... عمداً اپنے منہ پر کھولے۔"

نوطرز مرصّع میں کاف بیانیہ کا استعمال :۔ تحسین کی نوطرز مرصع میں بھی اس کا استعمال یوں ملتا ہے۔ "..... محارسان شہر نے..... کہ..... بموجب حکم والی اس دیار کے مامور تھے....."

دوسری جگہ ملاحظہ کیجئے :۔

" نوفل نے اس جھوٹے بدذات کے تئیں..... کہ..... گرفتار کرنا حاتم..... کا روا رکھ کر بولا تھا۔

اس سلسلے میں حقیقت کے ہاں کاف بیانیہ کا استعمال قاری کو تعجب میں ڈالتا ہے۔ حقیقت نے جذب عشق میں ان جگہوں پر لفظ "جو" کا استعمال تو کیا ہی ہے کہ جہاں اسے استعمال کیا جانا چاہیئے تھا مثلاً

"درمیان سیمری کے ..... جو ..... متصل قصبہ جھاتا ہے۔"

"ایک روز کمال سرفرازی اور مہر سے ..... جو ..... بزرگوں کو خوردوں کے حال پر ہمیشہ مبذول ہے ....."

اب ایسی عبارت میں لفظ "جو" کا استعمال ملاحظہ ہو۔ اس جگہ لفظ "جو" کا استعمال کسی طرح بھی مناسب نہیں ہے، اور یہاں کاف بیانیہ کا ہی استعمال ہونا چاہیئے تھا۔

"اس نوجوان نے ایک نعرہ مارا اور کہا ..... جو ..... اے حیوان مطلق۔" (جذب عشق ص ۳۲)

"اتنے میں ایک عورت نے گھر میں سے اس نازنین کو پکارا، اور کسی کا نام لے کر کہا ..... جو ... تو فلانی جگہ چل ....." (جذب عشق ص ۳۲)

"کیا دیکھے کہ نیچے ایک درخت کے چار عورتیں بیٹھی صورت ..... جو ..... فی الحقیقت چار چمن گلستان رعنائی اور جادو کی ریبائی کے تھیں۔" (جذب عشق ص ۲۲)

شمالی ہند میں اردو نثر اور جذب عشق

شمالی ہند میں اردو نثر کے ارتقا کی ایک اہم کڑی حقیقت کی جذب عشق بھی ہے جذب عشق کا سنہ تصنیف ۱۲۱۲ ہجری بمطابق ۹۸-۱۷۹۷ ہے گویا اس داستان کے لکھے جانے کے تقریباً پانچ سال بعد (۱۸۰۱ء) فورٹ ولیم کالج کا قیام عمل میں آیا جس نے شمالی ہند میں اردو نثر نگاروں کی ایک ایسی جماعت پیدا کی جن کی نثر کا طرۂ امتیاز عام فہم اسلوب سلاست، روانی اور شگفتگی تھی۔ جذب عشق تحریر کئے جانے کے وقت شمالی ہند میں بعض ایسی داستانیں ملتی ہیں جن میں فارسی کے زیر اثر اسلوب کو چھوڑ کر سادہ اندازِ بیان اختیار کیا گیا تھا۔ لیکن ان داستانوں کے مصنف، سادہ نثر لکھنے کی شعوری

کوشش اور دعوے کے باوجود، فارسی تراکیب اور اسلوب کی فارسی ساخت سے اپنے آپ کو کلیتاً نہ بچا سکے ان معروف داستان میں میر عطا حسین خان تحسین اور مہر چند مہر کھتری کے نام لئے جاسکتے ہیں۔ یہ دونوں نثر نگار انگریزوں سے وابستہ تھے گو فورٹ ولیم کالج کے قیام کے بعد اردو میں سادہ نثر نگاری کے آغاز کو متعین کیا جاتا ہے لیکن حقیقت یہ ہے کہ اس کالج کے قیام سے پہلے ہی انفرادی سطح پر انگریزوں سے میل میلاپ کے نتیجے میں یا ان کی فرمائش پر قدیم قصّوں کو سادہ نثر میں لکھے جانے کی کوششیں کی جاتی رہی تھیں۔ چنانچہ عطا حسین کی نوطرز مرصع اور مہر چند مہر کھتری کا قصہ ملک محمد و گیتی افروز کی مثالیں ان اثرات کی نشاندہی کے لئے کافی ہے۔

اس کے علاوہ سودا نے بھی میر تقی میر کی مثنوی شعلۂ عشق کے قصے کو اردو نثر میں لکھا تھا شمالی ہند میں اردو نثر کے ارتقا کے مطالعے کے سلسلے میں میر عطا حسین خان تحسین کی نوطرز مرصع کو بنیادی اہمیت حاصل ہے اس کا آغاز ۱۷۶۸ء میں ہوا اور یہ داستان ۱۷۷۵ء میں اختتام کو پہنچی۔ جذب عشق کا سال تصنیف ۱۷۹۷ء ہے گویا جذب عشق، تحسین کی نوطرز مرصع کے تقریباً بائیس سال بعد لکھی گئی۔ اس عرصہ میں زبان و بیان اور اسلوب و انشا میں کافی تبدیلی آچکی تھی نوطرز مرصع کی اہمیت اپنی جگہ، لیکن اس کے اسلوب میں اس کی شہرت کے مقابلے میں سادگی بیان کم پائی جاتی ہے۔ یہ چار درویش کا قصہ ہے اور بقول ڈاکٹر نورالحسن ہاشمی[1]۔

" یہ تصنیف اپنے اسلوب کے اعتبار سے ان ہندوستانی فارسی ادیبوں کی یاد تازہ کرتی ہے جن کی کتابیں سہ نثری ظہوری، مینا بازار، شبنم شاداب، پنج رقعہ، بہار دانش وغیرہ، آخر عہد مغلیہ میں فارسی کی انشا پردازی کی سنگ میل سمجھی جاتی تھیں۔"

نوطرز مرصع کی زبان، جملوں کی ترکیب اور الفاظ کی نشست کے لحاظ سے فارسی کی نقل ہے

۱۔ نوطرز مرصع :- مرتبہ ڈاکٹر نورالحسن ہاشمی مطبوعہ ہندوستانی اکیڈمی، الہ آباد ۱۹۵۸ء، ص ۷۷

"مگر بالفصل، کہ درازی سررشتہ شب تار کی نے زنجیر بے خوابی کی (اردو)

اما بالفصل، کہ درازی سررشتۂ شب تار زنجیر بے خوابی (فارسی)

بیچ پائے استراحت کے ڈالی ہے اس سے صلاح وقت یہ ہے (اردو)

دریاں پائے استراحت افگندہ است ازیں صلاح وقت این است (فارسی)

"کہ واسطے شغل بیداری کے ہر ایک قفل گنجینہ زبان کے تئیں (اردو)

کہ پیر شغل بیداری ہر یک قفل گنجینہ زبان را (فارسی)

ساتھ کلید تشریح تفصیل قصہ و سرگذشت واقعی اپنی کے کھولے (اردو)

باکلید تشریح تفصیل قصہ و سرگذشت واقعی خود بکشا یہ (فارسی)

کہ اس وسیلے سے متاع فوائد صحبت سراپا برکت یک دیگر کی بیچ لیٹ تمنا کے (اردو)

کہ بریں وسیلہ متاع فوائد صحبت سراپا برکت یک دیگر لیسہ تمنا (فارسی

حاصل کریں یاران دیگر نے انگشت قبولیت کی اوپر دیدۂ رضا و رغبت کے (اردو)

حاصل کنیم یاران دیگر انگشت قبولیت بر دیدۂ رضا و رغبت (فارسی)

کہ در لہا کہ کیا مضائقہ

نہادہ گفتند چہ مضائقہ[1]

نوطرز مرصع کی طرح اردو میں جتنی بھی داستانیں فارسی سے ترجمہ کی گئی ہیں ان کے اسلوب اور جملوں کی ساخت پر فارسی اسلوب کا اثر نمایاں اور گہرا ہے۔ اس کی ایک وجہ تو وہی ہے کہ فارسی اسلوب کی تقلید ہی اظہار علمیت کا ذریعہ اور عام لوگوں میں پسندیدگی کا سبب تھی دوسرے ہمارے بعض مترجمین نے بھی آزاد ترجمہ کرنے کے بجائے لفظ بہ لفظ ترجمہ کرنے کی کوشش کی اور

۱۔ نوطرز مرصع مرتبہ ڈاکٹر نورالحسن ہاشمی ص۷۷

چونکہ اردو میں فارسی کے الفاظ بہ کثرت ہیں۔ لہٰذا صرف فارسی کے ان الفاظ کی تبدیلی کرکے کہ جو ناگزیر تھے باقی وہی الفاظ استعمال کر لئے جاتے تھے۔

نوطرزِ مرصع میں سادگی کی مثال

"نوفل نے اس بات کے سننے سے نہایت متحیر اور مجوب ہوکر اس جھوٹے بدذات کے تئیں کہ.... اشرفیوں کے لالچ میں گرفتار کرنا حاکم سے شخص مخبر کا روا رکھ بولا تھا کہ "عرش پر جھنڈا ہم نے گاڑا... پنٹ زجرد تو بیخ سے کہا کہ "اے حارث ملعون! سچ کہہ یہ کیا حرام زدگی تھی کہ حاتم بے چارے پر وار کیا آیئے لیجئے اشرفیاں موجود ہیں! اور مشکیں بندھوا کر ایسی ہی پامالِ خواری کی کہ سرگنجا ہو کے مانند توبنے کے بن گیا۔"[1]

نوطرزِ مرصع میں اضافت کا استعمال بھی ابھی اردو نثر کے ارتقا کے ابتدائی عہد کی غمازی کرتا ہے۔ اسی طرح وہ فارسی الفاظ میں عبادت کی چستی کے لئے اضافت لگانے کے بجائے ہندوستانی بندشیں استعمال کرتے ہیں۔

میر تحسین کی نوطرزِ مرصع دراصل فسانۂ عجائب کے اسلوب کی ابتدائی صورت ہے۔ اس کی نثر کی سادگی کا چرچا عام ہے لیکن اس کی بنیادی اہمیت اصل میں اس وجہ سے ہے کہ شمالی ہند میں یہ پہلی نثری کتاب ہے جس میں ایک طرف وہ اسلوب بھی انگڑائیاں لیتا ہوا نظر آتا ہے۔ جو فسانۂ عجائب کا پیش رو ہے۔ دوسری طرف اس میں بعض مقامات پر ایسی سادگی بھی ملتی ہے جس کی اعلیٰ ترین صورت میر امن کی باغ و بہار ہے۔ گو اس نثر کا انداز منطق، دقیق اور رنگین ہے لیکن اس میں سرور کی نثر کی سی رنگینی، شستگی اور روانی و برجستگی بھی نہیں ہے اور ایسا نہ ہونا عین فطری بات بھی۔ ڈاکٹر گیان چند لکھتے ہیں" اس کی نثر اکھڑی اکھڑی غیر متوازن اور زیادہ فرسودہ ہے فسانۂ عجائب

۱:۔ نوطرز مرصع۔ مرتبہ ڈاکٹر نورالحسن ہاشمی ص ۱۵۴-۱۵۵ (۲)

میں یہی نثر ایک مشاق استاد کے قلم سے رواں دواں ہو کر نکلتی ہے۔[1]"

شمالی ہند میں اردو نثر کے ارتقا کے مطالعے کے لئے مہر چند مہری کھتری کا نام نہایت اہم ہے جس نے نوطرز مرصع کے تحریر کئے جانے کے چودہ سال بعد قصہ ملک محمد دگیتی افروز" لکھا تھا اس قصے کو اردو نثر کے ارتقائی مطالعے میں نہ جانے کیوں اہمیت نہ حاصل ہو سکی حالانکہ سلاست و صفائی اور زبان کی خوبیوں کے اعتبار سے یہ کسی صورت فورٹ ولیم کالج کے مصنفین کی نثری کتابوں سے کم نہیں۔

مہر چند مہر کھتری نے یہ قصہ ۱۲۰۳ھ (بمطابق ۸۹-۱۷۸۸) میں لکھا تھا۔ مہر چند کھتری کی یہ نثری داستان اردو کی اہم ترین داستانوں میں اپنے زبان و بیان اور اسلوب کے نقطۂ نظر سے شمار کئے جانے کے قابل ہے۔ اس کا ایک اقتباس ملاحظہ ہو۔

" ایک دن خورشید چہر برسات کے موسم میں موافق معمول کے اپنے محل میں آرام کرتا تھا کہ بکایک آندھی چلنے لگی اور ہوا کی شدت سے بادشاہ کی آنکھ کھل گئی۔ گھڑی دو ایک کے بعد (آندھی) تھم گئی اور ہوا موقوف ہوئی تو بادشاہ کے کان میں ایک عورت کی آواز آئی کہ آہ آہ کر کے کہتی تھی کہ میں جاتی ہوں کوئی ایسا ہے جو مجھے رکھ سکے۔ بادشاہ نے پلنگ پر لیٹے لیٹے بہیم دو تین دفعہ یہی آواز سنی پھر خواب گاہ سے نکل کر چھت پر آیا کہ آواز کا حال دریافت کرے۔ باہر نکل کر کیا دیکھتا ہے کہ زریوند تیر کمان ہاتھ میں لئے کھڑا ہے اور چھوٹی چھوٹی پھوار پڑتی ہے اور چاروں طرف اندھیاری جھکی تھی کہ اپنا ہاتھ بھی نہیں سوجھتا تھا۔ زریوند نے برق کی چمکاہٹ میں دیکھا کہ کوئی محل سرا پر کھڑا ہے"

ان دونوں مصنفین کی کتابوں پر بحث اور اقتباسات دینے کا مقصد بنیادی طور پر اردو نثر کے ارتقا اور اس کے حوالے سے حقیقت کے اسلوب نثر کا جائزہ لینا تھا۔ مہر چند مہر کھتری کی تصنیف

۱۔ اسعد کی نثری داستانیں ص ۱۲۴ (۲)

نوآئین ہندی یا قصہ ملک محمد دگیتی افروز کے سلسلے میں تو اکثر ناقدین متفق ہیں کہ اس کو وہ شہرت نہیں ملی کہ جس کی وہ حقدار تھی دوسری طرف تحسین کی نثر کو شمالی ہند میں اولیت کا فخر تو حاصل ہے لیکن مہر چند مہر کی داستان کا اندازِ بیان کی سادگی کا موازنہ میر امن کی باغ و بہار سے کیا جاسکتا ہے

حقیقت کی جذب عشق میں سادہ نثر بھی ہے اس لئے ہم اس کو تحسین کی نوطرز مرصع کی نثر کی ایک کڑی کہہ سکتے ہیں جس کی ارتقائی صورت سرور کے ہاں: عجائب میں ملتی ہے۔

تحسین نے اپنی کتاب میں لکھا تھا۔" مضمون اس داستان بہارستان کے نئیں بھی بیچ عبارت رنگین زبان ہندی کے لکھا چاہیئے کیونکہ آگے سلف میں کوئی شخص موجد اس ایجاد تازہ کا نہیں ہوا۔" تحسین کے نزدیک ان کی یہ نثر اردو کی پہلی تھی اور اردو سیکھنے کے لئے اس کا مطالعہ مفید اور سودمند تھا۔ اٹھارویں صدی کے آخر تک بھی۔ اردو میں نثر نگاری کو جدت اور ندرت سمجھا جاتا تھا لیکن فارسی ترکیبات اور استعارات کو پسندیدگی کی نظر سے دیکھا جاتا تھا لہذا شعوری یا غیر شعوری طور پر اردو میں لکھنے کا دعویٰ کرنے کے باوجود اس زمانے کے ہر مصنف پر فارسی اسلوب کا رنگ غالب رہتا تھا۔ چنانچہ تحسین، حقیقت اور سرور کے ہاں ہم یہ اثر نمایاں طور پر دیکھتے ہیں۔ ڈاکٹر مگین چند لکھتے ہیں:" نوطرز مرصع جس وقت لکھی گئی اس وقت تک اردو نثر کو علمی درجہ نصیب نہ تھا۔ نوطرز مرصع کے پون صدی بعد تک اردو کے شعرا اردو نثر کو سرمایۂ ننگ سمجھتے تھے۔ مثنویوں کی فصلوں کے عنوان فارسی میں لکھے جاتے تھے فارسی سے آشنا پروفاروں کی تصانیف مثلاً پنج رقعہ، بینا بازار سہ نثر ظہوری وغیرہ کا بول بالا تھا۔ اردو میں نثر لکھی جاتی تو اس کے بغیر چارہ نہ تھا۔ نوطرز مرصع کا اسلوب سب سے زیادہ مغلق مصنوعی اور پر تکلف ہے اگر ایک طرف اس کتاب میں تشبیہ و استعارہ کی افراط، مبالغہ کی بلند پروازی، تخیل کی نکتہ سیری ہے تو ساتھ ہی ساتھ عربی و فارسی کے موٹے لغات، فارسی کے انداز پر جار و مجرور اور صفت کی ترکیب، توازن و ہمواری کا فقدان۔ تعقید

گنجلک بھی ہے۔ قصہ تو فارسی سے لیا ہی ہے ان کی عبارت بھی اس انداز کی ہوتی ہے جیسے پہلے فارسی میں لکھ کر لفظی ترجمہ کیا ہو۔"[1]

حقیقت بھی اس رنگین اردو نثری دبستان کے ایک اہم رکن ہیں۔ جذبِ عشق میں ہمیں وہ نقائص کم سے کم نظر آتے ہیں جن کی طرف اشارے کئے جا چکے ہیں۔

جذبِ عشق رنگین اور سادہ نثر کا امتزاج لئے ہوئے ہے۔ اس میں فارسی الفاظ کا بکثرت استعمال ہے اس میں صفت و موصوف کے استعمال میں فارسی اسلوب کی تقلید کی گئی ہے اور یہ فارسی مرکبات کے لہجے کی حامل ہے لیکن اس کے باوجود اس میں نوطرز مرصع کا سا کھردرا پن مغلق الفاظ تعقید، اور اکھڑی اکھڑی ہوئی کیفیت نہیں ملتی اور اس میں کسی قسم کا ابہام، ژولیدگی اور الجھاؤ نہیں پایا جاتا۔

جذبِ عشق میں اکثر مقامات پر رنگین نثر کے ساتھ ساتھ سادہ اور سلیس نثر بھی لکھی گئی ہے۔ اس کا معیار وہی ہے جو بعد ازاں فورٹ ولیم کالج کے مصنفین کی سادہ نثر کا متعین کیا گیا۔ فورٹ ولیم کالج کی نثری تحریک، انگریزوں کے زیر اثر شروع ہوئی تھی۔ تحسین نے نوطرز مرصع اور مہر چند مہر نے قصہ ملک محمد و گیتی افروز اپنے ان انگریز دوں افسران کی ہدایت اور مشورے پر لکھی تھیں جن سے وہ وابستہ تھے۔ اس طرح اردو نثر کی یہ دونوں کتابیں بھی انگریزوں کی ہدایات پر لکھی گئیں جو ان سے اردو سے معلّی سیکھنا چاہتے تھے۔ کیا حقیقت نے کسی انگریز افسر کے مشورے پر یہ داستان لکھی تھی؟ اس کی وضاحت ان کی تحریروں میں تو نہیں ملتی۔ حقیقت نے یہ مثنوی کرناٹک کے سفر کے بعد لکھی تھی۔ اس زمانے میں انھوں نے ایک انگریز افسر کی فرمائش پر ہشت گلزار کو فارسی نثر میں لکھا تھا۔ ممکن ہے جذبِ عشق کے تخلیقی محرک اور اس کے اندازِ بیان کے پسِ پشت ان کے اس انگریز

۱:۔ اردو کی نثری داستانیں ص ۱۲۳

انسر کی فرمائش کو دخل رہا ہو جس کا تذکرہ ہشت بہشت کے سلسلے میں اوپر آچکا ہے۔ علاوہ ازیں اس امکان کو بھی نظر انداز نہیں کیا جاسکتا کہ حقیقت نے مستقبل قریب کے پسندیدہ اسلوب کا اندازہ لگالیا ہو اور بدلتی ہوئی نثری ساخت کو شعوری طور پر استعمال کرنے کی کوشش کی ہو۔

جذبِ عشق سے سادہ نثر کا ایک نمونہ ملاحظہ ہو۔ اس سادہ نثر کو ہم فورٹ ولیم کالج میں لکھی جانے والی نثر کا نقش اولین کہہ سکتے ہیں۔

"اور یہ بیدل مایوسِ وصال اس ریا سے ہوکر نظارے کی امید پر ٹھیک دوپہر کو عین شدت گرمی میں بام خانہ پر جو بلندی میں طعنہ زن الوند تھا، ساتھ تینوں ہمدموں محرم کے چڑھ کر نگاہیں ناامیدانہ کرنے لگی۔[1] "

جذبِ عشق میں مصنف نے لفظ "قدر" کو نذر کے معنوں میں استعمال کیا ہے

"اور واسطے ..... قدر ..... بھوانی کے رکھتی تھی۔"

اسی طرح لفظ "فکر" کو جو عام طور پر مونث باندھا جاتا ہے بطور مذکر کے ایک شعر میں بیان کیا گیا ہے۔ ؎

بہے گا چشم سے خوناب دل کا
کروں گا فکر کیا بے تاب دل کا

اسی طرح گھر کو پلٹنا کے بجائے: "گھر کو ہٹی" لکھا ہے۔ جواب متروک ہے۔

"بے حصول دولت وصال ادس دلارام کے مایوس اور نا امید بحال تباہ جو بیان اس کا عنت دشوار ہے ..... گھر کو ہٹی ....."

اکثر مقامات پر حقیقت نے ضرب المثل بھی استعمال کئے ہیں مثلاً رات تھوڑی اور سانگ بہت"

۱۔ جذبِ عشق

اور شیطان کے کان بہرے۔" وغیرہ

جذبِ عشق کا آغاز اردو اور فارسی کی داستانوں اور مثنویوں کی طرح حمد باری تعالےٰ اور نعت رسولِ مقبولؐ سے ہوتا ہے اس داستان میں اشعار کثرت سے استعمال کئے گئے ہیں۔ اس کا قصہ اگر مکمل طور پر نہیں تو اپنے موضوع اور انجام کے اعتبار سے میر تقی میر کی مختصر مثنوی دریائے عشق سے ملتا جلتا ہے۔ عشق خانہ خراب کی نیرنگیوں کو ظاہر کرنے کے لئے حقیقت نے میر کے "آبدار شعر" شروع میں دیئے ہیں۔ ؎

عشق ہے تازہ کار و تازہ خیال — ہر جگہ اس کی اک نئی ہے چال
کہیں ناحق ہیں اس نے خون کئے — کہیں ..... تیغ لئے
خار خار دل غزیاں ہے ! — انتظار بلا نصیباں ہے!
جس کو ہو التفات اس کا نصیب — ہے وہ مہمان چند روز غریب
عشق کے دلفگار سارے ہیں ! — اس نے کیا کیا جوان مارے ہیں
کہیں آنکھوں سے خون ہو کے بہا — کہیں سر میں جنون ہو کے رہا
کہیں بیٹھے ہے دل میں ہو کر چاہ — کہیں رہتا ہے قتل تک ہمراہ
کشش اس کی ہے ایک اعجوبہ — ڈوبا عاشق تو یار بھی ڈوبا
ایسی تقریب ڈھونڈ لاتا ہے !! — کہ وہ ناچار جی سے جاتا ہے

حقیقت نے میر کے ان اشعار کو بیان کرنے کے بعد کہا ہے کہ " القصہ انہی واقعوں میں سے یہ بھی ایک عجیب واقعہ ہے۔" یعنی عشق و محبت کے دلگداز افسانوں میں اس قصے کو بھی شمار کیا جانا چاہیئے۔

میر نے اپنی تمام مثنویوں کے آغاز میں عشق کی ماہیت و کیفیت پر روشنی ڈالی ہے۔ اور

عشق کی کرامات و صفات کے اظہار کے طور پر کوئی حصہ بیان کیا ہے۔ حقیقت نے بھی جذبِ عشق کے آغاز میں عشق کے جذبے، اس کی شوریدگی اور صفات و کرامات کے اظہار کے لئے میرؔ کے اشعار ہی دیئے ہیں۔ اصل داستان سے یہ حصہ علیٰحدہ ہے لیکن آگے چل کر جو دردانگیز واقعہ جس سبب سے رونما ہونے والا ہے یہ حصہ گویا اس کی تمہید ہے۔ داستان کی شدت تاثر کے سلسلے میں یہ ایک ناگزیر حصہ ہے۔

حقیقت نے جوان رعنا کی خوبصورتی و رعنائی نثر میں بھی بیان کی ہے۔ اور اس کی خوبصورتی کو نظم میں بھی بیان کیا ہے۔

"کہتے ہیں کہ مرہٹے کے لشکر میں ایک جوان رعنا تھا، انگریز کا رفیق اور سراپا وہ دُرِ نایاب بحرِ حُسن میں غرق نہایت ہی حسین اور صاحبِ جمال، قیامت ہی لطیف طبع اور شیریں مقال سرو قد اور لالہ رخسار سراسر آفت اور قیامت رفتار، تیغ نگاہ جلّاد اور فتنہ انگیز خنجر ابرو سفاک اور خونریز۔"

نظم میں اسی جوان رعنا کی خوبصورتی کو یوں بیان کیا ہے۔

یہ کیفی انکھڑیاں تھیں وہ خماری — کہ نرگس جس سے کھینچے تیر ساری
یہ سج دھج اور یہ محبوب صورت — کہ تھا ایسا نہ کوئی خوبصورت
غرض صورت یہ تھی اوس دلربا کی — نمایاں جس سے تھی قدرت خدا کی
یہ سن چار دہ وہ رشک ماہ تھا — خجل دیکھ اوس کو ماہ چاردہ تھا
اگرچہ حُسن میں تھا آپ یکتا! — ولے دم مارتا تھا عاشقی کا

مثنوی دریائے عشق کے آغاز میں میر تقی میرؔ اپنی مثنوی کے جوان رعنا کی تصویر یوں کھینچتے ہیں۔

ایک جا اک جوان رعنا تھا — لالہ رخسار سرو بالا تھا !!
عشق رکھتا تھا اس کی چھاتی گرم — دل وہ رکھتا تھا موم سے بھی نرم
تھا طرحدار آپ بھی لیکن ! — رہ نہ سکتا تھا اچھی صورت بن
دیکھتا گر کوئی وہ خوش پرکار — رہتا خمیازہ کش ہی لیل و نہار
سر میں تھا شوق، ذوق دل میں تھا — عشق ہی عشق آب و گل میں تھا

حقیقت اور میر کے ان اشعار کے موازنے سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ حقیقت کے اندازِ بیان اور ان کے شعروں میں وہ تاثر نہیں ہے جو میر کے ان اشعار میں ہے۔

سمیری گاؤں کی تعریف

سمیری گاؤں کی تعریف حقیقت نے اس داستان میں منظوم بیان کی ہے۔ اردو میں بہت سی ایسی مثنویات ہیں جن میں شاعروں نے مناظر قدرت کی نہایت خوبصورت تصویر کھینچی ہیں اور اپنے الفاظ سے باغ کی ایک ایک روش کو زندہ کر دیا ہے۔ میر حسن کا سا انداز بیان تو اردو کے کم مثنوی نگاروں کو حاصل ہے لیکن حقیقت نے جہاں سمیری گاؤں کی تعریف کی ہے وہ بھی اپنے اندازِ بیان، جزیات نگاری اور روانی کی بنا پر داد کی مستحق ہے۔

کہیں سبزہ ہے اور کہیں آبشار — کہیں ہیں درختاں خوش سایہ دار
یہ نقشہ ہے بستی کی تعمیر کا۔ — کہ گویا اک عالم ہے تصویر کا
سر پا وہ اک کان ہے حسن کی — وہ بستی نہیں جان ہے حسن کی
ہر اک کوچہ اتنا ہی مرغوب ہے — کہ جیوں کوچۂ زلف محبوب ہے !
غرض جو گلی ہے سو گلزار ہے ! — بہار گل و رشک گلنار ہے۔

اسی طرح بھوانی باغ کے منظر کا بیان ملاحظہ ہو۔

رکھے یہ رابنی کا سرو عالم　　قد موزوں ہو جس کو دیکھکر خم
سمن بالا و ریحان ہم آغوش!　　زمیں از سبزۂ تر پرنیاں پوش
کسی جانب کو پھولوں کی مہک تھی　　کسی جانب کو سبزے کی لہک تھی
ہر اک سنبل کا ایسا پیچ تھا خوب　　کہ بل بل جائے جس پر زلف محبوب
جہاں میں باغ ایسا کوئی کم ہے!　　نمونہ جس کا اک باغ ارم ہے

چشمۂ خوشگوار کا پانی، آب حیات کو شرمسار کر رہا ہے ؎

یہ جاں بخش وہ چشمۂ خوشگوار　　کہ آب حیات اوس سے ہے شرمسار

میلے کا ہجوم باغ کی خوبصورتی میں اضافہ کر رہا ہے۔ پوجا پاٹ کرنے والوں اور بھوانی کے میلے میں شریک ہونے والوں کا ہجوم ہے۔ ہر ایک اپنے آپ میں مگن ہے۔ لوگ خوب بن سنور کر آئے ہیں۔ پری جمالوں کی آمد اور ان کی زرق برق پوشاکوں نے ایک سماں باندھ رکھا ہے حقیقت نے اس میلے کی جزیات کو نہایت خوبصورت انداز میں بیان کیا ہے۔ اس منظر کو بیان کرنے میں حقیقت نے حسب عادت مختلف شاعروں کے اشعار دیئے ہیں۔ ان میں سے جن اشعار کے شاعر کی شناخت میں حافظے نے مدد دی ہے۔ ان کے آگے شاعر کا نام بھی لکھ دیا گیا ہے۔

میلے کا منظر

لباس زری میں ملبس تمام　　سجے اور سجائے سبھی خاص و عام　(میر حسن)
کوئی بت کی پوجا میں مالوف واں　　کوئی یاد میں حق کی مصروف واں　(　"　)
کرے کوئی اشنان جا نہر میں　　لب نہر اک اور ہے گہر میں
ملاوے ہے نظروں سے نظریں کوئی　　لڑاوے ہے آنکھوں سے آنکھیں کوئی

نوٹ: جیسا کہ صراحت کر چکا ہوں کہ حقیقت نے بہت سے دوسرے اساتذہ کے اشعار جذب عشق میں دیدیئے اور ان شعرا کے نام نہیں لکھے ہیں جس کی بنا پر التباس ہوتا ہے۔

بجادے کوئی دمدمے کوئی دف — بھبن بیٹھا گادے کوئی اک طرف
کہے کوئی قصّہ کرے کوئی نقل — جسے سن کے حیران رہ جائے عقل
ہنڈولوں پہ بیٹھے کئی رشک ماہ — دلوں کو تہہ و بالا کرتے تھے آہ
کہیں ریچھ بندر قلندر لڑائیں ! — مداری پرمل کے کبوتر بنائیں (میرحسن)
کہیں نٹ تماشا دکھاتے نیا — جواں کو دیا کوئی بوڑھا بنا
جدھر دیکھو اک پارۂ ماہ ہے — وہ مکھڑا کہ بس اللہ ہی اللہ ہے
دکھاوے کوئی اپنی چھب مسکرا — کوئی ناز سے لے بدن کو چھپا
جسے دیکھو اک آفت جان ہے — نہیں حسن اک گویا طوفان ہے
اگر دیکھو صورت نہ ہر ماہ کی — نظر آوے بس قدرت اللہ کی
اِدھر اور اُدھر آتیاں جاتیاں — پھریں اپنے جوبن کو دکھلاتیاں (میرحسن)

سراپا حقیقت نے جذبِ عشق میں نثر کے تاثر میں شدت پیدا کرنے کے لئے جو اشعار دیئے ہیں وہ نہایت موزوں و مناسب ہیں اور ان کا استعمال برمحل ہے۔ اس کے علاوہ اس داستان میں جو سراپا کھینچا گیا ہے۔ وہ مختلف اساتذہ کے اشعار پر مشتمل ہے جہاں مختلف اساتذہ کے اشعار دیئے ہیں وہاں ان کے انتخاب میں ایک ہی بحر ہونے کی نزاکت بھی رکھی گئی ہے۔ ان منتخب اشعار میں کچھ تو مفاعلین مفاعلین مفعول کی بحر میں ہیں اس میں نعت اور حمد بھی شامل ہیں۔ لیکن بیشتر مفعولن مفعولن فعل کی بحر میں ہیں۔ جو مثنوی کی مرغوب و پسندیدہ بحر ہے۔ حقیقت کی اس محنت و جانفشانی کی داد دینی چاہیئے کہ انھوں نے ایک ہی بحر اور وزن کے مختلف فارسی اور اردو کے اشعار یکجا کر کے محبوب کا سراپا بیان کیا ہے۔ جذبِ عشق میں اشعار کے استعمال میں حقیقت نے شاعر کا نام نہیں بتایا لیکن سراپا میں انھوں نے اس بات کی

صراحت کردی ہے کہ یہ سراپا مختلف اساتذہ کے اشعار کے ملا دینے سے ظہور میں آیا ہے۔

"اس لئے چند اشعار دُرِ نثار کو استادوں کے بیچ وصف سراپا اوس آفت جان کے لکھتا ہوں"۔ ؎

زسر تا پا فرد دایم چو مویش — شوم روشن ضمیر از عکس رویش

عیاں یوں موئے سر تھے عنبر آلود — کہ جیسے شمع کی شعاع پہ ہو دود

زفرق او دو نیمہ نافہ را مل !! — درآوردہ بہ نافہ کار مشکل !!

پریشان رخ پہ یوں زلفیں تھیں یکسر — رگ ابر سیہ ہو جیسے مہ پر !

فکر دید از جبیں چوں ماہ ہمسر — زخجلت داغ بر دل گشت یکسر

یہ خونریزی پہ تھے ابروئے پر خم — بیک جنبش کریں قتل دو عالم

دو گوش ایسے رکھے تھی وہ سمن بر — کہ پکڑیں جس کے آگے کان گلرد

کریں مژگان جھپک کر کچھ جو تقریر — دلوں کے پار ہو دیں دشنۂ تیر

وہ کیفی اوس کی آنکھیں چشم بد دور — ہے نرگس جس کے آگے چشم بے نور

نگہ کافر وہ گر جس سے لڑ جائے — تو گویا اوس پہ اک بجلی سی پڑ جائے

غرض وہ ترک چشم ایسی ہیں خونریز — کرے ہیں خون ناحق دن میں سو بار

ابھی بلوائے خون مردماں ہو !! — جو حق بینی نہ ان کے درمیاں ہو

بلندی حسن کی بینی دکھادے — بھڑک نتھنوں کی دل کو تلملائے

رخ اوس کا ایک شعلہ حسن کا تھا — نظر کو خیرگی جس سے ہو پیدا

جہاں میں شور سن کر اوس کے لب کا — گیا چرخ چہارم پر مسیحا !

دے اوس کے تئیں شہد و شکر باج — در دنداں کو دے سلک گہر باج

وہ دنداں آبدار اس سیم بر کے
کہ سوراخ ادن سے ہیں دل میں گہر کے

مسی آلود لب پر رنگ پاں یوں[1]
سواد ابر میں قوس قزح جوں!

اگر تنگی دہن کی دیکھ پاوے
تو پھر خجلت سے غنچہ منہ چھپاوے

ادسے کیا کیا جھکا دے عشق اے آہ
جسے چاہ زنخ کے ادس کی ہو چاہ

ہوئی غب غب سے خوبی ادس کی دونی
فقط یہ حسن ہی کی ہے فسوں نی!

قرار دل بود پایاب ایں جا!
کہ ہم چاہ است وہم گرداب ایں جا

نہیں گردن کی کچھ تعریف ہوتی!
وہ ہے گویا صراحی دار موتی

کہے وہ اس کی خوبی ہائے گردن
جو تیغ عشق سے کٹوائے گردن

اگرچہ ادس کی جگنی بھی بھلی تھی!
گلے کے ہار کی چمپا کلی تھی!

برد دوشش زدہ طعنہ سمنارا!
گل اندر جیب کردہ پیراہن را

یہ ساعد پر نزاکت تھی عذدار
رگ گل کی بھی نسبت جس پہ ہو بار

کلائی یہ کہ گویا وہ کلائی!!
خدا نے اپنے ہاتھوں سے بنائی

حنا سے سرخ یوں تھا پنجۂ ماہ
کہ جیوں خوش خط لکھیں سرخی سے اللہ

دو پستاں ہر یکے چوں قبۂ نور
حبابے خاستہ از عین کافور!

یہ گورے گورے ادنے پیارے پیارے
کہ دیکھے سے ہو دل کو بے قراری

یہ پستاں ادس کے رکھتے تھے کرختی
دکھاوے جن کا عشق ایام سختی!

اگر دیکھے انھیں نامرد ذاتی!!
عجب کیا وہ بھی کوٹے اپنی چھاتی

شکم تا سینہ لوح صاف ہے ایک
جو ہے ادس میں تو نون ناف ہے ایک

۱؎ میر حسن نے مسی آلود لب پر رنگ پاں کو یوں بیان کیا ہے ؎ سودا دیارِ بدخشاں کی شام

میانش ہوئے بل از موئے سیمیں
زباریکی براداز موئے سیمیں

کروں کیا ظاہر اب وصف نہاں کو
حیا دانتوں میں لاتی ہے زباں کو

سخن نم زساق اوکہ چوں مست
بنائے حسن اس میں ستوں مست

صفائی اوس کی رانوں نے یہ پائی
کہ جوں آئینہ میں صورت دکھائی

کہوں اوس پشت پا سا کیونکہ مہ کو
مقابل اوس کے ہو دے منہ تو دیکھو

کف پا اہیں کے ایسے پہنچے لال
کیا ہے خون ابھی گویا کہ پامال !

یہ پوشاک اوس کی سے شرماتے ہے برق
کہ پیدا ہوتے پھر چھپ جاتے ہے برق

یہ زرق و برق اور یہ غرق زیور
نہ ٹھہرے ٹک نگاہ اوس ماہرو پر

خرام اب کیا کہوں اوس فتنہ گر کا
کہ تھا ہر اک قدم پر حشر برپا

لکھوں کیا گفتگو کا یہ تھا انداز !
کہ تھا ہر اک سخن میں عشوۂ و ناز

ادا انداز و شوخی دلربائی !!
ہر اک طناز نے اوس سے اڑائی

یہ گرمی حسن کی اوس نازنیں پر
کہ گویا مہ اتر آیا زمیں پر

سبھی حیرت سے اوس کے محو دیدار
وہ اک یوسف تھی اور لاکھوں خریدار

بہ سن و سال آں کافر ستمگار
مثال ماہ دو ہفتہ وہ دو چار

نہ ہرگز بد دلش بارے نشستہ
نہ یکبارش بپا خارے شکستہ !

بنودہ عاشق و معشوق کس را !
ندارہ رہ بخاطر ایں ہوس را

زیبرنگ فلک آں ماہ غافل
کہ می آید بہ بیش اکنون مشکل[1]

۱۔ جذبِ عشق ص ۷، ۸، ۹

جذبِ عشق کی ہیروئن

اردو ادب میں مثنوی زہرِ عشق کی ہیروئن کو اپنے کردار کی خصوصیات کی بنا پر نقادوں نے ایک مکمل ہیروئن قرار دیا ہے۔ جذبِ عشق کی ہیروئن بھی اپنی صفات میں ایک مکمل عورت کا کردار ہے۔ وہ بہادر اور نڈر ہے اور راہِ عشق کی سختیوں سے بھی آگاہ ہے۔ ہر چند کہ اس کا عشق ایک نظری عشق ہے۔ اور وہ اپنے محبوب کے بارے میں زیادہ نہیں جانتی۔ لیکن اسے اپنے محبوب کی محبت کا کامل یقین ہے اور کسی صورت نہ تو اس کے خلاف کسی بدگمانی کو اپنے دل میں راہ دیتی ہے اور نہ ترکِ عشق پر آمادہ ہے چنانچہ جب اس کی بے قراری کو دیکھتے ہوئے اس کی سہیلیاں اس کو صبر و ضبط کی تلقین کرتی ہیں اور اس کو اس اجنبی کی خاطر اپنی حالت خراب کر لینے پر برا بھلا کہتی ہیں تو معلوم ہوتا ہے کہ اس کی سہیلیوں کے لئے تو یہ نظارہ بازی محض ایک تماشہ کی صورت رکھتی ہے لیکن اس کے دل میں ہرجائی پن نہیں۔ بلکہ ایک ہی شخص کا ہو رہنے کی تمنا ہے۔ اپنی سہیلیوں کے جواب میں وہ کہتی ہے کہ نہ جانے اس یار دغادار پر کیا گزری ہو گی۔ ایک طرف وہ اپنی سہیلیوں کو ان کی نصیحتوں کے جواب میں کہتی ہے۔ ؎

کہیں ان کا بھی دل اب تو لگا دے — مری بے تابیاں ان کو بتا دے
پڑے گر بارِ عشق ان پر یہ بھاری — تو سمجھیں کچھ یہ میری بے قراری!
لگے دل ان کا اک خونخوار سے جب — نصیحت اپنی یہ نہ کر رکھیں تب

پھر خیالِ محبوب سے مخاطب ہو کر یہ کہتی ہے۔ ؎

نہیں اب نیند بھی آتی مجھے ہائے — جو دیکھوں خواب میں پیارے تجھے ہائے
یہ کیسی کر گیا تو مجھ سے ظالم — توقع تو نہ تھی یہ تجھ سے ظالم
نہیں کچھ بس مرا اب آہ چلتا — کہ دل کو لے گیا اک راہ چلتا!

بتا تو کب تلک تجھ سے رہوں دور
نہ رکھ اب تو مجھے اپنے سے مہجور

بلا لے پاس مجھکو یا تو ہی آ !
بہر صورت مجھے صورت دکھا جا

نہ پاتی جب جواب اس سے تو روتی
یونہی رو رو کے اپنی جان کھوتی

خیال یار سے یہ تھی شکایات
کہ اس میں ہوئی سحر اور کٹ گئی رات

فراق

چھٹے دل سے ہزاروں بال تالب
ولے دل جانتا تھا اوس کو یالب

نہ آنکھیں دیکھتی تھیں صورت خواب
نہ تن میں کچھ رہی تھی طاقت و تاب

جلاتی تھی جگر کو آہ غم کی !
بسان برق تھی آہ اوس صنم کی

یہ سینے میں بھڑکتا تھا دل زار
قفس میں جوں ہو مرغ نو گرفتار

کبھی تھی نوحہ گر با دیدۂ تر !!
کبھی وہ پیٹتی تھی سینہ و سر

کبھی آنسو بہاتی چشم تر سے !
کبھی کہتی وہ کچھ دیوار و در سے

کبھی منہ نوچتی سر پیٹ لیتی
کبھی روتی تڑپتی جان دیتی !

کسی صورت نہ صدمہ غم کا جاتا
مگر آرام غش آتا تو آتا !

اگر بالفرض تھی وہ عید کی صبح
شب ماتم سے بھی گزری بہت تلخ

عجب حالت رہی تا صبح طاری
نہ تھا کچھ کام جز اختر شماری

یہ دیکھا آخر کو اوس کا حال ادراک
گریبان صبح صادق نے کیا چاک

جذبِ عشق کی ہیروئن کا دل لہولہو ہے۔ اور ساری رات، اس نے محبوب کے فراق میں تڑپ کر کاٹی ہے لیکن احتیاط لازم ہے اور رازِ عشق کو چھپانا ہی عشق میں ضروری ہے لہذا وہ اپنی بے قراری کو جس صورت سے چھپاتی ہے وہ قابلِ داد ہے۔ سہ

ہوئی جب صبح تب بستر سے اٹھ کر — سرشک چشم سے منہ دھو سراسر
ہوئی مشغول کاروبار خانہ — کہ تھی خود آپ ہی مختارِ خانہ
نہ ہو اس راز سے تا کوئی آگاہ — بہانے سینکڑوں کرتی تھی وہ آہ
سبھوں سے بولتی ہنستی بظاہر — نہ ہوں تا حال باطن سے وہ ماہر

لیکن مشہور ہے کہ عشق اور مشک نہیں چھپتے ؎

چھپاتی تھی وہ گو حال دل زار — کہیں چھپتے ہیں عشق و مشک پر یار
وہ تا مقدور رکھتی تھی چھپائے — "ولے سر میز واں ہر دم نہ جانے
سرشک سرخ وہ رنگ زرد اس کا — بتاتا انتہائی درد اس کا
جو دانا تھے وہ اس کو پا گئے تھے — جو تھے ناداں وہ سب گھبرا رہے تھے

عاشق کے ڈوبنے سے قبل جب مقررہ مقام پر تالاب کے کنارے ہیروئن اپنے محبوب سے ملنے آتی ہے تو وہاں موجود ہجوم کو پا کر نہ تو گھبراتی ہے اور نہ ہی ملاقات کا ارادہ ملتوی کیا محبوب سے ملاقات کرتی ہے۔ اور کہتی ہے کہ میں خلق میں تمھارے لئے بدنام ہوئی لیکن اس کا کیا خطرہ عاشقوں کو بدنامی سے نام آوری ہے اگر عاشق ننگ و نام سے گزرے اور قید ناموس میں رہے تو اس کو فرقہ عشاق میں سب نام رکھیں۔" جب اس کے عزیز نوجوان کو قتل کرنا چاہتے ہیں اور وہ ڈوب جاتا ہے تو یہ نازنین بھی اپنے قول سے پیچھے نہیں ہٹتی اور آخر ایک دن آکر اسی تالاب میں ڈوب جاتی ہے۔ جذبِ عشق کی ہیروئن راہ عشق میں ثابت قدم رہتی ہے۔

نوجوان کا کردار

جذبِ عشق میں یہ بات تو واضح ہے کہ ہیروئن مذہباً ہندو ہے لیکن ہیرو کے مذہب کے بارے میں کوئی صراحت نہیں ملتی۔ چنانچہ یہ وثوق سے نہیں کہا جا سکتا کہ آیا ہیرو بھی ہندو ہے البتہ اسے مرہٹہ لشکر کا ایک سپاہی

بنایا گیا ہے لیکن بعض مسلمان افراد بھی مرہٹوں کے لشکر میں شامل ہوتے تھے۔ بہر حال اس بات کی اتنی زیادہ اہمیت نہیں ہے کیونکہ عشق ان تمام باتوں سے بالاتر ہوتا ہے اس داستان کا ہیرو ایک مکمل ہیرو ہے۔ اور اس کی پاکدامنی اس کو عام داستانوں کے ہیروؤں سے ایک علیحدہ اور امتیازی مقام عطا کرتی ہے۔ اس داستان میں بھی اظہار عشق عورت کی طرف سے ہے ایک ہندو عورت کی طرف سے، ہندی شاعری میں بھی عورتوں کو ہی عاشق بنایا گیا ہے۔ جذبِ عشق میں وصل کے اعتبار سے عام داستانوں کی سی فضا ہے۔ یعنی ہیروئن سپردگی کا شدید جذبہ رکھتی ہے اور اکثر مقامات پر ہیرو کو دولت وصل سے شاد کام ہونے کا مشورہ دیتی ہے۔

اس کی بے قراری کو بیان کرتے ہوئے خود مصنف نے اسے عاشق ہی ظاہر کیا ہے" عزیزو اس عاشق زار نے یہ پیغام شکوہ آمیز ایسے معشوق کا جو مقام لیلائی سے نکل کر دشت مجنوں میں قدم زن تھی" چنانچہ اولین ملاقات میں ہی داستانوں کی روایت کے مطابق جذبہ عشق کی ہیروئن دعوت شب بسری دیتی نظر آتی ہے۔

" یکدم کلبۂ احزاں اور تاریک میرے کو نور قدم سے رشک افزائی شب ماہ کا کو....." ؎

بھلا آپس میں مل بیٹھیں کوئی دم — کہ پھر پیارے کہاں تم اور کہاں ہم
غنیمت ہے جو کوئی دم دید کر لیں — شب ماتم کو روزِ عید کر لیں !

لیکن ہیرو اس مرحلے پر اس دعوت کو قبول نہیں کرتا۔ داستان میں بہت سے ایسے نازک موقع آتے ہیں جب ہیرو اس دعوت کو قبول کر کے اپنے آپ کو وصل کی دولت سے شاد کام کر سکتا ہے لیکن اس کا عشق سچا ہے اور وہ بوالہوس نہیں۔ اس اعتبار سے مہ اردو کی عام داستانوں کے روایتی ہیروؤں سے بالکل مختلف نظر آتا ہے۔

اور موقع پر وہ اپنی محبوبہ کی دعوت کو نہایت خوبصورتی سے ٹال دیتا ہے۔ بار بار اس کی محبوبہ کی طرف سے اصرار ہوتا ہے کہ " اے خدا ناترس جلدی اپنی دولت وصل سے خرسند کر۔۔۔" لیکن اس کے پائے ثبات میں لغزش نہیں آتی اور ہوس پہ ہمیشہ عشق غالب آتا ہے اور وہ جواب دیتا ہے" بہتر ہے کہ ابھی اس قدر تعجیل کو کام مت فرما کس لئے جو

بمطلب می رسد جو پائے کام آہستہ آہستہ　　زدریا می کشد صیاد دام آہستہ آہستہ

مجھکو تو فریق بحر تفکر کا جان جو شبانہ روز اسی منصوبے میں غرق ہوں جو کیونکر نہال وصال تیسرے سے متمتع اور کامیاب ہوں پر تو دل قوی رکھ جو اگر تقدیر سے تدبیر لڑ جائے ہے تو کوئی دم کو بے زحمتِ اغیار تا ابد دولت ملاقات یکدگیر سے بہرہ مند ہوتے ہیں۔

زار نالے نہ کر شکیبا ہو ! !　　عشق کا تانہ کام رسوا ہو !! "

گو ہیرو بھی انسان ہے۔ اور اس کی بھی حالت عشق میں بری ہے۔ لیکن ہر مرحلے پر وہ جنسی بے راہروی سے بچ جاتا ہے اور آخر کار راہ عشق میں مردانہ وار جان دے دیتا ہے۔ ہیرو کے اسی کردار اور عمل کی بنا پر جذبِ عشق کا ہیرو، عام داستانوں کے ہیرو سے علیٰحدہ اور ممتاز نظر آتا ہے۔ دشمنوں سے مقابلہ کرنے سے وہ نہیں ڈرتا۔ اس وقت بھی وہ گھبراتا نہیں اور اپنی محبوبہ کو مقام فساد سے دور چلے جانے کو کہتا ہے وہ ہمت، شجاعت، بہادری۔ نیک نفسی اور پاکیزگی کردار کا نمونہ ہے۔ اپنی بہادری اور جوش کے عالم میں وہ یہ بھی بھول جاتا ہے کہ اسے تیرنا نہیں آتا۔ لیکن دشمن کے تعاقب کو ترک کرنا وہ بہادری کے لئے عار سمجھتا ہے چنانچہ اپنے ہی جوش و جذبے کے سبب تالاب میں ڈوب جاتا ہے۔

گزشتہ صفحات میں بیان کیا جا چکا ہے کہ اس کا انجام میر تقی میر کی مثنوی دریائے عشق سے ملتا ہے۔ حقیقت تو یہ ہے ہیرو کی موت کے سلسلے میں جو اشعار دیئے ہیں وہ بھی دریائے عشق

سے ہی لئے گئے ہیں۔ اور بعض اشعار حقیقت کے اپنے ہیں

میر کی مثنوی دریائے عشق کے انجام سے چند اشعار ملاحظہ ہوں۔

خلق یکجا ہوئی کنارے پر ! حشر برپا ہوئی کنارے پر !
نکلے باہم دلے موئے نکلے دونوں دست وبغل ہوئے نکلے
جو نظر ان کو آن کرتے تھے ایک قالب گمان کرتے تھے

جذبِ عشق کا انجام ملاحظہ ہو۔ اس میں میر کے اشعار بھی مصنف نے شامل کر دیئے ہیں۔ ؎

اب و عم مادر و برادر سب ! خاک افشاں و نالہ آہ بہ لب
آتش غم سے دل جگر بریاں آتش غم سے دل جگر بریاں
خلق یکجا ہوئی کنارے پر حشر برپا ہوئی کنارے پر
دام داروں سے سب نے کام لیا آخر ادنکو اسیر دام کیا !
نکلے باہر دلے موئے نکلے دونوں دست وبغل ہوئے نکلے
ربط چسپاں بہم ہویدا تھا !! مر گئے تب بھی شوق پیدا تھا
ایک کا ہاتھ ایک کی بالیں ایک کے لب سے ایک کو تسکین
جو نظر ان کو آن کرتے تھے ایک قالب گمان کرتے تھے
مل رہے تھے یہ دونوں وصلی وار کر جدا ہونا ان کا تھا دشوار !
کیوں نہ دشوار ہووے ان کا فصل بان دے دے ہوا ہو جن کا وصل
حیرت کارِ عشق سے مردم شکل تصویر آپ میں تھے گم

حقیقت نے بھی میر کی مثنوی کی طرح آخر میں عشق کی تاثیر بیان کی ہے لیکن ان اشعار

میں وہ سوز و گزارہ تاثیر اور روانی نہیں ہے جو میر کے ہاں ہے۔ ؎

فقط یہ کیا محبت سے ہوا ہے — محبت نے تو کیا کیا کچھ کیا ہے !
محبت ہے اک آفت سے عبارت — محبت نے کیا لاکھوں کو غارت
محبت ہے وہ کچھ جس نے کہ ناگاہ — ملا دیں خاک میں یہ صورتیں آہ
نہ چھوڑے پر نہ چھوڑے جان و دل عشق — کہ ہے غارت گر ایمان و دل عشق !
یہ آتش کب بیے ہے کے جانو ! — اس آتش نے جلایا اک جہاں کو
سبھی کچھ پھونکدے جیدھر ہو سرکش — یہ آتش ہے یہ آتش ہے یہ آتش
یہ آتش جس کے سر پہ شمع ساں ہے — تو یہ بھڑکے کہ قدموں سے گزر جائے
بیان کس سے ہو اس آتش کی طاقت — غرض یہ آگ ہے سوز محبت
محبت نے بہت بے جان کئے ہیں — کہوں کیا کیا جو کارستان کئے ہیں
نہو جو قائل تاثیر عشق آہ ! — سنے وہ آگے یہ احوال جانکاہ

تاثیر عشق کے بیان میں میر تقی میر کے اشعار ملاحظہ ہوں۔

عشق ہے تازہ کار و تازہ خیال — ہر جگہ اس کی اک نئی ہے چال
کہیں ناسق ہیں اس نے خون کئے — کہیں . تیغ لئے
خارِ خارِ دل غمزیاں ہے۔ — انتظار بلا نصیباں ہے!
جس کو ہو التفات اس کا نصیب — ہے وہ مہمان چند روزہ غریب
عشق کے دلفگار سارے ہیں — اس نے کیا کیا جوان مارے ہیں
کہیں آنکھوں سے خون ہو کے بہے — کہیں سر میں جنون ہو کے رہے
کہیں بیٹھے ہے دل میں ہو کر چاہ — کہیں رہتا ہے قتل تک ہمراہ
کشش اوسکی ہے ایک اعجوبہ — ڈوبا عاشق تو یار بھی ڈوبا!

مثنوی ہشت گلزار

مثنوی ہشت گلزار حقیقت کی سب سے طویل مثنوی ہے۔ اس مثنوی کا تنقیدی جائزہ لینے سے قبل یہ مناسب معلوم ہوتا ہے کہ مختصراً اردو مثنوی کی روایات اور تاریخ پر ایک نظر ڈال لی جائے۔

اردو مثنوی کی تاریخ

اردو کی دیگر اصناف شاعری کی طرح مثنوی بھی فارسی کی تقلید میں لکھی گئی۔ فارسی زبان کی مثنویوں کے موضوعات متنوع تھے۔ رزم و بزم اخلاق و تصوف اور عشق و عاشقی ان مثنویوں کے موضوع تھے۔ اردو میں بھی ابتدائی دور میں کم و بیش تمام موضوعات پر مثنویاں لکھی گئیں۔ لیکن رفتہ رفتہ تہذیبی، زندگی کے عروج اور شخصی حکومتوں میں تکلف و تصنع اور مجلسی زندگی کی رنگینوں نے تمام مثنوی نگاروں کی توجہ عشق و عاشقی تک محدود کر دی۔

اردو کی سب سے پہلی مثنوی فخر دین نظامی کی کدم راؤ پدم راؤ ہے۔ جو ۸۶۵ھ اور ۸۶۷ھ کے درمیان لکھی گئی۔ اس کے بعد ابتدائی دکنی دور کی مثنویاں معرفت و سلوک اور مذہبی عقائد پر مشتمل ہیں۔ اشرف، فیروز بیدری، شیخ خوب محمد چشتی شمس العشاق میراں جی اور شاہ برہان الدین جانم بعد نمایاں مثنوی نگاروں میں ملا وجہی کا نام سرفہرست ہے۔ وجہی کے بعد لکھی جانے والی مثنویوں میں معدودے چند کے علاوہ

بیشتر مثنویوں کا موضوع عشق و رومان ہے۔ ایسی مثنویوں میں لیلےٰ مجنوں، طوطی نامہ سیف الملوک و بدیع الجمال، چندر بدن مہیار، بہرام و حسن بانو، پسول بن، وغیرہ قابلِ ذکر ہیں۔

دکن ہی میں سترھویں صدی میں سماجی و سیاسی حالات کے اثرات سے متاثر ہو کر متصوفانہ مثنویاں بھی لکھی گئیں۔ نقادوں کا متفقہ فیصلہ ہے کہ اس دور میں چند بہترین متصوفانہ مثنویاں لکھی گئیں۔ جن میں ذوقی کی وصال العاشقین بحشرتی کی چت لگن، اور بجری کی من لگن خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔ اس کے ساتھ ساتھ عشقیہ مثنویوں میں سراج کی "بوستان خیال" نہایت اہم ہے۔

مثنوی شمالی ہند میں

شمالی ہند کی پہلی مثنوی افضل کی بکٹ کہانی ہے۔ شمالی ہند کی متصوفانہ مثنویاں، دکنی مثنویوں کے مقابلے میں بلند پایہ نہیں ہیں۔

شمالی ہند کی پہلی قابلِ ذکر مثنوی نقادوں کے خیال میں شاہ حاتم کی بہاریہ مثنوی ہے۔ یہ مثنوی بھی بہت زیادہ طویل نہیں ہے۔ عہد محمد شاہی میں میر فضائل علی کی مثنوی قابلِ ذکر ہے۔

اس کے بعد میر و سودا کا دور مثنوی نگاری کا بھی بہترین دور ہے۔ اس عہد کو شمالی ہند میں دبستان دہلی کی مثنوی نگاری کا زمانہ شباب کہا جا سکتا ہے۔ اس دور میں مثنوی کے موضوع متنوع ہیں۔ ڈاکٹر گیان چند لکھتے ہیں: "سودا اور میر کے یہاں مثنوی کا موضوع بے پایاں ہو گیا۔ سودا نے مثنوی کو ہجو، اخلاق، ادبی تنقید موسم، خط و کتابت، مدح وغیرہ کے اظہار کا ذریعہ بنا دیا۔ میر نے جانوروں کے

احوال، گھر کی حالت، شکارنامہ، بیان مرغ بازاں، بے ثباتی دُنیا، ہولی، جشنِ شادی ہجو و مدح وغیرہ کے موضوعات پر کچھ لکھ کر مثنوی کی افادیت اور صلاحیتوں کو اجاگر کیا۔"[1]

لیکن اس قدر متنوع موضوعات کے باوجود اس دور کی مثنوی نگاری کی خصوصیت اس کی رومانیت اور میر و سودا کی مثنویوں میں پایا جانے والا سوز و گداز، دلی کے دبستان شاعری کے مزاج کی غمازی کرتا ہے۔

میر کی تقلید میں یا اس سے متاثر ہو کر راسخ عظیم آبادی، قائم چاندپوری، اور مصحفی نے مثنویاں لکھیں۔ ان کے بعد حکیم بسمل نیض آبادی، اعظم الدولہ سرور دہلوی جعفر علیخاں راغب، قاضی محمد صادق اختر اور طالب علی عیشی کی لکھی ہوئی مثنویاں ملتی ہیں۔ یہ سب شعرا ناسخ و آتش کے ہم عصر تھے۔ اور اردو مثنوی کے ارتقا میں ان کا نام ناگزیر ہے۔

ادھر لکھنو میں میر حسن نے سحر البیان لکھ کر مثنوی نگاری کا ایک معیار قائم کیا۔ لیکن کوئی بھی اس کی تقلید میں کامیاب نہ ہو سکا اور رفتہ رفتہ درباداری اور عام لکھنوی مذاق سخن نے جس طرح شعرا کو متاثر کیا اس کا اثر غزل گوئی کے ساتھ ساتھ مثنوی نگاری پر بھی پڑا۔

لکھنؤ کے دبستان شاعری میں سحر البیان کے بعد دوسری اہم ترین مثنوی گلزار نسیم ہے۔ سحر البیان اگر سادگی میں ممتاز ہے تو گلزارِ نسیم تخیل، حسن تعلیل رعایت لفظی، ایہام وغیرہ کے سبب نمایاں ہے۔ اس میں لکھنؤ کی زبان کے بہترین

۱:۔ شمالی ہند میں مثنوی کا ارتقا صہ ۱۲۵۔ مطبوعہ انجمن ترقی اردو علی گڑھ۔

نمونے ہیں. لکھنؤ کے خاص قسم کے تہذیبی ماحول میں اس کے بعد آنے والے مثنوی نگاروں کو گلزارِ نسیم کی مرصع بیانی پسند آئی۔

گلزارِ نسیم لکھنؤی مثنوی نگاری کا نقطۂ عروج ہے. مرصع بیان کے اعتبار سے بھی بعد کے مثنوی نگار اس پایے کی مثنوی نہ لکھ سکے۔

اس دور کے نمایاں مثنوی نگاروں میں قلق، نواب محبت خان محبت، میر محمد حسین عرف تجلّی، اور میر غلام علی عشرت وغیرہ قابلِ ذکر ہیں۔

تقریباً اسی دور میں ایک نمایاں نام شاہ حسین حقیقت کا ہے۔ شاہ حسین حقیقت کی طویل مثنوی "ہشت گلزار" میں دبستان لکھنؤ کی رنگینی اور عبارت آرائی کے ساتھ ساتھ صفائی بیان اور سادگی اور منظر نگاری کی خوبیاں بھی پائی جاتی ہیں۔ ان کی مثنوی ہشت گلزار امیر خسرو کی مثنوی "ہشت بہشت" کا آزاد ترجمہ ہے. جس کے اشعار کی تعداد چار ہزار سے زیادہ ہے۔

ڈاکٹر گیان چند جین نے اپنی عالمانہ کتاب "شمالی ہند میں اردو مثنوی کا ارتقا" میں بہت سے لکھنؤی مثنوی نگاروں کا تذکرہ کیا ہے اور ان کے فنی کارناموں کی قدر و قیمت کا یقین کیا ہے۔ لیکن حیرت ہے کہ وہ شاہ حسین حقیقت کو بالکل ہی نظر انداز کر گئے ہیں۔ حالانکہ حقیقت بھی لکھنؤ کے اہم مثنوی نگاروں میں شمار کئے جانے کے قابل ہیں۔ آئندہ صفحات میں ان کی مثنوی ہشت گلزار کا جائزہ لیا جائے گا۔

شاہ حسین حقیقت کی یہ مثنوی چار ہزار سے زائد اشعار پر مشتمل ہے۔ حقیقت نے یہ مثنوی اپنے سفر کرناٹک کے دوران نواب عبدالقادر خاں بہادر ثابت جنگ ابنِ نواب والاجاہ والی کرناٹک کی خدمت میں پیش کرنے کی خاطر لکھی تھی۔

مندرجہ ذیل شعر سے اس مثنوی کا مادہ تاریخ تصنیف برآمد ہوتا ہے۔ جو ۱۲۲۵ھ ہے

؎ مثنوی یہ جو گل سے ہے رنگین ہے گل نوبہار خلد بریں

۱۲۲۵ھ

تاریخ تصنیف کے سلسلے میں حقیقت لکھتے ہیں۔ ؎

نامۂ نامی جب ہوا یہ طے سنہ تھے پچیس اور بارہ سے ۱۲۲۵

ختم جس روز مثنوی یہ ہوئی گیارہویں تھی ربیع الاوّل کی

یہ طویل مثنوی حقیقت نے صرف تین ماہ کے مختصر سے عرصے میں لکھی تھی جس سے ان کی زود گوئی اور قادر الکلامی کا اندازہ ہوتا ہے۔ اس مثنوی کا ماخذ امیر خسرو کی مثنوی ہشت بہشت ہے۔ اردو نظم میں ڈھالنے سے قبل حقیقت نے خسرو کی اس مثنوی کو کڈ نامی ایک انگریز کی فرمائش پر جو ہولکر کی فوج میں جنرل کے عہدے پر فائز تھا۔ آسان نثر میں لکھا تھا۔

طباعت

ہشت گلزار مطبع مصطفائی سے شائع ہوئی۔ اشرف علی اشرف نے اس کی تاریخ طباعت کہی جس سے سنہ طباعت ۱۲۶۷ برآمد ہوتا ہے

کیا چھپی مثنوی حقیقت کی! کھل گیا جس سے لالہ زار طبع

لکھا اشرف نے مصرع تاریخ ہشت گلزار ہے بہار طبع

۱۲۶۷ھ

وجہ تالیف

حقیقت مثنوی کی وجہ تالیف میں لکھتے ہیں :۔

بولا اے جوہری دُرِ سخن ! ہے تجھے یاد شاعری کا فن
شعر تو لعل و دُر سے بہتر ہے کب وہ لعل و گہر برابر ہے
ہیں ترے پاس اب جو دُرِ ثمین آج شاہوں کے گنج میں تو نہیں
بے بہا گوہر خوش آب ہر ایک درخور گوش آفتاب ہر ایک
ایسے کمیاب دُرِ بیش بہا ! درج دل میں ہیں کیوں چھپائے بتا
ہیں پر آنسو تیر سان یکسر منسلک ان کو سلک نظم میں کر
بے خطر جا پھر اس جناب کو تو نذر دے ان درخوش آب کو تو
بس یہی تیرے تئیں وسیلہ ہے بلنے کا واں یہ روز حیلہ ہے
کیونکہ وہ قدر دانِ فیض ہنر مشتریِ سخن ہے شام و سحر
ہے سخن کا بجان و دل خواہا ہے خریدار وہ سخن کا بجان[1]

ماخذ

اس مثنوی کا ماخذ امیر خسرو کی فارسی مثنوی ہشت بہشت ہے جو قصر بہرام گور کے نام سے بھی مشہور ہے۔ بہشت گلزار نام کی کئی اور مثنویاں بھی موجود ہیں۔ جو دوسرے شاعروں کی لکھی ہوئی ہیں۔ دکنی شاعر مقیمی کی ایک مثنوی بھی ہشت گلزار کے نام سے ملتی ہے۔ لیکن نام کی اس یکسانیت کے باوجود اس کا موضوع تصوف ہے۔ اسی طرح سندھی زبان میں بھی میر ٹھٹھوی کی ایک مثنوی ہشت بہشت کے نام سے موجود ہے۔

۱۔ ۱۔ ہشت گلزار ص ۲

حقیقت کی یہ مثنوی طبع زاد نہیں ہے۔ انھوں نے اعتراف کیا ہے کہ ان کی حیثیت اس نظم کے مترجم کی ہے۔ گو یہ ترجمہ لفظی نہیں آزاد ہے۔ چنانچہ حقیقت لکھتے ہیں ؎

گو کہ ہے خوب یا کہ ہے یہ زشت — لیک قصہ ہے یہ بہ ہشت بہشت
خسرو شاعراں نے جس کو کہا — فارسی کی زبان میں سرتاپا !
پیش ازیں اوس کو میں بہ نقش و نگار — فارسی میں کیا تھا نثر اے یار
نثر بھی ایسی ہی ہوئی وہ رقم — نثر جس پر نثار ہے ہر دم
طوطی ہند کا میں خوشہ چین — ہندی میں اب لکھوں ہوں اوس کے تئیں
ترجمہ اس کا میں نہیں کرتا — پر وہ قصہ کروں ہوں نظم جدا
ریختی کی زبان میں با انداز ! — خوش ہو سن جس کو بلبل شیراز[1]

اس صراحت کے ساتھ ساتھ حقیقت امیر خسرو کے مقابلے میں نہایت عجز و انکساری کا اظہار کرتا ہے۔ ؎

فی الحقیقت کہوں میں "دوست" — یعنی وہ مغز اور یہ ہے پوست
پوست گرچہ جو مغز شیریں نیست — بہر آں مغز پوست بہ زیں نسبت
الحقیقت کہا غلط تو نے !! — کی یہ بے منصفی غلط تو نے !!
مغز سے پوست کیونکہ ہوگا مغز — پوست ہے پوست اور مغز ہے مغز
ہے وہ لُبّ لباب مغز سخن — خار بن یہ ہے اور وہ گلبن !
یہ سُہا اور وہ مہر عالمتاب — ہے وہ آب حیات اور یہ سیراب
رشتہ یہ اور وہ در شاہوار — وہ گل تر ہے اور خشک یہ خار

---

۱ : ہشت گلزار، ص ۳

لیک اس خار کو اگر وہ جناب　　چشمۂ لطف سے کرے سیراب[1]

بہرام کے قصّے

شاہ بہرام گور کے قصّے کو امیر خسرو کے علاوہ کئی اور شاعروں نے بھی لکھا ہے۔ لیکن جو مقبولیت امیر خسرو کی مثنوی ہشت بہشت کو حاصل ہوئی۔ وہ کسی دوسرے شاعر کو حاصل نہ ہو سکی۔ حقیقت کا لکھا ہوا یہ قصہ تو شاعر کے بقول ترجمہ ہے۔ جن دیگر شعرا نے اس قصے کو بیان کیا ہے ان میں دکنی شعرا پیش پیش ہیں۔ ددلت دکنی نے ۱۰۵۰ ہجری میں بہرام و حسن بانو کے عنوان سے اس قصے کو اردو نظم میں باندھا تھا۔ ملک خوشنود نے بھی "ہشت بہشت" کے عنوان سے ایک مثنوی لکھی تھی۔ ڈاکٹر فرمان فتح پوری اس سلسلے میں لکھتے ہیں "ملک خوشنود نے ۱۰۵۶ ہجری میں مثنوی ہشت بہشت کے نام سے خسرو کی فارسی مثنوی "ہشت بہشت" کو اردو نظم کا جامہ پہنایا تھا۔" محمد باقر آگاہ کی ایک مثنوی ہشت بہشت ہے لیکن اس کا موضوع آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات مبارک اور ان کے معجزات اور صحابہ ہیں۔ طبعی دکنی نے اپنی مثنوی بہرام و گل اندام، نظامی گنجوی کی مثنوی ہفت پیکر کی تقلید میں لکھی تھی۔ شمالی ہند میں حیدر بخش حیدری نے ۱۲۲۰ ھ میں اس قصے کو اردو میں منتقل کیا تھا۔ اسی طرح میر فرخندہ علی نوتنوی نے قصہ بہرام گور کو اردو نثر میں ترجمہ کیا تھا۔ جس کا دوسرا ایڈیشن ۱۲۶۲ ھ (۱۸۴۵ سنہ عیسوی) میں شائع ہوا تھا[2]۔

گارساں دتاسی بہرام گور کے قصّوں کے بارے میں لکھتا ہے۔

"ہندوستان میں بہرام گور کے تین نسخوں سے واقف ہوں۔ ایک حیدری کا جس کا نام ہفت پیکر ہے۔ جو نظامی کی مثنوی کا نام ہے۔ دوسرا طبعی (ساکن گولکنڈہ) کا جو سنہ ۱۸۰۱ ھ (۱۶۷۱-۱۶۷۰) میں لکھا گیا۔ تیسرا حقیقت بریلوی کا

۱:۔ ہشت گلزار ص ۳ (۲) اردو کی منظوم داستانیں مطبوعہ انجمن ترقی اردو پاکستان ص ۸۹

جس کا سال تصنیف ۱۲۲۵ھ (۱۱-۱۸۱۰) اور نام ہشت گلزار ہے۔ غالباً یہ نام آٹھویں آسمان کی مناسبت سے رکھا گیا ہے۔ ورنہ نظامی کی ہفت پیکر اور باقی کی ہفت منظر کی مناسبت سے ہفت گلزار ہونا چاہیئے تھا۔ وجہ یہ ہے کہ ایران کے بادشاہ بہرام گور پسر یزدجرد کا قصہ ہے۔ جس کی سات بیویاں تھیں جو سات باغوں میں الگ الگ رہتی تھیں[1]۔"

فنی جائزہ

ہشت گلزار ایک ڈھیلے ڈھالے پلاٹ کی داستان ہے۔ یہ ایسی داستان نہیں ہے جس کی ذیلی داستانیں باہم مربوط ہو۔ اس میں سات داستانیں بیان کی گئی ہیں۔ ہر داستان اپنی جگہ مکمل ہے۔ اور ہر داستان میں ذیلی قصے اور آثار چڑھاؤ اور انجام و آغاز موجود ہے۔ ان ساتوں داستانوں میں سوائے اس کے اور کوئی باہمی ربط موجود نہیں ہے کہ یہ ایک ہی کردار یعنی شاہ بہرام گور کے سامنے بیان کی جارہی ہیں۔

آغاز داستان میں بہرام گور کی وجہ تسمیہ اور دلارام کنیز سے اس کی شدید محبت بیان کی گئی ہے۔ بعدازاں دونوں میں جدائی ہوتی ہے اور دلارام دوبارہ اپنے حسن تدبیر سے شاہ بہرام کو اپنا لیتی ہے۔ بہرام اور دلارام کی داستان یہاں تک ختم ہو جاتی ہے۔ باقی سات داستانوں میں دلارام آخر تک غائب ہے۔ چونکہ بہرام گور، دلارام کا فریفتہ ہو کر شب و روز سیر و شکار میں مصروف رہنے لگتا ہے۔ جس کے سبب اس کے ملازمین اور رعایا تنگ آجاتے ہیں۔ لہذا شاہ کا وزیر لقمان سات ایوان تیار کراتا ہے۔ ہر ایوان مختلف رنگ میں ڈوبا ہوا ہے۔ ان کی ساخت اور ساز و سامان اور ان میں موجود بادشاہ کی، محبوبائیں مختلف ملکوں سے تعلق رکھتی ہیں۔ باقی داستان میں دلارام کا کہیں تذکرہ

۱:۔ مطبوعات گارساں دتاسی ص ۱۸۳

نہیں آتا کہ آیا اس کا کیا حشر ہوا۔ کیونکہ بادشاہ اپنے شب و روز ان ایوانوں میں اور ان میں موجود مختلف ملکوں کی عورتوں کے ساتھ گزارتا تھا۔ لہٰذا بحیثیت مجموعی ہم اس پوری داستان کی ہیروئن دلارام کو نہیں قرار دے سکتے۔ آغاز داستان میں ہی اس کا کردار اپنا رول ختم کر دیتا ہے۔ یوں بنیادی طور پر یہ کوئی ایسا عشقیہ قصہ بھی نہیں کہلا جا سکتا جس کی ہیروئن اور ہیرو داستان کے روایتی انداز میں کسی کشمکش کا شکار ہوں۔ بلاشبہ دلارام اپنی حق گوئی کے سبب سے بادشاہ کے عتاب کا شکار ہو جاتی ہے۔ لیکن وہ مکمل ہیروئن نہیں ہے جو ہر داستان میں موجود ہو۔

ہشت گلزار میں بیان کی گئے والی تمام داستانیں علیحدہ علیحدہ ہیں۔ یہ مختصر داستانیں ہیں لیکن داستانوں میں پائی جانے والی دلچسپی اور تجسس جو قاری کے ذہن میں انجام سے جلد آشنا ہو جانے کی کیفیت جگاتی ہے ان داستانوں میں موجود ہے۔ ان داستانوں کا قاری ایک داستان کے ختم ہو جانے کے بعد دوسری داستان میں بیان کئے جانے والے حالات جاننے کا متمنی رہتا ہے۔

ان ساتوں داستانوں کے بیان کرنے کے بعد شاعر نے بہرام گور کی موت کا منظر بیان کیا ہے اور چند اشعار دنیا کی بے ثباتی کے بارے میں بھی تحریر کئے ہیں۔ اختتام میں شاعر نے اپنے حالات زندگی، اور اپنی اور اپنے استاد جرأت کی تعریف کی ہے۔

ان داستانوں میں بیان کئے جانے والے بہت سے واقعات اردو میں لکھی جانے والی بعض داستانوں میں بھی ہمیں ملتے ہیں۔ اور بعض جگہ سنسکرت کہانیوں کے اثرات بھی ملتے ہیں۔ مثلاً آٹھویں گلزار میں جو قصہ بیان ہوا ہے۔ یعنی بادشاہ کا عورتوں کی بے وفائی سے ڈرنا اور اس خوف کے سبب شادی نہ کرنا۔ اور بعد میں شادی کرنا اور آخر کار صحیح اور باوفا عورت کا مل جانا۔ عورتوں کی بے وفائی کے قصے سنسکرت کی داستانوں کا محبوب موضوع ہیں۔ غالباً"

اس کا سبب برہمنی مزاج تھا۔ جہاں ترک دنیا کو بہتر سمجھا جاتا تھا۔ اور سنیاسیوں کی سی زندگی اور مجرّد زندگی گزارنے کو بہتر سمجھا جاتا تھا اور اس شے کو زیادہ سے زیادہ تقویت دینے کے لئے عورتوں کی بے وفائی کا پرچار کیا جاتا تھا۔ تاکہ لوگ اس طرف متوجہ نہ ہوں اور دنیا کے بکھیڑوں میں نہ پڑیں۔

اس طرح جنوبی ہند اور جنوب مشرقی ایشیا کے ملکوں میں پائی جانے والی تبدیلی قالب کی داستانوں کا اثر بھی اس داستان میں ملتا ہے چنانچہ پانچویں گلزار میں ہیرامن طوطا کا قصّہ اسی کا ثبوت ہے۔

کردار نگاری

ان داستانوں میں ایسے کردار بہت کم ملتے ہیں جن کے کردار کی خوبیاں یا خرابیاں داستان کے واقعات و مصائب کی، کشمکش سے ابھر کر سامنے آتی ہیں۔ اور شاید بنیادی طور پر ایسے کرداروں کی عدم موجودگی کا سبب، ان داستانوں کا اختصار ہے۔ جہاں داستانوں کے اختصار کے سبب، کردار بہت نمایاں ہو کر سامنے نہیں آئے اور اپنا کوئی نقش، قائم نہیں کر پائے۔ تاہم بعض ایسے کردار ان داستانوں میں موجود ہیں جن کو مصنف نے حقیقت پسندی سے بیان کیا ہے۔ اور ان کرداروں کے نقوش اجاگر کئے ہیں۔

ساتویں گلزار میں ملکہ یمن کا کردار ایسا ہی ہے جس کا مکمل نقش ابھارنے کی مصنف نے کامیاب کوشش کی ہے۔ اس گلزار میں ملک یمن کے بادشاہ، اس کی ملکہ، ملکہ کے سوتیلے بیٹے اور وزیر کی داستان بیان کی گئی ہے۔ ملکہ ایک بدکردار عورت ہے۔ اور اس کے وزیر سے ناجائز تعلقات ہیں۔ ایک دن شہزادہ ان دونوں کو ہم آغوش دیکھ لیتا ہے۔ ملکہ کی بدکرداری کے سبب سے کسی بھی انتہائی اقدام اور تریا چرتر کی توقع کی جاسکتی ہے۔

جو عین فطری ہے۔ اس سلسلے میں جغرافیائی حدود کی کوئی پابندی عائد نہیں کی جاسکتی کہ مکّر و فریب ہر خطّے کی عورت سے متوقع ہو سکتا ہے۔ لیکن جس طرح میر انیس پر یہ اعتراض کیا کیا جاسکتا ہے کہ وہ عرب کی خواتین اور مردوں سے جو گفتگو کراتے ہیں۔ وہ ہندوستان سے مخصوص ہے اور امام حسینؑ کے خاندان کے اہل خانہ جس وقت گریہ و زاری کرتے ہیں تو ان سے کاملاً لکھنوی بیگمات کا تصور ابھرتا ہے۔ اسی صورت سے شاہ حسین حقیقت نے ملکہ یمن کا جو کردار پیش کیا ہے اور اپنی بے گناہی بادشاہ کے روبرو پیش کرنے کے سلسلے میں جو گفتگو کرائی ہے اس سے کسی لکھنوی بیگم کا سراپا ابھرتا ہے۔

چونکہ شہزادہ اپنی سوتیلی ماں کے جرم سے آگاہ ہو چکا ہے۔ لہذا ملکہ شہزادے کو راہ سے ہٹانے کے لئے اس پر دست درازی کا الزام لگاتی ہے۔ اور جس انداز میں، نالہ و شیون کر کے بادشاہ پر اپنی پاکدامنی کا اثر قائم کرتی ہے۔ اس کے پیش کرنے میں شاعر کامیاب ہے۔ ؎

آتے خسرو کو دیکھ وہ مکّار — آنسو بھر لائی آنکھوں میں یکبار
نوچ کر گال اور کھسوٹ کے بال — کر دیا پیٹ پیٹ چہرہ لال
ٹکڑے کر کپڑے اور گریبان پھاڑ — گر پڑی بس زمین پہ کھا کے پچھاڑ
دھجّی دھجّی کی کرتی اور انگیا — چوڑیاں توڑ نتھ کو پھینک دیا
گہہ دو ہتڑ زمین پہ مارے تھی — ہائے اور وائے کہہ پکارے تھی
پیٹتی تھی کبھی تو سینہ و سر — کوستی تھی کبھی یہ کہہ کہہ کر!
مریو ناشاد و بے مراد بچے! — اوڑیو دنیا سے شکل باد بچے
تیرے ہاتھوں سے جی مرا پکّا — لگیو شیطاں کا تجھے دھکا!

اے تری خاک میں جوانی ملاؤں　　موئے تو میں تیرے بھتّے کھاؤں
لگے تجھ کو کڑی کمان کا تیر!　　ہو نشانہ اجل کا تو بے پیر!

تمام باتوں سے ملکہ، بادشاہ کے دل میں اصل واقعات سے آگاہ ہونے کی خواہش بیدار کر رہی ہے۔ ساتھ ہی ساتھ اس کا نفسیاتی اثر بھی بادشاہ کے دل پر ملکہ کے حسب دلخواہ ہو رہا ہے۔ بادشاہ کے استفسار پر ملکہ صورتِ حال کو یوں بیان کرتی ہے۔ ۵

بولی وہ لمبے لمبے آنسو بہا　　نخرے سے ٹھن ٹھنا پکڑ ماتھا
آسماں سے نہ برسیں کیوں پتھر　　چاہے بیٹا ہو ماں سے ہم بستر
ہائے اس دور پر میری پٹکی　　بیٹا لے ماں کی ران میں چٹکی
شعلہ شہوت کا ماں پہ جو عارے　　کیوں نہ برسیں فلک سے انگارے
سوئی تھی میں پلنگ پر بے ہوش　　بے حیا آن لپٹا کھول آغوش
ہاتھ بند ازار پر ڈالا!!　　چاہا اپنا کرے وہ منہ کالا!!
چونک کر میں نے ایک ماری لات　　بھاگا تب خوف کھا کے وہ بدذات
بھاگ کر بچ گیا جوانا مرگ　　دو نہ چکھتا مزا جوانا مرگ!
ماں تو ہوں گو نہیں اسے میں جنی　　ہو وے پیوند خاک نا شدنی
ہے ستم جس کو پالا چھاتی پر　　وہ نوازے مرا تلا اوپر!
دے نہ اولاد ایسی حق زنہار　　مادر آزاد در پدر بیزار!
کاٹوں دانتوں سے بوٹیاں گر پاؤں　　بس چلے تو موئے کو کچا کھاؤں
ایڑی چوٹی پہ سے اوسے واروں　　ہو نہ پانی جہاں وہاں ماروں
ابھی اوس روسیاہ کو کر دے عاق　　زندگی ہے وگرنہ مجھ پر شاق!

کر کے منہ کالا اور گدھے پہ سوار　　شہر سے دے نکال بس یک بار
آنکھیں اوسکی نکال کر مجھے دے　　تا ملوں اپنے تلوؤں کے نیچے
کچھ نہ کچھ دے غرض اسے تو سزا　　تو کلیجہ ہو ٹھنڈا مرا ٹھنڈا
زہر ورنہ منگا کے کھاتی ہوں　　ڈوبنے کو کنویں میں جاتی ہوں!
دے تو اوس ناسزا کو جلد سزا　　کاٹتی ہوں وگرنہ اپنا گلا!

ان اشعار میں جس انداز میں ملکہ یمن کو محو تکلّم دکھایا گیا ہے۔ اس سے لکھنوی بیگمات کا سراپا ابھر کر سامنے آتا ہے۔

وزیرزادی کا کردار ملکہ یمن کے بادشاہ کے وزیر کی شہزادی کا کردار ایک باعصمت اور باحیا شہزادی کا کردار ہے۔ یہ کردار بھی ساتویں گلزار میں ہی ہے۔ شہزادی باحیا اور پاکدامن ہے۔ لیکن شہزادہ جوشش انتقام میں الوپ انجن لگا کر وزیرزادی سے دوبارہ محبت کرتا ہے۔ اس سے قبل وہ وزیر کے محل کی تمام بیگمات اور کنیزوں سے محبت کر چکا ہے اور پھر خود ہی ترکیب بنا کر آخر وزیرزادی کے سامنے اپنے اصل روپ میں آجاتا ہے۔ اس وقت وزیرزادی دل و جان سے شہزادہ پر عاشق ہو جاتی ہے۔ اس وقت وزیرزادی کی کیفیت عجیب ہے۔ ایک طرف اسے اپنی عصمت کے داغدار ہو جانے کا ملال بھی ہے۔ اور دوسری طرف یہ تجسّس بھی کہ اس کا گل چین کون ہے۔ فطری شرم و حیا بھی دامن گیر ہے۔ زبانِ حال سے یوں استفسار کرتی ہے۔

کام دل سے فراغ حاصل کر　　در فشاں یوں ہوئی وہ عشوہ گر
یعنی اے نوجوان زیبا رو!　　ابتو سچ سچ بتا کہ تو ہے کون
تھا جو ناسفتہ مرا گوہر پاک　　بیندھا دو بار ہائے رے بے باک

پھر کیا تپہ نامتاں سے دور — باپ سے دور اور ماں سے دور
ہو گیا پارہ پردۂ عصمت! — گھر سے نکلی تو کیا رہی عفت
ہو کے بدنام زیست کی تو کیا — مرگ ہے اس سے ہی بھلی بخدا
گھر میں ہو گی مری جو صبح تلاش — ہو گا افسوس مرا پردہ فاش
دل میں کیا کیا ہر ایک سوچے گا — ہو دیں گی بدگمانیاں کیا کیا!
کاش جنتی مجھے نہ میری ماں — ہوتی رسوا میں تا نہ یوں بہ جہاں
تو ہے بے باک شوخ اے عیّار — نہ کھلا تیرا مجھ پہ کچھ اسرار!
نہ کیا اپنے نام سے آگاہ! — اللہ بدنام یوں ہوئی میں آہ
ننگ و ناموس سب گیا میرا — بگڑا اے شوخ کہہ تو کیا تیرا
کیا ستم کیا جفا و جور ہے یہ — دلربائی کا کون طور ہے یہ

دلارام کا کردار

دلارام کا کردار بہشت گلزار کے تمہیدی باب میں متعارف ہوتا ہے۔ دلارام ایک سمجھدار، ذہین اور عقل مند کنیز ہے وہ حسن صورت اور حسن سیرت دونوں سے آراستہ ہے۔ عموماً خوبصورت عورتیں عقل و شعور اور سمجھ بوجھ سے عاری ہوتی ہیں۔ لیکن دلارام کے کردار میں ہمیں یہ بات بھی ملتی ہے۔

شاہ بہرام اپنی عقل و فہم بہادری و شجاعت اور تیر اندازی میں یکتائے روزگار ہے۔ دلارام اس کی بہی خواہ اور ہم درد بھی ہے اور اس سے بے پناہ محبت کرنے والی بھی،

عام طور سے دیکھنے میں آیا ہے کہ مال و دولت کی فراوانی اور رتبے کی بلندی آدمی کو مغرور بنا دیتی ہے۔ گو اس باب کا کہیں مثنوی نگار نے تذکرہ نہیں کیا لیکن ایسا معلوم ہوتا ہے کہ دلارام جب جنگل میں شکار کے وقت شاہ بہرام گور سے ملی تو اس کے دیکھنے کی فرمائش

رتی ہے تو اس میں اس کی یہ خواہش مضمر ہے کہ بادشاہ، جو اپنی خوبیوں میں منفرد اور یکتا ہے اور اس کا محبوب بھی ہے کہیں غلط روش کا شکار نہ ہو جائے۔ چنانچہ وہ اس سے کسی کمال کے دیکھنے کی آرزو مند ہوتی ہے۔ اور جب شاہ بہرام نر کو مادہ اور مادہ کو نر میں تبدیل کر کے اپنی تیر اندازی کے کمال کو ثابت کرتا ہے۔ تو دلارام کہتی ہے کہ آدمی کو غرور نہیں کرنا چاہیئے۔ اس دنیا میں ایک سے ایک بڑھکر ہنر مند اور صاحب کمال ہے۔ دلارام کے اس اندازِ گفتگو میں اندازِ محبوبی کے ساتھ ساتھ بے خوفی اور جرأت و بہادری بھی ہے۔ شاہ بہرام اس صاف گوئی پر ناراض ہو کر دلارام کو اس وسیع جنگل میں بے یار و مددگار چھوڑ جاتا ہے۔ ہر چند کہ دلارام بہادر عورت ہے اور بادشاہ کے ساتھ سیر و شکار میں مصروف رہی ہے۔ لیکن ایسی بے بسی اور مجبوری کا عالم اگر کسی مرد پہ ہوتا تو یقیناً وہ بھی گھبرا جاتا۔ پھر دلارام کا تعلق تو صنف نازک سے ہے۔ چنانچہ وہ گھبرا جاتی ہے۔ دلارام کی اس گھبراہٹ، بے چینی اور خوف کی تصویر حقیقت نے بہت خوبصورتی سے کھینچی ہے۔ ؎

دلارام کی کیفیت

ہر قدم پر تھی خائف و لرزاں — گاہ گریاں تھی اور گہے حیراں
سائے سے اپنے خوف کھاتی تھی — سایہ سال جاں نہ تھی پہ جاتی تھی
چبھتے تھے ہر قدم پہ سینکڑوں خار — کف پا دونوں خار سے تھے فگار
برگِ گل سے جو اس کے تھے کف پا — خار ان میں تھا ہر قدم چبھتا !
اپنی گفتار سے پشیماں تھی ! — حالت اس کی غرض پریشاں تھی
گرم ریتل وہ اور خوف رواں — دل سوزاں سے آہ سرد کشاں

بس کہ ہر ہر قدم تھا خوفِ ہلاک — تھی اوڑاتی وہ اپنے سر پر خاک
پات اگر کوئی کھڑکتا تھا !! — تو کلیجہ وہیں دھڑکتا تھا !!
گاہ آآ نظر جو بیشہ شیر !! — شیر غم لیتا آہوئے دلگیر !
کرتے جاتے تھے آبلے پابوس — بربب چلی اس طرح سے وہ کئی کوس

ان اشعار میں حقیقت نے نہایت خوبی کے ساتھ صحرا میں دلارام کی پریشانی کی کیفیت کی جزیات نگاری سے مکمل تصویر بنا دی ہے۔

مشترک عنصر

ہشت گلزار میں بعض ایسے جزئی قصے بھی ملتے ہیں جو بہت سی دوسری داستانوں میں بھی پائے جاتے ہیں۔ چونکہ یہ کتاب خسرو کی مثنوی کا آزاد ترجمہ ہے۔ لہٰذا ہم اس سلسلے میں امیر خسرو کا ہی ذکر کریں گے۔ ممکن ہے امیر خسرو نے پنجاب کی لوک داستان سوہنی مہینوال سُنی ہو گی۔ چنانچہ ہشت گلزار میں بادشاہ کی ایک بیوی کا کردار بیان ہوا ہے۔ جو گھڑے کے ذریعے دریا پار کر کے اپنے فقیر عاشق کے پاس رات کے وقت جاتی ہے۔ اس کردار کا انجام بھی سوہنی کے انجام سے مماثلت رکھتا ہے۔ جس کا کچا گھڑا دریا میں گھل جاتا ہے۔ بادشاہ ایک کچا گھڑا، رکھوا دیتا ہے۔ جب ملکہ اس گھڑے کو ندی میں ڈال کر ندی عبور کرتی ہے تو منجدھار میں گھڑا گھل جاتا ہے اور ملکہ ڈوب جاتی ہے۔

قیاس کہتا ہے کہ امیر خسرو پنجاب کی اس مشہور لوک داستان سے واقف رہے ہوں گے۔ لیکن چونکہ ہشت بہشت اور ہشت گلزار کا تفصیلی موازنہ کرنا ممکن نہ تھا۔ لہذا ممکن ہے حقیقت نے جو بعض اضافے اپنی طرف سے ہشت گلزار میں کئے ہیں۔ یہ بھی انہی اضافوں میں سے ہو۔ اگر ایسا ہے تو یقین سے کہا جا سکتا ہے کہ حقیقت پنجاب کی ان مشہور

زمانہ لوک داستانوں سے واقف ہوں گے۔ چونکہ ان سے قبل کے اردو شعرا ان داستانوں سے واقف تھے۔ انشا کا تو ایک شعر بھی پنجاب کی ایک اور مشہور داستان ہیر رانجھا کے بارے میں ہے ؎

سنایا رات کو قصہ جو ہیر رانجھے کا　　تو اہل درد کو پنجابیوں نے لوٹ لیا

بادشاہ کی تیسری بیوی کے سبو چہ خام کے ذریعے غرقابی کو حقیقت نے یوں بیان کیا ہے۔ ؎

جلد سے اِک منگا سبو چۂ خام!　　پانی لگتے ہی گل جو جائے تمام
تھی دھری پختہ جس مقام سبو　　رکھدی اس کی جگہ وہ خام سبو!
آئی جب اپنے وقت پر وہ نگار　　کہ سبو لے کے جائے دریا پار!
رکھ سبو چھاتی کے تلے بے غم　　قطرہ زن پہنچی بیچ میں جس دم
مرکب خام گھل چلا افسوس!　　قعر کی سمت ڈھل چلا افسوس
دی.....کش اجل کو لگام!　　رہ گیا نصف رہ میں مرکب خام
جا تہہ آب میں وہ دُر یتیم!!　　پہنچی پانی سے جا، بہ نار جحیم!

لقمان وزیر، شاہ بہرام گور کا دانا وزیر ہے۔ اور شاہ کے امرا وزراء، خدام وغیرہ کی درخواست پر اس بات کا اہتمام کرتا ہے کہ بادشاہ کو اپنے دارالخلافے میں ہی عیش و راحت کا سامان میسّر آجائے اور وہ یکسانیت سے بھی نہ گھبرائے۔ اس مقصد کے لئے ماہرین تعمیر اور منہدسوں سے سات ایوان تیار کراتا ہے۔ ان ایوانات کی تعمیر میں یہ خوبی رکھی گئی تھی کہ ہر ایوان کسی نہ کسی ستارے سے منسوب تھا اور اس اعتبار سے ہر ایوان کا رنگ اور اس کی تزئین و آرائش تھی۔

سات ایسے کئے مکان طیّار　　جس پہ تھے ساتوں آسمان نثار

سات گنبد بنائے رشک سپہر — رات دن جس پر صد تے ماہ و مہر
جب کہ طیار ہو چکے یہ مکان! — رنگیں اس رنگ وہ کٹے ایوان
بہر شنبہ بنایا تھا جو محل — سیہ اوسکو کیا برنگ زحل
جس کی اتوار کے لئے تھی بنا — شکل خود زعفرانی اس کو کیا
تھا دو شنبہ کے واسطے جو واہ — سبز ریحان رنگا برنگ ماہ!
تھا سہ شنبہ کے واسطے جو مقام — رنگا گلنار اس کو جوں بہرام!
چار شنبہ سے جو کہ تھا منسوب — جوں عطارد کیا کبود اسے خوب
پنجشنبہ کے واسطے جو بنا! — صندلی رنگ مشتری سا کیا
جس کو نسبت تھی جمعہ سے پوری — زہرہ آسا رنگا وہ کافوری

منظر نگاری اور جزئیات نگاری کے اعتبار سے محلات اور مناظر قدرت کی تصویر کشی ہمیں اردو کی کم و بیش تمام مثنویوں میں ملتی ہیں۔ ان مثنویوں میں سرفہرست زور بیان، سلاست روانی اور شاعرانہ طرز بیان کے اعتبار سے مثنوی سحر البیان اور مثنوی گلزار نسیم کا درجہ سب سے بڑھا ہوا ہے۔ تاہم حقیقت بھی ایسے کہ دفع پہ پیچھے نہیں رہتے۔ اور اپنی شاعرانہ قوت بیا کا بھرپور اظہار کرتے ہیں۔ شاہ بہرام کے ان سات عشرت کدوں کو جس خوبصورتی سے سجایا گیا تھا۔ ان کی تصویر کشی حقیقت نے نہایت خوبی کے ساتھ کھینچی ہے ان محلات کے در و دیوا ان کی زیبائش اور اس کے مکینوں کے پیراہنوں، ان کے رنگوں، اور تازہ انداز کو کامل مہارت ساتھ بیان کیا گیا ہے۔ ان کی خاص خوبی یہ ہے کہ ہر ایوان اور اس کی آرائشی اشیا حتیٰ کہ گلستان تک اسی رنگ میں ہیں۔ ان محلات میں جشن کا سا سماں ہے۔

تھے ملوّن و مکان وہ جیسے — پردے اور فرش بھی بنے ایسے

دخل واں دوسرے نہ رنگ کو تھا
ویسے ہی گل چمن میں تھے ہر جا

بن چکے جب مکاں یہ خاطر خواہ
اون میں آکر مکیں ہوئے وہ ماہ

کرکے ساتوں کے سات رنگ سنگار
اپنے اپنے دیا مکان میں اتار !

تھی بہر رنگ جس مکان کی اساس
تھا اوسی رنگ پر مکیں کا لباس

صندلی کوئی کوئی سبزہ رنگ !
بہتوں کا چنپئی سنہرا رنگ !

کوئی سرخ و سفید کوئی گلفام
یاسمن بو وہ یاسمن اندام !!

نسترن نرگس اور چنبیلی !!
سبوتی و گلاب و البیلی !!

گل بہار و بنفشہ و سوسن
گیندا رابیل کوئی غنچہ دہن

چنپنہ صد برگ کیتکی گلزار !
رعنا زیبا و ارغوان گلنار

زعفران مشکی اور رنگیلی کوئی
خوش قدم مہ لقا چھبیلی کوئی

چاندنی گلبدن اوجاگر کوئی
دل لگن ہنس مکھ اور دلبر کوئی

سب یہ پوشاک سج سجا رنگیں
اپنے اپنے مکاں میں جا کے رہیں

جو لباس اپنے رنگ کا پہنے
دونی ہم رنگ کے نہ کیوں وہ کرے

ہر بت اپنے نگار خانے میں
پھرتی عاشق کا دل لبھانے میں

کوئی بیٹھی کہیں سنگار کرے
بہر خود بینی آئینے کو دھرے

کوئی اپنی اکڑ کی چھب دکھلائے
کر اشارہ کوئی کسی کو بلائے !

اک غزل خواں وایک نغمہ سرا
بیٹھی اک پاؤں سہر میں لٹکا

کھیلے چوسر کوئی، کوئی شطرنج
کھیلے پچیس اک کرشمہ رنگ

لے کے چٹکی کسی کی بھاگے کوئی
گدگدی کرتے اوس کو وہ لاگے

کوئی دے بیٹھی ایک کو گالی — کوئی چٹکی بجائے کوئی تالی !
چپکے سے کوئی کسی کو جڑ دے دھول — ہنس دے وہ اک ادا سے پڑھ لاحول
کوئی پھبتی کسی پہ کچھ بولے — کوئی جگت پر زبان کو کھولے
کہیں خندہ کہیں قہاقے تھے — تالیوں کے کہیں تڑاقے تھے
منہ بنا کوئی کسی کے منہ کو چڑائے — کہہ پتے کی کوئی کسی کو کھجائے
لے کے پینگ ایک اس طرح جھولے — کنگرہ جا کے عرش کا چھولے
باندھ کر اک درشالے کی گاتی : — گاتی پھرتی وہ گات دکھلاتی
چلتی جب کوئی دکھا کے چھپ تختی — دیکھنے والوں کی تھی کم بختی !
کوئی مسی لگا کے کھا دے پان — خون عاشق کرے بہر عنوان
لیوے اک گلعذار پھول کو توڑ — ڈالے اک ہاتھ دوسرے کا مروڑ
کہے خندی کسی کو کوئی چھنال — کوئی برا مانے کوئی جاوے ٹال
جدی ہر ایک کی سجاوٹ تھی — کہیں لگاوٹ کہیں رکاوٹ تھی
ادنکا کب تک کیا کروں میں بیاں — الغرض تھی ہر ایک آفت جان
اک طرف ساقیان میگوں لب — لے کے اسباب مے خوری کا سب
مستعد پینے اور پلانے میں ! — مشتغل کوئی گزک کے کھانے میں

سمیری باغ کا منظر

سرو شمشاد جھومتے ہیں کھڑے — داد لبتوں پہ تاک مست پڑے
بلبلیں شاخ گل پہ نغمہ سرا ! — نعرہ زن قمری چمن پیرا !

لالہ و گل کھلے چمن بہ چمن ! نرگس شوخ چشم چشمک زن
شاخیں سنبل کی یوں بہ گرد گل عارض گل رخساں پہ جیوں کاکل
یوں لب آبجو پہ سبزۂ تر ! سبزہ جس رنگ لعل خوباں پر
شاخ ہر نخل میوے سے پر بار نونہالوں تلک تھے برخوردار
تھے ثمرداں جہاں کے سارے نہروں میں چھٹ رہے تھے فوارے
تھیں نسیم و صبا عبیر سرشت باغ تھا وہ غرض کہ رشک بہشت
بہر بستان باغ مرغ چمن ! دیکھ کر بے نظیر وہ گلشن !!
گل کے سیپارے میں تھے پڑھتے سبق مثلہا فی البلاد لم تخلق
طوطی مینا کی ہر شجر پہ صدا بسط اللہ ظلکم ابدا !!
مانگتا تھا دعا درخت چنار وقنا ربنا عذاب النار
شعلہ زن تھا چنار تو سارا لالہ دہکے تھا جیسے انگارا !

محاورات و ضرب الامثال

شاعری میں تلمیحات اور محاورات و ضرب الامثال کا استعمال، اختصار کو برقرار رکھتے ہوئے نفس مضمون کو دور تک پھیلا دیتا ہے۔ اس طرح شاعر کے خیال میں وسعت اور پھیلاؤ کا اضافہ ہو جاتا ہے اور شاعرانہ حسن بھی بڑھ جاتا ہے۔ مثنوی ہشت گلزار میں کثیر تعداد میں شاعر نے محاورات و ضرب الامثال کو استعمال کیا ہے۔ اور یہ شعوری کوشش کا نتیجہ ہے۔

ویسے بھی صنم کدۂ چین اور گنجینہ امثال اس بات کا ثبوت ہیں کہ حقیقت کو ضرب الامثال اور محاورات سے خصوصی دلچسپی تھی۔ چنانچہ گنجینہ امثال تو بنیادی طور پر امثال و محاورات کی کتاب ہے۔ اس میں اردو، فارسی اور عربی کی ہم معنی ضرب الامثال و محاورات

کو حقیقت نے نہایت محنت اور عرق ریزی کے ساتھ جمع کیا تھا۔ اب ذیل میں وہ اشعار دیئے جا رہے ہیں جن میں کوئی نہ کوئی ضرب المثل یا محاورہ بیان ہوا ہے۔

سچ مثل کہہ گئے ہیں دانشور — کہ جگر ہے جگر دگر ہے دگر
اس سوا اور بھی ہیں بے حد عیب — ہے مثل یہ کہ پیری و صد عیب
سمت کو سنتے ہی وہ بد خصلت — اشتر ہے مہار کی صورت
دے پتے کو یہ گھر کے نکلے چل — دیکھیں پر اونٹ بیٹھے ہے کس کل
تیر جب شست سے رہائی پائے — نہیں ممکن کہ پھر پلٹ کر آئے
اونٹ اور اس کا مال لادو سب — نہ بتاؤ اڑان گھاٹیاں اب
کہتے آپس میں تھے یہ شور مچا — ہم پہ ہوئی روشنی طبع بلا
کیا وہ پائے حسد سے آہ اخلاص — ہے مثل قاص لایحب القاص
اس لئے کر رہے تھے بس وہ داؤں — ہاتھی کے پاؤں میں ہے سب کا پاؤں
ہاتھ آیا ہے رشتۂ سر در گم — گیا ہاتھی نکل ہے اٹکی دم
پھرے ہاتھی اگرچہ گاؤں گاؤں — جس کا ہاتھی پر ہے اوسی کا ناؤں
کام جس کا اسی کو چھاجے ہے — کرے کوئی اور تو ٹھینگا باجے ہے
روبرو تیرے کون آوے گا — گنّے ہاتھی سے کون کھاوے گا
ہٹ لگی کرنے اور ہٹ بیٹھی — ماش کے آٹے کی طرح اینٹھی
ہائے سمجھا نہ وہ محال سکال — گھر میں راجہ کے موتی کا کیا کال
ہے کڑی بس کہ دھوپ اور ہوا — چیل اوپر سے چھوڑے ہے انڈا

قدر نعمت است بعد زوال

بعض جگہ پنجابی الفاظ بھی استعمال کئے گئے ہیں ؎

لب ہلانے پہ لگتا تھا لپٹر

ایک شعر میں تلمیح استعمال ہوئی ہے۔ جہاں شاعر نے محمود کے غلام ایاز کو ایاس باندھا ہے۔ غالباً ردیف کی مجبوری کے مختلف شاعر ایسا کرنے پر مجبور ہوا ہوگا۔ ؎

اپنی حد خوب جانتا ہے ایاس　　کہہ گئے ہیں یہ مرد رتبہ شناس

یا لسانیاتی اعتبار سے حرف "س" کا حرف "ز" سے تبادلہ بھی ممکن ہے۔ جو غالباً ادھی لہجے اور تلفظ کا نتیجہ ہو۔

اسی طرح "فرقے" کو شعبہ کے معنی میں اور کسی خاص فن سے تعلق رکھنے والے کے معنی میں بیان کیا ہے۔ فرقے کا یہ مفہوم جدید ادبیات میں متروک ہے۔ قدیم زمانے میں اس سے شعبہ کا مفہوم بھی لیا جاتا تھا۔ ؎

پوچھا شہ نے کہ کیا ہے یاد ہنر　　ہوگا کس فرقے میں بتا نوکر

"بحر فکر" کی ترکیب عام طور پر مستعمل ہے۔ حقیقت نے ایک جگہ اسے بحر فکرت کر کر دیا ہے۔ ؎

دیکھ کر شکل نیل اعجوبا　　بحرِ فکرت میں وہ کھڑا ڈوبا

حقیقت نے ہر جگہ لفظ "یادگار" کو مذکر باندھا ہے جبکہ عام طور پر یہ مونث ہی استعمال ہوتا ہے۔ ؎

یادگار اپنا کچھ تو یاں رہ جائے　　دم کا کیا اعتبار آئے نہ آئے

میر درد کا مشہور شعر ہے۔ ؎

فرصتِ زندگی بہت کم ہے　　مغتنم ہے یہ دید جو دم ہے

حقیقت نے بھی زندگی کے نفوس محتقر کو تقریباً اسی صورت سے ایک شعر میں بیان کیا ہے جو کسی بھی اعتبار سے زیادہ فصیح اور سلیس نہیں ہے۔ ع

دم غنیمت ہے دید جو دم ہے

ایک محاورے میں لفظ سلجے کی جگہ چھاجے باندھا ہے۔ یہ دونوں صورتوں میں مستعمل ہے۔

حالاتِ زندگی کا ماخذ

اس مثنوی سے حقیقت کی عمر کے آخری دور کے حالات پر بھی کافی روشنی پڑتی ہے۔ اس سے حقیقت کی شخصی زندگی کا خاکہ بھی بہ آسانی مرتب ہو سکتا ہے۔ اور معلوم ہوتا ہے کہ زندگی کے اس دور میں بھی فکر معاش نے ان کا پیچھا نہ چھوڑا تھا۔ اور تنگدستی کے علاوہ انھیں بہت سے دوسرے شدید جسمانی اور ذہنی عوارض بھی لاحق ہو چکے تھے۔ ایسی صورت میں ان کی ہمت کی داد دینا چاہیے کہ چار ہزار سے زائد اشعار پر مشتمل مثنوی کو انھوں نے صرف بیس دن کی قلیل مدت میں بایہ اختتام کو پہنچا دیا تھا۔ اب ہم ذیل میں ہشت گلزار سے وہ اشعار پیش کر رہے ہیں جن کی حیثیت خودنوشت سوانح کی ہے۔ ؎

یعنی کیا زیست کا بھروسہ ہے — اس سے بے اعتبار تر نہیں شے
یادگار اپنا کچھ تو یاں رہ جائے — دم کیا اعتبار آئے نہ آئے
باقی رہنے کا میں نہیں ناکام! — باقی رہ جائے گا پر اس سے نام
حق مطلق سے ہے یہ مجھکو امید — کہ رہوں اس سے زندۂ جاوید
ایں ورق کز نشاط دارد ہیر! — یادگار یست از من اندر دہر
ذہن ناقص میں جب کہ یہ آیا — اس کو میں قید نظم میں لایا!
تھا پریشان اگرچہ دل میرا — لفظ و معنی کو کر جمع یک جا

اک تو تھا میں اسیر دام مرض — مجھ کو انواع کے مرض تھے غرض
درد سر، سرفہ اور نفث الدم — نزلے سے ناک میں تھا پہنچا دم
تپ لوا سیر اور درد مراق ! — ان کے ہاتھوں سے بھی تھا جینا شاق
دمّل اور کلّہ اور خارش و داد — کر رہے تھے جدے ہی یہ بیداد
اس سوا اور تھے بہت آلام — لوں میں کس کس کا تیرے آگے نام
لاحق افکار دیتوی تس پر — ان میں پھر فکر شعر کیوں کر ہو
تیرے روزگار کا عالم ! — تھا نہ کچھ اختیار کا عالم
فرصت اس کے سبب نہ تھی دم بھر — دم بھی لے سکتا نہ تھا میں مضطر
صبح سے اک پہر تلک اے یار — تھا فراق اور باقی تھا دربار !
اتنی فرصت میں بھی غرض کہ مدام — متعلق تھے اپنی ذات کے کام
اس طرح سے بہ عرصہ سہ ماہ — مثنوی میں نے یہ لکھی ہے آہ
کیجے ساعات کا حساب اگر — نظم جن میں ہوئے ہیں یہ گوہر
بیس دن سے فزوں نہیں ہوتے — بلکہ کم اس سے ہیں کہیں ہوتے

فحش الفاظ

حقیقت کی کوئی سی تصنیف اٹھا کر دیکھ لیجئے۔ وہ اس سلسلے میں کسی قسم کے اخلاقی ضابطے کے پابند نظر نہیں آئے کہ نثر و نظم میں فحش الفاظ نہ لائے جائیں۔ خزینۃ الامثال جس میں انھوں نے عربی، فارسی اور اردو کی ہم معنی ضرب الامثال یکجا کی ہیں۔ اس میں بھی یہ عیب موجود ہے۔ اسی طرح ہشت گلزار میں بھی فحش الفاظ ملتے ہیں۔ ؎

رام کے آگے گوشے میں جاکر — کھول کر.... پڑ گیا اوندھا

یا

دیر تک اس طرح سے کرکے سلوک　　کہہ کے چھو... میں دیا بس تھوک

مدح استاد

حقیقت، شیخ قلندر بخش جرأت کے شاگرد تھے۔ ان کے بڑے بھائی سید حسن شاہ ضبط بھی جرأت ہی کے شاگرد تھے۔ لیکن ایسا محسوس ہوتا ہے کہ وہ استاد کی محبت اور عزت و احترام میں اپنے بھائی سے بھی سبقت لے گئے ہیں۔ ایک مشرقی طالب علم کے اپنے استاد کے بارے میں محبت، عزت و احترام کے جو جذبات ہو سکتے ہیں۔ وہ حقیقت میں موجود ہیں اور کسی بھی جگہ وہ اس کا برملا اظہار کرنے سے نہیں چوکتے۔ اور استاد کی محبت کے جذبے میں سرشار نظر آتے ہیں۔ اور اپنے استاد کو وقت کا سب سے بڑا شاعر سمجھتے ہیں۔ اور استاد سے اپنی اس مثنوی کی داد کے خواہاں بھی ہیں۔ ؎

جیتا رہتا اگر میرا استاد　　سرہ و ناسرہ کا وہ نقاد
خسرو شاعرانِ ہندوستان　　بلکہ سلطان شاعرانِ جہاں
مفتخر انوری و خاقانی !!　　سعدی وقت و خسرو ثانی !!
وہ بلاغت میں ابلغ العلما !　　بفصاحت۔ وہ افصح الفصحا
لفظ پیدا کرے تھا کیا موزوں　　تھا وہ خلاّق معنی و مضموں !
غلغلہ اس کا پہنچا تھا بسمک　　گوشِ مسکانِ عرشِ اعلیٰ تک
ایسا آوازہ کس کا تھا سمجھا　　یعنی یحییٰ امانِ جرأت کا !
عرف میں نام تھا قلندر بخش　　در معنی سے تھا وہ گوہر بخش
دوسرا ایسا کب غزل خواں ہے　　جس کا ہر حرف ایک دیواں ہے

اس کے دیواں کا کیا کہوں عالم — جس پہ مفتوں ہوا ہے اک عالم
حجت قاطع اوس کا ہر قطعا — جس نے اقطلاع ملک شعر لیا
ہر رباعی ہے ربع مسکوں گیر — شکل ارکان اربعہ ہے شہیر
اوسکی ہر ہر غزل ہے غزآلی — فیض لینے سے تک نہیں خالی
ہے قصیدے کا قصد یہ بخدا — کہ ہے قاصد جہاں کے لینے کا
مثنوی بھی ہیں اوس کی متشنا — منقطع جس سے سب کا ہے کہنا
بیت معمور سے تھی بیت — قدر عالم میں اپنے ہر ہر بیت
کیا کہوں اوسکی میں ادا بندی — کیوں نہ پھر اوسکی ہو ادا بندی
نہ رہا وہ مگر رہے گا نام! — زندہ شعر و سخن سے تا بہ قیام
وہ نہیں مر گیا ہے اوسکو حیات — رنجیتہ مر گیا مگر ہیہات
جبکہ خلاق ہو سخن کا نوت — آئے کیوں کر نہ پھر سخن کو موت
حق ہے حقا سخن حقیقت کا — ثانی پیدا نہ ہوگا جرأت کا!
شمع بزم سخن طرازاں تھا! — گل ہوئی وہ تو ہے اندھیرا سا
نہ رہا اس جہاں میں وہ مرحوم — آسمان ہنر جہان علوم!
دے کے اصلاح تا وہ سرتاپا — رہنے دیتا نہ سقم اس میں ذرا
گر صحیح اس کا قول ہو جاتا! — کس کا منہ تھا غلط جو ٹھہراتا
ملتجی تجھ سے تب نہ میں ہوتا — نہ رہا وہ رہوں نہ کیوں روتا
عجز کرتی بلا نہ تب میری — عاجزی اس میں اب ہے سب میری

ایک غلط فہمی کا ازالہ

ڈاکٹر اقتدا حسن اپنے مضمون میں لکھتے ہیں۔

"حقیقت نے چارلس پیرون (جنرل پیرون ملازم سندھیا) کی فرمائش پر خسرو کی ہشت بہشت کو اردو کا بھی جامہ پہنایا تھا۔ یہ ترجمہ ۱۲۱۱ھ یا ۱۲۱۵ھ میں ہوا۔"

حقیقت اور میر محسن لکھنوی پر اپنے مضامین میں بیشتر اہلِ علم نے وہی بات کہی ہے جس کا تذکرہ ڈاکٹر اقتدا حسن اپنے مضمون میں کر چکے ہیں۔ اور اس غلط فہمی کی بنیاد آگرہ کالج کے پروفیسر ٹامسن کا ایک مکتوب ہے جو میر محسن کے پڑپوتے میجر جنرل سید شاہد حامد کے خاندانی کاغذات میں موجود ہے۔ اس سلسلے میں سب سے زیادہ دقیع اور معتبر و مستند رائے خود مصنف کی ہو سکتی ہے۔ اگر اس مثنوی کا حقیقت نے اردو میں ترجمہ کیا ہوتا تو یقیناً اس کا تذکرہ کہیں نہ کہیں کرتے۔ البتہ ہشت گلزار میں ایک جگہ وہ بہ صراحت یہ کہتے ہیں کہ اس مثنوی کو اردو زبان میں منظوم کرنے سے قبل وہ آسان فارسی نثر میں منتقل کر چکے تھے۔ چنانچہ وہ کہتے ہیں۔ ؎

گو کہ ہے خوب یا کہ ہے یہ زشت!
لیک قصہ یہ ہے بہ ہشت بہشت

خسروئے شاعراں نے جس کو کہا — فارسی کی زبان میں سرتا پا!
پیش ازیں او سخن بہ نقش و نگار — فارسی میں کیا تھا نثر اے یار
نثر بھی ایسی ہی ہوتی وہ رقم! — مصرعہ جس پر نثار ہے ہر دم
طوطیٔ ہند کا میں خوشہ چیں! — ہندی میں اب لکھوں ہوں اسکے تئیں

۱۔ میر محسن لکھنوی۔ مطبوعہ صحیفہ لاہور۔

چنانچہ حقیقت نے خسرو کی اس مثنوی کو آسان فارسی نثر میں لکھا تھا جس کا اردو ترجمہ غلام احمد دہلوی نے کہا تھا جس کا تذکرہ پروفیسر بلوم ہارٹ کی دو فہرست کتب خانہ انڈیا آفس کے اردو مخطوطات میں ملتا ہے۔ اس فہرست کا اور ترجمہ حکیم شمس اللہ قادری نے کیا تھا۔

"غلام احمد دہلوی نے ہنری مارٹن کی فرمائش سے ۱۲۱۲ ہجری میں سید حسین حقیقت کی ہشت گلزار کا ترجمہ کیا۔" ہشت گلزار نثر ہے امیر خسرو کی مثنوی ہشت بہشت کی۔ ۱۲۱ ورق۔[1]

حقیقت کا اسلوب شاعری

شاہ حسین حقیقت کا اندازِ بیان خالصتاً لکھنوی ہے۔ لیکن اس مثنوی کو اعلیٰ درجے کی فنکارانہ تخلیق شاعرانہ خوبیوں کی بناء پر نہیں قرار دیا جا سکتا۔ جس عہد میں حقیقت یہ مثنوی لکھ رہے تھے۔ تو مثنوی سحر البیان اپنے اندازِ بیان سلاست اور مجلسی و تہذیبی زندگی کے مرقعے کھینچنے اور جذبات نگاری کے سبب نہ صرف غیر معمولی شہرت حاصل کر چکی تھی بلکہ فن کی انتہائی بلندیوں کو چھو کر مثنوی نگاری کی میں ایک اعلیٰ درجے کا معیار قائم کر چکی تھی۔ چنانچہ لکھنؤ کے تقریباً ہر شاعر کے دل میں اس بات کی خواہش بیدار ہونا فطری تھی کہ وہ بھی اس درجے کی کوئی مثنوی لکھ کر شہرت عام اور بقائے دوام پا سکے۔ چنانچہ ہم یہاں ڈاکٹر لطیف حسین ادیب کی اس رائے سے متفق ہیں کہ ہشت گلزار کی تصنیف کے وقت اس کا ردِ عمل فطری تھا۔ لیکن انھوں نے سحر البیان کے مقابلے میں نہ تو کوئی نئی بنیاد رکھی اور نہ آرائش کے لئے کوئی نیا سامان فراہم کیا۔ بس یہ تاثر ضرور دیا ہے کہ ہشت گلزار کے مقابلے میں سحر البیان پانے میں دھونے کے قابل ہو گئی ہے۔

---

[1] انڈیا آفس لائبریری میں ہندوستانی مخطوطات کی فہرست از پروفیسر بلوم ہارٹ، مطبوعہ آکسفورڈ پریس ۱۹۲۲ء، ص ۴۱-۴۲

اس شاعرانہ تعلّی کا اظہار حقیقت نے مثنوی کے آخر میں یوں کیا ہے۔ ؎

معنی تازہ ہیں لفظ بھی رنگین !
جوں گل نوبہار خلد بریں ! !

ہے ہر ایک لفظ غیرت گلزار — ہر سطر سے عیاں ہے سنبلِ زار
معنی یوں لفظ میں ہیں جلوہ گرا — ہو بھری جیسے شیشے میں صہبا
ہاں حسن دہلوی اگر ہوتے ! — مثنوی اپنی پانی میں دھوتے
لن ترانی نہ کر حقیقت تو — اپنے منہ سے نہ بن میاں مٹھو

شاعر کو اِس حد تک تو تعلّی کی اجازت دینا ہی چاہیئے۔ حقیقت یہ ہے کہ اگر تخلیق کار میں یہ احساس موجود نہ ہو تو پیشرو عظیم شعری و فنی کارناموں کی ہیبت اس سے کوئی تخلیق نہیں کرا سکتی۔ جہاں تک موازنے کا تعلق ہے تو بلا خوف تردید کیا جا سکتا ہے کہ سلاست بیان مجلسی و تہذیبی زندگی کے مرقعوں، انسانی جذبات کے اظہار اور فنکارانہ چابکدستی اور شاعرانہ محاسن کے اعتبار سے ہشت گلزار سحر البیان کی گرد کو بھی نہیں پہنچتی۔

ڈاکٹر ادیب :۔ مذکورہ مثنویوں کا موازنہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں۔

"ہشت گلزار کو سرو قدی تو ملی مگر حسن چمن بندی سے محروم رہی اُس کی معاشری جھلکیاں، رسوم کے بیانات، جذبات نگاری اور منظر کشی مثنوی سحر البیان کے فن کی اس بلندی کو نہیں پاتے جو حسن پاروں کی مربوط یکجائی کا نتیجہ ہوتی ہے۔"

ہشت گلزار کی [illegible] میں سادگی ہے اور اس میں حتی الامکان متروک الفاظ کے استعمال سے بھی پرہیز کیا گیا ہے۔ جو لکھنؤ میں تحریک اصلاح زبان کے زیر اثر معلوم ہوتا

ہے۔اس کی بحر، سحرالبیان کی بحر کی طرح رواں دواں نہیں ہے۔

اکثر جگہ اشعار میں کسی قسم کے شاعرانہ محاسن نہیں ملتے۔اور شاعر کا اندازِ بیان سپاٹ اور کھردرا ہو جاتا ہے۔اور یہ گمان گزرنے لگتا ہے کہ شاید ہم نثر کا مطالعہ کر رہے ہیں۔ ایسے مقامات پر آمد کی بجائے آورد معلوم ہوتی ہے۔اور قاری کے طبع رواں کو یک لخت جھٹکا سا محسوس ہوتا ہے۔بعض جگہ یہ خیال آتا ہے کہ شاعر نے بڑی مشکل سے خیال کو نظم کا روپ دیا ہے۔اکثر اشعار میں ترنم اور موسیقیت بھی موجود ہے۔لیکن بیشتر جگہ سپاٹ نثری انداز ہی ہے۔اس تمام کے باوجود اس بات سے اتفاق کرنا پڑے گا۔

"یہ مثنوی اس زمانے کی زبان کا بہتر نمونہ ہے۔سحرالبیان کے بعد اس کے زیر اثر وجود میں آنے والی مثنویات میں اس کا نام بلاشبہ سرفہرست ہی لکھنا ہوگا۔"

ہشت بہشت اور ہشت گلزار کا موازنہ

شاہ حسین حقیقت نے اپنی مثنوی کے آغاز میں ہی اس بات کا اعلان کر دیا ہے کہ وہ امیر خسرو کے مقابلے میں خود کو کم تر شاعر اور اپنی کاوشوں کو فروتر سمجھتے ہیں۔انھوں نے خسرو کی مثنوی کو مفرز اور اپنی شاعری کو پوست قرار دیا ہے۔تاہم ہم یہاں اس غرض سے ہشت گلزار اور ہشت بہشت کا موازنہ پیش کر رہے ہیں تاکہ ایک طرف تو یہ واضح ہو جائے کہ جب ایک بڑا شاعر کسی موضوع کو اختیار کرتا ہے تو اس میں کیا کیا خوبیاں پیدا کر دیتا ہے اور ایک کم تر درجے کے فنکار کے ہاتھوں وہی موضوع کسی شکل میں قارئین کے سامنے آتا ہے۔خسرو کی مثنوی میں اختصار کا فن جا بجا نظر آتا ہے۔حقیقت گو کہ اختصار سے بات کہنے کی کوشش کرتے ہیں لیکن ان کے ہاں وہ شدت تاثر پیدا نہیں ہوتا۔خسرو کی مثنوی کے

۱: شاہ حسین حقیقت از ڈاکٹر لطیف مجلہ سابق

حوالے سے ہی حقیقت، کی مثنوی کے مختلف رخصل پر بحث کی جاسکتی ہے۔ علاوہ ازیں اس اعتبار سے بھی دونوں مثنویوں کا موازنہ خالی از دلچسپی نہ ہوگا کہ حقیقت کس حد تک امیر خسرو کی تقلید میں کامیاب رہے اور ان کی مثنوی کو جملہ فنی محاسن کے ساتھ ترجمہ کرنے میں کامیاب ہوئے ہیں یا نہیں ؟

ہشت بہشت امیر خسرو کی آخری دور کی تصنیف ہے۔ اس وقت تک امیر خسرو کا فن ارتقا کے منازل طے کرتا ہوا اپنے عروج تک پہنچ گیا تھا۔ خسرو نے ۷۰۱ھ ہجری میں اس کو تخلیق کیا تھا۔ اس کے کل اشعار کی تعداد خسرو کے بقول تین ہزار تین سو پچاس ہے ؎

ہمہ شیش بگاہ عرضی شمار — سہ صد و پنجہ آمد و سہ ہزار !
سال ہجری یکے ز ہفتہ بود — کس بنا برد ، بچرخ کبود[1] !

ہشت گلزار کے اشعار کی تعداد چار ہزار سات سو پینسٹھ ہے۔ ؎

شعر کتنے ہوئے کیا جو شمار !
سات سو پینسٹھ اور چار ہزار !

بحر امیر خسرو کی مثنوی کی بحر "خفیف مسدس مخبوس مستور" ہے یعنی فاعلاتن مفاعلن مفلات۔

۵ حقیقت کی مثنوی کی بحر :- فاعلاتن مفاعلن فعُلن

ابواب ہشت بہشت کو سب سے پہلے مولانا نظامی گنجوی نے ہفت پیکر کے نام سے لکھا تھا۔ ہفت پیکر میں چند ابواب امیر خسرو کی ہشت بہشت سے زیادہ ہیں۔ نامۂ ابواب میں خاقان چین و بہرام کی لڑائی، شیر مارنے کی تعریف، اور

۱۔ ہشت بہشت از امیر خسرو مرتبہ مطبوعہ انجمن ترقی اردو علیگڑھ۔

اژدہا مارنے وغیرہ کا تذکرہ تقریباً پندرہ بیس عنوانات زائد ہیں۔ ان عنوانات کے ذیل میں کہیں کہیں کوئی حکایت اور تمثیل بھی آجاتی ہے۔ خسرو نے یہ عنوانات اپنی مثنوی میں قائم نہیں کئے تھے۔ ہفت پیکر میں نصیحت کا مخاطب بیٹا ہے اور ہشت بہشت میں بیٹی ہے۔ اب ہم خسرو اور حقیقت کی مثنویوں کے ابواب پیش کرتے ہیں۔ امیر خسرو کی مثنوی میں حسب ذیل اکیس ابواب ہیں۔

(۱) حمد (۲) نعت (۳) معراج (۴) تعریف بادشاہ (۵) خطاب بسوئے بادشاہ (۶) سبب تالیف (۷) نصیحت بدختر (۸) صفت دلارام (۹) شکار بہرام (۱۰) رنجیدن بہرام وگذاشتن دلارام (۱۱) آراستہ شدن محل بہرام (۱۲) گنبد مشکیں (۱۳) گنبد زعفرانی (۱۴) گنبد ریحانی (۱۵) گنبد گلناری (۱۶) گنبد نیفشتی (۱۷) گنبد صندلی (۱۸) گنبد کافوری (۱۹) وفات بہرام (۲۰) خاتمہ (۲۱) شکرگزاری حق تعالیٰ۔

حقیقت نے ہشت گلزار میں جو ابواب قائم کئے ہیں ان کی تعداد اٹھارہ ہے۔

(۱) حمد باری تعالیٰ (۲) نعت (۳) مجیب الدعوات سے حاجات (۴) چمنستان مناجات (۵) نالہ مصنف بہ رنگ ہزار داستان (۶) مدح امیر کبیر عبدالقادر خان ثابت جنگ (۷) گلزار اوّل نخل بندی آغاز داستان (۸) بہرام اور دلارام کا شکار کو جانا (۹) سات ایوانوں کی تیاری (۱۰) گنبد مشکیں (۱۱) گنبد زعفرانی (۱۲) گنبد ریحانی (۱۳) گنبد گلناری (۱۴) گنبد بنفشہ گوں (۱۵) گنبد صندلی محل (۱۶) برج کافوری (۱۷) بہرام گور کی وفات (۱۸) خاتمہ و عجز و نیاز مصنف۔

اصل فارسی مثنوی میں تمام گنبدوں کا رنگ جداگانہ ہے حقیقت نے بھی اس کی تقلید کی ہے۔ ہر شہزادی کا لباس جس گنبد میں وہ رہتی ہے۔ اس کی مناسبت سے ہے۔

بہرام گور کا لباس بھی ہر شب گنبد کے رنگ کے مطابق اور نیا ہوتا ہے۔ بہرام گور جس روز جس گنبد میں جاتا ہے۔ اس میں بھی ستارے کے رنگ کو ملحوظ رکھا گیا ہے۔ اہلِ نجوم کے مطابق تمام سیاروں کا رنگ منفرد ہوتا ہے۔ ان میں کوئی سیاہ، کوئی سبز کوئی سرخ ہے۔ اور اہلِ نجوم کی تقسیم کے مطابق ہفتے کے ساتوں دن انہی سیاروں سے تعلق رکھتے ہیں۔ حقیقت نے بھی یہی انداز اختیار کیا ہے۔ اور اضافوں کے باوجود مثنوی کی کہانی میں کوئی بنیادی تبدیلی نہیں کی ہے۔

امیر خسرو نے گنبد مشکیں کو یوں بیان کیا ہے۔ ؎

روز شنبہ کہ باد مشک انگیز — شد بدامانِ صبح غالیہ ریز!
شہ بہ گنبد سرائے مشکیں شد — خانہ او ہمچو نافۂ چیں شد
جامہ راہم بہ رنگ کیوانی! — داد ترتیب عنبر افشانی!

حقیقت نے اسی خیال کو اس صورت سے ادا کیا ہے ؎

روز شنبہ ہوا جو غالیہ سا — شب کا باد سحر نے مشک گھسا
شاہ کیواں ہم بلند مقام — مہر برج شرف وشہ بہرام!
سج کے پوشاک سب وہ کیواں رنگ — دیکھ کر جس کو ہو زحل بھی دنگ
برج مشکیں میں جلوہ گر وہ ہوا — نافۂ مشک چیں گہر وہ ہوا

خسرو جس بہشت کا بیان شروع کرتے ہیں اس کے رنگ کو اس خوبی سے بیان کرتے ہیں کہ ابتدا سے آخر تک پورے قصّے پر اسی رنگ کی کیفیت چھائی رہتی ہے۔ اور وہ اس رنگ کے فلسفے کو بیان کرتے ہیں۔ حقیقت نے ترجمے میں اس خوبی کو کامیابی کی حد تک برقرار رکھا ہے۔ جس کا اندازہ مذکورہ مثال سے بخوبی ہو سکتا ہے۔

کردار نگاری

امیر خسرو کی مثنوی میں نہایت اعلیٰ درجے کی کردار نگاری ملتی ہے۔ جس شخص کا تذکرہ خسرو کرتے ہیں اس کی حیثیت اور مرتبے کا پورا پورا خیال رکھتے ہیں اور اس صورت سے جزئیات نگاری اور تفصیلات بیان کرتے ہیں کہ کردار مکمل طور پر نمایاں ہو جاتا ہے۔ حقیقت نے اس کا خاص خیال رکھا ہے اور جزئیات نگاری سے کردار کو ابھارنے کی کامیاب کوششیں کی ہیں۔

دلارام بہرام گور کی معشوقہ ہے اور جملہ مہمات میں اس کی رفیق و دمساز رہی ہے۔ وہ بہادر اور جفاکش بھی ہے لیکن عورت ہونے کے سبب اپنی صنفی کمزوریاں بھی رکھتی ہے۔ پھر یہاں یہ بات قابلِ غور ہے کہ جو آفت ناگہانی ایک دم دلارام پر نازل ہوتی ہے۔ ایسی صورت حال سے اگر کوئی مرد بھی دوچار ہوتا تو اس کی بھی نفسیاتی و ذہنی کیفیت یہی ہوتی۔ جب بہرام گور، دلارام کو اس صحرا میں بے یار و مددگار چھوڑ جاتا ہے۔ تو اس یک بیک تبدیلی سے وہ گھبرا جاتی ہے۔ اس وقت دلارام کی جو ذہنی کیفیت ہے۔ اس ڈر، خوف، گھبراہٹ اور اندیشوں اور وسوسوں کی تصویر امیر خسرو نے نہایت کامیابی سے کھینچی ہے جو مرقع نگاری کا کمال ہے۔ اور یہ کیفیت عین فطری ہے۔ ؎

ماند بے خویشتن صنم تا دیر !
تشنہ و غرق آب و از جاں سیر !

پس بصد خستگی زجا برخاست — راہ صحرا گرفت و می شد راست
بسکہ منزل بدشت دیوان داشت — سایہ خویش دیو می پنداشت
بسکہ رہ برسنان تنیر شش بود ! — موزہ غربال خاک بنیر شش بود
از کف پائے خارہائے چو تیر — میگذشتن چو سوزنے چہ حریر

پاکہ از برگ گل نگار بود ! چوں شرر چوں بروئے خار شود

کس نہ ہمراہ و رہنمائش مگر سایہ درزیر و آفتاب زبر

می نمود اندراں پریشانی ! گفتہ و کردہ را پشیمانی ! !

زاں بساط دواں آہو خائے کرد بیم دو آتش آہو پائے

بیم بودش کہ پاشود بطواف !

چوں سم آہو از میانہ شگاف !

امیر خسرو نے ان اشعار میں دلارام کی جو کیفیت بیان کی ہے وہ بالکل فطری ہے۔ اس آفت ناگہانی کا پہلا اثر تو یہی ہوا کہ دلارام ایسی متحیر اور ششدر ہو گئی کہ تھوڑی دیر تک تو وہ یہی نہ سمجھ سکی کہ اس کے ساتھ کیا بیت چکی ہے جب ہوش و حواس بجا ہوتے ہیں تو اسے اپنی نازک حالت کا اندازہ ہوتا ہے۔ زبان سوکھ کر کانٹا ہو گئی ہے اور دہشت و غم سے نڈھال ہو گئی ہے۔ اور حیران و متوحش ہے۔ غرض خسرو نے نہایت کامیابی کے ساتھ اس بے سر و سامانی کی تصویر کھینچ دی ہے۔ دلارام کو پیش آنے والے اس واقع کو حقیقت نے کس طرح بیان کیا ہے۔ ملاحظہ ہو۔

ہر قدم پر تھی خائف و لرزاں
گاہ گریاں تھی اور گہے گریاں !

سائے سے اپنے خوف کھاتی تھی سایہ ساں جاں نہ تھی پہ جاتی تھی

چبھتے تھے ہر قدم پہ سینکڑوں خار کف پا دونوں خار سے تھے فگار

برگ گل سے جو اس کے تھے کف پا خار اون میں تھا ہر قدم چبھتا !

اپنی گفتار سے پشیماں تھی ! حالت اس کی غرض پریشاں تھی

گرم ریگ وہ اور خوف رواں — دل سوزاں سے آہ سرد کشاں
یکہ ہر ہر قدم تھا خوف ہلاک — تھی اوڑاتی وہ اپنے سر پر خاک
پات کوئی اگر کھڑکتا تھا — تو کلیجہ وہیں دھڑکتا تھا!
گاہ آتا نظر جو بیشۂ شیر! — شیر غم لیتا آہوئے دلگیر!

کرتے جاتے تھے آبلے پابوس
جب چلی اس طرح سے وہ کئی کوس

اسی طرح امیر خسرو نے ہشت بہشت کی بہشت ہفتم کے بیان میں اس واقعے کا ذکر کیا ہے جب شہزادہ طلسمی سرمہ آنکھوں میں لگا کر اہل دربار کی نگاہوں سے پوشیدہ ہو جاتا ہے اور اپنے مُوکّل کو اشارہ کر دیتا ہے کہ بدکار وزیر کو دھول لگائے۔ خسرو نے اس واقعے کو جزیات کے ساتھ یوں پیش کیا ہے کہ نظر کے سامنے تصویر کھنچ جاتی ہے۔

کرد اشارت بہ دیو تا برخاست
دست خود کرد بہر سیلی راست

زر قضائے بہ خواجۂ دیواں — کہ بلرزید زاں طراق ایواں!
کاردراں نہ جائے برجستند — سر آں حال را بہم جستند
ہمدریں گفتگوئے بُد ہر کس — کاہرمن باز در رسید ز پس
زد چناں سیلی دگر ناگاہ! — کز سر خواجہ برفتاد کلاہ!
کلہ گرد خوردہ رازاں گرد! — تا ستانہ تفنائے دیگر خورد
حیرتے درمیان خلق افتاد — دوست آزردہ گشت دشمن شاد
مردماں از خجالت دستور — دور گشتند یک بیک ز حضور

ایں زسودائے سیلیش خنداں واں دگر پشت دست بر دنداں

خواجہ جست از خجالت سیلی !

بارخ زرد گردن نیلی ! !

ان اشعار میں امیر خسرو نے نہایت تفصیل کے ساتھ دیو کا ہاتھ اٹھانا، دھول مارنے کے لئے اس کو سنبھالنا اور پھر دھول رسید کر کے ایک لمحے کے لئے ٹھہر جانا تاکہ لوگ متحیر ہوں۔ اور ایک دوسرے کی طرف تعجب و استعجاب کے ساتھ دیکھنا ان تمام تفصیلات کو اس صورت سے پیش کیا گیا ہے کہ واقعہ آنکھوں کے سامنے گھومنے لگتا ہے۔ اس کو جزیات نگاری اور مرقع نگاری کا کمال کہا جا سکتا ہے۔

شاہ حسین حقیقت نے بھی اس منظر کو بیان کرتے ہوئے یہ امر ملحوظ رکھا ہے کہ واقعہ کو جزئی تفصیلات کے ساتھ لکھا جائے اور وہ اس میں کامیاب بھی رہے ہیں۔ ؎

آکے دیوانِ عام میں یک بار

بولا یوں دیو سے کہ رہ ہشیار

یعنی جس کو کروں اشارہ میں خوب ہی دھولیانا اسکے تئیں

آیا جس دم وزیر گردن کش سر پُر از باد کبر چوں آتش

کج رکھے فرق پر کلاہ غرور مجرے کو خم ہوا جو شہ کے حضور

دیو نے ایسی ہی جڑی اک دھول کہ خطا ہوگیا وزیر کا بول !

ہو کے حیران اور پھرا گردن ! دیکھا یعنی ہے کون سیلی زن

سر پھرانے کے ساتھ ہی بس جب لگ گئی اور ایک سر پہ دھپ

گر پڑی سر پہ سے کلاہ اے وائے جھک کے چاہا زمین پہ سے اوٹھائے

نہ ابھی تھی اوٹھائی جو دی جڑ
دیو نے پھر یہ بارہ ایک چھکڑ

دوڑے مردم یہ دیکھ بوالعجبی !
یعنی کی کس نے ایسی بے ادبی

کوئی ادھر دوڑا کوئی ادھر آیا
بے ادب پر نہ وہ نظر آیا !

ہے ستم پڑنے پھر گئی شپ شپ
دھول پر دھول اور دھپ پر دھپ

دیکھ یہ حال سب ہوئے حیران
دوست غم گین اور عدو شاداں

چھپتا پھرتا تھا گو ادھر اور ادھر
سر کھجاتا ہوا برہنہ سر

پر نہ موقوف تھے جم و سر خپک
دیکھ یہ حال ہر کوئی تھا دنگ

ایک ہنسے ایک دکھ عجب تھا حال
کوئی ہنستا تھا منہ پہ دھر رومال

کوئی انگشت زیر دنداں تھا !
کوئی گریاں تھا کوئی خنداں تھا

پڑتے تھے جوں جوں دھول پر بس دھول
کہتے تھے لوگ الامان لاحول

دھول جس دم وزیر تھا کھاتا
شرم سے تھا زمیں میں گڑ جاتا

دیکھ کر لوگ خجلت دستور
ٹل کے جاتے رہے تھے پاس سے دور

لوٹے تھا کوئی ہنسی سے پکڑے پیٹ
ہنستے ہنستے گیا تھا کوئی لیٹ

کوئی کہتا کسی پہ غصہ کر !
ہنس نہ اتنا خدا کے قہر سے ڈر

چاند ہوتی ہے ایک کی گنجی !
سوجھتی کس طرح ہے تجھکو ہنسی

اس واقعے کے بیان میں حقیقت نے جزیات نگاری سے کام لیتے ہوئے پورے واقعے کی تصویر کھینچ دی ہے۔ بادشاہ کا دربار ہے۔ وزیر آگر بیٹھتا ہے کہ دیو جو نظر نہیں آتا۔ دھول لگانا شروع کر دیتا ہے۔ دوست دشمن سب کے ہوتے ہیں۔ ہر چند کہ اس بلائے

ناگہانی نے سب کو دہشت زدہ کردیا ہے۔ لیکن وزیر کے دشمن اسے اس حال میں دیکھ کر دل میں خوش ہو رہے ہیں۔ ایسے موقعوں پر معاملہ چاہے کتنا ہی سنگین کیوں نہ ہو لیکن اگر اس میں کوئی مزاح کا پہلو ہو تو یقیناً زندہ دل لوگ اس سے عبرت پکڑنے کے ساتھ ساتھ اپنی ہنسی کو بھی نہیں روک سکتے۔ ایسے لوگ یہاں بھی موجود ہیں جو ہنس بھی رہے ہیں اور ایسی ہنسی کے دوران دوسروں کو سنجیدہ ہونے کے لئے کہہ رہے ہیں۔

امیر خسرو کی مثنوی ہشت بہشت مرتب ایک جگہ لکھتے ہیں[1]۔

"فن ہمیشہ ایسے اختصار کو پسندیدگی کی نظر سے دیکھتا ہے کہ جس میں خیال آفرینی کے وسیع امکانات کو سمو دیا گیا ہو۔ امیر خسرو نے تمام شعبہ ہائے تیر اندازی کے کمال کو صرف تین اشعار میں بیان کر دیا ہے۔ جس سے ان کے قدرت فن، صفائی و سلاست اور کلام کی پختگی و چستی کا اظہار ہوتا ہے۔"

اس کے بعد انھوں نے مندرجہ ذیل تین شعر دیے ہیں۔ جن کا تعلق بہرام گور کی تیر اندازی سے ہے۔ ؎

آہن زچوں محک کردے — خط گوراں زپشت حک کردے
ورز آہو بدوے نشانہ او! — موئے بشگافتے زشانہ او!
ور شدے برنشانہ سخت انداز — رخنہ در ناف کوہ کردے باز

"بہرام گور جس طرح چاہتا تھا تیر چلاتا تھا کبھی تو گورخر کی پشت پر جو خطوط ہوتے تھے انھیں تیر سے اڑا دیتا تھا۔ کبھی ہرن کے بالوں کی موشگافی کرتا اور شکار کو کچھ آزار نہ پہنچتا اور جو زخم پہنچانا چاہتا تو ایسی قوت و طاقت سے

۱۔ ہشت بہشت مرتبہ نجیف اشرف ندوی۔ مطبوعہ انجمن ترقی اردو علیگڑھ

تیر بیٹھتا کہ گورخر کا تو کیا ذکر پہاڑ میں بھی سوراخ ہو جاتا۔"

ان اشعار میں شاعرانہ مبالغہ آرائی سے کام لیا گیا ہے۔ لیکن شاعری میں اس مبالغہ آرائی کو جائز قرار دیا جا سکتا ہے۔ اس میں شاعر نے بہرام گور کی ماہرانہ تیر اندازی کی تعریف کی ہے۔ اور صرف تین اشعار میں اس کو بیان کر دیا ہے۔

حقیقت نے بہرام گور کی تیر اندازی کو ذرا پھیلا کر بیان کیا ہے ؎

قادر انداز یوں بہ فن تیر
مارے اک تیر سے جو سو نخچیر

تیرہ شب میں وہ چھید تا تھا بال — تیر سے اوس کے تھا بچاؤ محال
تیر کے حق میں تھا وہ سخت کمان — الغرض کوئی تو تھا طوفان!
تیر جب ہاتھ اوس کے آتا تھا — تیر گردوں بھی سہم جاتا تھا!

اوس کے قبضے میں آتی جب کہ کمان
قوس چرخ اوس پہ جاتا تھا قرباں

اسی طرح بہشت ششم کے قصے میں جب سوداگر زادہ ایک سال غائب رہنے کے بعد طلسمی حمام سے برآمد ہوتا ہے تو اس وقت اس کے غلاموں کی جو کیفیت خسرو نے بیان کی ہے ان میں ان کے طبقاتی مزاج اور سماجی حیثیت کو ملحوظ رکھا ہے۔ ؎

چوں بدیدند روئے منعم خویش — در دویدند خواجہ را در پیش
ہر یک از بندگان بہ آزادی! — گریہ میکرد لیکن از شادی!
بندہ وارش بپا در افتادند — بوسہ بر دست و پاش مبدادند

حقیقت نے اس واقعے کو جس طرح بیان کیا ہے اس میں اثر آفرینی اور خاص

کیفیت جو ایسے موقع پر غلاموں میں دکھانی چاہیئے تھے، انہیں پیش کر سکے ؎

تھے غلام اس کے جو نمک بہ حلال　　آتے تھے روز واں وہ خستہ حال

منتظر در پہ رہتے تھے بیٹھے　　بارے موجود واں وہ اس دم تھے

دیکھ آقا کو دوڑے وہ اک بار　　اور رونے لگے پکار پکار !

امیر خسرو نے اس وقت غلاموں کے رونے کو "گریہ شادی" کہا ہے۔ حقیقت نے بس پکار پکار کر رونے کی کیفیت بیان کی ہے۔ جس سے یہ ظاہر نہیں ہوتا کہ ان غلاموں کی یہ کیفیت، مدت مدید کے بعد اور آقا کی زندگی سے مایوس ہو جانے کے بعد ہوئی ہے۔

قصہ ہیرامن طوطا

بعض تذکرہ نویسوں نے مثنوی ہیرامن طوطا کو بھی حقیقت کی ایک علیحدہ تصنیف قرار دیا ہے۔ اس غلط فہمی کی وجہ یہ ہے کہ حقیقت نے خود بھی اس داستان کو علیحدہ کتابی شکل میں کانتھ پریس لکھنؤ سے شائع کرایا تھا۔ لیکن اصل میں ہشت گلزار کی ہی ایک داستان ہے۔ مصنف نے اسی مثنوی کی حمد و نعت کے بعض اشعار اور آخر میں اپنی اشعار میں سے انتخاب کیا ہے۔ ——— جس میں شاعر نے اپنے حالات زندگی بیان کئے تھے۔ یہ داستان علیحدہ سے ۱۸۵۱-۵۲ میں شائع ہوئی تھی لہذا ہشت گلزار کی اس داستان پر خصوصیت سے بحث کی جارہی ہے۔

مثنوی ہیرامن طوطا

شاہ حسین حقیقت کی یہ مثنوی کانتھ پریس لکھنؤ سے سب فرمائش مرزا اصابت علی بیگ عنایت تخلص کے شائع ہوئی تھی۔ اس وقت ہمارے سامنے کانتھ پریس کا طبع شدہ نسخہ ہی ہے۔ اس قصے کو مصنف نے مثنوی نے کہا۔ بلکہ اس کا عنوان "قصہ ہیرامن طوطا" ہے۔ جس کو با اجازت مصنف، ناشر نے شائع کیا ہے۔ ہیرامن طوطا، حقیقت نے کس سنہ میں تصنیف کیا تھا اس کے بارے میں زیر تذکرہ مطبوعہ نسخے سے کچھ پتہ نہیں چلتا۔ البتہ عنایت کے قطعے

سے جو کتاب کے آخر میں دیا گیا ہے۔ اس کے سال طباعت کا پتہ چلتا ہے۔

قصہ یہ نیا جو اے عنایت چھاپا　　محظوظ ہوا وہ جس نے اسے پڑھا

آواز غریب سے یکایک آئی!　　لکھ قصہ دلپذیر مطبوع!

۱۲۶۸ھ

عنایت کے اس قطعے قصہ ہیرامن طوطا کا سن طباعت ۱۱۹۹ ہجری برآمد ہوتا ہے۔ جیسا کہ زیر تبصرہ نسخے میں شائع ہوا ہے۔ پروفیسر لطیف حسین ادیب نے مثنوی ہیرامن طوطا کا سن طباعت ۱۲۶۸ ہجری (۱۸۵۱-۱۸۵۲) بتایا ہے۔ چنانچہ وہ لکھتے ہیں۔ "یہ مثنوی ۱۲۶۸ھ (۱۸۵۱-۱۸۵۲) سن عیسوی میں کاٹھ پریس لکھنؤ میں طبع ہوئی۔" قصہ دلپذیر مطبوع۔" (۱۲۶۸ھ) سے سن طباعت برآمد ہوتا ہے۔[1] حقیقت نے پوری مثنوی ۱۲۲۵ھ میں سپرد قلم کی تھی۔ جس کا یہ حصہ "قصہ ہیرامن طوطا" کے عنوان سے ۱۲۶۸ ہجری میں علیحدہ مطبوع ہوا۔

حقیقت نے یہ مثنوی سفر کرناٹک وغیرہ کے بعد لکھی تھی۔ جس کے شواہد خود اس قصے میں ملتے ہیں۔ سفر وسیلہ ظفر ہوتا ہے۔ لیکن حقیقت کے معاملے میں جنوبی ہند کا یہ سفر، وسیلہ ظفر کی بجائے اور پریشانیوں کا موجب تھا۔ چنانچہ ہیرامن طوطا میں وہ لکھتے ہیں۔

نہ سفر سے تو کچھ ہوئی بہبود!　　کاربستہ نے کچھ نہ پائے کشود

تلاش معاش کے سلسلے میں لکھنؤ جیسے وطن کا چھوٹنا اور پھر دیار غیر میں بھی کسی مناسب ذریعۂ روزگار کے نہ ملنے نے حقیقت کے　　دل میں لکھنؤ کی محبت کو اور

۱:۔ شاہ حسین حقیقت۔ از پروفیسر لطیف حسین ادیب معارف ص ۱۴۷ قسط دوم۔

نیادہ شدت سے ابھارا ہے

ایک شب گفتگو یہ دل سے تھی
لائی قسمت مجھے کہاں میری

چھوٹے یار دیار اور حبیب — طالع شوم وائے ہائے نصیب
یاں کسی سے نہیں شناسائی — پاس نہیں کوئی غیر تنہائی
گھر سے جانا کہیں نہ آنا ہے — خانہ کیا ہے کہ قید خانہ ہے

جلد یاں سے نجات دیوے خدا
مجھکو دکھلائے پھر وطن میرا

معلوم ہوتا ہے کہ لکھنؤ واپس آنے کے بعد بھی معاشی حالات بدستور خراب رہے ہے[1]

جب میرا دل بہت ہی گھبرایا
مجھ سے ہاتف نے آکے فرمایا !

کس لئے اس قدر ہراساں ہے — ارے تیرا ہر ایک خواہاں ہے
مصطفائی دوکان تک تو جا — واں پہ ہیں ایک قدر دان مرزا
ہے عنایت علی جو نام ان کا — لطف احسان ہی ہے نام اونکا
تجھ کو جس وقت دیکھ پائیں گے — رائے عمدہ کوئی بتائیں گے !
اے حقیقت تو ان کے پاس تو جا — لیتا جا کوئی عمدہ سا قصہ
جبکہ ہاتف نے یہ کہا مجھ سے — اٹھ کے بیٹھا قلم دکاغذ لے
کہا میں نے یہ ہیرامن طوطا — گو کہ تھا کچھ نہیں میں کہہ سکتا

۱:۔ قصہ ہیرامن طوطا ص ۴

پروفیسر لطیف حسین ادیب اس سلسلے میں لکھتے ہیں۔

"انھوں (حقیقت) نے جس طرح مثنوی ہشت گلزار نواب عبدالقادر خاں کا تقریب حاصل کرنے کے لئے لکھی تھی۔ اسی طرح یہ مثنوی مرزا عنایت علی بیگ مہتمم مطبع مصطفائی کو پیش کرنے کے لئے لکھی تھی[1]۔"

اس سلسلے میں دو آرا نہیں ہو سکتیں کہ حقیقت نے یہ مثنوی نواب کرناٹک تک رسائی حاصل کرنے کے لئے لکھی تھی۔ شخصی بادشاہتوں کے دور میں یہ روایت عام رہی ہے کہ شعرا و ادبا بادشاہ تک رسائی حاصل کرنے کے لئے یا کوئی فن پارہ بادشاہ کی خدمت میں پیش کر جاتے تھے اس سے باریابی کا موقعہ ملتا تھا اور فنکارانہ اظہار بادشاہ کے دل میں شاعر یا ادیب کی قدر و منزلت کا احساس جگاتا تھا۔

چونکہ قصہ ہیر امن طوطا، اصل داستان کی ایک مختصر داستان ہے جس کو اگر علیحدہ صورت میں بھی پیش کیا جاتا تو اس کی افادیت اور دلچسپی اور فنی لوازمات کے اعتبار سے کوئی فرق نہ پڑتا تھا۔ لہذا سفر کرناٹک سے واپسی کے بعد حقیقت نے صرف اس داستان کو باقی کتاب سے جدا کر کے طباعت کے لئے دے دیا ہوگا۔ ناشر سے ملاقات کے سلسلے میں جو جواز حقیقت نے پیش کیا ہے۔ اس سے یہ سوال ذہن میں آتا ہے کہ کیا اس قصے کو لے جانے کا مقصد تقریب بہر ملاقات ہوگا یا حقیقت اس کے کسی معاوضے یا مطبع میں کام ملنے کی توقع رکھتے تھے۔ بہر حال اس قدر تو یقین سے کہا جا سکتا ہے کہ یہ قصہ ان کی آخر عمر کے قصوں میں سے ہے اور اس وقت تک حقیقت لکھنؤ میں غیر معروف نہیں تھے غالباً ان اشعار میں بھی شاعرانہ افتاد طبع کو دخل ہے اور اس زمانے میں یہ ایک رواج سا تھا کہ ناشر وغیرہ کے بارے میں بھی شکر گزاری کے اشعار درج کئے جاتے تھے۔ اس قصے کو

طباعت کے لئے دینے کا مقصد شاعر کے نزدیک مالی منفعت ہی ہوگی۔

سبب تالیف کے عنوان سے حقیقت نے جو اشعار قصہ ہیرامن طوطا میں دیئے ہیں۔ ان میں اور ہشت گلزار مثنوی کے سبب تالیف کے ذیل میں بیان کئے جانے والے بعض اشعار میں مشابہت ہے۔ البتہ الفاظ میں مناسب رد و بدل کیا گیا ہے۔

ہشت گلزار کا یہ شعر ہے۔

دیکھا پھر آکے ملک کرناٹک　　کہتے دکھن کا ہیں جسے پھاٹک[1]

ہیرامن طوطا میں معمولی سی تبدیلی کے بعد اس شعر کو یوں کر دیا گیا ہے۔

دیکھا پھر آکے لکھنؤ جس آں　　کہتے ہیں ہند کی جسے سب جاں[2]

قصہ ہیرامن طوطا میں کل ۸۲۴ اشعار ہیں، اردو مثنوی کی روایت کے باوصف اس مثنوی کا موضوع عشقیہ نہیں ہے۔ بلکہ یوگ کا علم ہے۔ اور دوستی کے پردے میں دشمنی کرنے والوں کا کردار اس میں پیش کیا گیا ہے۔ اردو کی تمام مثنویات کی طرح اس مثنوی میں بھی شروع میں حمد اور پھر نعت ہے۔ اس کے بعد سبب تالیف بیان کیا گیا ہے اور پھر اصل قصے کا آغاز ہوتا ہے۔ اگر حمد نعت اور سبب تالیف کے سلسلے میں کہے جانے والے اشعار جن کے اشعار کی تعداد ۲۶۴ نکال دیئے جائیں تو کہا جا سکتا ہے کہ اصل قصہ ۱۸۴ اشعار میں بیان کیا گیا ہے۔

یوگ کا علم ایک قدیم ہندوستانی علم ہے۔ جس سے ہندو سنیاسی واقف ہوا کرتے تھے۔ اس علم کو علم کایا پلٹ بھی کہتے ہیں۔ جس میں کسی بھی ذی روح کی روح ایک قالب سے دوسرے قالب میں منتر کے ذریعے منتقل کی جاتی تھی۔ اس قسم کی داستانوں

کا سراغ ہمیں جنوبی ہند کی قدیم داستانوں میں ملتا ہے یہ قصہ مستعار ہے۔ لیکن اس کے ماخذ کے بارے میں کچھ نہیں کہا جا سکتا۔ یہ بات قرین قیاس ہے۔ جسے بعد میں انھوں نے قصہ کے طور پر پیش کر دیا۔ پروفیسر لطیف حسین ادیب صاحب اپنے مضمون شاہ حسین حقیقت میں اس قصے کے بارے میں لکھتے ہیں۔

"اس قصے کا ماخذ کوئی پرانی کہانی ہے جو حقیقت نے دکن میں پڑھی یا سُنی تھی۔ دکنی مثنویات میں فخرالدین نظامی (نویں صدی ہجری) کی مثنوی، کدم راؤ پدم راؤ کا قصہ مثنوی ہیرامن طوطا کے قصہ سے مشابہ ہے۔"

سخادت مرزا صاحب کا بھی یہی خیال ہے۔"البتہ متاخرین میں شاہ حسین حقیقت لکھنوی ثم مدراسی کی ایک مثنوی ہیرامن طوطا تصنیف ۱۲۶۸ھ میری نظر سے گزری جو کاٹھ پریس سے باتصویر شائع ہوئی تھی۔ کدم راؤ کا قصہ اس سے ملتا جلتا ہے۔ غالباً ان ہر دو[1] حضرات نے قصہ ہیرامن طوطا" کو ایک علیحدہ تصنیف سمجھتے ہوئے یہ رائے قائم کی ہے غالباً خسرو کی ہشت بہشت کا آزاد ترجمہ ہشت گلزار' ان لوگوں کی نظر سے نہیں گزرا دکن میں ---- اردو زبان و ادب کے آغاز کے بارے میں اہل علم میں جو تحقیق کا سلسلہ جاری ہے۔ اس کے مطابق اردو کی پہلی تصنیف مثنوی کدم راؤ پدم راؤ ہے جس کے مصنف فخرالدین نظامی ہے۔ اس مثنوی کا قصہ، قصہ ہیرامن طوطا سے بعض جگہ پر ملتا ہے۔ اور دونوں کا موضوع یوگ کا علم ہے۔ اس قسم کے قصے جنوبی ہند کی بعض داستانوں میں بیان ہوتے ہیں۔ ممکن ہے خسرو نے بھی کوئی ایسا ہی قصہ یا تو کسی سے سنا ہوگا یا کوئی ایسی داستان ان کے زیر مطالعہ رہی ہوگی جس میں یوگ کا علم بیان کیا گیا ہوگا۔ اور یہ داستان

۱: بحوالہ سابق ص ۱۴۷

بھی شاہ بہرام کی ہندو نژاد بیوی سنائی ہے۔ ہم یہاں قصہ ہیرامن طوطا اور مثنوی کدم راؤ پدم راؤ[1] کا خلاصہ مختصراً پیش کرتے ہیں۔

خلاصہ کدم راؤ پدم راؤ

کدم راؤ ہیرانگر کا راجہ ہے اور پدم راؤ اس کا وزیر ہے۔ دونوں کے درمیان ابتدا میں کچھ باتیں ہوتی ہیں جن کا تعلق داستان سے معلوم نہیں ہوتا۔ کدم راؤ اپنے وزیر پدم راؤ سے کہتا ہے کہ بے سوچے سمجھے بات کرنا اچھا نہیں ہے۔ میں نے تجھ سے جو کہا تھا (چونکہ درمیان میں اشعار موجود نہیں تھے۔ لہٰذا فاضل محقق جمیل جالبی صاحب نے اس جگہ کو عبارت لکھنے کے بعد خالی چھوڑ دیا ہے) راجہ کدم راؤ نے غصے میں پدم راؤ سے یہ بھی کہا کہ اگر تو اپنی خطا بخشوانا چاہتا ہے اور بعد میں پچھتانا نہیں چاہتا تو مجھے (راجہ) صبح صحیح جواب دے۔ داستان میں یہ بات معلوم نہیں ہوتی کہ پدم راؤ سے کیا خطا سرزد ہوئی تھی۔

راجہ اس کے بعد محل میں جاتا ہے۔ وہ محل میں کسی سے بات نہیں کرتا۔ تمام عورتیں اس کے غصے کو دور کرنے میں ناکام ہو گئیں۔ آخر رانی آگے بڑھی۔ تو راجہ کدم راؤ نے کہا کہ مجھے یہ بتا کہ ناگن نے کیا چھند کیا تھا۔ ادھر ناگن سے بات کر کے پدم کدم کو ڈسنے کے لئے جاتا ہے۔ اور جا کر پھول پان میں جو سرہانے رکھے ہوتے ہیں چھپ جاتا ہے تاکہ جیسے ہی راجہ پھول پان کی طرف رخ کرے تو وہ اسے ڈس لے۔ پدم راؤ ابھی اسی خیال میں تھا کہ رانی کدم راؤ کے پاس آ جاتی ہے۔ راجہ کے پاؤں دبانے سے کدم راؤ جاگ جاتا ہے۔ رانی اس سے کہتی ہے کہ ہماری زندگی تمھاری محبت پر قائم ہے۔ اگر راجہ کھل کر بات کرے تو میں اس کا صحیح جواب دوں۔ کدم راؤ، رانی سے کہتا ہے کہ سنا تھا عورت فریب جانتی ہے۔ میں نے ایسا فریب آج اپنی آنکھ سے دیکھ لیا ہے میں نے دیکھا کہ ناگن، کوڑیال سانپ سے میل کھا رہی ہے۔ خدا نے مجھے حاکم بنایا ہے۔ مجھ سے ضبط

۱: مثنوی کدم راؤ پدم راؤ مرتبہ ڈاکٹر جمیل جالبی۔ مطبوعہ انجمن ترقی اردو کراچی۔

نہ ہو سکا لہذا میں نے تلوار نکال کر اسی وقت سانپ کو مار ڈالا۔ لیکن ناگن جان بچا کر نکل گئی اور صرف اس کی دم کٹ سکی یہ واقعہ دیکھ کر مجھے عورت پر بھروسہ نہیں رہا۔

اس داستان کا اہم حصّہ یہ ہے۔ کہ کدم راؤ پدم راؤ سے کہتا ہے کہ پردیسیوں کو میرے پاس سے کر آ کیونکہ میں ابھی تک پردیسیوں کی خدمت سے محروم ہوں۔ حالانکہ ہمیشہ سے یہ قاعدہ رہا ہے اور ساسان وجم بھی اسی ریت پر چلتے رہے ہیں۔ لہذا کسی پردیسی کو لے آ تا کہ میں اس کی خدمت کروں اور دان دوں۔

پدم راؤ عاجزی سے کہتا ہے کہ دنیا کے چلنے پھرنے والوں کو اپنے پاس مت بلاؤ کہ یہ آس دے کر نراس کر جاتے ہیں۔ ان لوگوں کی عادتیں خراب ہوتی ہیں۔ کدم راؤ ناراض ہوتا ہے اور کہتا ہے کہ آخر تو پردیسیوں کو برا کیوں کہتا ہے۔ ایک مسافر کو بلا کر لا۔ پدم راؤ ہر طرح سے عاجزی کرتا ہے اور راجہ سے پھر کہتا ہے کہ کسی سادھو کو اپنے پاس نہ بلا۔ جوگی لوگ بغیر شراب اور گوشت کے نہیں رہتے میں ڈرتا ہوں کہ کہیں مجھے بھی اسی راہ پر نہ ڈال دیں۔ اس میں گھڑی بھر کا سکھ ہے لیکن اس خمار کا دکھ زیادہ بھاری ہوتا ہے۔

پدم راؤ آخر میں کچھ ایسی وفاداری کی باتیں کرتا ہے کہ کدم راؤ خوش ہو کر اس کو خلعت سے نوازتا ہے۔ اور پھر پورے شاہی خاندان کو بلا کر ان کو اپنی عنایات سے سرفراز کرتا ہے۔ اس کے بعد کدم راؤ کہتا ہے کہ اب کسی پردیسی کو بلا کر مہمان داری بھی کرنی چاہیئے۔ اہلِ دربار میں سے ایک کہتا ہے کہ مچھندر کا بیٹا اگھور ناتھ آیا ہوا ہے۔ بہت بڑا جوگی ہے۔ بہت سے علوم سے واقف ہے۔ وہ یقیناً آپ کے دربار کے لائق ہے۔ چنانچہ اگھور ناتھ کو بلوایا جاتا ہے جو بادشاہ کے استفسارات پر بے حد لاف زنی کرتا ہے اور باتوں سے بادشاہ کو اپنا گرویدہ بنا لیتا ہے۔ راجہ کو اس کے بغیر ایک پل زندگی گزارنا بھی دشوار معلوم ہوتا ہے۔ جوگی نے راجہ

کو دھنور بھید سکھلایا۔ جسے کدم راؤ نے ایک مہینے میں سیکھ لیا۔ ادھر رعایا حیران تھی کہ آخر راجہ نے ایک جوگی کی صحبت کیوں قبول کر لی ہے۔

"ایک دن اگھورناتھ نے کہا کہ اے راجہ دھنور بید تو معمولی بات ہے میں تو آپ کو "امر بید" بھی سکھا سکتا ہوں۔ مگر مجھے قول دینا ہو گا کہ یہ کسی دوسرے کو آپ نہیں بتائیں گے۔ یہ کہہ کر اگھورناتھ نے راجہ سے کہا کہ اگر مجائیات دیکھنے ہیں تو ایک جانور لے کر آیئے۔ راجہ محل میں گیا اور وہاں سے ایک طوطا لے کر آیا جسے رانی نے بڑی محبت سے پالا تھا۔ راجہ اسے پھل کھلاتا اپنے ہاتھ میں لئے جوگی کے پاس آیا۔ اگھورناتھ نے کہا کہ اے راجہ اب اس کا گلا چبا ڈال میں ابھی کرامات دکھاتا ہوں۔ راجہ نے ایسا ہی کیا۔ طوطا مر گیا۔ اور سادھو نے اپنی روح طوطے کے جسم میں داخل کر دی۔ اور اڑ کر راجہ کے ہاتھ پر آ بیٹھا۔ طوطے نے کہا کہ راجہ بتا میں کون ہوں۔ کچھ دیر کے بعد وہ پھر اپنے جسم میں واپس آ گیا۔ اور طوطا بھی زندہ ہو گیا۔ یہ دیکھ کر راجہ ششدر رہ گیا اور جوگی کا پہلے سے بھی زیادہ قائل اور گرویدہ ہو گیا۔ پھر کہا کہ یہ عمل مجھے بھی سکھا دو۔ راجہ سے جوگی نے قبول کر لیا۔ اور پھر جیسے ہی راجہ نے یہ علم سیکھنا شروع کیا تو محل کا کلس ٹوٹ گیا لیکن راجہ نے اس بدشگونی کی کوئی پرواہ نہ کی اور علم سیکھتا رہا۔ جب راجہ نے "امر بید" سیکھ لیا تو جوگی نے کہا کہ اب اس کا تجربہ بھی کر کے دیکھنا چاہیئے چنانچہ راجہ نے جیسے ہی اپنی روح کو طوطے کے قالب میں منتقل کیا تو جوگی نے اسی وقت اپنی روح کو کدم راؤ کے قالب میں منتقل کر دیا۔ چنانچہ راجہ طوطا بن گیا اور جنگل کی جانب چلا گیا اور جوگی راجہ بن گیا۔

جوگی، کدم راؤ کے قالب میں آ تو گیا لیکن ابھی وہ آداب شاہی اور بادشاہ کی بیگمات سے واقف نہ ہوا تھا۔ چونکہ جوگی کو طوطے کے زندہ رہنے سے راز افشا ہو جانے کا ڈر تھا لہذا اس نے پدم راؤ سے کہا کہ طوطا مجھے گالیاں دے کر گیا ہے لہذا اسے پکڑنے کے لئے منادی کرا

دی جائے۔ پدم راڈ بادشاہ کو ایسا کرنے سے منع کرتا ہے۔

راجہ طوطے کے روپ میں پریشان پھرتا رہا۔ آخر ایک دن اپنے محل کی طرف آگیا جہاں اپنے وزیر پدم راڈ کو دیکھتا ہے۔ اس کو اپنی نشانی بتاتا ہے۔ جس سے پدم راڈ کو اس کی گفتگو کا یقین آجاتا ہے۔ وزیر، راجہ سے وفاداری دکھاتا ہے۔ اور ایک دن چپکے سے جوگی (جو راجہ کے قالب میں تھا) کے پاؤں میں کاٹ لیتا ہے۔ جوگی مرجاتا ہے۔ راجہ پھر اپنے قالب میں آ جاتا ہے۔ پدم راڈ ہی کدم راڈ کو بتاتا ہے کہ جوگی ایک دن بھی آرام سے نہیں بیٹھا۔ اور نہ ہی رانی کے پاس گیا۔ راجہ خوش ہوتا ہے۔ غرض راجہ سنگھاسن پر پھر زدیق افروز ہوتا ہے۔ اور چھ ماہ تک جشن منایا جاتا ہے۔"

ہیرامن طوطا کا خلاصہ

ملک ہندوستان میں ایک جلیل القدر فرمانروا تھا۔ جس کے تمام بادشاہ مطیع تھے۔ اور ہم زمین و ہم زمان سبھی لوگ اس کے تابع تھے۔ وہ باج خواہوں سے باج لیتا تھا۔ اور سب بے تاج لوگوں کو تاج دیتا تھا۔ بادشاہ عدل گستر تھا اور اس کی تمام رعایا اس کے زیر فرمانی شاد و آباد تھی۔ فتح و ظفر اس کے گھر کی باندیاں تھیں۔ اس بادشاہ کو نہ کسی چیز کی حاجت تھی اور نہ کسی چیز کی طلب، کیونکہ تمام نعمتیں اس کے خوان نعمت پر موجود تھیں۔

شب و روز پردیسیوں اور مسافروں کی مہمانداری اور دلجوئی میں مصروف رہتا تھا اور بڑا مہمان پرور اور مسافر دوست تھا۔ اس نے بر سر شاہراہ ایک مہمان سرائے بنا رکھی تھی جہاں جملہ سامان مہمانداری موجود تھے اور نوکر چاکر خدمت کے لئے ہر ہمہ وقت موجود رہتے تھے۔ چہار جانب سے آنے والے مسافر اس سرائے میں آکر قیام کرتے تھے۔ اس بادشاہ کا دستور یہ تھا کہ

بھی کوئی جب مسافر آتا تو وہ اس سے حال احوال پوچھتا اور یہ دریافت کرتا جہاں گردی و دیدہ پیمائی سے اسے کیا حاصل ہوا۔ بادشاہ کا یہ روزانہ کا معمول تھا غرض سب مسافروں سے ملاقات کر کے بادشاہ اپنی معلومات میں اضافہ کرتا تھا۔

ایک روز ایک نووارد شخص بادشاہ کی خدمت میں آیا۔ اس شخص کو علم یوگ اور تیر نجات میں کمال حاصل تھا۔ حسب معمول رات کے وقت بادشاہ نے اس نووارد کو اپنے حضور میں طلب کیا اور رسم مزاج پرسی اور آداب مہمانداری کے بعد بادشاہ نے اس سے دریافت کیا کہ جہاں گردی سے اسے کیا کچھ حاصل ہوا ہے۔ اس نے بادشاہ کے اس استفسار کے جواب میں اپنے مشاہدات بیان کرنا شروع کئے۔ لیکن اتفاق سے بادشاہ کو اس کی بیان کردہ بہت سی باتیں پہلے ہی معلوم تھیں۔ بادشاہ نے اس شخص کے جملہ علوم کے بارے میں سن کر ایک آہ سرد کھینچی اور پھر اس سے یوں گویا ہوا کہ میں نے تم جیسے لوگوں سے ہی بہت سے علوم کو بہچانا ہے۔ لیکن افسوس کہ جس گوہر مراد کی مجھے تمنا تھی وہ آج تک ہاتھ نہ آیا۔ آج تک میں نے موت کا علاج نہ پایا۔ آخر کار تھک ہار کر اس خیال سے ہی دست بردار ہو گیا۔

وہ مسافر بادشاہ کی بات سن کر مسکرایا۔ بادشاہ نے اس کے مسکرانے کا سبب دریافت کیا تو پہلے تو مسافر نے بات ٹالنا چاہی آخر بادشاہ کے اصرار پر یوں گویا ہوا کہ مجھے بھی بادشاہ کی طرح نوادرات و عجائبات جہاں دیکھنے کا شوق تھا۔ چنانچہ اسی شوق میں صورت گرد باد دنیا میں ملا مارا پھرتا تھا۔ اس جہاں نوردی میں کچھ ہنر و کمال حاصل تو ہوئے لیکن دل خوب سے خوب تر کی جستجو میں رہا۔ اتفاقاً ایک دن ایک استاد سے ملاقات ہوئی جو علم کایا پلٹ کا ماہر تھا۔ میں نے آوارہ گردی ترک کی اور اس جوگی کی خدمت میں پائے طلب کو توڑ کر بیٹھ رہا۔ میری خدمت و دریافت کام آئی اور آخر کار اس نے مجھے کایا پلٹ کا علم سکھا دیا۔ جس کے

لئے میں اس کا مرہون احسان ہوں۔ اے بادشاہ اگر آپ کہیں تو میں یہ علم آپ کو سکھا دوں اس بادشاہ نے کہا ضرور سکھا دے لیکن پہلے اس کا کوئی تجربہ کر کے دکھلاؤ۔ اس مسافر نے اسی وقت ایک مکھی کو مارا اور اس کے مردہ جسم میں اپنی روح منتقل کر دی۔ غرض اس کا لاشہ تو زمین پر گر گیا اور مکھی کے جسم میں داخل ہو کر اڑتا رہا۔ بعد چند ثانیے کے مسافر دوبارہ اپنے قالب میں آ گیا۔

بادشاہ کی حیرت کی کوئی حد نہ رہی۔ بادشاہ نے اس علم کو سیکھنے کی خواہش کا اظہار کیا اور کہا کہ اگر اس کے بدلے میرے مال وزر اور سلطنت کا نصف لے کر بھی تو یہ کام مجھے سکھا دے گا تو میں تیرا شکر گزار ہوں گا۔

بادشاہ کی اس فیاضی کے جواب میں اس مسافر نے جواب دیا کہ اے بادشاہ میں تیرے مال و زر اور ملک و سلطنت سے اپنے اس علم کو بہتر سمجھتا ہوں۔ اور مجھے تیری کسی چیز کی کوئی تمنا نہیں ہے۔ البتہ بلا کسی طمع و لالچ کے میں تمھیں یہ علم سکھا ضرور دوں گا۔ الغرض اس نے بادشاہ کو یہ علم سکھا دیا۔ اور بادشاہ نے اس کا تجربہ بھی کر کے دیکھ لیا۔ بادشاہ نے اس علم کو ازبر ہو جانے کے بعد مسافر کو عزت و تکریم کے ساتھ رخصت کیا۔

کچھ عرصہ تک تو بادشاہ نے اس علم کو اپنی ذات تک محدود رکھا۔ لیکن پھر ایک دن اس کے ذہن میں یہ خیال آیا کہ ایسی چیز جو جان سے بھی زیادہ قیمتی ہو اگر اس سے میرے سوا کسی کو فائدہ نہ ہو تو بے کار ہے اور اس کا وجود و عدم برابر ہے۔ میں شمع کی مانند نہیں۔ جو ایک مکان کو منور کرتی ہے۔ بلکہ میں خورشید کے مانند ہوں جس کی روشنی سے سارا عالم فیضیاب ہوتا ہے۔ آخر بادشاہ اس راز کو چھپا نہ سکا اور اپنے وزیر کو اپنا رازدار بنا لیا۔

ایک دن بادشاہ اور وزیر شکار کے لئے نکلے۔ شکار کی تلاش میں دونوں خادموں سے

دور نکل آئے۔ آخر دامن کوہ میں بادشاہ نے تیر سے ایک ہرن کو شکار کیا۔ اس کے بعد بادشاہ نے ہرن کو باندھنا چاہا تو وزیر بولا کہ اے بادشاہ زمن! ایک زمانہ ہو گیا کہ علم کایا پلٹ کا فن نہیں آزمایا۔ اور کچھ کچھ وہ مجھے بھول گیا ہے جس کی وجہ سے میں اداس ہوں۔ اتفاق سے اس وقت ایک صید بے جان بھی مہیا ہے اور ہم دونوں کے علاوہ کوئی یہاں موجود بھی نہیں ہے۔ لہذا اگر بادشاہ سلامت ایک بار پھر وہی دکھلا دیں تو مجھے ازبر ہو جائے گا۔

بادشاہ نے وزیر کی مکاری سے بے خبر ہونے کے سبب اپنی روح ہرن کے قالب میں منتقل کر دی۔ اور وزیر نے اسی وقت اپنی روح بادشاہ کے قالب میں منتقل کر دی۔ اور بادشاہ کے گھوڑے پر سوار ہو کر اس کی پوشاک پہن کر اپنے خدم و حشم کی طرف واپس پلٹا۔ وزیر نے شاہ کے روپ میں شاہی محل کا رخ کیا۔ اور جملہ حرم شاہی سے حرام کیا۔ غرض ہر عورت اس کی ہوس کا شکار ہوئی لیکن شاہ کی کدبانو نے جو بادشاہ کی ہمدم و ہم جلیس تھی۔ اس نے جب بادشاہ کے جملہ معاملات و عادات میں اس کے برعکس پایا تو اس کے دل میں کھٹکا ہوا جس کی وجہ سے اس نے بادشاہ (وزیر) سے نشست و برخواست اور ملنا جلنا، اٹھنا بیٹھنا موقوف رکھا۔ اس نے دل میں سوچا کہ ضرور شاہ پر کوئی مصیبت آئی ہے۔ کیونکہ بظاہر تو وہ بادشاہ لگ رہا ہے لیکن محل میں ہر چیز کو اجنبیوں کی طرح تکتا ہے۔ چنانچہ یہ سب سوچ کر اس نے بادشاہ سے کہا کہ میرے دل میں تیرے خلاف کچھ شکوک و شبہات پیدا ہو گئے ہیں۔ جب تک وہ تمام دور نہ ہوں مجھے ہاتھ لگانے کی کوشش مت کرنا۔

ادھر بادشاہ کا حال سنیئے:۔

ہرن کے قالب میں آکر بادشاہ دشت و دیار میں آوارہ و سرگرداں پھرتا رہا۔ کبھی ہرنوں کی ڈار میں شامل ہو جاتا اور کبھی ان سے علیحدہ ہو جاتا۔ اسی طرح دشت و صحرا میں آوارہ و سرگرداں

پھرتے ہوئے ایک دن بادشاہ نے جو آہو کے قالب میں تھا۔ ایک مردہ طوطے کو دیکھا۔ بادشاہ نے اسی وقت آہو کا قالب چھوڑ کر اپنی روح طوطے کے مردہ جسم میں منتقل کرلی۔ اور اس کے بعد بہت سے طوطوں کے ساتھ محو پرواز ہوا۔ پھر اپنے ہمراہی طوطوں کے ساتھ اپنے ملک کی جانب چلا تاکہ جاکر وہاں کے حال احوال سے واقف ہو۔ طوطوں نے جو اپنے درمیان ایک دانش مند طوطا پایا تو اسے اپنا بادشاہ بنالیا۔ بادشاہ بھی جو پرندے کے قالب میں تھا ان طوطوں کے ہمراہ اڑتا ہوا ایک فرحت بخش مقام تک جا پہنچا۔ طوطوں نے اس مقام کی آب وہوا کو دیکھتے ہوئے وہاں ایک درخت پر کچھ دیر آرام کیا۔ اس درخت کے نیچے صیاد نے دام بچھا رکھا تھا اور دانا بکھرا ہوا تھا۔ طوطوں نے صیاد کی چال نہ سمجھتے ہوئے اس دانے کو چگنے کے لئے اترنا چاہا لیکن بادشاہ نے جو طوطے کے قالب میں تھا۔ انھیں ایسا کرنے سے منع کیا اور کہا کہ ذرا سا لالچ ان کی جانوں کے اتلاف کا باعث بن جائے گا۔ لیکن طوطوں نے اس کی بات نہ مانی، اور جال میں پھنس گئے۔ بادشاہ نے بھی جانتے بوجھتے ہوئے خود کو جال میں پھنسوا دیا۔ اتفاق سے جس وقت طوطے دام میں پھنسے ہیں تو صیاد کہیں پانی پینے گیا ہوا تھا۔ اپنے بادشاہ کی نافرمانی کے سبب، اسیر دام ہوکر طوطوں نے بہت شور مچایا لیکن اب گریہ وزاری بے سود تھی۔ بادشاہ نے اب ان طوطوں سے کہا کہ تم نے میری بات نہ مانی اور جال میں پھنس گئے۔ اب میں ایک بات کہتا ہوں اگر اس پر عمل کرو تو رہائی کی امید ہے۔ ابھی صیاد نے تمہیں نہیں دیکھا ہے لہذا تم سب مردہ بن کر جال میں لیٹ جاؤ۔ صرف میں زندہ رہوں گا۔ صیاد مجھے زندہ دیکھ کر پکڑے گا اور تمہیں مردہ سمجھ کر جال سے نکال کر پھینک دے گا۔ اور میں بھی کسی نہ کسی ترکیب سے رہائی حاصل کرکے تم سے آملوں گا۔ غرض طوطوں نے اس کے کہنے پر عمل کیا اور مردہ بن کر لیٹ گئے۔ تھوڑی دیر بعد صیاد آیا۔ اتنے سارے طوطوں کو دیکھ کر خوش ہوا۔ لیکن ان میں سے ایک کو زندہ اور باقی طوطوں کو مردہ دیکھ کر افسوس کرنے لگا۔

افسوس کرتے ہوئے جال میں سے ایک ایک طوطے کو نکالتا رہا۔ جب تمام جال خالی کر چکا تو طوطے اڑ گئے۔ جب صیاد اپنا جال جھاڑ چکا تو تمام طوطے پھر پھڑا کر زندہ ہو گئے۔ صیاد یہ ماجرا دیکھ کر حیران ہوا اور کھسیانا ہو کر زندہ طوطے کو بھی مارنا چاہتا تھا۔ کہ طوطے نے صیاد سے کہا کہ مجھے مارنے کی بجائے بازار لے جا کر بیچ دو میں تمھیں تمہاری حسب منشا رقم دلوا دوں گا۔

طوطے کی یہ باتیں سن کر صیاد کی دل گرفتگی اور غصہ رخصت ہوا۔ چنانچہ وہ اسے لے کر شہر آیا۔ اور چوک میں اس کا پنجرہ رکھ دیا۔ اور صدا لگانے لگا کہ اے خریدارو، ہیرامن طوطا خریدو۔

وہ صیاد ابھی یہ صدا ہی لگا رہا تھا کہ اتنے میں ایک جانب سے انتہائی خوبصورت عورت ناز و انداز دکھائی ہوئی آنکلی اور ایک مہاجن بچے کی دوکان پر جا کر کھڑی ہو گئی۔ یہ مہاجن بچہ اس وقت روپیہ پیسے گننے میں مصروف تھا۔ اس عورت کی ہر ادا سے بیسوائپن برس رہا تھا۔ اپنی اداؤں سے خرمن ہوش کو جلاتی چلی آئی تھی۔ چلتی ہوئی آکر ایک مہاجن بچے کی دوکان پر آکر کھڑی ہو گئی۔ یہ مہاجن بچہ بھی جوان اور حسین تھا اور اپنی خوبصورتی کے اعتبار سے رشک آفتاب تھا۔ اس عورت نے اس مہاجن بچے کو یہ کہہ کر تو شب کو خواب میں میری خلوت میں رہا ہے۔ اور ہر طرح سے مجھ سے لطف اندوز ہوا ہے لہذا ایک ہزار دینار کا جو معاوضہ تو نے رات خواب میں مجھ سے طے کیا تھا وہ مجھے جلد دے دے۔ وہ مہاجن بچہ اس بیسوا کے اس عجیب و غریب مطالبے پر حیران ہوا۔ اور مارے شرمندگی اور خجالت کے اس سے کوئی جواب نہ بن پڑا اور خوف کے سبب اس کا رنگ زرد ہو گیا۔ ان دونوں کے درمیان یہ گفتگو ہوتے دیکھ کر بہت بڑا ہجوم وہاں جمع ہو گیا۔ لوگ طرح طرح کی باتیں تو بنا رہے تھے لیکن کوئی شخص ایسا مشورہ نہ دے پا رہا تھا کہ جس سے اس جھگڑے کا فیصلہ ہوتا۔ اس عجیب و غریب اور دلچسپ واقعے کو دیکھ کر صیاد بھی حیران ہوا اور طوطے کی فروخت کے لئے صدائیں لگانا بھول گیا۔ ہیرامن طوطے نے

یہ ماجرا دیکھ کر اپنے صیاد سے کہا کہ ان دونوں کو میرے پاس بلا لو تاکہ میں کوئی فیصلہ کرا دوں۔ صیاد جاکر دونوں فریقوں کو بلا لیا۔ ان کے پیچھے پیچھے ہجوم بھی چلا آیا۔ طوطے کے پاس آکر اس رنڈی نے پھر اپنا تمام دعویٰ دہرایا۔ طوطے نے کہا کہ اگر تم دونوں میرے فیصلے کو قبول کرنے کا عہد کرو تو میں کوئی فیصلہ کروں۔ دونوں نے اس کے فیصلے پر قبول کرنے کا عہد کیا۔

اس کے بعد طوطے نے مہاجن بچے کو ایک ہزار دینار کا توڑا لانے کا حکم دیا۔ مہاجن بچہ چونکہ عہد کر چکا تھا لہذا اسی وقت دوکان سے جاکر ایک توڑا اٹھا لایا۔ اس کے بعد اس مہاجن بچے نے نہایت اداسی و مایوسی کے ساتھ رقم گننا شروع کی۔ جب مہاجن بچہ رقم گن چکا تو اس بیسوا نے جلدی سے بڑھ کر رقم اٹھانا چاہی لیکن طوطے نے اس سے کہا کہ اس قدر جلدی مت کر یہ تیرا ہی حق ہے۔ اس کے بعد طوطے نے ایک قد آدم آئینہ منگوایا۔ جب آئینہ لایا جا چکا تو رقم کو آئینے کے سامنے رکھوا کر بیسوا سے بولا کہ آئینے میں جو رقم نظر آرہی ہے اسے اٹھالے اور اپنا زر شمار کرے لیکن خبردار زر نقد کی جانب نگاہ نہ اٹھے۔ کیونکہ جو کام خواب و خیال میں ہوا ہے اس کا معاوضہ بھی خیال کی صورت میں ملے گا۔ طوطے کا یہ حکم سن کر وہ بیسوا بالکل خاموش ہو گئی اور کوئی جواب نہ پاتے ہوئے اپنے گھر کو ناشاد و نامراد روانہ ہو گئی۔ اس کے پیچھے پیچھے ہجوم تالیاں بجاتا ہوا چلا۔ ادھر مہاجن بچہ طوطے کا ممنون ہو کر ہنسی خوشی اپنے گھر کو روانہ ہوا۔ اب تو طوطے کے خریداروں کی بھیڑ لگ گئی۔ لیکن ان میں سے کوئی بھی اتنی قیمت نہ دے سکا کہ طوطے کو خرید سکتا۔

طوطے کی خبر اڑتے اڑتے رانی تک پہنچی جو اپنے طوطے کی یاد میں اداس و رنجیدہ تھی۔ اس نے اپنے خادموں کو حکم دیا کہ فوراً جاکر ہیرامن طوطا کو خرید لائیں چنانچہ اسی وقت رانی کے نوکروں نے آکر صیاد کو خطیر رقم ادا کی اور طوطے کا پنجرہ ہاتھ میں لے کر رانی کی خدمت میں حاضر

ہوئے۔ طوطے نے اپنی شیریں بیانی اور خوش گفتاری سے رانی کا دل موہ لیا۔ رانی نے اس کے لئے سونے کا جڑاؤ پنجرہ بنوایا۔ اور اپنے کلیہ احزاں میں اسے لٹکا دیا۔ غرض طوطا اپنی دلچسپ باتوں سے رانی کے غم والم کو بھلا دیتا تھا۔

ایک رات رانی نے طوطے سے کہا کہ میاں مٹھو کوئی کہانی سناؤ۔ طوطے نے اس کے جواب میں پوچھا کہ آیا جگ بیتی سناؤں یا آپ بیتی۔ رانی نے آپ بیتی سنانے کا حکم دیا۔ طوطے نے یوں کہنا شروع کیا کہ اے ماہ لقا، ایک تھا بادشاہ، ہمارا تمھارا خدا بادشاہ۔ اس بادشاہ نے ایک محل سرا بنوا رکھی تھی جس میں تمام مسافروں کو دعوت دیا کرتا تھا۔ ایک دن ایک مسافر آیا کہ جس نے بادشاہ کو علم کایا پلٹ سکھا دیا۔ جس کے سبب سے روح ایک تن سے دوسرے میں جا سکتی تھی۔ بادشاہ یہ علم سیکھ کر مختلف مخلوقات کے تن مردہ میں نقل روح کیا کرتا تھا۔ اور شہر و دیار میں سیر کرتا ہوا پھرتا تھا۔ لیکن افسوس کہ بادشاہ اس راز کو راز نہ رکھ سکا اور اس نے یہ علم اپنے وزیر کو بھی سکھا دیا۔ ایک دن بادشاہ وزیر کے ساتھ شکار کو نکلا۔ بادشاہ نے ایک ہرن مارا۔ وزیر نے بادشاہ سے کایا پلٹ کے علم کے اظہار کی فرمائش کی۔ بادشاہ جو اس کی نیت سے بے خبر تھا۔ ہرن کے قالب میں چلا گیا اور وزیر فوراً بادشاہ کے قالب میں چلا گیا۔ شاہ ہرن کے تن میں منتقل ہو کر جان کے خوف سے کوہ و دشت میں مارا مارا پھرتا رہا۔ اے شہزادی ذرا غور کیجیے کہ بستر گل پر سونے والا بادشاہ جس کے بدن تا قدم دسمور سے بھی اثر انداز ہوتا ہو وہ یوں کسمپرسی کے عالم میں خار و خس پر گزارہ کرے۔ اور جس کی زبان پر پان کے پتے گراں ہوں وہ جنگل میں برگ و کاہ کھا کر گزارا کرے۔ جو بادشاہ خود آہوؤں کو صید کرتا ہو۔ وہ اپنی گرفتاری کے خوف سے منہ چھپائے پھرتا ہو۔ الغرض اے شہزادی جب اس حالت پر غور کرتا ہوں تو جگر ٹکڑے ٹکڑے ہوتا ہے۔

اسی عالم بے چارگی میں ایک دن بادشاہ کو ایک مردہ طوطا نظر آیا چنانچہ اس نے فوراً اپنی روح کو ہرن کے قالب سے نکال کر اس مردہ طوطے کے تن میں ڈالا۔ جس کے سبب پہلے کی زندگی سے کچھ آسودگی اور اطمینان اسے حاصل ہوا۔ اس کے بعد اس طوطے نے اڑ کر اپنے شہر کو جانا چاہا۔ راستے میں کچھ طوطے اس کے رفیق ہوئے۔ انھوں نے اسے اپنا بادشاہ بنالیا۔ ایک جگہ وہ طوطے آب و دانہ کی حرص میں اسیر بلا ہوئے۔ اور بادشاہ نے بھی جو طوطے کے روپ میں تھا۔ اپنے ساتھیوں کی رفاقت کا حق ادا کرتے ہوئے گرفتاری قبول کی۔ جہاں سے صیاد اس طوطے کو پکڑ کر شہر میں لایا۔ شہر میں ایک بیسوا نے اپنی مکاری سے ایک مہاجن بچے کو تنگ کرنا چاہا۔ بالآخر طوطے کی دانش مندی نے خوب اچھا فیصلہ کرا دیا۔"

شہزادی طوطے کی سرگذشت سن کر چونکی۔ اور پھر بولی کہ اے میاں مٹھو اس بیسوا نے کیا کیا۔

طوطا جو شہزادی کے دل میں شوقِ جستجو بیدار کرنا چاہتا تھا۔ یہاں تک داستان کہہ کر خاموش ہو گیا۔

شہزادی نے شوقِ جستجو میں طوطے سے قصے کو آگے بیان کرنے کی خواہش کی۔ لیکن طوطے نے جواب دیا کہ میں اب اونگھ رہا ہوں ایسی بھی کیا جلدی ہے باقی قصہ کل پر رکھو۔ شہزادی نے کہا کہ اچھا باقی قصہ کل پر سہی لیکن آتا تو بتا دو کہ کیا اس بادشاہ کا نام آغا شاہ تھا۔ طوطے نے اس کے جواب میں کہا کہ اے بی بی تمھیں نام سے کیا کام۔ طوطا تو یہ کہہ کر چپ ہو گیا۔ اور شہزادی نے دل میں سوچا کہ اس قصے سے کچھ نہ کچھ پتہ مجھے اپنے گمشدہ بادشاہ کا ملتا ہے۔ اور بیسوا کا جھگڑا تو خود اس طوطے نے طے کرایا تھا۔ اور جس وزیر کی شبیہہ بیان کی ہے اس سے میرے بادشاہ کے وزیر کی شبیہہ ملتی ہے۔ تاہم پھر بھی کچھ یقین سے نہیں کہا جا سکتا۔ نہ جانے یہ قصہ کس کا ہے۔ ممکن ہے طوطا کسی کی سُنی سنائی بات کر رہا ہو اور پھر میں ایسی خوش نصیب کہاں کہ میرا مظلوم شاہ مجھے مل جائے۔

دوسری رات سرِ شام ہی سے شہزادی نے کنیزوں کو رخصت کیا۔ اور طوطے سے باقی داستان سُنی۔ جب طوطا داستان بیان کر چکا تو شہزادی اس کے پاؤں پر گر پڑی۔ اور بولی کہ تو ہی میرا شاہ ہے۔ لیکن نصیب دیکھئے کہ وصل بھی کس عالم میں ہو رہا ہے کہ میں انسان ہوں اور تو طائر،

طوطے نے جواب دیا کہ اے رانی! اس بات کا غم نہ کر میں ایک ترکیب بتاتا ہوں کہ اب کے جو وزیر تیرے پاس آئے تو کسی صورت سے کایا پلٹ پر آمادہ کر لو۔ اس طرح میں فوراً اپنے قالب میں آ جاؤں گا۔

"سرے دن جب وزیر، رانی کے پاس آیا۔ تو رانی نے خلاف توقع اس سے لطف و عنایت کا سلوک کیا اور احترام سے ملی۔ وزیر نے جو بادشاہ کے روپ میں تھا۔ برعکس سلوک دیکھ کر اس کی وجہ دریافت کی۔ رانی نے جواب دیا کہ میں نے ایک عرصے تک تجھے آزمایا۔ آخر تو ہی میرا شاہ نکلا۔ لیکن ایک امتحان اب بھی باقی ہے۔ اگر اس میں بھی تو پورا اترے تو پھر مجھے تجھے تسلیم کرنے میں کوئی عار نہ ہوگا۔ میرے شاہ کو علم کایا پلٹ آتا تھا اگر تو وہی ہے تو یقیناً تجھے بھی علم کایا پلٹ آتا ہوگا۔ لہذا اس کا مظاہرہ کر کے دکھا بصورت دیگر میں تیری گردن تن سے جدا کر دوں گی۔

وزیر جو بادشاہ کے روپ میں تھا رانی کی یہ بات سن کر مسرور ہوا اور بولا کہ یہ امتحان تو، تو جب چاہے کر لے۔ چنانچہ اسی وقت ایک مرغ منگوا کر مارا اور وزیر نے اپنی روح کو اس مرغ کے قالب میں منتقل کیا۔ جب شاہ کا لاشہ بے جان ہو کر گرا تو بادشاہ نے فوراً اپنی روح کو جسد طوطی سے اپنے قالب میں منتقل کیا۔ اور بادشاہ بنتے ہی ایک خنجر سے اس مرغ کو ہلاک کر ڈالا اور بادشاہ کی وفادار رانی نے اپنے ہاتھ سے اس مرغ کی دونوں ٹانگیں چیر ڈالیں۔

سلطنت میں خوشی کے شادیانے بجنے لگے۔ شاہی حرم کی ان تمام خواتین کو جن کے ساتھ وزیر نے شاہ کا روپ بدل کر حرام کیا تھا۔ شاہی محل سے نکال دی گئیں۔ اور مردہ طوطے

کی کھال پوست کو بادشاہ نے ایک صندوق میں رکھوادیا اور روزانہ اس کو دیکھتا تھا۔ اس کے بعد اس نے اپنا لقب طوطی الملک اختیار کیا اور خود بھی سبز لباس میں رہنے لگا اور طوطوں سے بے پناہ پیار کرنے لگا۔

ہیرامن طوطا اور کدم راؤ پدم راؤ کا موازنہ

سخاوت مرزا صاحب نے اپنے ایک مضمون میں (جس کا حوالہ سابقہ سطور میں آچکا ہے) مثنوی ہیرامن طوطا کا ماخذ یا اس سے ملتا جلتا قصہ مثنوی کدم راؤ پدم راؤ کو قرار دیا ہے۔ جس زمانے میں سخاوت مرزا صاحب نے یہ حوالہ دیا تھا۔ اس وقت مثنوی کدم راؤ پدم راؤ کو رسم الخط کے سبب پڑھا نہیں جا سکا تھا۔ اور وہ غیر مطبوعہ صورت میں تھی۔ اب یہ مثنوی مطبوعہ صورت میں موجود ہے۔ قصہ ہیرامن طوطا اور مثنوی کدم راؤ پدم راؤ کا موازنہ کرتے ہوئے جو حقائق سامنے آتے ہیں۔ انکی روشنی میں کہا جا سکتا ہے کہ کدم راؤ پدم راؤ اور ہیرامن طوطا دونوں کا موضوع تو ایک ہی یعنی علم یوگ یا علم کایا پلٹ ہے۔ لیکن دونوں داستانوں میں واضح فرق موجود ہے۔ جس کی بنیاد پر یہ کہا جا سکتا ہے کہ حقیقت نے اپنا قصہ اس داستان سے مستعار نہیں لیا ہوگا جبکہ یہ بات بھی واضح ہے کہ یہ قصہ خسرو کی ہشت گلزار کا ایک قصہ ہے اور حقیقت نے صرف اس کا آزاد ترجمہ کیا تھا۔

مثنوی کدم راؤ پدم راؤ میں ایک اعلےٰ ذات کی ناگن اور ایک کوڑیالے سانپ کے باہمی تعلق کو دیکھ کر کدم راؤ کے دل سے عورتوں کی وفاداری کا اعتبار اٹھ جاتا ہے۔

لیکن مثنوی ہیرامن طوطا میں رانی سے بادشاہ کو ایسی کسی بے وفائی کا اندیشہ نہیں۔ اور نہ ہی ان دونوں کے درمیان اس قسم کی کوئی بات زیر بحث آتی ہے۔ البتہ کدم راؤ پدم راؤ میں، کدم راؤ کی رانی بھی آخر میں صاحب عصمت ثابت ہوتی ہے۔ جب جوگی راجہ کو مارنے کے بعد

اور راجہ کے روپ میں آنے کے بعد بھی رانی سے خلوت حاصل نہ کر سکا۔ مثنوی ہیرامن طوطا میں تو آغاز داستان میں رانی کسی قسم کا دعویٰ نہیں کرتی۔ لیکن جب وزیر، بادشاہ کے قالب میں آنے کے بعد بادشاہ کے ایک ایک حرم سے خلوت میں ملاقات کر چکتا ہے۔ اور رانی سے ہم بستری کرنے میں ناکام رہتا ہے تو رانی کی بادفائی ثابت ہو جاتی ہے۔

مثنوی کدم راؤ پدم راؤ میں راجہ کے ساتھ ایک جوگی جو اس کو علم کایا پلٹ سکھاتا ہے۔ فریب کرتا ہے اور اس کا وزیر جو ناگ ہے آخر میں اپنے راجہ کو پہچان کر جوگی کو ڈس کر ہلاک کر ڈالتا ہے۔ اور راجہ پھر اپنے قالب میں آجاتا ہے۔

ہیرامن طوطا میں بادشاہ کا وزیر اس کے ساتھ فریب کرتا ہے۔ اور آخر میں رانی کی عقلمندی اور تعاون سے وزیر ہلاک ہوتا ہے اور بادشاہ اپنے قالب میں واپس آتا ہے۔

کدم راؤ پدم راؤ میں راجہ کا وزیر ایک ناگ ہے۔ ہندی دیومالا کے قصوں میں اور سنسکرت کے ایسے قصے ملتے ہیں جن میں انسانوں کے مشیر دوسری مخلوقات سے تعلق رکھتے ہیں۔ ہیرامن طوطا میں بادشاہ کا وزیر بھی انسان ہی ہے۔ اس اعتبار سے مثنوی کدم راؤ پدم راؤ میں مافوق الفطرت عنصر موجود ہے۔ جبکہ ہیرامن طوطا میں ایسا نہیں ہے۔ اور اس کے سارے کردار انسان ہیں۔ تاہم اس کے باوجود بحیثیت مجموعی اس داستان کو فرضی قرار دیا جا سکتا ہے۔

علم کایا پلٹ کا موضوع

یقیناً امیر خسرو نے دکنی زبان یا سنسکرت کے ایسے قصے سنے ہونگے جن کا موضوع علم کایا پلٹ ہوگا۔ لہٰذا اس قسم کے قصے کو ایک داستان کی صورت میں بیان کر دیا ہوگا۔ دراصل مثنوی کدم راؤ پدم راؤ کی طرح اس قصے کے ماخذ بھی سنسکرت کی کہانیاں ہیں۔ اصل میں ان دونوں مثنویوں

کے قصے قدیم دور سے تعلق رکھتے ہیں۔ جب انسان جادو اور طلسمات پر یقین رکھتا تھا۔ انتقال روح کے ایسے قصے عام ہیں۔ ایسے قصے برصغیر سے لے کر ہیبریڈیز تک آریائی نسل کی تمام قوموں میں ملتے ہیں۔

سر جیمس فریزر نے اپنی کتاب "شاخ زریں" میں انتقال روح کے بعض قصوں کو بنایا کیا ہے۔

ایک جگہ فریزر نے ایک ہندوستانی بیان کیا ہے۔ جس میں ایک راجہ ایک برہمن کے قالب میں اپنی روح منتقل کر دیتا ہے۔ اور ایک کبڑا راجہ کے قالب میں اپنی روح منتقل کر دیتا ہے۔ اس طرح کبڑا راجہ اور راجہ برہمن بن جاتا ہے۔ پھر کبڑے کو ایک مرے ہوئے طوطے کے قالب میں منتقل ہو کر ماہر فن ہونے کا ثبوت دینے جانے کے لئے کہا جاتا ہے۔ اس طرح جب کبڑا راجہ کا قالب چھوڑ کر طوطے کے قالب میں جاتا ہے تو راجہ فوراً دوبارہ اپنی روح اپنے بدن میں منتقل کر لیتا ہے۔

اسی طرح انتقال روح کی ایک کہانی ملایا والوں کی زبان میں بھی ملتی ہے۔ یونان کی قدیم کہانیوں میں ایک ایسے شخص کے داستان ملتی ہے جو اپنی روح منتقل کر دیا کرتا تھا۔[2]

مثنوی گلزار نسیم میں بھی ایک جگہ انتقال روح کا واقعہ ملتا ہے۔ ایپلیس (APELIUS) کا زریں گدھا جو یورپ کا طویل ترین اور یونان کے آخری دور کا قصہ ہے۔ اس میں بھی ایک لڑکے کی روح ایک گدھے میں ڈالی جاتی ہے۔

مثنوی ہیرامن طوطا میں ایک جگہ بیان کیا گیا ہے کہ جب شاہ ہرن کے قالب سے اپنی روح کو طوطے کے قالب میں منتقل کر کے طوطوں کے ایک غول کے ہمراہ ان کا سردار بن

۱:۔ شاخ زریں ص ۲۷۳-۲۷۴ مطبوعہ مجلس ترقی ادب لاہور۔

۲:۔ " " " " " "

کر اپنے شہر کی طرف روانہ ہوتا ہے تو راستے میں ایک سرسبز مقام پر درخت کے نیچے پڑا ہوا دانہ دیکھ کر طوطے لالچ میں جاتے ہیں۔ بادشاہ ان کو سمجھاتا ہے لیکن وہ لالچ میں اتنے اندھے ہو جاتے ہیں کہ اپنے بادشاہ (طیور کا بھی بادشاہ ہی تھا) کی نصیحت نہیں مانتے جب وہ طوطے اسیر دام ہو جاتے ہیں تو بادشاہ بھی ان کے ساتھ گرفتار ہوتا ہے۔ بتیسال پچیسی میں بھی یہی واقعہ بیان کیا گیا ہے۔ لیکن اس میں طوطوں کے بجائے کردار کبوتر ہیں جو اپنے اتحاد سے اور کبوتروں کے سردار کے مشورے سے پورا جال اڑا کر لے جاتے ہیں اور جا کر اپنے دوست چوہے سے جال کے بند کھلواتے ہیں۔

بلا خوف تردید یہ کہا جا سکتا ہے کہ یہ قصہ قدیم سنسکرت کہانیوں سے یا تو براہِ راست ماخوذ ہے یا پھر انہی تصورات کے زیر اثر لکھا گیا ہے اور اس قصہ پر بتیال پچیسی اور کتھا سرت ساگر کے اثرات ہیں۔ یوں بھی قالب بدلنا، راج پر غاصبانہ قبضہ کرنا اور حیوان کرداروں کا انسانی عقل و فراست سے کام لینا سنسکرت کہانیوں کے تصورات ہیں۔ لیکن اس امکان کو بھی نظر انداز نہیں کیا جا سکتا کہ بتیال پچیسی اور کتھا سرت ساگر کی قدیم کہانیوں سے مشابہ ہونے کے باوجود یہ امیر خسرو کے اپنے ذہن کی پیداوار ہو۔ اور انھوں نے کسی کہانی یا مثنوی سے استفادہ نہیں کیا بلکہ مشہور العوام افسانے کو اپنے طور پر مرتب کر کے مثنوی لکھ دی۔ یہ بات حقیقت کی بجائے امیر خسرو کے بارے میں کہی جانی چاہیئے تھی۔

مثنوی ہیرا من طوطا کا تنقیدی جائزہ اور محاسن

حقیقت کی اس مثنوی کا موضوع عشقیہ نہیں ہے۔ قصہ کی ترتیب اور داستان کے بیان میں جو طریقہ اختیار کیا گیا ہے وہ فنکارانہ ہے۔ اندازِ بیان صاف اور سادہ ہے اور نثر کی

۱:۔ پروفیسر لطیف حسین ادیب ص ۱۲۹

سی سادگی لئے ہوئے ہے۔ اس میں شاعرانہ محاسن کی کمی ہے جس کی ایک وجہ یہ معلوم ہوتی ہے کہ چونکہ اس کا موضوع عشقیہ نہ تھا۔ اس وجہ سے اس وہ رنگین اور دلپذیر پیرایہ اختیار کرنا مشکل تھا۔ ادیب صاحب نے اسے عام فہم زبان میں بیانیہ شاعری کا ایک عمدہ نمونہ قرار دیا ہے۔ یہ ایک مختصر مثنوی ہے جس میں نہ تو فوق الفطرت عنصر کی فراوانی ہے اور نہ ہی قصے کو بہت زیادہ الجھایا گیا ہے۔ البتہ حقیقت قصہ کہنے کے فن سے واقف نظر آتے ہیں۔ انھوں نے فنی مہارت کے ساتھ قصہ بیان کیا ہے اور قصے میں نہ تو ناگوار خاطر طولانی مہمات کو بیان کیا گیا ہے اور نہ ہی کوئی ژولیدگی یا الجھاڑ ہے۔ یہ مثنوی یک رخ پلاٹ کی حامل ہے۔

کردار نگاری

مثنوی ہیر امن طوطا میں شاہ کی بیوی کا کردار ایک باحیا اور باعصمت بیوی کا کردار ہے جو ہر مصیبت برداشت کرتی ہے اور اپنے محبوب شوہر کے فراق اور جدائی میں بے قرار رہتی ہے۔ جب بادشاہ سے فریب کر کے وزیر بادشاہ کے قالب میں اپنی روح منتقل کرنے کے بعد محل میں آتا ہے تو رانی کے علاوہ محل کی ہر حرم کے ساتھ خلوت میں بسر کرتا ہے اور محل کی کوئی کنیز اور کوئی حرم اس کی نفسانی خواہشات سے نہیں بچتیں۔ بلکہ ہر کسی کو وہم و گمان بھی نہیں ہے کہ بادشاہ کے روپ میں کون شخص ہے اور خود مثنوی نگار ایک جگہ ان تمام حرم اور کنیزوں کو بے قصور ٹھہراتا ہے۔ لیکن رانی وہ واحد عورت ہے جو بادشاہ میں کچھ خلاف معمول باتیں پاکر خبردار ہو جاتی ہے۔ چنانچہ جب بادشاہ کے روپ میں وزیر محل میں آتا ہے تو رانی سمجھ جاتی ہے کہ ضرور دال میں کچھ کالا ہے۔ اس وقت خوف و خطر، وہم اور اندیشوں کے ساتھ ساتھ رانی کے کردار معاملہ فہمی اور

۱؎ بحوالہ سابق ص ۱۴۹

بے خوفی کی تصویر حقیقت نے خوب کھینچی ہے۔

پلنگے بر عکس شاہ ساری چال!
ہو کے رد گرداں اوس سے وہ فی الحال

آمد و شد نشت اور برخاست — جز کجی ایک بھی نہ پائے راست
سونچی کچھ شہ پہ آئی ہے آفت — اولٹی کیوں در نہ ہو گئی ہے مت
شکل شہ کی ہے لیک شاہ نہیں — راست میں شاہ کج کلاہ نہیں

ہر کا بکّا ہے یہ نویوں اے دائے
اجنبی جیسے کوئی گھر میں آئے

رانی بادشاہ میں غیر معمولی تبدیلیاں پانے کے بعد جس طرح اس سے دور رہنے اور نہ چھونے کو منع کرتی ہے۔ اس سے رانی کی پاکدامنی اور پاک سیرتی واضح ہوتی ہے اور اس موقع پر ایک پاکدامن عورت کے جذبات جس صورت میں ظاہر ہوتے ہیں۔ ان کی تصویر حقیقت نے خوب کھینچی ہے۔ اگرچہ یہ داستان خیالی ہے لیکن رانی کی زبان سے اس موقع پر جس گفتگو کا مثنوی نگار اظہار کراتا ہے۔ وہ لکھنوی بیگمات کا سا طور و طریقہ ہے۔

نہ بڑھانا تو ہاتھ میری طرف
ورنہ اپنے تئیں کروں گی تلف

تو تُے میرا اگر چھُوا دامن! — ہاتھ میرا ہے اور ترا دامن
لہو کی ندیاں بہاؤں گی! — خاک و خوں میں تجھے رلاؤں گی
گر گلے سے مرے تو آن لگا — کاٹوں گی اپنا اور تیرا گلا
میرا بچا نہ آہ ہر دم لے! — تھوڑے دن تو چُری تلے دم لے

رانی، بادشاہ سے اپنے شک کا اظہار کردیتی ہے۔

ہوگیا رفع شک مرا جس دن
نہ رہوں گی میں ایک دن تجھ بن

جب میں سمجھی ہے میرا تو ہی شاہ — کام دل مجھ سے لیجو خاطر خواہ
اب نہ کر کچھ ارادہ میرے ساتھ — نہ لگی ہوں نہ لگوں گی تیرے ہاتھ
ساتھ اب تیرے گو نہیں سوتی — مانع دید پر نہیں ہوتی !

پردہ تنک ہو جب تنک پارہ
پس کیا کرے دور نظارہ !

آخر میں جب ہیرامن طوطا کے قالب میں بادشاہ اپنے محل میں جاتا ہے اور اپنی رانی کو آپ بیتی سناتا ہے تو رانی اس کو پہچان لیتی ہے۔ اور آخر بادشاہ اور رانی کے باہمی مشورے سے رانی وزیر کو ایک بار قالب بدلنے کے علم کا اظہار چاہتی ہے۔ اور یوں اپنی رانی کی دانش مندی کے سبب، بادشاہ پھر دوبارہ اپنے اصلی قالب میں آجاتا ہے۔

صبح کے وقت معمول کے مطابق جب جعلی بادشاہ آتا ہے۔ تو رانی اپنی چالاکی اور ہوشیاری سے اسے قالب بدلنے پر مجبور کرتی ہے۔ ؎

صبح ہوتے ہی بارے آیا وزیر — غافل از حقہ بازی تقدیر
اٹھی یہ سرو قد پئے تکریم — سرو قد اوس کی کرنیکو تعظیم
کرکے تسلیم تخت پر بٹھلا — لے لیں چٹ پٹ بلائیں سر نایا

رانی کا یہ ظاہری اخلاص و محبت اس کے گزشتہ سلوک کے برعکس تھا جس کے سبب وزیر حیران تھا۔

اوس نے دیکھا جو ایسا ساز و برگ　　تھا نہ نزدیک ہو دے شادی و مرگ
ہو کے حیران نگاہ وہ یوں کہنے　　یہ نوازش ہے آج مجھ پر کیوں!

رانی، اس گرفتار ہوس کو زیر دام لانے کے لئے ان جذبات کا اظہار کرتی ہے۔

بولی وہ نازنین یہ کر کے نیاز
ہوں میں تیری قدیم سے دمساز

پر کئی بات سے گئی تھی سہم　　رہ رہ آتا تھا میرے دل کو وہم
دیکھ برعکس تیری کتنی چال!　　بندھ گیا دل میں تھا کچھ اور خیال
کہ خدا جانے کیا ہوا شہ کو!　　گئی یکایک بدل جو اوسکی خو!
رفع وہ شبہے سو ہوئے یک یک　　للہ الحمد اب نہیں کچھ شک
امتحان کر چکی جو کرنا تھا!　　گیا گزرا جو کچھ گزرنا تھا!
آزمائش رہی ہے اِک باقی
ہے کمال آج اوسکی مشتاقی!

اوپر کا آخری شعر ایک خاص نفسیاتی کیفیت کا مظہر ہے۔ جس کی تمہید رانی کے الفاظ میں شاعر نے اس طرح سے باندھی ہے۔ یہ شعر اس جذبے کا نقطۂ عروج ہے شاہ اور رانی کی محبت، درمیان میں ان تعلقات میں ایک کشیدگی کے سبب ان شکوک و شبہات کے رفع ہو جانے کے بعد، رانی کی طرف سے اس بے قراری کی کیفیت کا اظہار عین فطری ہے کیونکہ اس نے اپنے شاہ سے ملاقات کے لئے جو شرط رکھی ہے۔ ان کے پورا ہونے کے بعد صرف علم کایا پلٹ کے مظاہرے کی جس انداز میں رانی مطالبہ کرتی ہے۔ اس سے یہاں صرف یہی ظاہر کرنا مقصود تھا کہ اب وہ اس دوری کو تادیر قائم نہیں

رکھنا چاہتی۔ چنانچہ اپنے اس بے کانہ اظہار کی بدولت وہ وزیر پرتزویر کو اپنے دام میں لانے میں کامیاب ہو جاتی ہے۔ اور وزیر بقالب شاہ اس سے جواب میں کہتا ہے۔ وزیر نے جو جواب دیا اور جس طرح فی الفور علم کایا پلٹ دکھانے کا اظہار کرتا ہے۔ وہ بھی عین فطری ہے اور اس سے اس بے قراری کا پتہ بھی چلتا ہے جو وہ بادشاہ کے روپ میں ہو کر اپنے گوہر مراد کو حاصل کرنا چاہتا ہے۔ رانی کہتی ہے کہ میرے بادشاہ کو علم کایا پلٹ یاد تھا۔ اگر تجھے بھی وہ علم آتا ہے تو میں تجھے اپنا بادشاہ مان لوں گی۔ وگرنہ

گر نہیں یاد تجھ کو کایا پلٹ !
مار ڈالوں گی میں تجھے، تجھے جھٹ پٹ

وزیر کا جواب :۔

بولا وہ میں ہوں تابع فرمان !
تجھ پہ ہو جاؤں دل سے میں قربان

یہ بھی کوئی بات ہے جو تو نے کہی — چاہتی جب تو امتحان کرتی
وہیں اس مرغی نے منگا کر مرغ — مار ڈالا گلا دبا کر مرغ !
پڑھ کے کچھ اور کہہ کے چھو منتر — ڈالی جان اپنی مرغ کے اندر
بولا مرغا وہ اوٹھکے ککڑوں کوں — شہ کا لاشہ گرا زمین پہ نگوں
نعش دیکھی تو کر کے کایا پلٹ — طوطا وہ شاہ بن گیا جھٹ پٹ
مار کر ایک خنجر خونخوار ! — کیا اوس مرغ کے تئیں مردار

بانوئے بادفا نے بے تاخیر !!
ڈالیں مرغے کی دونوں ٹانگیں چیر

یوں شاہ کی کدبانو کے تدبر و دانش مندی سے شاہ دوبارہ اپنے قالب میں آتا ہے اور وزیر اپنے کیفر کردار کو پہنچتا ہے۔

بیسوا کا سراپا

حقیقت نے بیسوا کا سراپا بھی خوب بیان کیا ہے اور اس کی بے حیائی، لوگوں کو اپنی جانب متوجہ کرنے کے انداز کی تصویر خوب کھینچی ہے۔ یہ ایک ایسی بیسوا کا کردار ہے جو حسن میں لاثانی بھی ہے اور چالاکی سے شریف لوگوں کو اپنے دام میں پھنساتی اور ان سے دام کھرے کرتی ہے۔ اپنے مطالبے سے وہ انتہائی ڈھیٹ ظاہر ہوتی ہے اور اس کا یہ مطالبہ دلچسپ بھی ہے اور عجیب و غریب بھی، عام انسانی زندگی میں اس قسم کے واقعے کا رونما ہونا ناممکن ہے۔ لیکن داستانوں میں اس قسم کے واقعات، داستان کی دلچسپی کو بڑھانے کے لئے بیان کئے جاتے ہیں۔ مثنوی نگار کا اس قسم کا دلچسپ واقعہ بیان کرنے کا مقصد ایک تو داستان کی دلچسپی بڑھانا ہو سکتا ہے۔ دوسرے اس سے طوطے کی دانش مندی کا اظہار بھی مقصود تھا۔ یہی واقعہ صیاد کو طوطے کی اچھی قیمت دلاتا ہے جس کا وعدہ ہیرامن طوطے نے صیاد سے کیا تھا۔ اور پھر بیسوا اور مہاجن بچے کے قصے کا ہیرامن طوطا جس طرح تصفیہ کراتا ہے۔ وہ رانی تک اس کی رسائی کا سبب بنتا ہے۔ یوں یہ دلچسپ قصہ اس داستان کے ارتقا میں ایک مربوط سلسلے کی حیثیت رکھتا ہے۔ اور اس سے وہی نتائج پیدا ہوتے ہیں۔ جن کی طرف داستان کے سننے یا مطالعہ کے دوران قاری کی توجہ ہوتی ہے۔

بیسوا کے کردار کو جس طرح حقیقت نے بیان کیا ہے۔ اس میں بیسوا پن کی ساری باتیں نمایاں ہو جاتی ہیں۔ اور خود شاعر کو شاید یہ کہنے کی چنداں ضرورت نہ رہتی کہ ؎

بیسوا بن بھرا ہوا سارا !
جس کو دیکھو وہ محو نظارہ

اتنے میں ایک سرو گل اندام — تھی قیامت ہی جس کی طرز خرام
مہر رخسار و رشک مہ صورت — زہرہ پیشانی مشتری طلعت
بیسوا بن بھرا ہوا سارا ! — جس کو دیکھو محو نظارہ
شوخ پر فتنہ شکل پر بھولی — سادہ پرکار دلربا بولی !
..... اداؤ عشوہ و ناز — غمزہ پرواز ابروئے شمشیر باز
گرم سر تا بپا بڑھی چنچل — برق سال چال میں بھرے چھل بل
عربدہ جو وہ خشم آلودہ !
ہوئی آ اک دوکان پہ استادہ

یہاں حقیقت نے بیسوا کے شکار جس کردار کو منتخب کیا ہے۔ وہ خوبصورت بھی اور مالدار بھی، جس سے اس بیسوا کے ذہن کی چالاکی اور ہوشیاری کا پتہ بھی چلتا ہے کہ وہ آخر کیوں ایک خوش شکل اور امیر شخص کو اپنے الزام کا ہدف بناتی ہے۔ اس میں یہ مصلحت نظر آتی ہے کہ ایسی صورت میں لوگ، اسی الزام کو بھی سچ تسلیم کریں گے۔ یا اس معشوقانہ انداز کو مذاق سمجھ کر جوہری بچہ، اسیر محبت ہو جائے۔ یا بدنامی کی صورت میں رقم ادا کر دے وغیرہ۔

دامن اوس کا پکڑ وہ شور انگیز
لگی کرنے سیتز اور آویز !!

یعنی تو شب کو خواب میں مرے آ — سینہ بر سینہ لب بہ لب ہے رہا
بوسے لیتا رہا ہے تو چٹ چٹ — سات سویا ہے میرے ہونٹ پٹ

تو نے چاہا جو میرے ساتھ کیا　　اور مانع ہوئی نہ میں اصلا۔
میرے چوکے ہزار ہیں دینار　　دے مجھے جلد اور نہ کر تکرار
گر خوشی سے دے تو واہ جی دا　　ہوگی رسوائی تو لطف ہے کیا۔

خرچی دینے میں اب مکر نا واہ
اور گپت عیش شب کو کرنا وا ہ

صیاد کی تصویر کشی بھی حقیقت نے خوب کی ہے۔شروع میں تو اس کی مایوسی کا کوئی ٹھکانہ نہیں ہوتا۔جب وہ ہیرامن طوطا کے علاوہ طوطوں کو مردہ پاتا ہے اور اپنی ہتھلیاں غم میں کاٹتا ہے کہ اس کی غفلت سے شکار مر گئے اس وقت بھی صیاد کے غم و غصے کی بالکل فطری کیفیت مثنوی نگار نے بیان کی ہے۔پھر جب ہیرامن طوطا اس سے گفتگو کرتا ہے اور بازار میں لے جاکر فروخت کرنے کے لئے کہتا ہے تو بھی صیاد اسے کوئی غیر معمولی شے نہیں سمجھتا۔البتہ جب طوطا اپنی دانش مندی سے بیوپار اور مہاجن بچے کا فیصلہ چکاتا ہے۔اور ایک ہجوم سے اپنے فیصلے کی دادِ تحسین وصول کرتا ہے تو صیاد کو اس کی قدر و قیمت کا احساس ہوتا ہے۔اس وقت بہت سے لوگ طوطے کے جو دام لگاتے ہیں۔وہ مصر کے بازار میں یوسف علیہ السلام کی نیلامی کے موقع پر موجود ایسے خریداروں کی مانند نظر آتے ہیں جنھیں جنس کمیاب کی قدر و قیمت کا اندازہ نہیں ہوتا۔اس واقعے کے بعد صیاد کی جو کیفیت ہو جاتی ہے اور جو خود اعتمادی اس میں پیدا ہو جاتی ہے۔وہ بالکل فطری ہے اور حقیقت نے اس کا نقشہ خوب کھینچا ہے۔

خریداروں کی دونی ہمتی کا اظہار :-

کوئی کہتا تھا دو ڑ صد کو تو ں !　　نیوے یوسف کو بن زلیخا کون

کوئی کہتا تھا ڈیر دو کوئی پون لیو نے یوسف کو بن زلیخا کون

صیاد کا احساس فتحمندی :-

کم جو کہتا تھا سن کے بول زیاد !

ناک بھوں ٹھیر کر دہیں صیاد

پھیر کر اد سے منہ کہتا ادنوں لیں گے طوطا یہ دیکھو ان کا منہ

دیں گے چھین تکے سا غی کھول طوطا ہی نت رہے نہیں لیتے مول

لینے دیتے نہیں ہیں کچھ مطلق بہ ٹین ٹین ٹین ٹین لگا ئی ہے ناحق

میاں مٹھو یہ میرا لو گے کیا ٹیاں کوئی لو دھیلے کا طوطا !

جب خریدار جائیں گے رب مر لیجیے گا آپ اس کو تب آ کر

کوئی نہ لیوے گا تو دل گا تم کو پھیر جاؤ جی مت پھراؤ میرا سر

طوطے اور رانی کی گفتگو جب طوطے کی شہرت رانی تک پہنچتی ہے اور رانی صیاد کو منہ مانگے دام دے کر طوطے کو خرید والیتی ہے۔

اس کے بعد طوطا ایک شب رانی کی فرمائش پر اپنی داستان سناتا ہے۔

بولا اچھا پہ یہ تو کہدو جی ! آپ بیتی کہوں کہ پر بیتی !

بولی کہ آپ بیتی اے مٹھو لگا کہنے وہ مرغ شیریں گو

طوطا نصف داستان سنانے کے بعد داستان کو اگلی شب کے لئے ملتوی کر دیتا ہے گویا رانی کی آتش شوق کو فزوں کرنا چاہتا تھا۔ رانی زیادہ ضد کرتی ہے اور آخر میں بادشاہ کا صرف نام سننے کی آرزو کرتی ہے۔ رانی کی اس خواہش کو بھی طوطا بہ لطائف الحیل ٹال دیتا ہے یہیں مثنوی نگار کا مقصد، اس جستجو کو رانی میں پیدا کرنا مقصود تھی۔ چنانچہ رانی تمام رات ایک

کش مکش کے عالم میں رہتی ہے اور اضطراب و بے چینی میں وہ شب اور دن کا دقت گزار کر سر شام طوطے سے پھر باقی داستان کو سنانے کے لئے کہتی ہے۔ اس عرصے میں کبھی رانی مایوس ہوتی ہے اور کبھی امید کی کرن مایوسی کے اندھیروں میں روشنی کرتی ہے اور پھر معدوم ہو جاتی ہے۔ کبھی رانی سوچتی ہے کہ پرند کا کیا اعتبار، ممکن ہے کہیں کی سنی سنائی داستان بیان کر رہا ہے۔ پھر سوچتی ہے کہ تمام آثار و قرائن سے تو میرے گمشدہ شاہ کا پتہ چلتا ہے۔

غرض دوسری شب وہ حقیقت حال سے باخبر ہوتی ہے۔ لیکن ستم ظریفی اور بدنصیبی ملاحظہ ہو کہ بچھڑے ہوؤں کا ملاپ اس صورت میں ہوتا ہے کہ ایک انسان ہے اور دوسرا پرند۔

ہجر نے گو کیا بہ مرگ قریب　　پر یہ کیسا ہے وصل ہائے نصیب
کہ میں انسان ہوں اور تو طائر　　غیر جنسیت ان کی ہے ظاہر

مثنوی کے اسلوب اور طرز بیان میں شاعرانہ لطافتوں اور ادبی نزاکتوں کے استعمال کی بڑی گنجائش رہتی ہے۔ لیکن مثنوی کی اصلی خوبی اس کا ربط اور تسلسل ہے۔ شاعرانہ لطافتوں اور نزاکتوں کی نمائندہ مثنویوں میں سحر البیان اور گلزار نسیم کا نام لیا جا سکتا ہے۔ جن میں جملہ شاعرانہ محاسن کے ساتھ واقعات کے ارتقا، ترکیب اور مثنوی کی ہیئت اور ربط و تسلسل کی طرف بھی مکمل توجہ دی گئی ہے۔ لیکن بیشتر مثنویوں میں ساری خوبیوں کا جمع ہو جانا ناممکن ہے۔

ہیر امن طوطا میں شاعرانہ لطافتیں اور نزاکتیں کمیاب ہیں جس کی بنیادی وجہ یہ ہے کہ بنیادی طور پر قصہ کا موضوع عشقیہ نہیں ہے۔ وگرنہ شاعر کو ضرور ایسے کمالات دکھانے کا موقع ملتا۔ جہاں تک ربط اور تسلسل کا تعلق ہے یہ مثنوی اس پر پورا اترتی ہے۔ اس میں واقعات کا بتدریج ارتقا موجود ہے۔ اور ترتیب میں موقع محل کی موزونیت کا خیال رکھا گیا

ہے۔ مثنوی ہیرامن طوطا میں اختیار کردہ موضوع کے مطابق اس داستان کو نہ تو زیادہ پھیلانے اور پیچ در پیچ واقعات کو بیان کرنے کی ضرورت تھی۔ اور نہ کسی طویل مرقعے کو بیان کرنا ممکن تھا۔ ڈاکٹر گیان چند نے داستانوں کے ڈھانچوں کی دو اقسام بیان کی ہیں۔ ایک شکل میں پلاٹ واحد ہوتا ہے۔ یعنی داستان ایک یا چند کرداروں کی سرگزشت ہوتی ہے۔ جو بغیر کسی انقطاع کے مسلسل بیان کردی جاتی ہے۔ دوسری صورت میں بنیادی پلاٹ بہت نحیف اور کاہیدہ ہوتا ہے۔ ہیرامن طوطا اکہرے پلاٹ کا قصہ ہے۔ جس میں راوی صرف ایک ہی کردار رہنے۔ اور صرف ایک ضمنی کہانی درمیان میں بیان ہوتی ہے اور اس ضمنی کہانی کا بھی بنیادی پلاٹ سے گہرا تعلق ہے۔ اس اعتبار سے یہ واحد پلاٹ کی داستان ہے۔ بیتال پچیسی، چار درویش، آرائش محفل اور بعض دوسری داستانوں کی طرح ہیرامن طوطا میں بھی بیوپا اور مہاجن بچے کی کہانی، اپنے انجام اور آغاز کے اعتبار سے اپنی جگہ ایک مختصر سی کہانی بھی ہے۔ لیکن اس کا داستان کے بنیادی پلاٹ سے بھی گہرا تعلق ہے۔ ہیرامن طوطا کی تمہید و بندش میں نہ تو اردو مضمون ہے اور نہ ہی تکرار بیان پایا جاتا ہے۔ البتہ اس میں ایسے ڈرامائی موڑ نہیں آتے کہ جو ذوق و تجسس کو ہر ہر قدم پر افزوں کرتے رہیں۔ زبان کی سادگی، اور اسلوب کی روانی داستان کو سریع الفہم بناتی ہے۔ اور یہ سریع الفہمی ہی فن قصہ گوئی کا لازمی جزو ہے۔ حقیقت کے انداز شاعری کو دیکھ کر حیرت ہوتی ہے۔ ان کی غزلوں میں تو لکھنویت کا اثر نمایاں ہے لیکن مثنویوں میں ایسی بات نہیں ہے۔ جو تعجب خیز امر ہے۔ حقیقت کی یہ مثنوی ایک متوسط درجے کی مثنوی ہے۔

خزینۃ الامثال

حقیقت نے اپنی اس تالیف میں عربی، فارسی اور ہندی (یعنی اردو) ضرب الامثال یکجا کی ہیں۔

وجۂ تالیف

کتاب کے آخر میں حقیقت نے اس کتاب کی وجہ تالیف بیان کرتے ہوئے لکھا ہے۔

"حسین شاہ تخلص بہ حقیقت عفا اللہ تعالےٰ عن سیاتہٖ فی یوم القیامۃ صاحب سخن کی خدمت میں ملتمس ہے کہ ایک روز غریب خانے میں مجمع ان دوستان موافق اور یارانِ صادق کا مانند عقد پروین دپرن کے تھا۔ جو ہر ایک ان میں سے سخن فہمی ونکتہ شناسی، بذلہ گوئی ولطیفہ سنجی میں ضرب المثال اہلِ سخن کا تھا۔ سب شکل بلبل نغمہ سرا اور طوطی شکریں نوا کے چہچہے بھر رہے تھے اور باہم چرچا ہر ایک فن کا اور تذکرہ شعر وسخن کا کر رہے تھے۔ اتفاقاً بر سبیل مذکورہ ذکر امثال کا درمیان آیا۔ سب نے یک زبان ہوکر بندے کو فرمایا کہ دفتر کے دفتر انواع علوم سے آراستہ ہیں اور اقسام فنون سے پیراستہ مگر ایسی کتاب جو مجمع امثال ہو نظر نہیں آتی۔ اگر تو ہمارے پاس خاطر سے موافق اس مثل کے بیکار مباش کچھ کیا کر امثال پریشان کو جمع کرے تو خالی لطف اور فائدے

سے نہ ہوگا۔ ہر چند بندہ اپنے تئیں مرد اس میدان کا نہ جانتا تھا لیکن دوستوں کے کہنے سے اس وادی پُر خطر میں گامزن ہوا۔ اور بعونہ تعالیٰ بہت سی محنت اور مشقت کر کے ایک مدت مدید اور عرصہ بعید میں امثال عربی و فارسی اور ہندی کو زبان زد خواص و عام کے تھیں جمع کیں اور ہر مثل کو مواضع اور مواقع لائقہ میں مانند سبحہ لآلی کے منظم اور منسلک کر کے موسوم بہ خزینۃ الامثال کیا[1]۔"

سنہ تصنیف

شاہ حسین حقیقت کے بیان کے مطابق اس کا سال تالیف ۱۲۱۵ ہجری مطابق ۱۸۰۱ سنہ عیسوی ہے۔ وہ لکھتے ہیں۔

"بحمد اللہ کہ با جود حوادث انگیزی ہائے فلک خلل انداز تفرقہ پرداز ایں بحر ذخار و محیط ناپیدا کنار کہ بہ تخیل ساحلش عقل بالادست غواصان قلزم ہمہ دانی لطمۂ خور پنجہ امواج حیرانست بنا بر حسن نیت طالباں در ۱۲۱۵ھ یک ہزار و دو صد و پانزدہ ہجری نبوی گرداب دارد گوہر کرد از یکجا و دریک صدف قرار گزید الخ۔"

حسین اتمت ھذہ النسخۃ — میتعناً عربی المتعال

سال تاریخ خواستم کہ کنم ! — ہم زبانش عیاں بر اہل کمال ! !

کر خزینے سے فرو ساٹھ عدد — بولا ہاتف خزینۃ الامثال

مندرجہ ذیل حساب سے اس سے جو اعداد بنتے ہیں۔ ان کے مطابق سال تصنیف ۱۸۰۱ سنہ عیسوی برآمد ہوتا ہے۔

۱۔ خزینۃ الامثال ص ۴، ۵ مطبع مصطفائی ۱۸۵۴

اعداد

خزنیہ :- ۶۷۲ - ۶۰ = ۶۱۲

الامثال :- ۶۰۳ + ۶۱۲ = ۱۲۱۵ (۱۸۰۱ سنہ عیسوی)

طباعت

ہمارے پیشِ نظر جو نسخہ ہے وہ مصطفائی کا طبع کردہ ہے۔ سال طباعت ۱۲۷۰ ہجری مطابق ۱۸۵۴ء ہے۔ ناشر کے بیان سے واضح ہے کہ یہ کتاب اس سے قبل بھی شائع ہو چکی تھی۔ ناشر نے طبع اوّل کا سنہ اشاعت نہیں لکھا ہے لہذا کچھ یقین کے ساتھ نہیں کہا جا سکتا کہ یہ کب طبع ہوئی تھی ؟ ناشر نے جو کچھ لکھا ہے اس سے یہ پتا چلتا ہے کہ حقیقت کے خلف الرشید میر محسن لکھنوی جو خود بھی لکھنؤ کے مشہور شاعروں میں سے تھے اس کتاب کو بغرض اشاعت لائے تھے۔ میر زمانہ شاہی میں یہ کتاب مطبع نظامی لکھنؤ سے شائع ہوئی تھی۔ چنانچہ ناشر لکھتا ہے۔

"بہ توجہ برگزیدہ حضرت میاں عبدالرحمٰن خان صاحب مہتمم مطبع نظامی زمانہ شاہی میں یہ کتاب بمقام لکھنؤ طبع ہوئی تھی۔ اور بوجہ عدم قدردانی رواج وقت کے ایسی اچھی کتاب مکرّر طبع نہیں ہوئی۔ چونکہ فی الحال زمانہ فیض تعلیم سرکار دولت انگلیشہ میں ہر ایک فن اور علوم کی قدردانی ہو چلی ہے اس لئے بہ نظر ترویج مدارس و علّہ شائق علوم کی نظر سے یہ کتاب اس مطبع میں با اضافہ و چند لطیفہ و اشعارات لفات آداب مجلس میں طبع ہوئی۔"[1]

اس کتاب کی طبع دوم میں بعض اضافے بھی کئے گئے ہیں۔ جن کی صراحت ناشر نے یوں کی ہے۔

۱:- خزینۃ الامثال ص۲ مطبوعہ مطبع مصطفائی لکھنؤ۔ ۱۸۵۴ء

"جو امثال عرب کتاب میں داخل تھیں اور سمجھنا ان کا ہر ایک کو مشکل تھا خیال میں آیا کہ اگر ان کا ترجمہ ہو جاوے تو باسہل وجوہ سب کی سمجھ میں آوے اس واسطے ماضی الضمیر اپنا خدمت میں حضرت جبر المحقیقین تحریر المدقیقین یکتائے ماہران فنون عقلی یگانہ واقفان علوم نقلی ادیب بے بدیل فلسفی، فقید المثال حکیم حکمت مصطفوی، متبع سنت سنیۂ نبویہ، الوذعی علمائے روزگار المعی کملائے اعصار مورد فیوضات نامتناہی لم یزلی مولانا بالفضل والکمال اولانا جناب مولانا ابوالبرکات رکن الدین محمد البشیر مولوی تراب علی لازالت شموس افادات باز غنہ وماہر برحت اقمار افاضاۃ ساطعہ عرض کیا۔ جناب معظم الیہ بالقابہ نے برحسب پذیرائی التماس اعراب اور ترجمہ اور مورد استعمال امثال عرب لکھا بلکہ جس جا حل مطلب ترجمہ سے بخوبی نہ ہوا وہاں توضیح حاشیے پر چڑھائی اور جو مثل پوری کتاب میں نہ تھی وہ بہ تحریر باقی کامل فرمائیں[1]۔"

گویا مولوی ابوالبرکات نے بھی اپنی طرف سے مزید ضرب الامثال یکجا کر دیں۔

خزینۃ الامثال کی ترتیب حقیقت نے اس طرح رکھی ہے کہ حروف تہجی کے اعتبار سے ضرب الامثال پیش کی گئی ہیں۔ چنانچہ الف سے شروع ہونے والی ضرب الامثال پہلے دی گئی ہیں۔ لسانی اعتبار سے ترتیب یوں رکھی گئی ہے کہ پہلے فارسی زبان کی ضرب الامثال پر عربی کی اور اس کے بعد ہندی کی ضرب الامثال ہیں۔ فارسی ضرب الامثال کا اردو ترجمہ یا ان کا محل استعمال بیان نہیں کیا گیا۔ حقیقت نے تو دراصل عربی ضرب الامثال کے اردو ترجمہ کا اہتمام بھی نہیں کیا تھا۔ اور کتاب کی اشاعت بغیر ترجمے کے ہوئی تھی۔ لیکن طبع دوم میں عربی ضرب الامثال کے اردو

۱۔ خزینۃ الامثال ص۳ مطبوعہ مطبع مصطفائی لکھنؤ ۱۸۵۴ء

ترجمے دینے کی ضرورت خاص طور پر محسوس کی گئی۔ اس کی ایک بنیادی وجہ یہ سمجھ میں آتی ہے کہ چونکہ اس زمانے میں فارسی زبان کا رواج عام تھا۔ اور گو امتداد زمانہ کے سبب اردو زبان فارسی کی حریف بن کر ابھر چکی تھی۔ اور رفتہ رفتہ فارسی کا اثر اور مقبولیت ختم ہو رہی تھی۔ تاہم اس کے باوجود ابھی برصغیر پاک و ہند میں فارسی زبان سے واقفیت عام تھی۔ اور ہر پڑھا لکھا آدمی [illegible] جانتا اور اس میں کچھ نہ کچھ لکھنے پڑھنے کی استطاعت بھی رکھتا تھا۔ اس سبب سے مصنف کے فرزند محسن لکھنوی نے اور نہ کتاب کے ناشر نے یہ ضروری سمجھا ہوگا کہ فارسی زبان کی ضرب الامثال کا اردو ترجمہ شریک اشاعت کیا جائے۔ لیکن عربی ضرب الامثال کے اردو ترجمے کی ضرورت سمجھی گئی۔ ہر چند کہ اس زمانے میں عام پڑھا لکھا آدمی بھی عربی زبان سے تھوڑی بہت شناسائی رکھتا تھا۔ لیکن اس زبان کی واقفیت کا دائرہ، فارسی کے مقابلے میں بہت محدود تھا۔

اس کتاب کی افادیت میں اور بھی اضافہ ہو جاتا اگر ہر ضرب المثل کے پس پردہ، واقعہ کو بھی اختصار کے ساتھ بیان کر دیا جاتا۔

گو خزینۃ الامثال کی عربی، فارسی اور ہندی ضرب الامثال میں سے بیشتر ہم معنی ہیں۔ لیکن چونکہ مولف کے پیش نظر کتاب کی ترتیب کے وقت یہ خیال نہ تھا۔ کہ وہ تینوں زبانوں کی ہم معنی ضرب الامثال یکجا کر رہا ہے۔ لہذا اس سبب سے مولف نے کتاب کی ترتیب دوسرے انداز میں رکھی ہے۔

حقیقت اس ترتیب کے بارے میں لکھتے ہیں۔

"بنا اس خزانۂ عامرہ کی بہ ترتیب حروف تہجی اکتیس خزینے پر ہوئی اور بنا ہر خزینے کی گئی گنجینے پر اور لکھنے میں کہاوتوں کی رعایت دوسرے

بلکہ تیسرے حرف کے بھی واسطے سہولت نکال لینے مثل کے کی گئی۔ مثلاً" یہ مثل اختلاط زیادہ برآشنائی یا اعتبار" ۔ دوسرے حرف کے الف اور خ کے ساتھ لکھے گئے۔ اور اس کہاوت کو کہ ایک تو میاں تھے ہی تھے اور دوسرے کہائے نہنگ" الف مع الیلے کے مقام پر لکھا اور اول جس مثل عربی کے کہ الف لام تعریف سے مثلاً" یہ مثل کہ المکتوب نصف الملاقات" حرف میم اس کو لکھا نہ حرف الف میں۔ اس طرح سب کہاوتوں پر قیاس کیا جانا چاہیئے۔[1]"

ضرب المثل کیا ہے

ضرب المثل کس طرح وجود میں آتی ہے؟ کہا جاتا ہے کہ یہ دانائی کے اظہار کی قدیم ترین شکل ہے۔ ان کہاوتوں کے خالق کون ہوتے ہیں؟ ان کے بارے میں بھی کچھ نہیں کہا جا سکتا۔ یہ بھی لوک ادب کی طرح خود ہی پھلتی پھولتی ہیں۔ اور زمانے کے ساتھ ساتھ عوام میں ان کی جڑیں گہری ہوتی جاتی ہیں۔ انھیں لوک داستانوں کی طرح خودرو پودوں کے مماثل قرار دیا جا سکتا ہے جو رفتہ رفتہ ایک عالمگیر اور ابدی سچائی کی صورت اختیار کر لیتی ہیں۔ ہر ضرب المثل کے پس پشت کوئی نہ کوئی واقعہ ضرور ہوتا ہے۔ یہ فیصلہ نہیں کیا جا سکتا کہ آیا کوئی ضرب المثل پہلے وجود میں آئی۔ یا کسی خلاق ذہن نے یا معاشرے کے اجتماعی شعور نے ضرب المثل میں پوشیدہ تجربے کو صداقت کا روپ دینے کے لئے اس کے ساتھ کوئی نہ کوئی واقعہ متعلق کر دیا۔

ضرب المثل اصل میں طوالت کے بجائے اختصار کا فن ہے۔ اور کسی ضرب المثل سے لطف اندوز ہونے یا کسی خاص موقع پر اس کو حسب حال بولنے کا فن بھی اسی وقت کامیاب

۱۔ خزینۃ الامثال۔ بحوالہ سابق ص۵

کہا جاسکتا ہے کہ جب فریق مخالف یا سننے والے بھی اس کہاوت یا ضرب المثل میں پوشیدہ معنوں سے پوری طرح آگاہ ہوں۔ گویا یوں کہا جاسکتا ہے کہ ایک خاص سطح کے تہذیب یافتہ معاشرے میں ضرب المثل کی اہمیت اور استعمال زیادہ بہتر اور سود مند ہوگا۔

شاہ حسین کا نقطہ نظر اس سلسلے میں کیا تھا۔ وہ لکھتے ہیں۔

"یہ بھی دریافت کرنا ضرور ہے کہ مثل کیا ہے کہ جس سے احوال گزشتہ معلوم ہوتا ہے کہ اس کہاوت کو کسی نے وقت ظاہر ہونے کسی حادثے کے یا واسطے مثال دینے کے ایک حال کے ساتھ حال دوسرے کے ایک لطف و عزابت کے ساتھ وضع کیا ہو۔ تو جس وقت ویسا ہی سانحہ ظاہر ہو۔ اس مثل کو کہیں تا سننے والوں کو شے مخیل محقق ہو جاوے۔ اور متوہم بصورت متیقن کے نظر آوے یا غائب بمنزلہ شاہد کے دکھائی دے۔ اور کچھ پردہ حقیقت میں اس چیز کے نہ رہے اور اگر ساتھ موقع کے کسی عبارت میں کوئی کہاوت درج کی جائے وہ کلام لاکلام ایک خوبی اور رنگینی، لطافت اور ملاحت بہم پہنچائے کہ سلف کے لوگ کہتے ہیں۔ المثل فی الکلام کالملح فی الطعام یعنی کہاوت کلام میں جیسے نمک ہے طعام میں۔"[1]

یہاں ہم ضرب المثل کی وہ تعریف بھی پیش کر دیں۔ جس پر اکثر اہل علم میں اتفاق پایا جاتا ہے۔ جب ایک یا دو جملے مدت مدید سے کسی خاص موقع پر استعمال کئے جاتے ہوں۔ اور اپنے لفظی معنوں کے علاوہ کچھ اور معنی دیتے ہوں اور ان کی، حقیقت و ماہیت بارہا تجربہ کرنے سے درست ثابت ہو چکی ہو تو ایسے جملے کو ضرب المثل

۱:۔ بحوالہ سابق ص۵

کہتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ضرب المثل ہمارے مشاہدات اور تجربات کا خلاصہ ہوتی ہیں۔ اور دلچسپ ہونے اور حکمت و دانائی کا پہلو رکھنے کے سبب زبان زد عوام ہوتی ہیں۔

ضرب المثل کی اہمیت

لسانی اور ادبی اعتبار سے بھی ضرب الامثال کی اہمیت مسلّم ہے۔ ضرب الامثال ہر زبان میں پائی جاتی ہیں۔ اور کسی زبان سے مکمل واقفیت اور اس پر پورا عبور رکھنے کے لئے ضرب الامثال سے کما حقہ آگاہی اور موقع محل کے اعتبار سے ان کے مناسب اور برجستہ استعمال کو نہایت مستحسن سمجھا جاتا ہے۔

بعض ضرب الامثال میں تاریخی واقعات بھی مضمر ہوتے ہیں۔ ضرب الامثال کے استعمال کے وقت اسی ترتیب کو ملحوظ رکھنا چاہیئے لیکن بعض اوقات ایسا نہیں ہوتا۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ چونکہ ضرب الامثال ضابطہ تحریر میں کم لائی جاتی تھیں۔ اور ان کا استعمال بھی زبانی ہوتا تھا۔ لہٰذا افراد انھیں استعمال کرتے ہوئے بعض اوقات بعینہٖ وہی الفاظ استعمال کرنے کے بجائے کوئی دوسرا لفظ یا اس کے ہم معنی لفظ کو ضرب المثل میں پنہاں مفہوم کو ادا کرنے کے لئے استعمال کر لیتے تھے۔ اسی بنا پر ضرب المثل میں الفاظ کی تقدیم و تاخیر کو گوارا کر لیا جاتا ہے۔ لیکن محاورے کی طرح مصدر کے تمام مشتقات کے ساتھ استعمال کرنا، اہل علم نے ناجائز قرار دیا ہے۔

آخر میں خزینتہ الامثال سے چند ضرب الامثال دی جاتی ہیں۔ جن کی ترتیب گنجینہ کے حساب سے ہے۔

گنجینہ ۱۔ جزو ۲ امثلل فارسیہ۔ امثال الف

آب آمد تیمم برخواست۔ آب ندیدہ موزہ کشیدہ۔ آب و آتش را چہ آشنائی

۱۔ پیری وداع عمر ست۔ اب صرف امثال ہندیہ پیش کی جاتی ہیں۔ کنیجنہ سوم۔ در امثال ہندیہ (گنیجنہ ۳۔ جزو ۳ امثال ہندیہ۔ امثال الف۔ آبرو جگ میں رہی تو جان جانا پشم ہے۔ آبلہ گلے پڑا۔ آبیل مجھے مار یا آپڑوسن لڑیں۔ آپڑوسن مجھ سے ہو۔ آپ کاج مہا کاج۔ آپ ہی میاں مانگتے۔ اور باہر کھڑے درویش۔ آپ ہی ناک چوٹی میں گرفتار ہیں۔ آٹے کا چراغ گھر رکھو تو چوہا کھائے باہر رکھو تو کوّا لے جائے۔ آٹے کے ساتھ کہیں گھن نہ پس جائے۔ آدمی آدمی انتر کوئی ہیرا کوئی کنکر۔ آدمی کا آدمی شیطان۔ آدمی سا پکھیرو کوئی نہیں۔ آنکھ پھوٹے گی تو کیا بھنوؤں سے دیکھیں گے۔ آنکھوں کے اندھے نام شیخ روشن۔ آنکھوں کے اندے نام نین سُکھ۔

امثال ہندیہ در مثل ہائے با باپ نہ مارے پدڑی اور بیٹا تیر انداز۔ باپ نہ دادے مار خوادے۔ باپ کرے باپ کے آگے بیٹا کرے بیٹے کے آگے آئے۔ باپت پوت پتا پر گھوڑا بہت نہیں تو تھوڑا تھوڑا۔ باگ بگری کو ایک جگہ پانی پلایا ہے۔ بخت اڑ گئے بلندی رہ گئی۔ بخت دیں یاری تو کر گھوڑے اسواری۔ کم بخت کی دال گیلی۔ بخشو بی بلّی چوہا لنڈورا ہو کے جئے گا۔ براتی کنارے ہو جائیں گے۔ کام دولہا دلہن ہی سے آپڑتا ہے۔

گنیجنہ چہارم در مثل ہائے حرف بھا بھات ہوگا تو کوّے بہت آرہیں گے۔ بھات چھوڑا جاتا ہے۔ سات نہیں چھوڑا جاتا ہے۔ بھاری پتھر دیکھا چوم کر چھوڑ دیا۔

بھاگل پور کے بھگیلے اور کل گاؤں کے ٹھگ۔ بھٹ پڑے وہ سونا جس سے ٹوٹیں کان۔ بھلے گھوڑے کو ایک چابک بھلے آدمی کو ایک بات۔

گنجینہ دُمثل ہائے ہندی حرف پا

پاپی کا مال پراپت جائے، ڈانڈ بھرے یا چور لے جائے۔ پاپی کی ناؤ ڈوبے۔ بے پر ڈوبے بادشاہوں کا اور دریاؤں کا کس نے پھیر پایا ہے۔ پاک زہ بے باک رہ۔ پال پال تیرے جی کا ہوگا کال۔ پانچویں پنڈت چھٹے نرائن۔

امثال ہندیہ دُحرف پھا

پھاٹک ٹوٹا گرڈھ لوٹا۔ پھاوڑے کا نام گل صفا۔ پھل چڑھے تو پھل لگے۔ پھوئیں پھوئیں کال بھرتا ہے

امثال ہندیہ دُحرف جا

جا بدھ رہے رام تا ہے بدھ نہ ہے۔ جامد برحق کرنے والا کافر۔ جان ہے تو جہان ہے۔ جب چنے تھے تو دانت نہ تھے دانت ہوئے تو چنے نہیں۔ جب سے جمے بال تب سے یہی احوال۔

امثال ہندیہ دُحرف سا

سخی کا سر بلند۔ سخی شوم برسویں دن برابر ہوتے ہیں۔ سر سجدے میں من بدیوں میں۔ سگھڑ ہنس گیئیں، پھوہڑوں کو آیا ہانسا۔ سلامت رہے بہو جس کا بڑا بھروسہ۔ سوکھے ساون رو کھے بھادوں۔ سیاں بھئی کوتوال اب کا ہے کا ڈر۔ سیر میں پن سیرے کا دھوکا۔ سیکھ پڑوسن تیرے لچھن

امثال ہندیہ حرف ص

صبح کی بوہنی اور اللہ میاں کی آس۔ صبر کی داد خدا کے ہاتھ میں ہے۔ صندل کے چھاپے منہ کو لگے۔ صورت نہ شکل چولہے میں سے نکل۔ صورت چڑیل کی نام پریوں کا۔

امثال ہندیہ حرف م

مکے میں رہتے ہیں پر حج نہیں کیا۔ مفلسی میں آٹا گیلا۔ مفلسی اور فالسے کا شربت۔ مفلس سے سوال حرام

ہے۔ ملّا کی دوڑ مسیت تلک۔ منہ میں دانت نہ پیٹ میں آنت۔ منہ ہالے ستر بلا ٹالے۔

امثال ہندیہ حرف ہ

ہاتھ دیکھن آرسی کیا۔ ہاتھ نہ مٹھی ہلبلاتی اٹھی۔ ہاتھ پاؤں کی کاہلی اور منہ میں مونچھیں جائیں۔ ہاتھیوں سے گنّے کھلنے۔ ہاتھی کے پاؤں میں سب کا پاؤں۔ ہاتھی پھرے گاؤں گاؤں جس کا ہاتھی اسی کا ناؤں۔ ہتھیلی پر سرسوں جماتے ہیں۔ ہزار ہاتھی لٹا تو بھی سوا لاکھ ٹکے کا۔ ہزار لاٹھی ٹوٹی گھر بار کے باسن توڑنے کو بہت۔

غرض اسی صورت سے تینوں زبانوں کی ضرب الامثال حرف یا تک دی گئی ہیں۔ مذاق عام کے پیشِ نظر صرف اردو ضرب الامثال کے حصّے سے کچھ نمونے نذرِ قارئین کئے ہیں۔

زیرِ نظر کتاب میں صرف اردو ضرب الامثال کی تعداد ڈھائی ہزار سے زائد ہے ان میں بہت سی ضرب الامثال ایسی ہیں کہ جواب عام طور پہ تحریر میں بھی کم ہی آتی ہیں اور سننے میں بھی نہیں آتیں۔ ہمارے حافظے اور ذہن ان میں سے بیشتر کو فراموش کر چکے ہیں۔ حقیقت کی یہ کاوش اس اعتبار سے بھی قابلِ قدر ہے کہ انھوں نے بڑی محنت اور جستجو کے ساتھ ان ضرب الامثال کو یکجا کر کے انھیں ہمیشہ ہمیشہ کے لئے محفوظ کر دیا ہے۔

حقیقت نے بیشتر ایسی ضرب الامثال بھی اس کتاب میں شامل کر دی ہیں۔ جو فحش ہیں۔ اور جو عام طور پہ طبقہ جہلا اور پست طبقے کے لوگ بولتے ہیں۔ بعض شاعروں کے ایسے مصرعے بھی دے دیئے گئے ہیں جو فحش اور مبتذل ہیں۔

اسی طرح جنسی افعال کے لئے بھی بعض نہایت سوقیانہ لفظ ضرب الامثال میں پیش کئے گئے ہیں۔ حقیقت اس سلسلہ میں کسی قسم کے ادب و آداب یا تہذیب و

شائستگی کو ملحوظ خاطر نہیں رکھتے۔

ممکن ہے یہ طریق کار بعض لوگوں کو ناپسند ہو۔ لیکن لغت اور لغت سے متعلق مسائل پر لکھتے ہوئے معاشرے کی عام اقدار اخلاق کو ملحوظ نہیں رکھا جا سکتا۔ لغت نگار کا یہ کام نہیں ہے کہ وہ کسی لفظ یا محاورے کو اخلاقی معیار سے جانچے۔ اُسے تو زبان کے ذخیرہ الفاظ کا جائزہ لینے کے لئے ہر طرح کے الفاظ سے سابقہ پڑتا ہے۔ اس بات کو یوں ذہن نشین کیا جا سکتا ہے کہ مذہبی کتابوں میں بہت سے ایسے فقہی مسائل پر بحث کی جاتی ہے۔ جن پر کھلم کھلا گفتگو کرنا ممکن نہیں ہوتا۔

ان مسائل پر بحث کی موجودگی میں ہم ہرگز یہ نہیں کہہ سکتے کہ ایسے مصنفین نے "اخلاق" کو پیش نظر نہیں رکھا۔ یہی حال طبّی کتابوں کا ہے جن میں اعضائے جسمانی اور افعالِ جسمانی کا تذکرہ ہوتا ہے۔ کیا ان کے بارے میں بھی یہ کیا جائے گا کہ ایسی کتابوں کے مصنفین "اخلاقی" سے بے بہرہ ہیں۔

صنم کدۂ چین

شاہ حسین حقیقت کی یہ ایک ادر مفید اور دلچسپ کتاب ہے۔ یہ ایک کھیل کا نام ہے۔ اس کا مقصد تعلیمی ہے۔ قدیم زمانے میں طلبہ میں علمی ذوق و تجسّس، اور شعر و شاعری سے لگاؤ پیدا کرنے کے لئے یہ کھیل عام طور پر بچوں کی ذہنی مشق کی خاطر کھیلا جاتا تھا۔ اور طلبہ میں ذہانت و فطانت، حاضر جوابی اور برجستہ گوئی کی صلاحیت پیدا کرنا بھی اس کھیل کا مقصد ہوتا تھا۔

حقیقت کی یہ کاوش بھی انکے تبحر علمی پر دلالت کرتی ہے۔ یہ کتاب آسان فارسی زبان میں لکھی گئی تھی۔ اس کے کل صفحات کی تعداد ۳۲ ہے۔

سنہ تصنیف اس کتاب کا سنہ تصنیف ۱۲۰۹ ہجری مطابق ۱۷۹۵ ہے۔

سنہ طباعت یہ کتاب ۶ر صفر ۱۲۶۳ ہجری مطابق ۲۴ر جنوری ۱۸۴۷ کو مطبع محمدی لکھنؤ سے شائع ہوئی تھی۔ اس کا مادہ تاریخ "صنم خانہ" ہے جس سے ۱۸۴۷ سنہ عیسوی برآمد ہوتا ہے۔

وجہ تسمیہ "صنم آمد" ایک کھیل کا نام ہے۔ جس میں دو طالب علم ایک دوسرے سے سوال جواب کرتے ہیں۔ اس کی صورت یہ ہوتی ہے کہ ایک طالبعلم یہ کہتا ہے۔ "صنم آمد"۔ دوسرا سوال کرتا ہے "از کجا آمد"۔

اس کے بعد پہلا طالب علم سوال کرتا ہے جس کا جواب دوسرا دیتا ہے اور پھر سوالوں کا سلسلہ شروع ہو جاتا ہے۔ سوالات اس قسم کے ہوتے ہیں۔

" صنم از کجا آمد ؟ "

کجا میرود

برچہ سوار است

چہ پوشیدہ است

در دست چہ دارد

چہ می خورد

چہ می نوشد

چہ می سراید وغیرہ ، وغیرہ ،

اس کھیل کی خصوصیت یہ ہے کہ اس میں اتنے دور ہوتے ہیں جتنے حروف تہجی ہیں۔ پہلے دور کے جوابات " الف " سے شروع ہوتے ہیں۔ دوسرے دور کے " ب " سے اسی طرح بعد کے ادوار حروف تہجی کے مطابق یکے بعد دیگرے آتے رہتے ہیں۔ جب کوئی طالب علم صحیح جواب نہیں دے سکتا تو وہ ہار جاتا ہے۔

شاہ حسین حقیقت نے اس کھیل " صنم آمد " کی مناسبت سے یہ کتاب لکھی ہے اس میں " الف " سے " یا " تک باب ہیں۔ ہر باب میں کھیل کی مناسبت سے جوابات دیئے گئے ہیں۔ حقیقت نے اس میں یہ بھی اضافہ کیا ہے کہ اشعار، امثال اور پہیلیوں وغیرہ کے بارے میں بھی سوالات قائم کئے ہیں۔ اشعار کے ضمن میں یہ التزام رکھا ہے کہ ایک عربی، ایک فارسی کا شعر درج کیا جائے۔ اور ایک یا دو اردو کے ہوں اور پھر ایک یا دو ہندی کے

امثال اور پہیلیوں کے تحت بھی یہ خصوصیت قائم رکھی ہے۔اور عربی، فارسی، ازدو، اور ہندی کی امثال دی ہیں۔

اس قسم کی کتاب میں ضروری ہے کہ بہت سے مشکل الفاظ بھی استعمال کئے جائیں تاکہ طلبہ کے ذخیرۂ الفاظ میں اضافہ ہو۔حقیقت نے ایسے تمام مشکل الفاظ کے معانی حواشی میں دیئے ہیں اور عربی اشعار کا فارسی میں ترجمہ بھی دیا ہے۔

اس کتاب کی حیثیت تعلیمی ہے۔اس کے مطالعے سے عربی، فارسی، ہندی اور اردو کی استعداد میں اضافہ ہو سکتا ہے۔اس کی ادبی حیثیت یہ ہے کہ مصنف نے اس میں بہت سے اچھے اشعار جمع کر دیئے ہیں۔

صنم کدۂ چین سے ایک مثال ملاحظہ ہو۔

"صنم آمد از کجا ؟"

"از آذر بائیجان ."

"کجا می رود ؟"

"بہ اصفہان ."

"ہر چہ سوار است ؟"

"اسپ."

"اسپ چہ پوشیدہ است ؟"

"اچکن ، اطلس."

"در دست چہ دارد ؟"

"انگشتری ."

"چہ می خورد ؟"

"آش انگور اندرسی ۔"

"چہ می نوشد ؟"

"آب ۔"

چہ می سراہے ؟"

" ادج ایمن ۔"

ہر اسم، شعر، رنجیتہ، دوہا، کبت، مثل، چیستاں اور پہیلی کا پہلا حرف الف سے شروع ہوتا ہے۔ پوری کتاب میں یہ التزام ملحوظ رکھا گیا ہے۔ اس سلسلے میں چند مثالیں پیش کی جاتی ہیں۔ اس میں سب سے پہلے عربی شعر دیا گیا ہے۔ جو الف سے شروع ہوتا ہے۔ پھر اس کے ہم معنی فارسی، رنجیتہ، دوہرہ، کبت وغیرہ دیئے گئے ہیں۔

(عربی) اَنَ لم امت یوم الوداع تاسفاً"

لاتحسبانی المودّۃ مصنفاً" !

(فارسی) ادسخن از کشش من میکنید

نہ من بمیس خوش رسخن میکنید

(رنجیتہ) اس طرف وہ ہاتھ سے دامن چھڑا جانے لگا

اس طرف چاک گریباں ہاتھ پھیلانے لگا (رقتؔ)

(دوہرہ) انگ انگ پرت بینہ پر ورپن سے سب کات

دوہری تہیری جوہری پھوکن جانی جات

(کبت) آدت ہو پھر مون رہی نیت ایسے کھچائیں ناوک میں نہ پہنی نہ ادتر دیسکی جبتک

جب تک پوچھت ہی لاگ گھائیں۔ ہیں کہیو کسو کچھو بول جہہ کی پاڑں پری
اور سوسنہ دوائیں نہ لوٹ پری راگ تیں آنسو آنکھ کھولت ہی پنچورہ کی نائیں

کدام مثل ہم ۔ دارد ؟ آری

عربی :۔ ا: اجأ القفأ البصر (پارسی)

فارسی :۔ آمدن بارادت رفتن باجازت

ہندی :۔ ان نینن کا یہی لبیکھ۔ وہ بھی دیکھا یہ بھی دیکھ

اس کتاب کا ایک پہلو تو یہ ہی ہے کہ حقیقت نے اس میں لاتعداد خوبصورت اور
چھے ، اردو ، فارسی ، عربی اور ہندی اشعار یکجا کر دیئے ہیں۔ اردو کے علاوہ فارسی
عربی ، ہندی کے جو اشعار دیئے گئے ہیں یا ان زبانوں کی ضرب الامثال جہاں جہاں
پیش کی گئی ہیں۔

حقیقت نے ان کا اردو ترجمہ بھی ساتھ پیش کر دیا ہے۔ اور مزید تشریحات
حواشی میں دے دی ہیں جس سے کتاب کی افادیت میں اضافہ ہو گیا ہے۔

تحفۃ العجم

حسین شاہ حقیقت کی فارسی تالیف ہے جس میں فارسی زبان کے قواعد اور رموز و نکات پر بڑی نادر بحثیں کی گئی ہیں۔ برصغیر پاک و ہند کے مختلف کتب خانوں میں اس کے نسخے دستیاب ہیں۔ انجمن ترقی اردو پاکستان، کراچی کے کتب خانہ خاص میں اس کے نسخے موجود ہیں یہ سب خط شکستہ میں لکھے گئے ہیں۔

حقیقت نے تحفۃ العجم نواب سعادت علی خان کے تخت پہ بیٹھنے کے بعد تالیف کی چناں چہ اس کا تذکرہ خود دیباچہ میں کیا گیا ہے اور اس کے مطابق اس کی سنہ تالیف ۱۲۱۲ھ ہجری ہے۔ اور کل تین ماہ کی مدت میں اختتام کو پہنچی۔ آغاز کتاب میں حمد و نعت کے بعد یہ عبارت درج ہے:

"... بعدی گوید بندہ سراسر گنہگار رامی برحمت رب غفار جامع این عبارات سیدہ حسین شاہ المتخلص بہ حقیقت عفی اللہ تعالیٰ عن سیاتہ وضاعف ثواب حسناتہ کہ ازمدت مذکور خاطر نیاز ماثرہ بود کہ نسخہ مفید درغایت ایضاح ونہایت اختصار در قواعد فارسی کہ بہترین السنہ است با فوایدد یگر ہمچوں کہ مبتدیان را بکار آید ومنتہیان را ضیافت طبع نماید تالیف کردہ یادگارے در روزگار ناپایدار گزاردوالحق بیت یادگاری کز آدمی زاد است سخن است ودگر ہمہ باد است. للہ الحمد والمنہ کہ شاہد این تمنا در ایام بشاشت التیام یعنی بعد از مرافقت لکھنؤ کہ عبارت از عزل نواب وزیر علی خان و نصب نواب

سعادت علی خان روز یکشنبہ بتاریخ بست و ہفتم شوال المکرم سنہ یکہزار و دوصد و دوازدہ ہجریہ نبویہ
شروع آراستگی نمودہ در عرصہ سہ ماہ سلخ محرم الحرام سنہ سیعدہ بہ زیور اختتام وحلیہ انصرام نقشگیرد
صورت پذیر شدہ با اللہ التوفیق ۔

ہم مباحث :

تقسیم کلام، نظم ونثر و بیان، اقسام کلمہ، حروف کا تفرقہ۔ ان لفظوں کا بیان جن سے کلام میں حسن
ورفصاحت پیدا ہوتی ہے۔ اسما و افعال، منقوطہ وغیر منقوطہ کی بحثیں۔ مضارع کی بحث۔ اسمائے
مرکبہ۔ اقسام جملہ۔ تلفظ کی بحث۔ منفصلات اور مباحث کی بحث۔

ان بحثوں اور قواعد کی افادیت کے علاوہ 'تحفۃ العجم' میں اور بھی بہت سی مفید بحثیں ہیں۔ اکثر
شہروں کے نئے پرانے نام اور ان کی وجہ تسمیہ بیان کی گئی ہیں۔ جیسے "نہاوند" کے متعلق لکھا ہے کہ اصل میں
آغاز میں "نوح آوند" تھا جو نوحؑ یا ان کی قوم کے کچھ لوگوں نے آباد کیا تھا۔ جو بعد میں نہاوند ہو گیا
وغیرہ وغیرہ۔

سند میں ہندی شاعروں کے اشعار بھی پیش کیے گئے ہیں اور ساتھ شاعروں کے نام بھی درج
ہیں اسی طرح بعض ایسے شاعر بھی نظر آتے ہیں جو تراجم تذکروں میں موجود نہیں یا اگر موجود ہیں
تو شاذ کا حکم رکھتے ہیں[1]۔

---

[1] یہاں تحفۃ العجم کا اجمالی تعارف مقصود تھا اسی لیے تفصیلی بحث نہیں کی گئی اور اس لیے بھی کہ میرے چھوٹے
بھائی سید سعید احمد اس کی ترتیب و تدوین میں مصروف ہیں۔ کئی نسخے رکھ کر متن تیار کیا ہے۔ تعلیقات و
حواشی اور قواعد و بیان کی دوسری کتابوں کے تقابل کا کام باقی ہے۔

دیوانِ حقیقت

شاہ حسین حقیقت ممتاز شعرا میں سے تھے۔ ان کا دیوان کبھی شائع نہ ہوسکا۔ ا
کے کلام کا ایک مجموعہ، جو غالباً دیوان کا انتخاب ہے، قلمی صورت میں انجمن ترقی اُردو
پاکستان، کراچی کے کتب خانہ خاص میں موجود ہے۔ اس کا کتب خانہ نمبر ق ۳ / ۱۵۶
سائز ۲۱ × ۱۵ ہے، اوراق پچاس ہیں۔ اور ہر صفحے میں گیارہ سطریں ہیں۔

یہ نسخہ مصنف کی زندگی کا معلوم ہوتا ہے۔ اس کا سنہ کتابت ۱۲۴۹ھ مطا
۴ - ۱۸۳۴ء ہے۔ یہ خط نستعلیق مائل بہ شکستہ میں لکھا ہوا ہے۔ اور اس کا کا
دبیز، چکنا اور سفید ہے۔ تمام مقطوں میں تخلص پر سرخ روشنائی سے تخلص کی علامت بنائی گئی ہے۔
عنوانات بھی سرخ ہیں۔ متن ورق ۱ ب سے شروع ہوتا ہے، اور ۵۰ الف پر ختم۔ ور
۱، الف اور ۵۰ ب سادہ ہیں:

مندرجات: ۱ - ورق ۱ ب مطلع (چھ عدد)

۲ - ورق ۲ الف تا ۲ ب مطلع غزل حافظ شیرازی (اس پر
حافظ کی مشہور غزل کے مصرعوں پر اردو کے مصرعے لگائے گئے ہیں۔ مثلاً

لانے میں اس صنم کے جاتا ہے کیا تمہارا — دل میرود ز دستم صاحبدلاں خدا ر
گر درد دل کا میرے کیجے گا کچھ نہ چارا — دردا کہ زاز پنہاں خواہد شد آشکار

۳ - ورق ۲ ب تا ۳۹ الف غزلیات (تعداد اشعار ۴۳۷)
۴ - ورق ۳ الف تا ۴۱ ب مخمسات (مخمس دو ہیں - پہلا جرأت کی غزل پر جس کا مطلع یہ ہے ؎

کل جو بیٹھا پاس میں یک جا تیرے ہم نام کے
رہ گیا بس نام سنتے ہی کلیجہ تھام کے

دوسرا قبس کی غزل پر ہے جس کا مطلع یہ ہے ؎

دل سے مطلب نہ کام جی سے ہے
مدّعا یار کی خوشی سے ہے

یہ حقیقت کا مکمل دیوان نہیں ہے - اور نہ ان کا اپنا مرتبہ انتخاب معلوم ہوتا ہے، بلکہ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ کسی اور نے ان کے دیوان کا انتخاب کیا ہے - اس کا سبب یہ ہے کہ ن اوری کی ردیفوں کے سوا تمام ردیفوں میں ایک ایک دو دو غزلیں ہیں - ردیف الف میں ایک بھی مکمل غزل نہیں ہے - تذکروں میں حقیقت کے جو اشعار ملتے ہیں وہ اس دیوان میں نہیں ہیں - مثلاً خم خانہ جاوید (دوم ص ۲-۴۹۱) میں جو آٹھ اشعار ہیں وہ دیوان میں موجود نہیں ہیں - اس کے علاوہ سخن شعراء، تذکرہ ہندی، اور سراپا سخن میں مندرج حقیقت کے بہت سے اشعار اس دیوان میں موجود نہیں ہیں

حقیقت کی شاعری دبستان لکھنؤ کی روایتی شاعری سے الگ نہیں ہے - البتہ شاعرانہ صنعتوں کے استعمال کا وہ شوق ان کی شاعری میں کارفرما نظر نہیں آتا جس نے لکھنوی شاعری کے معتدبہ حصّے کو چیستان بنا کر رکھ دیا ہے اور شاعری کی

اصل روح، لطافت، علوئے تخیل اور اثر آفرینی کی خوبیاں اس لفظی بازی گر کے سبب رخصت ہوگئیں۔

جس طرح حقیقت کی مثنویوں میں ان کا خاص انداز نظر آتا ہے۔ اسی طرح غزل گوئی میں بھی وہ بڑی حد تک منفرد نظر آتے ہیں۔ انھیں کوئی بڑا اور عہد آفریں شاعر تو نہیں کہا جا سکتا۔ وہ اپنے استاد جرأت کے مقابلے میں بھی کم درجے کے شاعر نظر آتے ہیں۔ جرات کی شاعری کو چولما چپائی کی شاعری کہا جاتا ہے۔ اور اس میں جنسی ہیجان اور لذت پرستی کی کیفیت ملتی ہے۔ حقیقت کے ہاں یہ کیفیت ناپید ہے۔ جرات کی شاعری کی ایک بڑی خوبی ان کی زبان کی سلاست اور روانی و صفائی ہے۔ حقیقت اس معاملے میں کسی حد تک اپنے استاد کی کامیاب پیروی کرتے نظر آتے ہیں۔

لکھنوی زندگی کے تہذیبی اور مجلسی اثرات کی کارفرمائی حقیقت کی شاعری میں نظر نہیں آتی۔ اس کا سبب ایک تو یہ ہے کہ ان کی زندگی کا بڑا حصہ لکھنؤ سے باہر گزرا دوسرے ان کی طبیعت کے ثقہ پن یا ان کے اندر پنہاں سید زادے نے انھیں اظہار عشق کے اس انداز سے روکا ہے۔ میر تقی میر کی طرح وہ کوچہ عشق کی رسوائیوں کو مول لینے کے لیے آمادہ نظر نہیں آتے۔ جس سے دل کی وہ آگ جنم لیتی ہے جو میر جیسے شاعروں کی شخصیت کو آب و تاب بخشتی ہے حقیقت کی شاعری میں ہمیں ان کی شخصیت دولخت نظر آتی ہے۔ ان کے ہاں عشق میں رہ و رسم دنیا کی پاسداری زیادہ نظر آتی ہے۔ اور عشق کے اظہار میں ان کے اندر پنہاں "معزز فرد" اس بات کی اجازت نہیں دیتا کہ عشق ان کے لیے وجہ رسوائی بن جائے اور بہت نہ سہی تو کم از کم لکھنوی معیار کی پرجوش عاشقانہ شاعری ہی تخلیق ہو سکے۔

حقیقت کے ہاں ہمیں ایسے اشعار بھی مل جاتے ہیں۔ جن میں محبوب کو رام کرنے کے

لیے تسخیر کے عملیات کا ذکر ہے۔ تعویذ گنڈوں کا تذکرہ انکے بھائی سید حسن شاہ ضبط کے ناول نشتر میں بھی پایا جاتا ہے۔ اردو شاعری میں عشاق اپنے محبوب کو رام کرنے کے لیے صرف جذبہ صادق کو کام میں لاتے ہیں۔ بظاہر حقیقت کی شاعری میں اس رجحان یا روّیے کے [illegible] ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ اس زمانے کے زوال آمادہ معاشرے میں اس نوع کے توہمات عام تھے۔

ممکن ہے حقیقت اپنے خاندانی ماحول سے متاثر ہوئے ہوں۔ ان کے خاندان میں روحانیات کا عمل دخل بہت تھا۔ اور تعویذ گنڈوں اور عملیات کے سلسلے میں اکثر لوگ ان کے اہل خاندان سے رجوع کرتے تھے۔

چند اس قسم کے اشعار ملاحظہ ہوں :

اک تو نگاہ میں اس کے ہے جادو حقیقت اور　　تسخیر کا کرے ہے عمل یک نشد دو شد

کیے کیا کیا نہ عمل ہم نے ولیکن اس کا　　اپنے دل سے نہیں ملتا کسی تدبیر سے دل

ایک پوری غزل میں تسخیر اور مختلف عملیات کا تذکرہ موجود ہے۔

عمل اب ایسا کرتے ہو جو تم میں مجھ میں بغض پڑے
گھول[1]... یا حب کے تعویذ پلائے جاتے تھے۔

اب تو ہیں رنجش کی باتیں یا میرے ہی ملنے کو آہ
نذریں مانی جاتی تھیں اور پیر منائے جاتے تھے

---

[1] کرم خوردہ۔

مرے جدا ہونے کی بابت پوچھتے ہو برہمن سے
یا ملنے کے رمّالوں سے قرعے پھنکائے جاتے تھے

مری بدی کا نقش ہے دل پہ یا تب میرے ملنے کو
لکھ لکھ کر دریاؤں میں تعویذ بہائے جاتے

حقیقت کی شاعری میں بہت کم ایسے اشعار ملتے ہیں جن میں کسی نوع کا فلسفیانہ یا فکر انگیز خیال بیان کیا گیا ہو۔ حال خال ایسے اشعار مل جاتے ہیں لیکن ان میں بہت زیادہ فلسفیانہ گہرائی نہیں پائی جاتی۔

عدم میں میں سوتا تھا آرام سے عبث زندگی نے جگایا مجھے

حقیقت کی شاعری میں بعض ایسے اشعار بھی ملتے ہیں جو دامن کشِ دل ہوتے ہیں :

نخل تن سرو چراغاں کی طرح جلتا ہے نہ لگا کوئی ثمر آہ شجر میں میرے

ٹک دکھا اے مہ وش بکھڑا کہ تیرے ہجر میں تعب گریہ سے ہے تر دامانِ چشم آئینہ

چمن دل کی مرے تو بھی تو کر سیر فدا روز یک رنگ کا یاں پھول کھلا رہتا ہے

"رقیب" اردو شاعری کا ایک ایسا کردار ہے جسے ہمارے شاعروں نے ہر ممکن تضحیک و تحقیر کا ہدف بنایا ہے۔ حقیقت بھی اپنے رقیب کو "کمینہ" کہہ کر دل کی بھڑاس نکالتے ہیں

دیکھ محفل میں اپنی تم صاحب نہ بلاؤ ہر اک کمینے کو

دراصل رقیب کا خوف، عاشق میں خود اعتمادی کی کمی کا مظہر ہے۔ ورنہ جن کے ہاں عشق کی جڑیں زیادہ

گہری ہیں ان کے انداز میں رقیب کے حوالے سے انسان دوستی کا جذبہ پیدا ہو گیا ہے۔ مومن کہتا ہے

سامنے اس کے نہ کہتے مگر اب کہتے ہیں ۔ لذت عشق گئی غیر کے سرہانے سے

ہماری جدید شاعری میں تو رقیب کے لیے جن جذبات کا اظہار کیا گیا ہے۔ اس میں "غم الفت کے مشترکہ احسان" کو مدنظر رکھا گیا ہے فیض کی نظم "رقیب سے" کا موضوع سب پر عیاں ہے محبوب کے حوالے سے ہر چیز سے محبت کا اظہار جس میں خود رقیب بھی شامل ہے، احمد ندیم قاسمی کے اس شعر میں ملاحظہ ہو ؎

میرا دشمن بھی مرے پیار کا حقدار بنا ۔ تجھ سے کی ہے کہ زمانے سے محبت میں نے

غالب محبوب کی محفل میں رقیب کے آنے سے ناخوش ہے مگر ایک خاص سطح پہ رہتے ہوئے کہتا ہے ؎

تم جانو تم کو غیر سے جو رسم و راہ ہو ۔ مجھ کو بھی پوچھتے رہو تو کیا گناہ ہو

اسی مفہوم کا شعر محشر بدایونی کے ہاں بھی ملتا ہے ؎

جیسے ہم آتے ہیں محفل میں سبھی آیا کریں ۔ لیکن اے جان کرم جب ہم چلے جایا کریں

فن اور بالخصوص فن شاعری اور ادبیات میں یہ دیکھا جاتا ہے کہ فنکار اپنی بات کو کس پیرائے میں بیان کرتا ہے یہی بات اس کا فن کارانہ درجہ متعین کرتی ہے حقیقت کے ہاں بات بیان کرنے کا بہت خوب صورت انداز کمیاب نہیں۔ ان کا ایک شعر ملاحظہ ہو ؎

تو جو عشاق پہ کرتا ہے جفا اے کافر ۔ کچھ خدا کا بھی تجھے خوف خطر ہے کہ نہیں

خواجہ میر درد کے ہاں اسی مضمون کا شعر اپنی سادگی اور بے ساختگی کی بنا پہ ایک جداگانہ اثر آفرینی کا حامل ہے ؎

کتنے بندوں کو جان سے کھویا ۔ کچھ خدا کا بھی تو نے ڈر نہ کیا

شاعروں نے اس مضمون کو اکثر باندھا ہے کہ وصل کی شب میں بھی ہجر کا خیال، لذت وصل کو متاثر کرتا ہے۔ حقیقت کے ہاں اس خیال کو اس انداز میں باندھا گیا ہے ۔ ؎

ہجر میں تو وصل کا رہتا ہے مجھکو دھیان آہ　　وصل ہوتا ہے تو صدمہ ہجر کا یاد آئے ہے

حقیقت کا ایک اور شعر ہے ؎

عجب وقت پہ اس کا آنا ہوا ہے
کہ جی تن سے جس دم روانہ ہوا ہے

اسی خیال کو ایک اور شاعر نے اس طرح بیان کیا ہے :

مند گئیں کھولتے ہی کھولتے آنکھیں ہے ہے
یار لائے مرے بالیں پہ اسے پر کس وقت

حقیقت کے ہاں بعض غزلیں سہل ممتنع کی اچھی مثال ہیں ؎

دن کو نالہ ہے شب کو زاری ہے　　روز و شب ہم کو بے قراری ہے
بات کرنی جو ترک کی ہم سے　　کہیے تقصیر کیا ہماری ہے
اور کچھ ذکر خوش نہیں آتا　　نام تیرا زباں پہ جاری ہے
رات بھر خواب کا خیال کہاں　　چشم تر ہے اور اشک باری ہے

حقیقت کے دیوان کے مطالعے سے اندازہ ہوتا ہے کہ وہ کسی شوخ بنگالی محبوب سے بھی تعلق خاطر رکھتے تھے ؎

اے حقیقت گر طلب کرتا ہوں بوسہ اس سے میں
کیا مزے سے دے ہے گالی شوخ بنگالی مجھے

ان کے دیوان سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ وہ مدراس کی کسی طوائف زینت بائی پر بھی

عاشق تھے۔ ان کے دیوان میں کئی جگہ مختلف غزلوں میں ایسے اشعار ملتے ہیں۔ مثلاً

حقیقت کیا کہیں ہم اور اپنی
بہ دل ہیں تجھ پہ زینت جان عاشق

انھوں نے ایک غزل نما نظم بھی زینت بائی کے نام لکھی تھی۔ شاعرانہ محاسن کے علاوہ اسکی ایک خصوصیت یہ بھی ہے کہ اسے اردو کی پہلی عشقیہ نظم قرار دیا جا سکتا ہے۔ نظم ملاحظہ ہو:

در توصیف رقص زینت بائی

یارا بزم میں گر آکے وہ زینت ناچے
رقص میں آئے فلک زہرہ وہیں گت ناچے

آکے رقصندہ و بخشندۂ راحت ہو جہاں
ہو خجل پھر تو نہ واں بخشی و راحت ناچے

گانے اور باجنے والی جو ہیں سب پکڑیں کان
کا لڑا گا کے جو وہ کان صباحت ناچے

مشتری زہرا و خور اوسکے ہوں اونھیں بخدا
وہ بت ماہ جبیں جب کہ بہ شوکت ناچے

ہو نہ شرفو کو شرف گھسٹی گھسٹی ہی پھرے
مونہہ ہے کیا روبرو آ اوس کے جو صورت ناچے

ہاتھ اٹھاویں وہیں جینے سے قیامت ہو بپا
ہاتھ اٹھا سر پہ جو وہ خوش قد و قامت ناچے

پائے کوباں نکل آوے سبھی اور دست فشاں
گر وہ عشاق کے آ بہ سر تُربت ناچے

شکر و مصری و میٹھا کا ہونا پھیکا
بے نمک ہو جو حضور اوس کے ملاحت ناچے

دیکھے اوس بت کو جو رقصاں تو وہیں وجد میں آ
پیر اور شیخ بہ ایں فضل و مشیخیت ناچے

ناچ عشاق کو جو جو وہ نچاوے ہے بجا
جو بایں شوخی و شنگی و شرارت ناچے

ہو کے جنگل کو نکل جائے دیوانے جنگلو
گا کے جنگلا وہ پری چہرہ اگر گت ناچے

جس کی رفتار ہی سے ہو تہ و بالا عالم
ہو قیامت جو وہ ٹک خوش قد و قامت ناچے

منہ ہٹا کیوں کہ نہ اندر کی سمجھا ہو روپوش
جب وہ سنگیت لیے سات کی سنگت ناچے

جان دل جانے کی کیا تاک ہے کیا ....
سامنے اس کے اجی کس کی ہے قدرت ناچے

ناچنے گانے کا لونی فاک چھیڑے خیال
ایک دو ٹپے ہی گر گا کے وہ دھرپت ناچے

واں کی کچھ اور ہی بس زینت و زیبائش ہو
فی الحقیقت ہے جہاں آن کے زینت ناچے

اوس سی سر پہ ہو جو یہ کوڑ تو مجرا میں کہوں
ناچ کر زہرہ اٹھا دے گی خجالت ناچے

ناچ آتا نہیں آنگن کو کہے ہے ٹیڑھا
اس سے بہتر ہے یہی کر کے نہ سبقت ناچے

وجد میں کیوں کہ نہ آ جاوے وہ بے خود ہو کر
جبکہ زینت سی صنم پیش حقیقت ناچے

انتخاب اشعار :

ثابت اب جوش جنوں سے کب ہے پیراہن مرا
رفتہ رفتہ کر دیا وحشت نے عریاں تن مرا

یہ تو فرما دو کہ ہوں ایسا میں کیا بد نظر ا
دیکھ مجھ کو جو چھپاتے ہو بدن غمال سے خوب

دل کو میرے کیا جا کے خراب
سوزش عشق کا ہو خانہ خراب

اور ہی کچھ حقیقت آئی نظر
کھولی جب آنکھ ہم نے مثل حباب

دور میں اس کے جو ہے عشق کا آزار بہت
ہر گلی کوچے نظر آتے ہیں بیمار بہت

ناصحا سایہ طوبی کی نہ دے تو ترغیب
ہے مجھے یار کا ہی سایہ دیوار بہت

کچھ نہ کچھ چوٹ لگی دل کو بھی اس کے شاید
درد کے جیسے وہ اب سنتا ہے اشعار بہت

تصویر وہ بھی پہروں رکھتا نظر کے آگے
بہزاد کھینچتا گر اس بے وفا کی صورت

تیرے بن اترے مرے حلق سے یوں آبحیات
بصد اکراہ پیے جوں کوئی جلاب کے گھونٹ

گئی آہ کے ساتھ جان نکل یک نشد دو شد
اب ہے زبان پہ یہ مثل یک نشد دو شد

پیغام یار کا نہیں آتا تھا تسپہ آہ
آیا ہمیں پیام اجل یک نشد دو شد

گر حسن صبر لے کے چلا ہے تو میری جان
دل کو بھی رکھ لے زیر بغل یک نشد دو شد

اک تو نگاہ میں اس کے ہے جادو حقیقت اور
تسخیر کا کرے ہے عمل یک نشد دو شد

نکلے گا آفتاب تو اے ماہ جا یو
گھبرا کے ایسے وقت سحر تم چلے کدھر

سمجھو نہ گرد باد کہ یہ خاک قیس ہے
رقصاں صدائے ناقۂ لیلیٰ ہے رنگ پر

فلک نے جور و ستم درد و غم دکھایا پھر
یہ اس کمینے نے دیکھو کہ سر اٹھایا پھر

جو کشور دل وصل سے آباد تھا دن رات
اوس بن نظر آتا ہے وہ برباد شب و روز

جو شخص گرفتار محبت ہے حقیقت
دُنیا کے غموں سے ہے وہ آزاد شب و روز

ٹکڑے جو گریبان کیا گُل نے کہا بس
رویا جو غم عشق میں بُلبُل نے کہا بس

سب دل سے بھلا دیتے ولے عشق بُتاں آہ
ہم سے نہیں ہوتا کسی عنوان فراموش

میں جس کے ہاتھ اسے بھیجتا ہوں نامۂ شوق
وہ لے کے پر نہیں جاتا مرا نامہ بر خط

اب حقیقت کے جو ہے اک صاحب جرات سے عشق
شعر کا چرچا ہے اوس کے گھر کے گھر چاروں طرف

نہ کیوں کر تجھ پہ وارے جان عاشق
اسی لائق ہے تو قربان معاشق

قیامت کرتے ہیں گے حشر برپا
تری قامت کا کر کر دھیان عاشق

حقیقت کیا کہیں ہم اور اپنی
بدل ہیں تجھ پہ زینت جان عاشق

تمہاری یاد میں ہے رات دن ہمارا دل
ہمیں بھی یاد کرے ہے کبھی تمہارا دل

آپ اُٹھ جاؤ کہو غیر سے تم اس کو بٹھاؤ
خوش نہیں ہونے کا اس آپ کی تدبیر سے دل

ہم کو میخانے میں ہے ساقیٔ گل فام سے کام
نہ غرض بادہ سے : مینا سے نہ کچھ جام سے کام

نہیں ہے تجھ سا کوئی آج گل عذاروں میں
خدا گواہ ہے تو ایک ہے ہزاروں میں

غم یار میں اشک گر ہم بہا دیں
تو یکدم میں دونوں جہاں کو ڈبا دیں

تصور تیرا جان جاتا نہیں
ترے بن کوئی یاد آتا نہیں

پھرے ہے تری شکل آنکھوں تلے
تصور ذرا تیرا جاتا نہیں

کونسی ہے وہ سحر جس کے تئیں شام نہیں
پر شب ہجر کے آغاز کا انجام نہیں

اوس کا خط لایا ہے قاصد پہ کروں جان نثار
اور اس کام کے لائق کوئی انعام نہیں

وہ اپنے گھر میں بیکل ہم مضطر اپنے گھر میں
اب وہ بلانے والے کیا جانیے کدھر ہیں

گر موسم گل آیا تو کیا کریں صبا ہم
مژدہ یہ دے تو اون کو رکھتے جو بال و پہ ہیں

برنگ موج دریا اضطراب دل کے مارے آب .
چلے جاتے ہیں کیا جانے کدھر ہم بے قراری میں

حقیقت اب بقول استاد جرات اور کیا کہیے
کہ سب کچھ ہم بھلا بیٹھے کسی کی یادگاری میں

کس کے ہیں انتظار میں آنکھیں
جو کھلیں ہیں مزار میں آنکھیں

جو صورتیں تمھاری آنکھوں میں بستیاں ہیں
دیدار کو انھوں کے آنکھیں ترستیاں ہیں

خاک ہو جاوے تو جاہل سے نہ چھوٹے اس کا جل
گو کہ جل جاتی ہے رسّی پہ کہیں بل جائے ہے

ہجر میں تو وصل کا رہتا ہے مجھ کو دھیان آہ
وصل ہوتا ہے تو صدمہ ہجر کا یاد آئے ہے

کچھ حقیقت کو جو یاد آتا ہے جرات کی طرح
بس وہیں دو دو پہر ہچکی سی کچھ لگ جائے ہے

صورت اس کی مجھے ہر شکل سے دکھلائے کوئی
مجھ کو لے جائے کوئی یا اوسے لے آئے کوئی

سب سے بیگانہ ہوا میں تری خاطر پیارے
مجھ سا جب ہو لے تو عاشق تیرا کہلائے کوئی

اک غزل اور بھی حقیقت پڑھ — دیکھیں مضمون کیا تو لاتا ہے

آکے نزع میں بالیں پہ وہ ذرا پھر جائے — تو جی اُٹھوں مری آئی ہوئی قضا پھر جائے

کھینچے ہوئے ہے تیغ نگہہ ترک چشم نازؔ — اب جنس دل کا اس سے بچانا محال ہے

بات کرنی جو ترک کی ہم سے — کہیے تقصیر کیا ہماری ہے

رات بھر خواب کا خیال کہاں — چشم تر ہے اور اشک باری ہے

حقیقت میں ہے اور عاشق کا مذہب — نہ یہ رافضی ہے نہ یہ چار یاری

ی مرے تن سے نکل جائے تو ہے مجھ کو قبول — آہ پر دل سے نہ اوس تیر کا پیکان نکلے

نئے معشوق میں برگشتہ ہوں عاشق اون سے — شہر میں سیر کو جب وہ مہ خوباں نکلے

نیخ مت سایہ طوبیٰ کی مجھے دے ترغیب — یار کا سایہ دیوار ہے درکار مجھے

اپنے کھینچا ہی کرتا اوس کے ملنے کے سدا — گر سکھا دیتا کوئی تھوڑی سی رسّالی مجھے

اے حقیقت گر طلب کرتا ہوں بوسہ اوس سے میں
کیا مزے سے دے ہے گالی شوخ بنگالی مجھے

تذکرۂ احبّا

شاہ حسین حقیقت نے اس زمانے کی روش کے مطابق اردو شاعروں کا ایک تذکرہ بھی ترتیب دیا تھا۔ بعض لوگوں کو شاید خیال ہو کہ یہ تذکرہ وہی ہوگا جس کا ذکر مصحفی نے کیا ہے اور حقیقت کو اپنے تذکرے کا چور کہا ہے۔ ہم حقیقت کے حالات زندگی میں یہ دلائل بیان کر آئے ہیں کہ انہوں نے مصحفی کے تذکرے کی نقل شیخ امام بخش کشمیری کی فرمائش پہ تیار کی تھی۔ اور حقیقت کی عمر اس وقت سترہ برس سے زائد نہ تھی۔

تذکرۂ احبا کو مصحفی کے تذکرے کا چربہ نہیں قرار دیا جا سکتا جیسا کہ عام طور پہ مشہور ہو گیا ہے۔ بلکہ یہ ایک جداگانہ تذکرہ ہے۔ حقیقت جیسے صاحب علم اور کثیر التعداد مصنف پہ کسی تذکرے کے چربے کا الزام لگانا درست معلوم نہیں ہوتا۔

لیکن اس وقت تذکرۂ احبا کا کوئی قلمی نسخہ موجود نہیں ہے جس سے بظاہر اس کا وجود ثابت کرنا مشکل معلوم ہوتا ہے۔ البتہ مختلف تذکروں میں اس کے حوالے ملتے ہیں۔ چنانچہ محسن لکھنوی نے اپنے تذکرے سراپا سخن میں اس کا کئی مقامات پہ تذکرہ کیا ہے۔

خوش معرکۂ زیبا میں سعادت خاں ناصر نے بھی لکھا ہے کہ اس نے تذکرہ احبا سے استفادہ کیا ہے۔ اس کے علاوہ عبداللہ ضیغم کے تذکرے یادگار ضیغم کے قلمی نسخے مملوکہ ادارۂ ادبیات اردو حیدرآباد دکن میں بھی تذکرۂ احبا کا حوالہ ملتا ہے جس سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ اس صدی کے اوائل تک یہ تذکرہ موجود تھا۔

شاہ حسن ضبط

حالاتِ زندگی شاہ حسن ضبط، شاہ حسین حقیقت کے بڑے بھائی تھے۔ ضبط آنولہ بریلی میں ۱۱۸۴ ہجری مطابق ۷۰-۱۷۷۱ سنہ عیسوی میں پیدا ہوئے۔ حقیقت نے ان تصانیف میں اپنے اہلِ خاندان کے بارے میں نہایت مختصر اشارات کئے ہیں۔ یہ ضبط کا نادل نشتری ہے جس سے ضبط اور حقیقت دونوں بھائیوں کے اجداد کے حالات اور ترکستان سے ہندوستان میں آمد اور پھر مختلف اضلاع ہندوستان میں قیام کرتے ہوئے مستقلاً آنولہ بریلی اور لکھنؤ میں قیام پذیر ہونے تک حالات ملتے ہیں۔

ضبط کے نانا آنولہ بریلی کے ایک مشہور اور باعزت آدمی تھے۔ جو کسی زمانے میں حافظ رحمت خاں کے لڑکے کی سرکار سے بھی وابستہ رہ چکے تھے۔ اور بعد میں منگ نامی ایک انگریز سے وابستہ ہوئے تھے۔ انھوں نے ہی ان دونوں بھائیوں کی پرورش اور تعلیم و تربیت کی تھی۔

شاہ حسن ضبط لکھتے ہیں۔

"بعد خرابی و تباہی حکومت ہندوستان، میرے نانا صاحب، مسٹر منگ صاحب ممبر کونسل کیمپ کانپور کی سرکار میں جو ہمیشہ زادہ جنرل کوٹ کے تھے اور

۱۔ شاہ حسین حقیقت کے حالات زندگی، خاندان، پیدائش، ترکِ وطن اور ہندوستان کے مختلف اضلاع میں ان کے خاندان کے قیام کے بارے میں تفصیلی طور پر تذکرہ آچکا ہے لہذا یہاں صرف وہی حالات پیش کئے جا رہے ہیں جن کا تعلق براہِ راست شاہ حسن ضبط کی نجی زندگی سے ہے۔

یہ جنرل صاحب ایک عالی مرتبت انگریز تھے۔ عہدہ منشی گری پر مامور ہوئے۔"

ضبط کے بیان سے یہ نتیجہ برآمد ہوتا ہے کہ مسٹر منگ، ان کے نانا سے پڑھتا تھا! کیا پڑھتا تھا اس کی وضاحت، انھوں نے نہیں کی صرف اتنا لکھا ہے کہ کلکتہ کے سفر سے واپسی کے بعد اس نے ضبط کے نانا سے پڑھنا چھوڑ دیا تھا۔ چونکہ اس زمانے میں ایسٹ انڈیا کمپنی کے تمام اہلکاروں کے لئے مقامی زبانیں سیکھنا لازمی تھیں اور صاحب استطاعت اور بڑے درجے کے انگریز یہ زبانیں سیکھنے کے لئے استادوں کو ذاتی ملازم کی حیثیت سے رکھ لیتے تھے۔ لہذا قیاس یہی کہتا ہے کہ ضبط کے نانا، منگ کو ہندوستانی اور فارسی زبانوں کی تعلیم دیتے ہوں گے۔

منگ کو جب اپنی سرکاری اور نجی مصروفیات کی بناء پر ذاتی تجارتی کاموں کی طرف توجہ دینے میں مشکلات ہوئیں تو اس نے حکیم میر محمد نواز کو اپنے کاروبار کی نگرانی کی خدمت بھی سونپنا چاہی لیکن انھوں نے اس نئی خدمت سے معذوری کا اظہار کیا۔ اور اس سلسلے میں اپنے نواسے شاہ حسن ضبط کا نام تجویز کیا۔ منگ نے حکیم صاحب موصوف کی اس تجویز سے اتفاق کرتے ہوئے شاہ حسن ضبط کو اپنے کاروبار کی نگرانی کے لئے ملازم رکھ لیا۔ ضبط لکھتے ہیں کہ "اس وقت میری عمر پندرہ سولہ برس تھی[1]۔ گویا شاہ حسن ضبط نے ۱۷۸۵ سنہ عیسوی کے لگ بھگ یہ ملازمت اختیار کی۔

ضبط کے بیان سے اندازہ ہوتا ہے کہ منگ کے ہاں زمانۂ ملازمت کے دوران انھیں کبھی تنگدستی سے سابقہ نہیں پڑا اور وہ ہمیشہ خوشحال رہے۔ معاشی معاملات میں منگ نے انھیں سیاہ و سفید کا مالک بنا رکھا تھا۔ عموماً آقاؤں کی نظر میں ان کے جو ملازمین اپنا اعتبار جما لیتے ہیں۔ انھیں دوسرے ملازمین کے حسد اور شکوہ، شکایتوں کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ چنانچہ منگ

۱۔ نشتر ص ۹ ترجمہ انجم حسین کمنڈوی مرتبہ عشرت رحمانی مطبوعہ مجلس ترقی ادب لاہور (۲) نشتر ص ۹

کے دیگر ملازمین بھی شاہ حسن ضبط کے مقام و مرتبے اور منگ کے مزاج میں ان کے دخیل ہونے کو ناپسندیدگی کی نظر سے دیکھتے تھے۔ لیکن منگ کو ان پر کلی اعتماد تھا۔ اور وہ اپنے منشی ضبط کے خلاف کسی کی لگائی بجھائی پر یقین نہیں کرتا تھا۔

دیکھنے میں آیا ہے کہ لوگ عورتوں کے بہکانے میں جلد آجاتے ہیں۔ لیکن منگ اس سلسلے میں بھی کانوں کا کچا نہیں تھا۔ چنانچہ ضبط نے منگ کی ایک ہندوستانی داشتہ کا واقعہ اپنے ناول کے دیباچے میں لکھا ہے جو ضبط کی دشمن تھی اور اس کو منشی گری کے عہدے سے موقوف کرا کر اپنے بھائی کو ملازم رکھوانا چاہتی تھی۔ ضبط لکھتے ہیں۔

"ایک دن اس کی داشتہ عورت نے جو ایک فرخ آبادی پٹھان کی بیٹی تھی۔ میری چغلی صاحب سے کھائی کہ تمہارا منشی سالا مال غبن کرتا ہے۔ اگر آپ کی مرضی ہو میرا بھائی جو نہایت لائق ہے۔ اس کے سپرد یہ کارخانہ کرایا جائے، جس سے بڑی کفایت ہوگی۔ صاحب نے اس کو تو کچھ جواب نہ دیا اور کمرے کے باہر آکر مجھ سے کہا کہ آج ہماری بی بی آپ کی اس طرح سفارش کرتی تھی۔ میں نے کہا" بالکل سچ کہتی ہے میں آپ کا خیر خواہ ہوں جس بات میں آپ کی کفایت اور بہبود ہو مجھے بدل و جان منظور ہے۔ اور اس کے ساتھ ہی میں نے کنجیاں صاحب کے سامنے میز پر رکھ دیں اور کہا کہ مجھے اب زیادہ آپ کے پاس رہنا منظور نہیں ہے۔ کب تک حاسدوں کا نشانہ ملامت رہوں۔" صاحب پہلے تو چپ رہا پھر فرمایا کہ اچھا اس وقت کنجیاں اپنے پاس رکھئے میں پھر لے لوں گا۔ میں خوش ہوا کہ اس بلا سے نجات ملی۔ دوسرے دن صاحب نے اس عورت کو نکلوا دیا۔ میں نے سنتے ہی صاحب سے جا کر سفارش کی۔ مگر اس نے

ہرگز قبول نہ کیا۔ تب میں نے کہا کہ "خیر اگر آپ اس کو نکالتے ہیں آپ کو اختیار ہے مگر میں بھی نہ رہوں گا۔ مجھے بھی رخصت کیجئے۔ صاحب نے کہا تم کیسی باتیں کرتے ہو۔ وہ تمھاری دشمن ہے۔ میں نے کہا ہوا کرے۔ اگر آپ مہربان ہیں تو کسی کی دشمنی ضرر نہیں پہنچا سکتی۔ ناچار صاحب نے پھر اس کو بلوالیا[1]۔"

ضبط کے حالات زندگی کا واحد ماخذ ان کا ناول نشتر ہی ہے۔ ضبط نے اس ناول کو آسان فارسی زبان میں لکھا تھا اور اس کا اصل نام "قصہ حسن و عشق" تھا۔ لیکن اردو دنیا میں یہ "نشتر" کے نام سے معروف ہوا۔ یہ نام منشی سجاد حسین انجم کسمنڈوی نے رکھا تھا۔ جو اس ناول کے مترجم بھی ہیں۔ اور جن کے پاس اس کا اصل فارسی نسخہ موجود تھا[2]۔

ضبط کے چھوٹے بھائی حقیقت نے اپنی کسی بھی تالیف میں اپنے اور اپنے آباواجداد کے حالات زیادہ تفصیل سے بیان نہیں کئے ہیں۔ چنانچہ ضبط اور حقیقت کے بارے میں سب سے زیادہ معلومات "نشتر" کے دیباچہ میں ملتی ہیں۔ لیکن افسوس کہ ضبط نے بھی اپنے اور اپنے خاندانی حالات بہت زیادہ تفصیل سے نہیں لکھے۔

نشتر کے مصنف نے اپنے جو حالات بیان کئے ہیں وہ نامکمل ہیں۔ انھوں نے بس اس قدر ہی لکھا ہے کہ منگ کی سرکار سے وابستہ ہو جانے کے بعد ان کے نانا میر محمد نواز خدمت سے سبکدوش ہو کر مستقلاً قصبہ جاج مئو میں سکونت پذیر ہو گئے تھے۔ اور خود مصنف نے اپنے آپ کو کانپور میں مقیم بتایا ہے۔ لیکن خانم جان سے عشق ہو جانے اور جدائی کے بعد، ضبط مستقل طور پر ترک ملازمت کر کے لکھنؤ آ گئے تھے۔ چنانچہ ان کے باقی ماندہ حالاتِ زندگی کو ہم اردو تذکرہ نگاروں کے بیان کردہ واقعات کی روشنی میں یوں ترتیب

۱۔ نشتر ص ۱۲ مطبوعہ مجلس ترقی ادب مرتبہ عشرت رحمانی ۱۹۶۵ء

۲۔ چونکہ شاد حسن ضبط کا ناول "قصہ حسن و عشق" کا اصل مسودہ میری نظر سے نہیں گزرا اور "نشتر" قصہ حسن و عشق کا ترجمہ ہے۔ لہٰذا اس ناول پر بحث کرتے ہوئے میں نے بعض جگہ "نشتر" کے نام کو ہی بطور متبادل کے استعمال کیا ہے۔

دے سکتے ہیں۔

خانم جان سے جدائی اور اس کی موت کے بعد حسن شاہ لکھنؤ میں آکر رہنے لگے تھے۔ یہاں انھوں نے جرأت کے سامنے زانوئے تلمذ تہہ کیا۔ اور یہیں حقیقت بھی اپنے بڑے بھائی کے توسط سے جرأت تک پہنچے اور اس کے شاگرد ہوئے۔ اس حادثۂ محبت کے بعد پھر حقیقت نے زندگی میں کوئی دلچسپی نہ لی اور ان کی کل دنیا سمٹ سمٹا کر شعر و ادب کی دلچسپی کی حد تک رہ گئی۔ یہ بے نیازی اس قدر بڑھی کہ عمر کے آخری برسوں میں ترک دنیا کر کے فقیری اختیار کر لی تھی۔ اسی اثنا میں انھوں نے اپنی آپ بیتی بھی قلم بند کی۔ تذکرہ نگاروں کے مطابق شاہ حسن ضبط ۱۸۲۴ سنہ عیسوی تک بقید حیات تھے۔ قدرت اللہ قاسم نے اپنے تذکرے میں جو ۱۲۲۱ سنہ ہجری کی تصنیف ہے انھیں ایک "باحیا" اور "صاف طبیعت" کا انسان قرار دیا ہے۔ ضبط کے حالات زندگی کے بارے میں اس سے زیادہ معلومات حاصل نہیں ہو سکیں۔

نشتر "قصۂ حسن و دل" جس کا اردو نام اس کے مترجم منشی سجاد حسین انجم کسمنڈوی نے نشتر رکھا ہے، کا سال تصنیف بقول مترجم سال تصنیف ۱۲۰۵ ہجری اور تاریخ کتابت ۱۲۶۷ ہجری ہے۔"

منشی سجاد حسین انجم کی رائے اس سلسلے میں سب سے زیادہ وقیع اور معتبر قرار دی جا سکتی ہے۔ کیونکہ ادبی دنیا سب سے پہلے انہی کے ذریعے اس ناول سے متعارف ہوئی۔ اس کتاب کا ایک قلمی نسخہ ان کے پاس تھا۔ جس سے انھوں نے اردو ترجمہ کیا۔ چنانچہ وہ لکھتے ہیں۔

"اصل کتاب سیدھی سادی فارسی ہندی آمیز زبان میں قلمی میرے

۱۔ نشتر بحوالہ سابق ص ۲

پاس موجود ہے۔"

اقتدار عالم خان اپنے مضمون میں لکھتے ہیں[1]۔ ضبط نے یہ واقعات تقریباً تیس برس کی عمر میں لکھے تھے۔ اور انھوں نے ضبط کو پیش آنے والے اس معرکہ محبت کا سنہ ۱۷۸۱ء قرار دیا ہے۔ اس طرح گویا اپنی محبت کی ناکامی کے بعد ضبط نے گویا پندرہ برس بعد اس داستان کو صفحہ قرطاس پر منتقل کیا تھا۔ اسی طرح اقتدار عالم لکھتے ہیں کہ ضبط نے ان واقعات کو ۹۱ - ۱۷۹۰ء میں قلم بند کیا۔

لیکن خود صاحب تصنیف نے لکھا ہے کہ اس پر یہ واقعات ۱۱۹۹ھ بمطابق ۸۵-۱۷۸۴ میں گزر رہے تھے اور اس داستان کے قلمی نسخے مملوکہ منشی سجاد حسین میں اس کا سال تصنیف ۱۲۰۵ ہجری لکھا ہے اور سنہ کتابت ۱۲۶۵ ہجری۔ لہٰذا یہ بلاخوف تردید کہا جا سکتا ہے کہ ضبط نے اس واقعے کو تقریباً چھ برس بعد ہی قلمبند کر دیا تھا۔ اور سال کتابت سے یہ مراد ہوگی کہ اصل قلمی نسخے کی یہ کوئی دوسری نقل ہوگی جو ۱۲۶۷ھ میں تیار کی گئی ہوگی۔

اقتدار عالم خاں نے سال تصنیف اور پیش آمدہ واقعات کا جو سال دیا ہے۔ اس سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ گویا ضبط گیارہ برس کی عمر میں محبت کے اس سانحے سے دوچار ہوئے تھے جبکہ مصنف خود لکھ رہا ہے کہ اس وقت اسی کی عمر چودہ پندرہ برس تھی۔ لہٰذا اس سلسلے میں سب سے زیادہ معتبر تو مصنف کی رائے ہے۔ اس کے بعد منشی سجاد حسین کی رائے ہے جن کے پاس ناول کا قلمی نسخہ موجود تھا۔

نقد و نظر | نشتر اٹھارویں صدی کے اواخر کا لکھا ہوا ایک آسان فارسی ہندی آمیز زبان میں لکھا ہوا قصہ ہے۔ لیکن بعض ناقدین کے

---

[1] اردو میں ناول نگاری کی ابتدا ایک نیا زاویہ نظر مطبوعہ نقوش لاہور۔ شمارہ ۱۰۳، ستمبر ۱۹۶۵ء

نزدیک اس کی قدامت اور اس کا کسی فارسی قصے سے ترجمہ مشکوک ہے۔ اور ان کی اس رائے کی بنیاد یہ ہے کہ وہ اس میں ناول نگاری کی جدید تکنیک پاتے ہیں۔ اور اس قصے کو بھی انہی ناولوں کے زیر اثر قرار دیتے ہیں جو انگریزی ناول نگاری اور ناول کے فن سے متاثر ہونے کے بعد لکھے گئے۔

چنانچہ پروفیسر اختر انصاری دہلوی اپنے مضمون میں لکھتے ہیں۔

"آخر نشتر کے بارے میں اس قسم کی قیاس آرائی کا کیا سبب ہے۔ اور ایسی کون سی ضرورت آن پڑی کہ منشی صاحب کے بیان پر شک کیا جائے۔ اور جس چیز کو وہ ترجمہ بتا رہے ہیں۔ اسے طبعزاد تخلیق ثابت کرنے میں ایڑی چوٹی کا زور لگایا جائے۔"

یہ سوال اٹھانے کے بعد وہ خود ہی آگے چل کر لکھتے ہیں۔

"ناول کے پلاٹ کی نوعیت، قصے کا ارتقاء، واقعات کا اتار چڑھاؤ، اور بہت سے ایسے ضمنی پہلو اور جزئی امور ایسے ہیں کہ ان کی بنا پر ترجمے والی بات مشکوک معلوم ہوتی ہے۔ بالفاظ دیگر ناول میں ایسی اندرونی شہادتیں موجود ہیں جن سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ یہ سچا واقعہ نہیں بلکہ افسانہ ہے۔"

"ہم نشتر پر نظر ڈالتے ہیں تو ہمیں کرداروں کے عمل اور واقعات کے بہاؤ میں افسانہ نگار کے ذہن کی کارفرمائی صاف طور پر جھلکتی نظر آتی ہے خصوصاً ناول کے آخری حصے میں واقعات جو روش اختیار کرتے ہیں اور افراد جس انداز میں المناک انجام کی طرف بڑھتے ہیں (بلکہ یوں کہنا چاہیئے ڈھکیلے جاتے ہیں) وہ

اقتباس از مضمون ناول کا آغاز اور ابتدائی نشوونما۔ مطبوعہ رسالہ نقوش لاہور۔ شمارہ ۱۰۳، ستمبر ۱۹۶۵ء

صریحی طور پر افسانوی آرٹ کا مظاہرہ ہے۔ کوئی پڑھنے والا یہ محسوس کئے بغیر نہیں رہ سکتا کہ قصّہ کی حرکت افسانہ نگار کی کوشش اور من مانی کارروائی کی مرہون منت ہے۔"

پروفیسر اختر انصاری صاحب کو اس ناول کی تکنیک کے علاوہ دو اور اہم اعتراض ہیں۔ ایک تو یہ کہ یہ قصّہ سچا نہیں ہے۔ دوسرے اس کے مصنف کا وجود نہیں ہے۔ اور یہ اصل میں منشی سجاد حسین انجم کے قلم کے شاہکار ہے۔

اس تمام بحث کے بعد پروفیسر صاحب موصوف اس تذبذب کا شکار ہو جاتے ہیں کہ آیا اس کو اٹھارویں صدی کا ناول تسلیم کریں یا نہیں؟ اس کی بنیادی وجہ یہ ہے کہ اردو کے بیشتر نقادوں نے یہ تسلیم کیا ہوا ہے۔ اور ہمیشہ اردو ناول کے ارتقا کی بحث اسی بنیاد سے شروع کی جاتی ہے کہ اردو ناول ۱۸۵۷ء کے بعد انگریزی ادبیات سے متاثر ہونے کے بعد لکھے گئے ہیں۔

چونکہ ناول نگاری کا فن اردو ادب میں انگریزی سے آیا ہے۔ لہذا کسی ایسی تصنیف کا دستیاب ہونا جس میں ناول کے جملہ عناصر پائے جاتے ہوں لیکن اس کا زمانہ تصنیف اٹھارویں صدی کا ہو اجب ابھی انگریزی ادبیات کا براہِ راست اثر اردو ادب پر پڑنا شروع نہیں ہوا تھا۔ یقیناً چونکا دیتا ہے اور ذہن طرح طرح کے معروضات قائم کرنے میں مصروف ہو جاتا ہے۔

نثر کا فنی مطالعہ اگر ایک طرف اس بات کا ثبوت ہے کہ شاہ حسن ضبط میں قصّہ بیان کرنے کی بے پناہ فطری صلاحیت تھی۔ اور گو شعوری طور پر وہ اس میں اپنی عاشقانہ آپ بیتی تحریر کر رہے تھے، جو اتفاق سے ایک ناول کی صورت اختیار کر گیا۔

مزید برآں نشتر اس بات کا ثبوت بھی ہے کہ اردو میں صرف داستانیں ہی نہیں لکھی جاتی تھیں بلکہ "ناول" کی فنی اصطلاح استعمال کئے بغیر انگریزی ادبیات کے اثرات سے آزاد اردو میں کچھ ناول بھی وجود میں آچکے تھے۔

اس قسم کی غلط فہمیوں کے دھندلکوں میں یہ سوال اٹھایا جاسکتا ہے کہ کیا "شاہ حسن ضبط" کے وجود کو ثابت کیا جاسکتا ہے؟ شاہ حسن ضبط کا ذکر اردو کے کم و بیش تمام تذکروں میں پایا جاتا ہے۔ وہ شاعر بھی تھے، اور اس ناول کے علاوہ انھوں نے رمل و نجوم وغیرہ پر بھی بعض کتابیں لکھیں تھیں جن کا تذکرہ آگے آئے گا۔ لیکن صرف اس ناول کے داخلی شواہد ایسے ہیں کہ جن کی بنا پر اسے اٹھارویں صدی کے اواخر کی تصنیف تسلیم کرنا پڑتا ہے۔

محسن لکھنوی نے اپنے تذکرے "سراپا سخن" میں جو ۱۸۶۰ء کی تصنیف ہے۔ شاہ حسن ضبط کا نام، وطن اور شاعری کا نمونہ دیا ہے۔ اور انھیں اپنا "چچا" بتایا ہے۔ واضح رہے کہ نشتر میں خود ضبط نے اپنے جن بھائیوں کا ذکر کیا ہے ان میں سے ایک شاہ حسین حقیقت ہیں۔ جو خود ایک مشہور شاعر اور مصنف گزرے ہیں اور اپنے بھائی ضبط کے ایما پر ہی قلندر بخش جرأت کے شاگرد ہوئے تھے۔

اصل میں اس ناول کے مصنف کے وجود کو تسلیم کرنے کی راہ میں وہی رکاوٹ درپیش آتی ہے۔ جس کا تذکرہ اوپر آچکا ہے۔ اگر اس ناول کو اٹھارویں صدی میں لکھے جانے والا ناول تسلیم بھی کرلیں تو بھی اس حقیقت سے انکار ممکن نہیں ہے کہ اردو ادب میں ناول کے خدوخال انگریزی ادبیات کے اثرات سے ہی ابھرنا شروع ہوتے تھے۔ یا یہ اثر ۱۸۵۷ء کے بعد بہت زیادہ نمایاں ہو کر سامنے آیا۔ لیکن اگر ۱۸۵۷ء سے قبل بھی اتکا دتکا ایسی،

تصنیفات مل جاتی ہیں جن کے فارم کو ہم ادبی ناول کا فارم قرار دے سکتے ہیں۔

نشتر کو ہم واقعی ایک ایسا قصہ کہہ سکتے ہیں جو مکمل ناول کے فارم میں ملتا ہے۔ اردو ناول کو داستان کی روایات سے مربوط قرار دیا جاتا ہے۔ داستانوں کی تخیلی فضا ان کا ماحول، ان کی بے پناہ قوت بیانیہ، نے ناول نگاری کے فن پر یقیناً گہرا اثر ڈالا ہے۔ لیکن اگر ہم اردو ناول کے اولین نقوش کا جائزہ لیں تو ہمیں نشتر کے علاوہ اسی عہد میں چند اور ایسے قصے بھی نظر آتے ہیں۔ جن میں حقیقی زندگی کی کہانی بیان کی گئی ہے۔ اور ان کو ہم طویل کہانیاں یا کسی حد تک ناول بھی قرار دے سکتے ہیں۔

ناول اور داستان میں بنیادی فرق واقعیت اور حقیقت کا ہے۔ اس اعتبار سے ایسے قصے داستانوں سے الگ اور اردو ناول کے نقوش اولین کہلائے جانے کے مستحق ہیں۔ اور اس طرح ہم اردو ناول کی روایت کو اٹھارویں صدی تک پھیلا سکتے ہیں۔ نشتر اردو ناول کی ان روایات میں ایک روشن ترین روایت ہے۔

اصل قصہ چونکہ فارسی میں لکھا گیا تھا۔ لہذا یہ کہا جا سکتا ہے کہ ہم فارسی زبان میں لکھے ہوئے ایک ناول کو اردو ناول کی روایات کی کڑی نہیں کہہ سکتے۔ لیکن اصل میں یہ برائے نام فارسی زبان کا قصہ ہے۔ اور اس میں ہندوستانی یعنی اردو زبان اس قدر زیادہ مستعمل ہوئی تھی اور فارسی کی نثر بھی انتہائی سادہ تھی لہذا اسے اردو کا ہی ایک قصہ قرار دیا جا سکتا ہے۔ اسی طرح بعض ایسے قصے بھی ہیں کہ جو اردو زبان میں لکھے گئے تھے اور ان کا ترجمہ فارسی زبان میں کیا گیا تھا۔ مزید برآں نشتر جس آسان فارسی میں لکھا گیا تھا وہ ہندوستان میں اجنبی زبان نہیں تھی۔ چنانچہ نشتر کا اندازِ بیان دوسرے قصوں پر اثر انداز ہوا ہوگا۔

اقتدار عالم خاں نے بجا طور پر لکھا ہے کہ "اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا کہ اصلی کہانی فارسی میں تھی۔ اٹھارویں صدی میں اردو اور فارسی کا چولی دامن کا ساتھ تھا۔ اس زمانے کی "ہندوستانی فارسی" کے ادبی رجحانات اردو کی ادبی وراثت کا ایک اہم حصّہ مانے جاتے ہیں۔"

بعض نقادوں نے اردو ناول میں واقعیت اور مقدیت کے عناصر کی تلاش، انیسویں صدی کے ادب میں کی ہے۔ گویا وہ اس سے قبل کسی ایسے ناول کے یا تو وجود سے آگاہ نہیں ہیں یا ان کو تسلیم کرنے سے انکار کرتے ہیں۔ اس سلسلے میں ڈاکٹر افتخار احمد صدیقی لکھتے ہیں: "اردو کہانیوں میں واقفیت اور مقصدیت کے عناصر انیسویں صدی کے وسط میں نمودار ہونا شروع ہوئے۔"

اسی طرح ڈاکٹر محمود الٰہی نے اپنے مضمون "اردو کا پہلا ناول" میں مولوی کریم الدین کے لکھے ہوئے قصّے "خطِ تقدیر" کو اردو کا پہلا ناول قرار دیا ہے لیکن درحقیقت یہ ناول نہیں بلکہ ایک تمثیلی قصّہ ہے۔

گو ایسے مذکورہ بالا تمام قصّوں میں واقعیت و حقیقت پائی جاتی ہے اور وہ انیسویں صدی کے نصف میں تحریر کئے جانے والے قصّے ہیں۔ لیکن ان تمام قصّوں سے تقریباً پچاس برس قبل ہی ۹۱-۱۷۹۰ء میں ہی ایک ایسا قصّہ وجود میں آچکا تھا۔ جس میں واقعیت تخیّل اور حقیقت کا خوبصورت امتزاج بھی ہے۔ اور جو ناول کے فن کی کسوٹی پر بھی پورا اترتا ہے۔ اور وہ ہے شاہ حسن ضبط کا ناول "تشتر"۔

ہم ذیل میں نشتر کے علاوہ دوسرے قصّوں کا سنہ طباعت اور نشتر کے علاوہ

۱:۔ اردو ناول کی ابتدا ایک نیا زاویۂ نظر مطبوعہ نقوش لاہور بحوالہ سابق ص ۲۱) مولوی نذیر احمد احوال و آثار ص ۳۱۸ مطبوعہ مجلس ترقی ادب لاہور۔

دوسرے قصّوں کے مرکزی خیال پیش کرتے ہیں۔

۱۸۵۱ء میں مطبع مصدر الفوائد آگرہ سے "دھرم سنگھ کا قصّہ" شائع ہوا تھا۔ اس سے اگلے سال ۱۸۵۲ء میں اسی مطبع سے "سورج پور" کی کہانی شائع ہوئی۔ بعدازاں ان دونوں قصّوں کا آسان فارسی زبان میں ترجمہ بھی شائع کیا گیا تھا۔ چنانچہ "دھرم سنگھ کا قصّہ" کو قصہ صادق خاں اور سورج پور کی کہانی کو "قصّہ شمس آباد" کے نام سے مطبع اسد الاخبار آگرہ نے شائع کیا تھا۔

یہاں یہ سوال بھی اٹھتا ہے کہ آخر ان قصّوں کو ہندوستانی زبان میں شائع کرنے کے بعد آسان ہندوستانی فارسی میں ترجمہ کرنے کی ضرورت کیوں پیش آئی۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ ہندوستانی اور فارسی کی ادبی روایت باہم دگر ہم آمیز تھی۔ اور دونوں کے رجحانات مشترکہ تھے۔

۱۸۵۲ء میں ہی مطبع اسعد الاخبار آگرہ سے سودھی کبودھی نامی قصّہ بھی شائع ہوا تھا۔ جو ایک اخلاقی قصّہ ہے۔

۱۸۶۴ء میں مطبع آفتاب قدرت آگرہ سے شیخ محمد کریم اللہ عرف شیخ غوث محمد قریشی کا فسانۂ غوث شائع ہوا۔ اس میں محلاتی زندگی کی کہانی بیان کی گئی ہے۔ اس میں بھی کرداروں کے نام تمثیلاتی ہیں اور قصّہ یا ناول کے بجائے اپنے فارم اور اندازِ بیان کی بنا پر داستان کہلانے کی زیادہ مستحق ہے۔ ڈاکٹر ڈیوڈ میل بخاری اس قصّے کو اردو ناول کا پیشرو قرار دیتے ہیں۔ "قدیم اردو افسانے کے اتنے بڑے سرمائے میں اگر کوئی افسانہ واقعی ایسا ہو سکتا ہے جسے صحیح معنوں میں اردو ناول کا پیشرو کہا جا سکے تو وہ شیخ غوث محمد قریشی بنارسی کا "فسانۂ غوث" ہے۔ جو ۱۸۶۴ء میں مطبع آفتاب قدرت لوہا منڈی آگرہ میں چھپا ہے۔ اس کا پلاٹ ایک

بادشاہ کے دو وزیروں کی باہمی رقابت سے تیار ہوتا ہے اور مافوق الفطرت واقعات ، غیر انسانی کردار، عجائب نگاری، اور سحر سے یکسر پاک ہے۔ فسانہ غوث ایک المیہ قصہ ہے۔ جس کا خاتمہ بھی وزیر محمود اور اس کی زوجہ کی خودکشی پر ہوتا ہے[1]۔"

اپنے ایک اور مقالے میں ڈاکٹر سہیل بخاری فسانہ غوث کے سلسلے میں لکھتے ہیں۔

"اس وقت جب کہ عجائب نگاری تمام داستانوں کا ایک عام دستور تھا۔ یہ اپنی پہلی قسم کی کوشش ہے اسے ہم بہ آسانی اردو ناول کا پیشرو کہہ سکتے ہیں[2]۔"

لیکن فسانۂ غوث کے کرداروں کے تمام نام تمثیلی ہیں۔ مثلاً وزیر نیک، وزیر شریر فتنہ نما، خردکیش، وغیرہ گوکہ بنین کی پلگرمس پروگریس کی طرح جسے ناول کہا جاتا ہے۔ فسانہ غوث کو بھی ناول کہہ سکتے ہیں۔ لیکن اس سلسلے میں ہم ڈاکٹر افتخار احمد صدیقی کی رائے سے اتفاق کریں گے جو لکھتے ہیں[3]۔ "اس میں شک نہیں کہ فسانۂ غوث اور داستان جمیلہ خاتون (مصنفہ ایم کیمپسن) کے مصنفین نے اپنے قصوں کو فوق الفطرت عناصر سے پاک کرکے قصہ گوئی کے میدان میں ایک قدم آگے بڑھایا لیکن ان قصوں کی داستانی فضا، جدید کہانیوں کی مانوس واقعاتی فضا سے مختلف اور زمان و مکان کی تخصیص و تحدید سے آزاد ہے۔"

اب ہم سورج پور کا قصہ اور دھرم سنگھ کا قصہ کی طرف آتے ہیں۔ دھرم سنگھ کا قصہ مطبوعہ ۱۸۵۱ء میں دیہاتی زندگی کے حقیقی مسائل بیان کئے گئے ہیں۔ یہ تین داستانوں

---

[1] ناول نگاری ص ۴۹۔ مطبوعہ میری لائبریری لاہور (۲) اردو کی نثری داستانوں کا تنقیدی مطالعہ ص ۲۷ مطبوعہ اوراق لاہور۔ (۳) مولوی نذیر احمد احوال و آثار ص ۳۲۲

پر مشتمل ہے۔ پہلی داستان میں زمینداری کے معاملات میں قانون کو ہاتھ میں لینے کے بجائے، مہذب طریقے پر عدالتی چارہ جوئی کے طریقے کی تعلیم دی گئی ہے۔ قصّے کا مرکزی کردار ایک صلح جو اور انصاف پسند زمیندار دھرم سنگھ ہے۔ جو گاؤں والوں کو راستی کی تعلیم دیتا ہے۔

سورج پور کا قصّہ مطبوعہ ۱۸۵۲ء میں گاؤں کے زمینداروں اور پٹواریوں کی جعل سازی اور مقدمہ بازی سے متعلق کہانی بیان کی گئی ہے۔ یہ سب واقعات حقیقی اور دیہاتی زندگی کے مسائل کو پیش کرتے ہیں۔ ان قصّوں میں چندر رام، سندر سنگھ، دھرم سنگھ، بلونت سنگھ، بدیادھر اور ظالم سنگھ وغیرہ زمیندار طبقے کے نمائندے ہیں۔ بدھ سنگھ اور موہن اہیر کسانوں کے طبقے سے تعلق رکھتے ہیں۔ علاوہ ازیں بھوانی اور شوبرنداس پٹواری کے کردار ہیں۔

ان میں سے بعض قصّے مختصر ہیں۔ اور اپنے اختصار کے سبب ناولٹ یا ناول کی قلمرو میں نہیں آتے۔ لیکن ان کے بیان کرنے کا مقصد یہ تھا کہ ایک تو یہ انیسویں صدی کے نصف آخر میں تحریر کئے جانے والے قصّے ہیں۔ دوسرے ان میں داستانیں نہیں بلکہ حقیقی زندگی کے مسائل پیش کئے گئے ہیں۔ اور ان میں واقعیت و حقیقت موجود ہے۔ یہ قصّے بھی یقیناً اردو ناول اور اردو افسانے پر اثر انداز ہوئے ہوں گے۔

لیکن انہی قصّوں کو اردو ناول کے اولین نقوش قرار دینا صحیح نہیں ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ یہ تمام قصّے ضبط کے ناول نشتر کے تحریر کئے جانے کے تقریباً ۶۰ برس بعد لکھے گئے۔ لہٰذا اردو ناول کا اولین نقش نشتر کو ہی قرار دیا جا سکتا ہے۔ البتہ یہاں نشتر کے تقریباً پندرہ سولہ برس بعد تحریر کئے جانے والے بعض اور قصّوں کا سرسری تذکرہ کرنا، مناسب ہوگا۔

گویا زمانی اعتبار سے ان قصّوں کو بھی مذکورہ بالا ان قصّوں سے اولیّت حاصل

ہے جن کا تذکرہ ہمارے مختلف نقاد اردو ناول کے اولین نقوش کے سلسلے میں کرتے آئے ہیں۔

میرا اشارہ اس قصّے کی جانب ہے جو ۶-۱۸۰۷ء میں لکھا گیا۔ یعنی انیسویں صدی کی پہلی دہائی میں۔ اس قصّے کا مصنف ڈیرہ غازی خاں کا رہنے والا تھا۔ یہ بھی آسان فارسی میں لکھا ہوا قصّہ ہے جس میں واقعیت و حقیقت پائی جاتی ہے۔ اس کا ایک قلمی نسخہ، برٹش میوزیم لائبریری میں موجود ہے۔ اس قصّے کا بنیادی موضوع عشق و محبّت ہے۔ اس قصّے کی ہیروئن کو بعض بااثر افراد اغوا کرنا چاہتے ہیں۔ لیکن ملتان کے صوبے دار مظفر خاں کی مدد سے دونوں دشمنوں سے محفوظ رہتے ہیں۔ اس کہانی کی زبان بھی نثر کی طرح عام فہم اور سادہ ہے۔

تقریباً اسی زمانے کا لکھا ہوا، ایک اور قصّہ میسور کے مشہور لیٹرے ڈھوروجی کے بارے میں فارسی زبان میں ملتا ہے۔ ایک اور قصّہ "قصّہ سلطان محمود" ہے۔ جس کا موضوع افلاطونی محبت ہے۔ یہ بھی ایک مکمل کہانی ہے اور اس میں سلطان محمود کا نام صرف علامتی طور پر استعمال ہوا ہے۔ اس کے نسخے بانکی پور پٹنہ اور پٹنہ یونیورسٹی لائبریری میں موجود ہیں۔

یہ تمام قصّے اردو ناول کی تکنیک کے کافی حد تک مماثل ہیں۔ اور نثر کو پہلا مکمل ناول تسلیم کر لینے سے ان قصّوں کی ادبی اہمیّت و افادیت میں کوئی فرق نہیں آتا۔ یہ اردو ناول کی روایت کی ایک کڑی ہیں جن کا سرا نثر ہے۔ چنانچہ اگر مغرب کے ناول کے ساتھ ساتھ ان روایات سے بھی اردو ناول کا تعلق جوڑا جائے اور اردو ناول کے تنقیدی، جائزے کے وقت انھیں نظر انداز نہیں کرنا چاہیئے۔ مغرب کے ناول اور ان قصّوں کے اردو ناول پر مشترکہ اثرات کی تلاش احسن ہوگی۔ ڈاکٹر سہیل بخاری نے بہت صحیح لکھا ہے۔

"ناول کو اردو داستان کی اولاد ثابت کرنے یا دونوں کا کسی نہ

کسی طرح جوڑ ملانے کے بجائے مغربی ناول اور اپنے ان قصہ کہانیوں میں قدر مشترک کی تلاش کرنا زیادہ مفید مطلب ہے۔"

نشتر کا قلمی نسخہ اور اس کا اردو ترجمہ

قصہ حسن و عشق جواب اردو میں "نشتر" کے نام سے معروف ہے، کے قلمی نسخے نہیں ملتے۔ اس کا ایک قلمی نسخہ اس کے فاضل مترجم منشی سجاد حسین انجم کسمنڈوی کے پاس تھا۔ جس کا انھوں نے اردو ترجمہ کیا تھا۔ لیکن اس کے مترجم نے مصنف کی طرف سے دیئے جانے والے بہت سے اشعار حذف کر دیئے ہیں۔ اور بہت سی دوسرے ترامیم بھی کی ہیں۔ بعض مقامات پر مترجم نے اپنی طرف سے بھی موقع محل کی مناسبت سے اشعار کا اضافہ کیا ہے اور ایسا کرتے ہوئے صراحت کر دی ہے۔ غرض مترجم نے اپنے نقطۂ نقطر سے ناول میں کچھ نہ کچھ اضافے ضرور کئے ہیں۔ اور حواشی میں اپنی بعض آرا بھی لکھی ہیں۔ لیکن اشعار کے ان اضافوں سے اصل ناول پر کوئی بنیادی اثر نہیں پڑا ہے۔

ناول کی ابتدا میں ہی ایک جگہ، جہاں قصے کا راوی حسن شاہ ضبط، میرزائی اور خانم جان کی محفل میں موجود ہے اور بہت سے دوسری حسینائیں بھی جمع ہیں۔ اس موقع پر سوال و جواب کے سلسلے میں مصنف نے بہت سے اشعار لکھے تھے۔ جن کو مترجم نے قلمزد کر دیا ہے۔ چنانچہ منشی صاحب حاشیئے میں لکھتے ہیں۔

"اسی طرح بہت سے شعر حضرت نے پڑھے جس کے تین حصے پانچ صفحوں پر ہیں، ایک عام عاشقانہ انداز، کے دوسرے حسینوں کی تعریف میں تیسرے اپنے حسب حال میں نے وہ سب چھوڑ دیئے۔"[۱۲]

۱۱۔ اردو ناول نگاری ص ۴۹ مکتبہ اردو لاہور
۱۲۔ ناول نشتر ص ۱۹

اسی طرح نشتر میں جہاں نامل کا ہیرو (ضبط) خانم جان سے پہلی ملاقات کے بعد گھر میں آکر بے قرار ہوتا ہے۔ اور بہت سے اشعار پڑھتا ہے، جو یقیناً ہیرو کے اضطراب اور بے چینی و بے قراری کو ظاہر کرتے ہوں گے۔ لیکن فاضل مترجم نے یہاں بھی بہت سے اشعار کو حذف کر دیا ہے۔ اور صرف ہیرو کے حال زار کے بیان کے بعد لکھتے ہیں۔

"یہاں بہت سے شعر کسی پرانی مثنوی سے لکھے ہیں جس میں کا ایک یہ ہے۔

پنٹھ گریہ کناں چھوڑ اس کے در کو
بہ ناچاری چلا میں اپنے گھر کو !"

اور حاشیے میں مزید وضاحت کرتے ہیں۔

"اس وقت کے اردو شاعر وہی ہوں گے جن کا ذکر پروفیسر آزاد نے "آب حیات" کے دور اوّل میں لکھا ہے۔ میں نے یہ سب شعر چھوڑ دیئے۔"[1]

حسن شاہ اور خانم جان کے نکاح اور شب عروسی کے واقعات کے تمام بیان کو جو مصنف کے قلم سے تھا، مترجم نے بدل ڈالا، چنانچہ وہ لکھتے ہیں۔

"اندازِ بیان کو میں نے بہت سنبھالا ہے ورنہ مصنف نے تو اس میں زمانے کا کچھ خیال ہی نہ کیا تھا۔"[2]

مذکورہ بالا چند بیانات میں ترمیم و اضافے کے باوجود یہ بات وثوق سے نہیں کہی جا سکتی کہ مترجم نے مزید کیا کیا تبدیلیاں کی ہیں۔ کیونکہ میرے پیش نظر اس کتاب کا کوئی قلمی نسخہ نہیں ہے جس سے اصل اور ترجمے کا موازنہ کیا جا سکتا۔ اس مضمون کی تیاری میں میرے پیش نظر، نامل نشتر کے تین نسخے رہے ہیں۔ دو نسخے تو منشی سجاد حسین

۱۔ نشتر ص ۱۲ (۲) نشتر ص ۱۲

نجم کمنڈوی کی زندگی میں ہی شائع ہوئے تھے۔ اور تیسرا نسخہ مجلس ترقی ادب لاہور کا شائع کردہ ہے جس کے مرتب عشرت رحمانی ہیں۔ مجلس کے نسخے کی بنیاد بھی وہی دو نسخے ہیں جن کا تذکرہ آچکا ہے۔

اس سلسلے میں ہم اقتدار عالم کے مضمون کا ایک اقتباس پیش کریں گے۔ جن کی نظر سے نادل نشتر کا قلمی نسخہ گزرا ہے۔ چنانچہ وہ لکھتے ہیں۔

"نشتر کا ایک فارسی نسخہ کتبہ ۱۲۶۹ھ (۱۸۴۸-۴۹) قاضی محمد سعید صاحب (پٹنہ) کی ملکیت ہے۔ قاضی صاحب موصوف نے مخطوطات کی ایک مطبوعہ فہرست میں اس کا ذکر کیا ہے۔ فارسی متن اور اردو ترجمہ کے تقابل سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ مترجم نے اصل قصہ کو جوں کا توں پیش کرنے کی پوری کوشش کی ہے۔ یہاں تک کہ محاورہ کے استعمال اور اندازِ بیان میں بھی اصل تاثر برقرار رکھنے کا پورا اہتمام کیا گیا ہے۔

چند اختلافات جو نظر آتے ہیں وہ غیر اہم اور جزئی امور سے متعلق ہیں۔ مثلاً فارسی قصہ میں حسن شاہ کے جدّی حالات سرے سے غائب ہیں جبکہ منشی سجاد حسین کے ترجمہ میں تمہید کے بعد اس موضوع پر ایک علیحدہ سرخی قائم کی گئی ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ فارسی نسخہ کے کاتب نے جدّی حالات کو غیر ضروری تصور کرتے ہوئے حذف کر دیا ہے۔ دوسری طرف فارسی قصہ کی تمہید میں خدا اور رسول کی توصیف و تعریف میں دو یا تین صفحات لکھے گئے ہیں۔ لیکن منشی سجاد حسین نے "بعد حمد و نعت۔" کہہ کر اس قصے کو چند الفاظ میں ہی نبٹا دیا ہے۔ ایک اور جگہ حسن شاہ اور خانم خان

کے نکاح اور شب عروسی کے بیان کو خود منشی صاحب نے تھوڑا سا بدل دیا ہے۔ حاشیہ میں اس کی وجہ یوں بیان کی گئی ہے ..... اندازِ بیان کو میں نے بہت سنبھالا ہے ورنہ مصنف نے تو اس زمانے کا کچھ خیال ہی نہ کیا تھا ..... فارسی متن ملاحظہ کیجئے تو اندازہ ہوگا کہ منشی سجاد حسین کا تہذیب جائز تھا[1]۔"

اس کے بعد آگے چل کر اقتدار عالم اپنے مضمون میں لکھتے ہیں :-

"بہر حال ان چند جزوی اختلافات کے علاوہ جہاں تک میں جائزہ لے سکا ہوں۔ دونوں قصّوں کے درمیان کوئی فرق نہیں ہے بلکہ اردو ترجمہ لفظ بہ لفظ فارسی کا چربہ معلوم ہوتا ہے[2]۔"

اقتدار عالم خاں نے مذکورہ قلمی نسخہ دیکھنے کے بعد جس پر سنہ کتابت ۱۲۶۹ھ تحریر ہے۔ اپنے مضمون میں یہ سوال اٹھایا ہے کہ ۱۲۰۵ ھ کو مذکورہ کتاب کا سنہ تصنیف کیسے تسلیم کر لیا جائے ؟ اس کا جواب نادل میں پائی جانے والی داخلی شہادتیں ہیں جو اس بات کا ثبوت فراہم کرتی ہیں کہ نشتر یقیناً اٹھارویں صدی عیسوی کے آخری عشرے کی تصنیف ہے کیونکہ اس کے بیشتر کردار تاریخی شخصیات ہیں۔

اس ضمن میں مضمون نگار نے میجر ہولیر کا تذکرہ کیا ہے۔ اقتدار عالم خاں کی اس تحقیق و تجسّس کی داد نہ دینا ناانصافی ہوگی کہ انھوں نے نہایت کاوش و محنت سے نشتر میں بیان کی جانے والی بعض شخصیات کو اس کے ہم عصری ماخذات کے ثبوت سے

۱:- اردو میں ناول نگاری کی ابتدا ایک نیا زاویہ نظر ص ۳ مطبوعہ نقوش

۲:- " " " " " " "

معتبر کیا ہے۔ مثلاً میجر پولیر کے بارے میں وہ لکھتے ہیں :۔

" ایک اور تاریخی شخصیت جس کا ذکر نشتر میں ملتا ہے فرانسیسی نژاد افسر میجر پولیر تھا۔ جو ایک مدت تک ایسٹ انڈیا کمپنی کی طرف سے اودھ میں تعینات رہا۔ وہ اودھ کی تہذیب کا بڑا دلدادہ تھا۔ اس کا شمار اٹھارویں صدی کے ان یورپینوں میں کیا جاتا ہے۔ جو ہندوستان آکر خود بھی نوابوں کی سی زندگی گزارنے لگے تھے۔ پولیر کی میرزا منشی کا گواہ ایک ہم عصر نقش اب تک موجود ہے جس میں اسے شاہ شجاع الدولہ کی معیت میں مرغوں کی لڑائی کا تماشہ دیکھتے ہوئے پیش کیا گیا ہے۔ ایک مرغ خود اس کی بغل میں دبا ہوا ہے۔ نشتر میں اس نام کے ہجے " ہولیر " ہیں۔ یہ محض کتابت کی غلطی ہے۔ اس نام کے سلسلے میں بعض کتابوں میں بھی یہی غلطی ہوئی ہے۔

ولی اللہ فرخ آبادی کی کتاب تاریخ فرخ آباد کے بعض نسخوں میں بھی " پولیر " کے بجائے " ہولیر " درج ہے۔ مزید برآں محمد بخش آشوب کی کتاب تاریخ شہادت فرخ سیر و جلوس محمد شاہ اور پولیر کے خطوط سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ وہ ۱۷۸۰-۸۱ء میں پہلے کانپور میں اور پھر چنار میں مقیم تھا جس سے ہولیر صاحب کی نقل و حرکت کی بابت نشتر کی فراہم کردہ اطلاعات کی تصدیق ہوتی ہے۔ اور ہمارا یہ خیال مزید محکم ہوتا ہے کہ نشتر میں جس ہولیر صاحب کا ذکر ہے۔ وہ دراصل میجر پولیر ہی تھا۔ یہ بات بھی غور طلب ہے۔ کہ نشتر میں ہولیر کے نام کے ساتھ اس کے فوجی عہدے کی نشاندہی نہیں کی گئی ہے جبکہ باقی دوسرے انگریز افسران کے سلسلے میں اس چیز کا خاص اہتمام

کیاگیا ہے۔ یہ واقعہ ایک لحاظ سے منفی شہادت کا درجہ رکھتا ہے۔ ہمیں تاریخی ماخذ کے ذریعے یہ معلوم ہوتا ہے کہ بعض وجوہ کی بناء پر میجر لوپلیر ۱۷۷۶ء میں اپنے فوجی عہدے سے دستبردار ہونا پڑا تھا۔ ۱۷۷۹ء میں جب وہ کانپور آیا تو اس وقت تک گورنر جنرل کی کونسل نے اس کو معاف تو ضرور کر دیا تھا۔ لیکن ابھی تک وہ اپنے پرانے عہدے پر بحال نہیں ہو پایا تھا۔ ظاہر ہے اس زمانہ میں اس کے نام کے ساتھ کوئی فوجی منصب نہیں لگایا جا سکتا تھا اس طرح ہولیر صاحب کو میجر لوپلیر کی حیثیت سے شناخت اور اس امر کا ثبوت ملنا کہ وہ کانپور اور چنار گڑھ میں اسی دوران میں مقیم تھا جو کہ نشتر میں بیان کیا گیا ہے نہ صرف یہ ظاہر کرتا ہے کہ اس کہانی کے اکثر کردار تاریخی شخصیتوں سے عبارت ہیں۔ بلکہ کہانی کے بنیادی ڈھانچے کا حقیقی واقعات پر مبنی ہونا بھی ثابت ہوتا ہے۔"

علاوہ ازیں ناول میں چند دوسرے کردار مثلاً حکیم شفائی اور حکیم میر محمد نواز بھی حقیقی شخصیات ہیں جن کا تذکرہ اس دور کی اکثر کتابوں میں موجود ہے۔

چنانچہ نشتر میں موجود داخلی شہادتوں، اور تاریخی و ادبی ماخذ کی روشنی میں پرکھنے کے بعد بلاخوف تردید یہ بات کہی جا سکتی ہے کہ یہ اٹھارویں صدی کا ہی ایک قصہ ہے۔ جس میں فسانہ محبت کے ساتھ ساتھ اس عہد کے ہندوستان کی حالت، ایسٹ انڈیا کمپنی اور بعض انگریز افسران کا تذکرہ ملتا ہے۔

اس ناول میں ہمیں انگریز افسران کی عیش کوشی و عیش پرستی، ان کی میرزا منشی

۱:۔ بحوالہ سابق ص

عام انگریز سپاہیوں کے طوائف بازی کے شوق کے علاوہ اس زمانے کے ہندوستان کے سیاسی و سماجی حالات کی جھلکیاں جگہ جگہ ملتی ہیں۔ انگریز افسران کا تذکرہ، ایسٹ انڈیا کمپنی کی فوجی چھاؤنیوں کے مقامات، انگریزی لشکروں کے پڑاؤ، اور نقل مکانی، اور ان کی ترتیب و تنظیم کے بارے میں بھی اشارے ملتے ہیں۔ حسن شاہ ضبط نے ایک جگہ اس بات کا تذکرہ بھی کیا ہے کہ انگریزی لشکر کے روزمرہ کے اخراجات اور سپاہیوں کی تنخواہوں وغیرہ کا خرچ مہاجنوں سے سود پر قرض لے کر پورا کیا جاتا تھا۔

مئی ۱۷۸۱ء میں انگریزی لشکر کے کانپور سے پورب جانے کے بارے میں کلکتہ کے احکامات کا تذکرہ بھی ملتا ہے۔ اسی زمانے میں خائم جان بھی کانپور سے پورب کی جانب روانہ ہوتی ہے۔ لشکر کی روانگی کی خبریں سن کر قرض خواہ جس صورت سے اپنا اپنا قرض وصول کرنے کی تگ و دو کرتے ہیں اس کا تذکرہ بھی ملتا ہے۔ یہی قرض خواہ، حسن شاہ ضبط کو اس امر پر مجبور کر دیتے ہیں کہ ان کا حساب بے باق کئے بغیر وہ نہیں جا سکتا۔ جس کا نتیجہ حسن شاہ، اور اس کی ہیروئن کے حق میں المناک نکلتا ہے۔ ایسٹ انڈیا کمپنی کی مالی ساکھ، جس کا تذکرہ نشتر میں ملتا ہے، کی تصدیق گورنر جنرل بااجلاس کونسل کے ان الفاظ سے بھی ہوتی ہے جو اس نے ۸۲-۱۷۸۱ء میں کمپنی کی مالی حالت کا جائزہ لیتے ہوئے کہے تھے "کمپنی کی ساکھ اتنی گر چکی ہے کہ فوجوں کے روزانہ کے اخراجات کو پورا کرنے کے لئے مناسب رقموں کا قرض ملنا مشکل ہو گیا ہے۔"

ڈیرے دار طوائفوں کے اعلےٰ درجے کے انگریزوں سے تعلقات، اور انگریزوں کو ان کے داشتہ رکھے جانے کے بارے میں بھی عام تاریخی ماخذوں سے تصدیق ہوتی ہے اس زمانے میں کمپنی کے لشکر کے ساتھ ساتھ نچلے درجے کی طوائفوں اور ڈیرے دار طوائفوں

کے گروہ بھی ہوا کرتے تھے۔ ہندوستان کے عیاش روسا امرا کی طرح انگریز افسران بھی، اس سلسلے میں مقامی لوگوں سے مسابقت کا جذبہ رکھتے تھے۔ اور اپنی دولت کو اندھا دھند عیاشیوں میں اڑاتے تھے۔ ایسٹ انڈیا کمپنی کے ان لشکروں کے درمیان میں ایک جگہ ان طوائفوں کے لئے مخصوص ہوتی تھی جسے اصطلاح میں "لول بازار" کہا جاتا تھا۔ سیموئیل ہیکس نے جس نے ۱۷۷۷ء اور ۱۷۸۵ء میں ہندوستان کی سیر کی تھی اپنے سفر نامے میں جنرل گوڈرڈ کے ہمراہی میں پیش آنے والے واقعات لکھے ہیں۔ جس میں اس نے بتایا ہے کہ طوائفوں کے ڈیروں کے لئے علیحدہ طور پر ایک دائرہ بنا ہوا کرتا تھا۔ جس کو کیمپ کی اصطلاح میں لعل بازار کہا جاتا تھا۔ بعض اوقات لعل بازار کے مکینوں کے لئے حفظان صحت اور طبی امداد بھی لشکر کے ڈاکٹروں کی ذمے داری مانی جاتی تھی۔[1] "

نشتر میں موجود فنکارانہ تخیل کی بناء پر اختر انصاری صاحب نے اس خیال کا اظہار بھی کیا ہے کہ " قصہ کسی افسانہ نگار کے ذہن کی پیداوار معلوم ہوتا ہے۔" اس ناول میں یقیناً فنکارانہ تخیل پایا جاتا ہے۔ جو ہر صنف ادب کے شہ پارے کے لئے ناگزیر ہے۔ تاہم اس فنکارانہ تخیل کی موجودگی کے باوجود ہم اس کو ایک سچی آپ بیتی ماننے پر مجبور ہیں۔ اور یہ کہیں گے کہ فنکارانہ تخیل کی موجودگی نے حقائق کے بیان کو صحافیانہ یا سطحی انداز عطا کرنے کی بجائے ایک خوبصورت فن پارے میں تبدیل کر دیا ہے۔ اور اس سے قصے کی سچائی متاثر ہونے کے بجائے اس میں اضافہ اور اثر آفرینی پیدا ہوئی ہے۔

صفحات گزشتہ میں ہم ذکر کر آئے ہیں کہ ضبط پر یہ واقعات ۸۱-۱۷۸۰ء میں بیتے تھے۔ جسے انھوں نے ۹۱-۱۷۹۰ء میں دس برس گزر جانے کے بعد قلمبند کیا تھا ایسی

۱:- بحوالہ مضمون اقتدار عالم خان۔ مطبوعہ نقوش۔

صورت میں مکالمے، ضمنی واقعات، اور ان کی نسبت سے جو اشعار پڑھے گئے تھے۔ ان سب کا اسی ترتیب سے یاد رکھنا اور لکھنا اور ہیرو و ہیروئن کے درمیان جو خط و کتابت ہوئی تھی۔ ان کو بجنسہٖ نقل کرنا اور اسی صورت سے حافظے میں موجود رہنا ناممکن ہے۔ چنانچہ یہ کہا جا سکتا ہے کہ واقعات میں کیف و کم پیدا کرنے اور ماضی کے بیتے ہوئے ان رنگین لمحات کو سپردِ قلم کرنے میں مصنف اپنے فنکارانہ تخیل کو بھی کام میں لایا ہوگا جس کی بنا پر یہ قصّہ آپ بیتی ہونے کے ساتھ ساتھ کسی افسانہ نگار کی خلاّقی بھی معلوم ہوتا ہے۔

نادل کا قصّہ

نادل کا ہیرو شاہ حسن ضبط ایک انگریز افسر مسٹر منگ کا ملازم تھا۔ جو انگریز کیمپ کے قریب ہی اقامت پذیر تھا۔ اسی مقام پر چار کشمیری طائفے بھی قیام پذیر ہیں۔ ایک کشمیری طائفے کی مالک میرزائی خانم ہے۔ میرزائی کی ایک نواسی خانم جان ہے۔ اس طائفے میں دوسری خوبصورت طوائفیں گلبدن خانم اور بی جان بھی ہیں۔ اتفاق سے حسن شاہ ضبط کا تعارف اس طائفے کی مالکن سے ہو جاتا ہے۔ حسن شاہ ضبط اس طائفے میں آنا جانا شروع کر دیتا ہے اور خانم جان پر عاشق ہو جاتا ہے۔ خانم جان بھی محبت کا جواب محبت سے دیتی ہے۔ بعدازاں ہیرو ہیروئن میں خفیہ ملاقاتیں بھی ہوتی ہیں۔ خانم خان طوائف زادی ہونے کے باوجود، شاہ حسن ضبط سے وصل سے قبل خفیہ طور پر نکاح بھی کرتی ہے۔ لیکن اپنی مجبوریوں کے سبب نادل کا ہیرو کھلے عام خانم جان کو اپنا نہیں سکتا۔ ایک برس تک اسی طرح ملاقاتیں ہوتی رہتی ہیں۔ یکایک لشکر کے کوچ کا حکم ہوتا ہے۔ یہ طائفہ کلّن نامی انگریز کا ملازم تھا لہٰذا کلّن کے لشکر کے کوچ کرنے کے بعد خود بھی کوچ کرنا چاہتا ہے یا وہیں کسی اور انگریز کے ہاں ملازم ہو جانے کا خواہش مند ہو جاتا ہے۔ چنانچہ حسن شاہ ضبط کے مشورے اور

اسی کی کوششوں سے مٹھو نامی ایک دلال کی معرفت انگریز منگ، ہیرو کا آقا، میرزائی کے طائفے کو اپنے ہاں ملازم رکھ لیتا ہے۔

اس اثنا میں گلبدن ایک اور انگریز کے ہمراہ فرار ہو جاتی ہے۔ تقریباً ایک برس کی لمبائی اور رنگین مخلفوں کے بعد منگ کا تبادلہ کلکتہ ہو جاتا ہے اور میرزائی کے طائفے کو حساب کتاب اور بخشش کے بعد فارغ کر دیا جاتا ہے۔ اس موقع پر نادل کا ہیرو اور ہیروئن فرار کا منصوبہ بناتے ہیں۔ دونوں میں طے پاتا ہے کہ خانم جان پہلے کشتی میں میرزائی کے ہمراہ جائے گی بعد ازاں حسن شاہ ضبط ایک تیز رفتار کشتی لے کر راستے میں موقع پاکر خانم خان کو اپنی کشتی میں لے کر فرار ہو جائے گا۔ دونوں میں قول و قرار ہو جاتے ہیں۔ ہیروئن اپنے طائفے کے ہمراہ رخصت ہو جاتی ہے۔ لیکن ہیرو اپنے آقا کے احکامات کے سبب اور مہاجنوں کے حساب کتاب کو بے باق کرنے کے سبب سے روانگی میں تاخیر کر دیتا ہے۔ اس کے بعد کشتی کی تلاش میں نکلتا ہے۔ لیکن بے سود۔ کنارے کنارے ہیرو کو خانم جان کے ہاتھ کے لکھے ہوئے شکوہ آمیز خطوط ملتے ہیں۔

میرزائی کا طائفہ چنار گڑھ سے ہوتا ہوا لکھنؤ پہنچتا ہے۔ خانم جان اپنے محبوب کی بے وفائی کے سبب بیمار ہو جاتی ہے۔ میرزائی علاج معالجے کی غرض سے ہیرو کے نانا حکیم میر محمد نواز کو آدمی بھیج کر بلاتی ہے۔ بوجوہ حکیم صاحب اور ہیرو کی روانگی میں تاخیر ہوتی چلی جاتی ہے۔ آخر کار منگ کے مشورے اور اجازت سے قاصد کے آنے کے تقریباً پانچ دن بعد دونوں لکھنؤ روانہ ہوتے ہیں۔ لیکن خانم جان محبوب کا انتظار کرتے کرتے مر جاتی ہے۔ جس وقت ہیرو اپنے نانا کے ہمراہ لکھنؤ میں میرزائی کے ڈیرے پر پہنچتا ہے تو اس وقت وہاں خانم جان کی رسم قل ادا کی جا رہی تھی۔ ہیرو، خانم جان اور

اپنے واقف محبت لڑکے کے ہمراہ خانم جان کی قبر پر جاتا ہے اور گریہ زاری کرتا ہے بعد ازاں رخصت ہو کر ناکام و نامراد لکھنؤ کو واپس آ جاتا ہے۔

نشتر ایک رومانی اور کرداری ناول ہے۔ اس کا پلاٹ ڈھیلا ڈھالا ہے۔ اور پلاٹ کی تعمیر "مبتا" معیاری انداز اس میں موجود ہے۔ تاہم یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ اٹھارویں صدی میں کسی ایسی کہانی یا تخلیق کے سلسلے میں جس کا فارم ناول سے ملتا جلتا ہو، اس کے مصنف سے اس بات کی توقع بھی نہیں کی جا سکتی کہ وہ ناول کے مکمل فارم اور اس کو بیان کرنے اور اس کی تکنیک کو استعمال کرنے سے شعوری طور پر واقف ہو گا۔

اس کے باوجود اس میں ناول کے تمام لوازم موجود ہیں۔ اس میں پلاٹ ہے۔ قصہ ہے، کردار ہیں، مکالمات ہیں اور کہانی کو نہایت خوبصورتی اور تسلسل کے ساتھ بڑھاتے ہوئے اس کے حزنیہ انجام تک لے جایا گیا ہے۔ ناول کی ہیروئن خانم جان کا کردار اپنی خوبیوں کی بنا پر سب سے زیادہ جاندار اور نمایاں ہے۔ حتیٰ کہ ہیرو کی شخصیت اس کے کردار کے آگے ماند پڑ جاتی ہے۔

اس ناول کی سماجی، تہذیبی اور تاریخی قدر و قیمت کا تذکرہ ہم گزشتہ صفحات میں کر چکے ہیں۔ یہاں صرف اتنا اور کہنا ہے کہ اگر ناول کے مصنف کو اس تصنیف کی اہمیت کا اندازہ ہوتا اور وہ اپنی آپ بیتی کے ساتھ ساتھ انگریز افسران کی اس مخصوص طرز زندگی کو اور زیادہ ابھار سکتا تو بلاشبہ اس ناول کی ادبی اور تاریخی قدر و قیمت میں اور اضافہ ہو سکتا تھا۔

اس ناول کے مطالعے سے اندازہ ہوتا ہے کہ جس طرح دوسرے شعبہ ہائے زندگی کے افراد ہندوستان میں موجود سفید فام اقوام کے افراد اور حاکموں سے ربط و ضبط بڑھاتے اور اس پر فخر محسوس کرتے تھے اسی طرح چھوٹی بڑی ہر درجے کی طوائفوں نے بھی مقامی

رئیسوں کے علاوہ انگریز حکام سے بھی تعلقات استوار کر رکھے تھے۔ان کی داشتہ بنتی تھیں
اور ان کے ہاں گانے بجانے کے کام پر بھی بیش قرار تنخواہوں پر ملازم ہوتی تھیں۔حالانکہ
ان انگریز افسران اور ان طوائفوں پر یہ فارسی مصرع بھی صادق آتا تھا کہ زبان یار من ترکی و
من ترکی نمی دانم۔رنگین مزاج انگریز افسران اپنے منشیوں کی مدد سے ان طوائفوں سے گفتگو
کرتے اور ان کی گائی ہوئی اردو فارسی غزلیات کا مطلب سمجھ کر داد دیتے تھے۔

ان طوائفوں کی رفاقت ان انگریزوں سے دائمی نہیں ہوتی تھی۔چنانچہ انگریزی
لشکروں کے کوچ اور افسران کے تبادلوں کے ساتھ ہی بے روزگاری کا خوف ان طوائفوں
کو گھیر لیتا تھا۔اور وہ بھی اپنا بوریا بستر سمیت کر کسی نئے قدردان اور خاص طور پر کسی انگریز
قدردان کی تلاش میں مختلف شہروں اور کمپنی کی چھاؤنیوں کی جانب سفر اختیار کرتی تھیں۔

ان طائفوں کے اراکین کی زندگیاں رقص و نغمہ اور عیش و نشاط کے باوجود خانہ بدوشوں
کی زندگیوں سے مختلف نہ تھیں۔اس زمانے کے ہندوستان کی عام سیاسی و سماجی ابتری
کے سبب مقامی رؤسا و امرا ان طائفوں کو ملازم رکھنے کی سکت نہ رکھتے ہوں گے۔دوسرے
انگریز افسران چونکہ مشرقی تہذیب کے اس بدنما عنصر کو اپنا رہے تھے۔اور اجنبی دیس میں
بیویوں کی جدائی کے سبب انھیں اس قسم کی پیشہ ور عورتوں کی ضرورت بھی تھی۔علاوہ ازیں
وہ عیاش مشہور ہو جانے کو قابلِ فخر سمجھتے تھے۔اور ایسٹ انڈیا کمپنی کے ملازمین
چونکہ تنخواہوں کے علاوہ، نجی تجارت اور دوسرے ہتھکنڈوں سے ہندوستان میں بے پناہ
دولت کماتے تھے۔لہٰذا نو دولتیے رئیسوں کی طرح وہ ہر قسم کے عیوب میں خود کو ملوث
کر لیتے تھے۔چنانچہ منگ ایک ایسے ہی کردار کے طور پر ابھر کر سامنے آتا ہے۔

میرزائی کے طائفے کو ملازم رکھنے کی ترغیب دینے کے سلسلے میں جب مٹھو دلال

اس سے کہتا ہے کہ حضور کا نام تمام انگریزوں میں عیاشی میں معروف ہے ہر چند کہ یہ انگریز فارسی، اردو کے بلند پایہ عاشقانہ اشعار سن کر سر دھنتے ہیں۔ لیکن ان کی بنیادی دلچسپی حسن میں ہے۔ اور ہندوستان کی عورت کی قربت کی خواہش انھیں کثیر رقومات کے خرچ کرنے پر مجبور کرتی ہے۔ پرسی مل پیر نے اپنی کتاب "نواب" میں ایسٹ انڈیا کمپنی کے ملازمین کی پست اخلاقی حالت، رنگین مزاجی اور کمپنی کی ملازمت کے ساتھ ساتھ ان کے نجی کاروبار کے سلسلے میں تاریخی حقائق بیان کئے ہیں۔ اس سے اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ ایسٹ انڈیا کمپنی کا ہر ملازم اپنی استطاعت کے مطابق اور بسا اوقات بساط سے بڑھ کر لذت کوشی اور عیش پرستی میں مبتلا تھا۔ عام انگریز سپاہیوں کے لئے نچلے درجے کی، بیسوائیں تھیں اور اعلیٰ مناصب پر فائز انگریز اپنے مناصب اور دولت کے مطابق ڈیرے دار طوائفوں کو ماہانہ مشاہرے پر ملازم رکھ کر دادِ عیش دیتے تھے۔

انگریزوں کی عیاشیوں کے بہت سے ضمنی قصے اس ناول میں بیان کئے جا سکتے تھے منگ کے علاوہ انگریزوں میں جو افسران عیاشی کے لئے بہت زیادہ مشہور ہیں۔ ان میں کیمپ کے بخشی کلن نامی انگریز کا تذکرہ بھی ملتا ہے۔ بالفرض اگر ہولیر اور کلن کے کرداروں کو اور زیادہ نمایاں کیا جاتا تو ضمنی کردار وں میں بعض اچھے کردار پیش کئے جا سکتے تھے۔ کیمپ کے بخشی کلن کے نام کے ساتھ اس کو انگریز بیان کرنے سے یہ تو پتہ چل جاتا ہے کہ وہ انگریز تھا۔ لیکن ظاہر ہے کہ اس کا اصل نام کلن نہیں ہو سکتا جو ایک مقامی نام ہے۔ غالباً اس کا یہ نام عیاشیوں کے سبب ہندوستانیوں میں مشہور ہوا ہو گا۔ تاہم ناول میں اس زمانے کے انگریزوں کے کردار کی مکمل نمائندگی منگ کرتا ہے۔

منگ کا کردار

منگ کا کردار اس زمانے کے عام انگریز افسران کے کردار کی نمائندگی کرنے کے ساتھ ساتھ اپنی کچھ انفرادی خصوصیات بھی رکھتا ہے۔ علاوہ خود بھی نجیب الطرفین ہے اور شریف و نجیب ہندوستانیوں کا احترام کرتا ہے اس احترام کی سب سے بڑی مثال خود ناول کا ہیرو ہے۔ جو منگ کے نجی ملازم کی حیثیت رکھتا ہے اور ایک نیٹو ہندوستانی ہے۔ لیکن منگ حسن شاہ کا بہت خیال رکھتا اور اس کا احترام کرتا ہے۔ معاشی اعتبار سے بھی تنخواہ کے علاوہ بھی اس سے سلوک کرتا رہتا ہے، اور اپنی فرخ آبادی پٹھان داشتہ کے بہکانے کے باوجود جو نادل کے ہیرو کو منگ کی ملازمت سے نکلوانا چاہتی ہے، خود اپنی داشتہ کو نکال دیتا ہے اور ہیرو کے سمجھانے بجھانے سے معاملے کو ٹال دیتا ہے۔ حسن شاہ نے صرف اس کا ملازم ہونے کے سبب سے ہی اس کو شریف اور وضعدار انگریز بیان نہیں کیا ہے۔ حالانکہ سماجی حیثیت سے بھی منگ کا درجہ بلند ہے اور وہ جنرل کوٹ کا ہمشیر زادہ ہے۔ ناول میں بیان کئے جانے والے واقعات سے اندازہ ہوتا ہے کہ وہ واقعی ایک عالی ظرف انگریز ہے۔

اپنی عالی ظرفی اور خاندانی شرافت کے باوجود وہ عام انگریز افسران کی طرح رنگین مزاج واقع ہوا ہے۔ طوائفیں اس سے وابستہ رہتی ہیں۔ وہ کھڑا کھیل فرخ آبادی کھیلنے کا عادی ہے۔ اور بغیر مرضی کے طوائف تک کو اپنی آغوش میں لینے کا قائل نہیں ہے چنانچہ جب میرزائی کا طائفہ اس کی سرکار میں ملازم ہو جاتا ہے۔ اور گلبدن بیگم کے فرار ہو جانے کے بعد وہ بیلہ معاش کو برقرار رکھنے کے لئے میرزائی، خانم جان کو زبردستی بناؤ سنگھار کر کے خلوت میں منگ کے پاس چھوڑ آتی ہے۔ اور وہ واویلا کرتی ہے تو منگ اس کو بغیر چھیڑے واپس جانے دیتا ہے۔ اور خانم جان باعصمت منگ کے خلوت کدہ سے واپس آتی ہے۔

ہر چند کہ یہ بات قرینِ قیاس نہیں معلوم ہوتی لیکن منگ کے کردار کو ذہن میں رکھتے ہوئے ہم یہ یقین کرنے پر مجبور ہیں کہ عیاش طبع ہونے کے باوجود وہ زبردستی کا قائل نہیں ہے۔

وہ ایسا شخص بھی نہیں ہے جو عیاشیوں میں بلا سوچے سمجھے تمام ہی جائیداد لٹا بیٹھتے ہیں اور آخر میں کوڑی کوڑی کو محتاج ہو جاتے ہیں۔ چنانچہ وہ عیاشی کے سلسلے میں باقاعدہ تنخواہ پر کسی کو ملازم نہیں رکھتا بلکہ اس کے اپنے الفاظ میں "کھڑا کھیل فرخ آبادی" کھیلنے کا قائل ہے۔ جب مٹھو دلال اپنی چکنی چپڑی باتوں سے اس کو آمادہ کر لیتا ہے۔ تو بھی وہ اپنے منشی سے مشورہ کئے بغیر کسی قسم کا وعدہ نہیں کرتا۔ اس تمام کارروائی میں نادل کے ہیرو کا درپردہ ہاتھ ہے۔ لیکن وہ بظاہر منگ کو ایسا کرنے سے روکتا ہے۔ اور ایسی باتیں کرتا ہے کہ جس سے خود منگ کا جذبہ غیرت بیدار ہو سکے۔ چنانچہ منشی کے بار بار سمجھانے پر کہ اس میں پیسہ برباد ہوگا وہ ناراض ہوتا ہے اور خود کو کنجوس کہلوانا پسند نہیں کرتا ہے۔

منگ کے دل میں رحم دلی کا مادہ بھی بہت ہے۔ جب خانم جان اس کی خلوت سے بچ کر آ جاتی ہے اور صبح کو طائفے کے ڈیرے پر جا کر منگ خانم جان کو روتا ہوا پاتا ہے اور تمام طائفے کو خانم جان کو لعنت ملامت کرتے دیکھ کر وجہ پوچھتا ہے تو تمام معاملہ جان کر ہنستا ہے اور خانم جان کی میوہ خوری کے لئے بھی رقم مقرر کر دیتا ہے اور پھر خانم جان کی شوخی سے اس کی تنخواہ بھی بی جان کے برابر کر دیتا ہے۔

اس واقعہ کے بعد میرزائی کا طائفہ تقریباً ایک برس تک اس سے وابستہ رہتا ہے لیکن وہ دوبارہ کبھی خانم جان کے لئے فرمائش نہیں کرتا اور نہ ہی اس کی میوہ خوری کی رقم بند کرتا ہے۔ ملاقاتیں ہوتی ہیں۔ خانم جان سے گانا وغیرہ بھی سنتا ہے۔ لیکن کبھی اس کے جسم کی خواہش نہیں کرتا۔ اس سے منگ کے کردار کی خوبی اور اس کے ظرف کا اندازہ ہوتا ہے۔

حالانکہ خود خانم جان کو اس بات کا احساس ہے کہ ان لوگوں کے درمیان ہمیشہ رہتے ہوئے کسی نہ کسی مرحلے پر اس کی عصمت داغدار ہو جائے گی اور ممکن ہے کہ اگر منگ اصرار کرتا تو میرزائی اور اعظم جی، خانم خان کو مجبور کر دیتے لیکن منگ جسم فروشی کے ایسے معاملوں میں بھی جس کی بنیاد پیسہ ہو۔ زبردستی کا قائل نہیں۔ حالانکہ اس طائفے کی معاشی مجبوریوں کے پیش نظر وہ اپنا مقصود بہ آسانی حاصل کر سکتا تھا۔ اس کی عیاشیانہ زندگی کا یہ تضاد بھی خوب ہے۔ چنانچہ اس کا کردار ہمارے ذہن پر ایک یادگار نقش چھوڑ دیتا ہے۔

اعظم جی نشتر کا ایک اور کردار اعظم جی ہے۔ جو میرزائی کا دیرینہ آشنا ہے اور کبھی ایک صاحب حیثیت تاجر تھا۔ لیکن تجارت میں نقصان ہو جانے کے باعث، تباہ حال ہو کر خود کو میرزائی کے رحم و کرم پر چھوڑ دیتا ہے۔ اس کی سیرت کا کوئی نمایاں نقش ناول میں نہیں ابھرتا۔ اعظم جی کی مثال ان افراد کی ہے جو تماش بینی میں اپنا مال و متاع لٹا کر کسمپرسی کے عالم میں نقش عبرت بن جاتے ہیں یا اپنی آشنا کے ہاں معمولی خدمت پر یاد لالی پر اکتفا کر لیتے ہیں۔ لیکن اس کے اور میرزائی کے درمیان کچھ ایسا رشتہ محبت استوار ہے کہ تباہ ہو جانے کے بعد، میرزائی اسے بے یار و مددگار نہیں چھوڑتی، جو عام طوائفوں کا وطیرہ ہے بلکہ وہ اپنے تباہ حال آشنا سے آشنائی برقرار رکھتی ہے۔ اور اسے اپنے ساتھ اس طرح رکھتی ہے کہ اس کی عزت و تکریم میں کوئی فرق نہیں آنے دیتی۔

اعظم جی اس طائفے کا سربراہ ہے۔ میرزائی کوئی کام اس کے مشورے کے بغیر نہیں کرتی، طائفے کی طوائفوں کو انگریز دل کے ہاں ملازمت کے سلسلے میں بھی اعظم جی کے مشورے کو میرزائی اولیت دیتی ہے۔ وہ میرزائی کے ہمراہ اپنے طائفے کے گاہکوں سے ملاقاتیں کرنے

اور معاملات طے کرنے بھی جاتا ہے۔

ناول میں بیان کردہ واقعات کے مطابق اس کی تباہ حالی کے بعد میرزائی نے ہی اسے مشورہ دیا تھا کہ میں دو تین طوائفیں جمع کرتی ہوں اور تمہاری ہمراہی سے کسب سے روپیہ کماتی ہوں۔

اعظم جی، میرزائی کے اس مشورے کو قبول کر لیتا ہے۔ اعظم کبھی ایک عزتدار اور صاحب ثروت شخص رہ چکا تھا۔ ہمیں اس کے کردار میں کسی ایسی کش مکش کا پتہ نہیں چلتا۔ کہ کیوں غربت و افلاس کی زندگی گزارنے کے بجائے وہ دلال بننا پسند کرتا ہے۔ اگرچہ اس کی دلالی اس طرح کی نہیں ہے کہ وہ ان طوائفوں کے لئے گاہک تلاش کر کے لاتا ہو۔

ایک طرف تو اعظم جی اس پستی کا شکار ہو جاتا ہے۔ اور حالات سے سمجھوتہ کر لیتا ہے لیکن دوسری طرف ہم یہ دیکھتے ہیں کہ وہ خانم جان کے پیشہ کرنے کے حق میں نہیں ہے البتہ اس کے گانے بجانے کی حد تک معترض نہیں ہوتا۔ میرزائی بھی اس سلسلے میں اعظم جی سے متفق ہے۔ تاہم میرزائی کے کردار اور قول و فعل پر اعتبار نہیں کیا جا سکتا۔ کیونکہ وہ پکی نائیکہ ہے۔ لیکن اعظم جی سے امید کی جا سکتی تھی کہ وہ خانم جان کو جسم فروشی کی بھٹی کا ایندھن بن جانے سے بچائے رکھے گا۔ گلبدن کے کسی انگریز کے ساتھ فرار ہو جانے کے بعد اس پورے طائفے پر سراسیمگی اور ہراس چھا جاتا ہے۔ اور انھیں اپنا مستقبل تاریک نظر آنے لگتا ہے۔ ایسی صورت میں میرزائی کا خیال فوراً خانم جان کی طرف جاتا ہے۔ اور وہ گلبدن کے بجائے خانم جان کی خلاف مرضی اس کو بنا سنوار کر منگ کے پاس بھیج دیتی ہے۔ گویا اس وقت رنڈی کی ذہنیت پر اتر آتی ہے۔ لیکن اعظم جی، جو خانم جان کی جسم فروشی کے خلاف تھا۔ اتنا پست ہمت ہے کہ فوراً اس خیال سے تائب ہو جاتا ہے۔

اور میر زائی کو سمجھانے بجھانے کے بجائے خود بھی خانم جان کی جسم فروشی کے حق میں ہو جاتا ہے۔ اعظم جی ایک مرد ہونے کے باوجود اس موقع پر میر زائی سے زیادہ پریشان ہو جاتا ہے غرض ناول میں اعظم جی کا کردار ایک گھٹیا درجے کے دلال کا کردار ہے۔

میر زائی

میر زائی، اعظم جی کی داشتہ اور اس طائفے کی منتظمہ ہے۔ وہ پیدائشی طوائف ہے۔ اس کی عمر تیس برس ہے۔ وہ خوبصورت بھی ہے۔ ابھی اس کے بہت سے عشاق پیدا ہو سکتے ہیں۔ لیکن وہ پیشہ نہیں کرتی۔ وہ ہوشیار اور چالاک عورت ہے۔ اعظم گویے کے بیان کے مطابق وہ ذات کی کسبی ہے۔ جو اعظم جی کے گھر پڑ گئی تھی۔ اب ترک جسم فروشی میں غالباً یہی چیز مانع ہے۔ کیونکہ طوائفوں میں یہ بات عام طور پر دیکھنے میں آئی ہے کہ اگر وہ ایک بار کسی کی ہو جائیں تو پھر دوبارہ کوئی ترغیب انھیں جسم فروشی پر آمادہ نہیں کر سکتی۔ شومئی قسمت سے اس کا آشنا اعظم جی تباہ و برباد ہو جاتا ہے۔ ایسی صورت میں میر زائی اب پھر اپنے پرانے پیشے کی طرف مراجعت کرتی ہے۔ لیکن اب کے صورت دوسری ہے۔ اب وہ خود جسم فروشی نہیں کرنا چاہتی بلکہ ایک طائفہ تشکیل دے کر اس کو اپنا گزر بسر کا ذریعہ بنانا چاہتی ہے۔

چنانچہ گبدن اور بی جان طوائفوں کو لے کر انگریز قدر دانوں کی تلاش میں لاہور سے ہوتے ہوئے ان مقامات کی طرف آتی ہے جہاں ایسٹ انڈیا کمپنی کی فوجوں کی چھاؤنیاں ہیں۔

میر زائی اپنے عاشق اعظم جی کو آسودہ رکھنے کی خاطر دوبارہ اسی دلدل کی طرف واپس لوٹتی ہے۔ یہ اس کی شخصیت کا تضاد ہے۔ کیونکہ طوائفوں کے کردار اس کے برعکس ہوتے ہیں۔ لیکن یہاں وہ ہمیں ایک ایسی عورت کے روپ میں بھی نظر آتی ہے جو

اچھے اور برے ہر حال میں اپنے مرد کے ساتھ رہنا پسند کرتی ہے۔

میرزائی کی گفتگو، اس کا انداز نشست و برخاست، ادبی ذوق، قابلِ تعریف ہے وہ خوش اخلاق اور زندہ دل عورت ہے۔ میرزائی، پرانی رفاقتوں کو نبھانا خوب جانتی ہے چنانچہ خانم جان اسے صرف اس لئے عزیز ہے کہ وہ چنبل جان نامی ایک طوائف کی بیٹی ہے جو مر چکی ہے۔ خانم جان کی پرورش میرزائی نے ہی کی ہے۔ لیکن وہ خانم جان کو اس گندگی سے دور رکھنا چاہتی ہے۔ بہت سے انگریزوں نے خانم جان کو اپنانے کی خواہش کا میرزائی سے اظہار کیا۔ لیکن میرزائی نے نہ مانا۔ اس کا گریز اس سبب سے نہیں تھا کہ خانم جان ابھی بچی ہے۔ وہ جوان ہے۔ اور عمر کی چودہ بہاریں دیکھ چکی ہے۔ اس کا قیامت خیز حسن اور ابھرتی جوانی لوگوں کی تجوریوں کو خالی کرا سکتی ہے۔ لیکن میرزائی اس بات پر آمادہ نہیں ہے یہاں اس کی طوائفانہ فطرت کا تضاد نمایاں ہوتا ہے۔ لیکن خانم جان کی رقص و موسیقی کی تربیت میں کوئی کسر نہیں اٹھا رکھتی۔ البتہ اس قدر خواہش کے باوجود کہ خانم جان گندگی میں ملوث نہ ہو۔ وہ گلبدن کے بھاگ جانے کے بعد اس کو اپنا وسیلہ معاش بنا لینا چاہتی ہے

میرزائی کی انتظامی صلاحیتیں، اس کی نگہ انتخاب، طائفے پر اس کا رعب و داب اور اس کا مہذب و شائستہ انداز، ہمیں امراؤ جان ادا کے ناول میں چکلہ چلانے والی خانم جان کی یاد دلاتا ہے۔ میرزائی رحمدل بھی ہے اور اپنے تمام متعلقین کا بہت زیادہ خیال رکھتی ہے۔ لیکن اپنی خلاف مرضی کسی بات کو پسند بھی نہیں کرتی اور ایسے موقعوں پر فوراً سرزنش کرنا بھی خوب جانتی ہے۔

خانم جان ناول کی ہیروئن خانم جان ایک جاندار اور یادگار کردار ہے۔ وہ ایک چودہ سال کی شوخ و چنچل، فقرہ باز اور حاضر جواب خوبصورت

لڑکی کے طور پر ناول میں ظاہر ہوتی ہے۔ اس آغاز کے بعد اس کی شخصیت اس صورت سے بار بار جلوہ گر ہوتی ہے کہ قاری سے کردار کے مختلف پہلوؤں کو متعارف کراتے ہوئے ناول میں موجود تمام کرداروں میں سب سے زیادہ نمایاں ہو جاتی ہے۔ حتیٰ کہ خود ہیرو کا کردار بھی اس کے آگے پھیکا پڑ جاتا ہے۔ اور سوائے ایک دو مرحلوں کے جہاں ہیرو اپنی ذہانت کو کام میں لاتا ہے باقی ہر جگہ ہم خانم جان کے کردار کو ہی اس پر حاوی دیکھتے ہیں۔

خانم جان جسم فروشی اور رقص و نغمہ کو پسند نہیں کرتی۔ اس کی پوری زندگی طوائفیت کے خلاف ایک خاموش جہاد ہے۔ وہ کوئی انقلابی کردار نہیں ہے۔ اور نہ ہی پناہ کی تلاش میں بار بار مرعلی کے دام فریب میں آنا چاہتی ہے۔ بلکہ وہ کسی ایسے مرد کی منتظر ہے جو اس کا نجات دہندہ بن کر آئے اور جس کو ایک بار وہ اپنا جسم و جان سونپ دینے کے بعد ہمیشہ ہمیشہ کے لئے اس کے ساتھ شریفانہ اور باعزت زندگی گزار دے۔ یہی اس کی زندگی کی سب سے بڑی تمنا ہے۔

ہیرو سے محبت ہو جانے، اور ہیرو کو اچھی طرح سے جانچ پرکھ لینے کے بعد خانم جان جو خطوط محبت ہیرو کو لکھتی ہے اور اس میں جس قسم کے خیالات کا اظہار کرتی ہے انھیں خانم جان کے فلسفۂ حیات کا نچوڑ کہنا چاہیئے۔ ان خطوط کے مطالعے کے بعد یہ کہا جا سکتا ہے کہ خانم جان ایک انتہائی ذہین اور حساس لڑکی ہے۔ ہر چند کہ اس کی عمر کم ہے۔ لیکن ہوشیار طوائفوں کے ساتھ رہنے اور اپنی طبعی ذہانت اور سوجھ بوجھ کے سبب اسے زمانے کے گرم و سرد کا خوب اندازہ ہے۔ اس کو مردوں کے جسمانی قرب کا کبھی تجربہ نہیں ہوا۔ اور اکثر مرد اس کے طلب گار ہوتے ہیں۔ لیکن وہ مردوں کی نفسیات اور ان کی عادتوں سے خوب آگاہی رکھتی ہے۔

خانم جان طوائفوں کے درمیان ہی پلی بڑھی اور پیدائشی اعتبار سے بھی وہ طوائف زادی ہے لیکن اس کے اندر نیکی اور عزت و حرمت کا تصور موجود ہے اور خود کو پاکیزہ اور باعصمت رکھنے کا احساس اس میں شدید ہے۔

بظاہر یہ خواہش اس پورے ماحول کو دیکھتے ہوئے عجیب اور انوکھی معلوم ہوتی ہے۔ خود خانم جان کو بھی اس بات کا احساس ہے کہ ان لوگوں کے درمیان رہتے ہوئے کسی بھی وقت اس کی پاکیزگی آلودہ ہو سکتی ہے۔ یہی احساس اور بلندی پیدا کر دی ہے اور اس سے بچنے کی شدید خواہش نے اسی کے کردار میں عظمت حقیقی .....

زندگی کا کردار ہے جس کو داستانوں کے اختتام کے زمانے میں تخلیق کیا گیا ہے۔ وہ کوئی داستانوی کردار نہیں ہے جو پہلی ہی ملاقات میں اپنے محبوب کو وصل کی دولت سے شاد کام کر دیتے ہیں۔ اپنے ماحول کے تقاضوں کے برعکس اس کا حصول آسان نہیں ہے۔

طائفے میں غیر اخلاقی زندگی کے وجود نے اس کو انتہائی مذہبی اور جذبات پر قابو رکھنے والی بنا دیا ہے۔ وہ اپنے محبوب سے وصل کی خواہش مند تو ضرور ہے اور جب خلوت میں ایسا موقع آتا ہے تو خود کو اس کے سپرد بھی کر دیتی ہے لیکن اس سے قبل وہ نکاح کرتی ہے۔ اپنے پسندیدہ محبوب کو خوب اچھی طرح پرکھنے کے باوجود بھی وہ خوفزدہ ہے کہ کہیں عاشق بے وفائی نہ اختیار کر لے۔ اور مجبوراً ایک طویل مزاحمت کرنے کے بعد اسے اپنے طائفے کے لوگوں کی مرضی کے مطابق خود کو ڈھالنا پڑے۔

ناول نشتر کا مطالعہ کرتے ہوئے خانم جان کا کردار بار بار مرزا ہادی رسوا کے ناول امراؤ جان ادا کے کردار امراؤ جان ادا کی یاد دلاتا ہے جو نشتر کے بعد کی تصنیف ہے۔

خانم جان، امراؤ جان کی طرح خود شاعرہ نہیں ہے لیکن اس کو اعلیٰ درجے کی غزلیں یاد ہیں۔ اس کا ادبی ذوق شائستہ اور بلند ہے۔ برمحل اور برجستہ اشعار پڑھنے میں وہ

امراؤ جان ادا کی طرح ہی ماہر ہے۔ شعر فہمی کا ملکہ بھی اس میں خداداد ہے۔ امراؤ جان کی طرح وہ مردوں کو لبھانے، اپنی طرف لو تجہ دلانے اور ان کی نفسیات سے بخوبی آگاہ ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ دونوں میں کچھ فرق بھی ہے۔ اور بعض مقامات پر خانم جان اپنی انہی خوبیوں کی بنا پر امراؤ جان سے ممتاز نظر آنے لگتی ہے۔

مثلاً خانم جان ایک طوائف زادی ہے اور امراؤ جان ادا شریف زادی، امراؤ جان بچپن میں اغوا کرلی جاتی ہے۔ جبکہ خانم جان اسی طائفے میں پلی بڑھی۔ اس کو طوائفوں کے دستور کے مطابق راگ رنگ اور رقص و موسیقی کی اعلیٰ درجے کی تعلیم بھی دی گئی ہے۔ جو اس پیشے کے لئے ضروری ہے۔ لیکن اس تمام کے باوجود خانم جان میں ہمیں پاکیزہ اور باعصمت زندگی گزارنے کی ایک شدید خواہش نظر آتی ہے۔ اور اس کے سبب سے وہ خلوت میں منگ سے مزاحمت بھی کرتی ہے۔ اور اپنی عصمت محفوظ رکھنے میں کامیاب ہو جاتی ہے۔

دوسری طرف امراؤ جان ادا ایک شریف گھرانے کی لڑکی ہے۔ جس کو اس کے بچپن میں غالباً دس برس کی عمر میں اغوا کر کے طوائف کے ہاتھ بیچ دیا جاتا ہے۔ اس کے کردار میں شروع میں ہی ہمیں کوئی ایسی بات نظر نہیں آتی کہ جس کو اس کے شریف گھرانے کی چھاپ قرار دیا جا سکے۔ اور نہ ہی اس کے کردار میں ہمیں حالات کے دھارے کے خلاف جانے کا جذبہ ملتا ہے۔ بہت ابتدا میں بھی جب کہ ابھی امراؤ جان ادا کی مسی کی رسم بھی ادا نہیں ہوتی تو گوہر مرزا، ایک معمولی ملازم اس کا گلچین اول بن جاتا ہے۔ امراؤ جان ادا کے ہاں ہمیں بار بار یہ حسرت تو ملتی ہے کہ اسے دام ملے یا اور دوسری اغوا شدہ لڑکیوں کی طرح کسی گھر کی بیگم بن کر زندگی گزارنا نصیب ہو جاتی۔ لیکن نامل کے آغاز میں ہی ہم

اس کو اس سیل بلا میں پھنس جانے کے بعد اس کے خلاف مزاحمت کرنے کے بجائے خود کو حالات کے سپرد کر دینے کے آثار نظر آتے ہیں۔ جبکہ خانم جان ایسے مواقع پر مزاحمت کرتی ہے۔ خانم جان، امراؤ جان کی طرح تجربہ کار، جہاں دیدہ اور پختہ عمر کی عورت نہیں ہے۔ لیکن اس کے اندازِ گفتگو سے کسی قسم کے تصنع یا بناوٹ کا پتہ نہیں چلتا۔ چونکہ اس کی تعلیم و تربیت اچھی ہوئی ہے۔ نیز جن لوگوں کے ساتھ وہ زندگی گزار رہی ہے۔ ان کے تجربات سے شناسائی نے اس کی ذہانت اور اندازِ فکر کو ایک جہاں دیدہ اور پختہ کار عورت کا سا انداز عطا کر دیا ہے۔

محبت کے معاملے میں خانم جان اس حد تک دور بین ہے کہ حسن و عشق میں پیدا ہو جانے والی بدگمانیوں کو اپنے اور محبوب سے دور رکھنے کے لئے چند شرائط ہیرو کو لکھ کر بھیجتی ہے۔ وہ دھیمے دھیمے سلگنے والی لکڑی ہے۔ آتش فشاں پہاڑ نہیں۔ وہ کوئی انقلابی کردار نہیں ہے جو ایکدم بغاوت کر دے۔ جسم فروشی تو بہت بڑی بات ہے اسے غیر مردوں کے سامنے آنے جانے، ناچ رنگ اور غزلیں تک سنانا گوارا نہیں ہے۔ لیکن اس تمام کے باوجود وہ جبر و اختیار کی حدود کو پہنچانتی ہے۔ چنانچہ مصلحت وقت کے پیشِ نظر وہ منگ سے تھوڑی بہت راہ و رسم اور ہنسی مذاق کو برقرار رکھتی ہے۔ اپنے رازِ عشق کو پوشیدہ رکھنے کی خاطر وہ منگ کے سامنے اس کے منشی اور اپنے عاشق کا بھی مذاق اڑاتی اور اسے طرح طرح سے تنگ کرتی ہے۔ اس میں اندازِ دلربائی بھی ہے اور شوخی بھی۔ نیز عشق کے معاملات کو خفیہ رکھنے کا جذبہ بھی کارفرما ہے۔

خانم جان پرلے درجے کی خود دار بھی ہے۔ ایک موقع پر جب منگ کے سامنے خانم جان نادل کے ہیرو کو طرح طرح سے تنگ کرتی ہے تو ہیرو کے منہ سے اتفاقاً خانم جان

کے طبقے (طوائفوں) کے بارے میں یہ نکل جاتا ہے کہ یہ لوگ تو پیسے کے بندے ہوتے ہیں۔ خانم جان کو یہ بات ناگوار گزرتی ہے اور کئی روز تک ان دونوں کے درمیان ہر قسم کی گفتگو اور مراسلت بند رہتی ہے۔ آخرکار ہیرو کے معافی مانگنے پر خانم جان اسے معاف کرتی ہے۔ دوسری جانب خانم جان کا یہ رویّہ بھی تعجب انگیز ہے۔ کہ جس وقت خلوت میں رونے کے سبب منگ اسے واپس ڈیرے بھیج دیتا ہے اور صبح کو طائفے کی قیام گاہ پر آتا ہے جہاں میرزائی خانم جان کو رات کے واقعہ پر سخت سُست کہہ رہی ہے۔ منگ صورت احوال سے واقف ہوکر خانم جان کی بلا خدمت تنخواہ مقرر کر دیتا ہے۔ لیکن یہ تنخواہ گلبدن سے کم ہے۔ چنانچہ اس موقع پر خانم جان گلبدن سے کم تنخواہ مقرر ہونے پر اعتراض کرتی ہے۔ اس کی اس گفتگو میں شوخی، برابری کا دعویٰ اور ناز سب ہی کچھ ہے۔ خانم جان یہ بھی جانتی ہے کہ میرزائی کی ناراضگی کا اصلی سبب، کم تنخواہ ہے جو اس پورے طائفے کے لئے ناکافی ہوگی۔ اس موقع پر خانم جان نہایت کامیابی سے عفیفہ رہتے ہوئے اپنی تنخواہ بندھوانے میں کامیاب ہو جاتی ہے۔ دونوں کے درمیان ہونے والی گفتگو ملاحظہ ہو :۔

"صاحب نے کہا کہ اچھا خانم جان اگر روئے نہیں ہم اس کی بھی تنخواہ مقرر کر دیں گے۔"

یہ سنتے ہی آپ (خانم جان) جھٹ پٹ آنسو وانسو پونچھ صاحب کے پاس جا بیٹھیں اور کہا کہ میں صرف دو باتوں کے واسطے روتی تھی۔ ایک یہ کہ چند روز اور مجھے یہ بات منظور نہیں ہے۔ ورنہ یہ تو جانتی ہی ہوں کہ ہر گاہ ان لوگوں میں رہتی ہوں کب تک بچوں گی۔ دوسرے یہ کہ سو روپے میں ان کی بسر اوقات کیسے ہوگی جس کا باعث میں ہی کم بخت ہوں۔"

صاحب نے کہا "اچھا پچاس روپے تم کو بھی میوہ خوری کو دیں گے۔"

خانم جان نے کہا۔ "میری حمیت اس بات کی متقاضی کا ہے کو ہوگی کہ بی جان کے سو روپے

ہوں اور مجھے پچاس روپے ملیں۔"

صاحب نے کہا: "وہ مجھ سے راضی ہو گئی اگر تم راضی ہوتیں تو تم کو ڈھائی سو روپے ماہوار دیتا تھا۔"

اس نے ہالہ "پھر پچاس روپے بھی کس لئے آپ دیتے ہیں؟"

صاحب نے کہا: "جس میں تم روڈ نہیں اور آوارہ نہ ہو۔ اور دوسرے یہ کہ بی جان کی باتوں سے جی نہیں بہلتا تمھاری پیاری پیاری باتیں اچھی معلوم ہوتی ہیں۔"

اس عیار نے جواب دیا: "جب یہ بات ہے تو تنخواہ میری کم کیوں کرتے ہو۔ جو لوگ سیرت اور خوش بیانی کے قدردان ہوتے ہیں وہ دوسری باتوں پر اس کو فوق دیا کرتے ہیں۔"

صاحب نے ہنس کر کہا: "معلوم ہوتا ہے کہ ہم سنی کی غیرت سے تم کو بی جان سے کم تر رہنا گوارا نہ خیر تو تم دھی سو روپے ماہوار دیں گے... مگر خبردار اب رونا نہیں۔"

"اپ (خانم جان) نے اٹھ کر بندگی کی اور کہا اب رونے دھونے کی کیا ضرورت ہے خدا آپ جیسے قدردان کو سلامت رکھے۔"

تمام قصے میں خانم جان کا کردار اپنی حاضر جوابی، شگفتہ گفتگو، ادبی ذوق اور دوسری خوبیوں کی بنا پر ممتاز ہوتا چلا جاتا ہے۔ وہ کم عمر ہے لیکن اس کی باتوں سے اس کی ذہنی بلوغت اور پختہ کاری اور اپنی ذات پر کامل اعتماد کا اظہار ہوتا ہے۔ اس کی زندگی کا انجام حزنیہ ہے وہ اپنے محبوب کو بے وفا سمجھتی ہے اور اس کے فراق میں گھل گھل کر جان دے دیتی ہے۔

ہیرو کا کردار

اس ناول کا تمام قصہ، ناول کا ہیرو واحد متکلم کے صیغے میں بیان کرتا ہے۔ قصے کا ہیرو ایک سیدھا سادا نوجوان ہے۔ جو

۱۔ نشتر ص ۶۳-۶۲

خوبصورت ہے۔ اور میر زایانہ مزاج رکھتا ہے۔ پہلی ہی ملاقات میں وہ خانم جان پر دل و جان سے فدا ہو جاتا ہے۔ ہیرو ابھی کم سن ہے۔ اور اس کم سنی میں ڈیرے دار طوائفوں میں اٹھنے بیٹھنے کا یہ اس کا پہلا موقع ہے۔ اولین ملاقاتوں میں ہی وہ ان لوگوں سے بہت زیادہ ربط و ضبط بڑھا لیتا ہے۔ اس زمانے کی عام مجلسی زندگی کے پیشِ نظر، ہیرو کا یہ بے تکلف اختلاط کچھ زیادہ تعجب خیز نہیں آتا۔ ہیرو خوبصورت اور طرحدار ہے اور ابھی اس کا بھی آغاز شباب کا ہی زمانہ ہے۔ اوّل اوّل اس کا ادبی مذاق اس طائفے سے ربط و ضبط بڑھانے کا سبب بنتا ہے۔

قصّے کے دوران نادل کا ہیرو بہت کم اپنی مرضی سے کوئی فیصلہ کرتا ہوا ملتا ہے۔ اور بہت کم اپنے عقل و تدبر سے کام لیتا ہے۔ ہر جگہ وہ ہیروئن کے بتائے ہوئے راستے پر چلتا نظر آتا ہے۔ اس میں قوت فیصلہ کی بھی کمی ہے اس کی چالاکی اور منصوبہ سازی ایک تو اس وقت ظاہر ہوتی ہے۔ جب وہ نہایت ہوشیاری سے ایک دلاّل کے ذریعے اپنے آقا منگ کو اس بات پر اکساتا ہے کہ وہ خانم جان کے طائفے کو اپنے ہاں ملازم رکھ لے۔ اور خود منگ کو اس طائفے کے ملازم رکھنے کے خلاف دلائل دے کر منگ کے آتش شوق کو بھڑکاتا ہے۔ ایسی صورت میں عموماً عیاش طبع لوگوں کو اخراجات وغیرہ کا خوف دلایا جاتا ہے۔ ہیرو بھی نہایت چالاکی اور ہوشیاری سے منگ کی توجہ اس جانب مبذول کراتا ہے۔ جس کی بنا پر منگ کو اور زیادہ غصہ آجاتا ہے۔ جوں جوں ہیرو اس طائفے کو ملازم نہ رکھنے کے سلسلے میں اظہار رائے کرتا ہے۔ ویسے ویسے منگ کا ارادہ طائفے کو ملازم رکھنے کے سلسلے میں پختہ ہوتا جاتا ہے۔ روپے پیسے کے ذکر کو وہ اپنی توہین سمجھتا ہے اور ہیرو پر ناراض ہوتا ہے۔ یوں دوہری چال چل کر ہیرو اپنے مقصد میں کامیاب ہو جاتا ہے۔ اور منگ اس طائفے کو ملازم رکھ لیتا ہے۔

نادل کا ہیرو ضعیف الاعتقاد بھی ہے۔ وہ تعویز گنڈوں اور فال نکالنے کا عادی ہے بات بات میں فال کا سہارا لینا اس کی ضعیف الاعتقادی کو ظاہر کرتا ہے۔ ہمارے خیال میں اس زمانے کے معاشرے میں ضعیف الاعتقادی اور مذہب کا اس صورت سے استعمال عام لوگوں کا وطیرہ تھا۔

اصول ضابطے اور دفتری امور کی پابندی کے سلسلے میں ہیرو بہت زیادہ محتاط ہے۔ حتیٰ کہ سرکاری امور کی انجام دہی میں مصروف رہ کر وہ اپنے عشق کو بھی بالائے طاق رکھ دیتا ہے۔ اور محبوبہ کے تعاقب میں جانے اور اس کو حاصل کرنے کی نازک گھڑی میں بھی جب اس سے کسی باغیانہ اقدام کی توقع کی جاسکتی تھی وہ حساب کتاب کے معاملات میں ہی الجھا رہتا ہے۔ اور بعد از مرگ واویلا کرتا ہے۔ اپنی محبوبہ کے تعاقب میں ناکام ہو جانے کے بعد جو قیاس آرائیاں اور منصوبہ سازیاں وہ بعد میں سوچتا ہے۔ ان پر اگر پہلے ہی عمل کر لیتا تو بہتر ہوتا۔

نادل کے ہیرو شاہ حسن میں ارادے کی پختگی مفقود ہے۔ وہ سادہ لوح عاشق ہے اس کی اس سادگی، نوجوانی اور معصومیت پر خاتم جان کے علاوہ بھی اس طائفے کی ساری طوائفیں فریفتہ ہیں۔ بہر حال عشق میں بے لوثی، جذبے کی شدت اور محبت کی بے قراری اس کی ذات کے خاص جوہر ہیں۔ ایک طرف اپنی محبوبہ کو قریب رکھنے کے لئے وہ کوشش کر کے اس کے طائفے کو منگ کے ہاں ملازم کراتا ہے۔ اور پھر خود ہی اس سلسلے میں پریشان ہو جاتا ہے کہ ایسا کرنے سے اس کی محبوبہ کی پاکدامنی متاثر ہو جانے کا ڈر ہے۔ یہ سوچ کر وہ جس کرب اور بے چینی سے گزرتا ہے۔ وہ دیدنی ہے اور پھر خود ہی اپنی محبوبہ کی حفاظت اور اس کی عصمت و عفت کی حفاظت کے لئے رات بھر وظیفہ کرتا ہے اور کامیاب ہوتا ہے۔ وہ دیانت دار ہے۔ منگ کو اس پر کامل اعتماد ہے۔ اسے سرکاری کاموں کی بجا آوری اور زندگی گزارنے کے طریقوں سے بھی کما حقہ واقفیت ہے لیکن معاملات عشق میں اناڑی ہے۔

خانم جان میں اپنی دلچسپی کو پوشیدہ رکھنے کے لئے وہ نہایت احتیاط کرتا ہے۔ خانم جان کی طرح اس کو بھی انگریزوں اور دوسرے عیاش طبع لوگوں کے سامنے خانم جان کا آنا جانا پسند نہیں ہے۔ غیرت مند ہونے کے ساتھ ساتھ وہ اپنی مجبوری کو سمجھتا ہے۔ کیونکہ وہ جانتا ہے کہ بہر حال خانم جان کا تعلق طوائفوں سے ہی ہے۔ اور اس کی کچھ ایسی مجبوریاں بھی ہیں جو اس کے ماحول کے جبر نے اسے عطا کی ہوئی ہیں۔ البتہ جہاں ہیرو بعض مجبوریوں کے موقع پر، بے دست و پا رہ جاتا ہے۔ وہاں خانم جان ہر آزمائش سے کامیاب ہو کر نکلتی ہے۔ اس ناول کے ہیرو اور ہیروئن کسی قسم کی پاک محبت یا افلاطونی محبت کے قائل نہیں ہیں۔ وہ عشق میں جسم و جان کے تمام مرحلوں سے گزر جانا چاہتے ہیں۔ جنسی جذبہ دونوں میں موجود ہے۔ البتہ خانم جان کو محبت میں پاکدامنی مطلوب ہے۔ اور وہ اپنے جسم کو محبوب کو پیش کرنے سے قبل خفیہ طریقے پر اس سے نکاح پڑھوا لیتی ہے۔ دونوں کردار جنس کی بے پناہ کشش کے قائل نظر آتے ہیں۔ خانم جان اس لئے بھی جلد از جلد یہ رشتہ قائم کرنا چاہتی ہے کہ اسے یہ سکون و طمانیت حاصل ہو جائے کہ اس کی روح کے مالک نے ہی سب سے پہلے اس کے جسم کے لمس کو محسوس کیا تھا۔

رحم اللہ کا کردار

اس ناول میں رحم اللہ ننھے قاصد کے روپ میں نظر آتا ہے۔ ہمارے قصوں کہانیوں میں اس قسم کے کردار کوئی نئے اور اجنبی نہیں ہیں۔ لیکن نشتر پر بحث کرتے ہوئے اکثر ناقدین نے یہ سوال اٹھایا ہے کہ مصنف نے جس طور پر رحم اللہ کے کردار کو متعارف کرایا ہے اس کی ضرورت تھی بھی یا نہیں؟ اور کیا ناول کے فارم میں وہ موزوں کردار کی حیثیت سے نظر بھی آتا ہے یا نہیں؟

میرے خیال میں ناول نگار کے لئے کسی ایسے کردار کی ضرورت تو تھی کہ جس سے

ہیرو اور ہیروئن کے درمیان خطوط اور پیغامات کا تبادلہ ہو سکتا۔ غالباً ایسی صورت میں کسی بڑی عمر کی عورت یا مرد کو درمیان میں لانے سے کئی طرح کے خدشات پیدا ہو سکتے تھے۔ طائفے کے ملازمین یقینی طور پر ہیرو سے زیادہ اپنے مالکان کے وفادار ہو سکتے تھے۔ پھر رازداری کی قیمت زیادہ ادا کرنا پڑتی۔ رحم اللہ ایک ماما کا جو طائفے میں ملازم تھی، کم عمر لڑکا۔ جو چند پیسوں میں خوش ہو جاتا ہے لیکن اصل میں اس کردار پر اعتراضات کی میرے نزدیک چند دوسری بنیادی وجوہ ہیں۔ اپنی کم عمری کے باوجود وہ اولین ملاقات میں ہیرو کے دلی جذبات کا اندازہ لگانے کے لئے جس طور پر گفتگو کرتا ہے۔ وہ ناقابلِ یقین ہے۔ اتنی چھوٹی سی عمر میں پختہ کار لوگوں جیسی باتیں کرنا یقیناً حیرت ناک ہے۔ اقتدار عالم نے بجا طور پر رحم اللہ کے کردار پر بحث کرتے ہوئے اپنے مضمون[1] میں لکھا ہے کہ اس عمر میں ایسی باتیں کرنے والے کو تو جن ہی سمجھ کر خوفزدہ ہوا جا سکتا ہے۔ کیونکہ اس کی باتیں کٹنیوں کو بھی مات کرتی ہیں۔

ہمارے خیال میں یہ ناول کا کوئی فالتو کردار نہیں ہے۔ کہانی کے سلسلے کو مربوط رکھنے اور اسے آگے بڑھانے میں یہ کردار معاون ثابت ہوتا ہے۔ البتہ بنیادی اعتراض اس کردار پر ایسے مکالمات کی ادائیگی ہے جو اس کی عمر کے بچے کے لئے قرینِ قیاس معلوم نہیں ہوتیں۔ اس کردار کی حد تک ہم ناول کے مصنف میں اس شعور کی کمی پاتے ہیں جس کو جدید تنقید کی روشنی میں، ہر کردار کے حسبِ حال اس سے مکالمہ ادا کرانا ہے۔ مصنف نے طوائفوں کی زندگی، ان کے مکالمات وغیرہ کو نہایت موزوں اور فطری انداز میں پیش کیا ہے۔ اور اس کا مشاہدہ بھی غضب کا ہے۔ لیکن رحم اللہ کے کردار کو اس کے فطری انداز میں پیش کرنے میں مصنف ناکام رہا ہے۔ رحم اللہ کی زبان سے جو گفتگو جن مواقع پر بھی اس ناول میں پیش کی گئی ہے۔

---

[1] ۔ ارمغان میں ناول نگاری کی ابتدا ایک نیا زاویۂ نظر مطبوعہ نقش۔

اس میں مصنف کے زورِ بیان عبارت آرائی اور مبالغے کو زیادہ دخل ہے۔

ناول پر عمومی بحث

ناول میں پلاٹ کی تعمیر کا اچھا انداز ملتا ہے۔ واقعات تناسب و ترتیب کے ساتھ ہمارے سامنے لائے جاتے ہیں۔ پہلا باب ناول کے ہیرو کی اعظم جی گویّے سے ملاقات پر شروع ہوتا ہے اور ابتدائی باب میں ہی تمام کردار ہمارے سامنے لاکر نہایت مختصر اور مکمل طور پر متعارف کرا دیئے جاتے ہیں۔ ابتدائی باب سے ہی ناول کی ہیروئن خانم جان کے بارے میں جو رائے قائم ہو جاتی ہے۔ وہ ناول کے اختتام تک باقی رہتی ہے۔ اور تمام واقعات اس کی توثیق کرتے چلے جاتے ہیں۔

ناول میں غیر ضروری طوالت سے گریز کرتے ہوئے ہر واقع کو اس کی ضرورت کے مطابق بیان کیا گیا ہے۔ مثلاً "کمن نامی انگریز" کا ذکر چونکہ اس قصّے سے براہِ راست اس کا کوئی تعلق نہیں تھا لہٰذا ایک ہی فقرے میں اس کے عیاشانہ مزاج کا تذکرہ کرتے ہوئے کہانی کو آگے بیان کر دیا گیا ہے۔

اسی طرح خانم جان کے کردار کے سلسلے میں اس کے حالاتِ زندگی جہاں بیان ہوئے ہیں۔ وہاں اس بات کی زیادہ تفصیل کی ضرورت نہ تھی کہ اس کی ماں کن پٹھانوں کے درمیان بیاہی گئی تھی۔ اور کہاں رہی تھی۔ صرف سرسری سا تذکرہ کرنے کے بعد ناول نگار آگے بڑھ جاتا ہے

منگ کے کردار کو تفصیل کے ساتھ بیان کیا گیا ہے۔ چونکہ ناول میں صرف اس کی زندگی کے ایک اہم رخ یعنی عیاشانہ زندگی کو پیش کرنا مقصود تھا۔ لہٰذا صرف ایسے ہی واقعات کو چُنا گیا ہے خانم جان اور اس طائفے کی دوسری طوائفوں کے ساتھ ربط و ضبط کی وجہ سے اس کا کردار آخر تک قصّے کے ساتھ ساتھ چلتا ہے اور ہیرو ہیروئن کے علاوہ ناول کا سب سے زیادہ جاندار کردار نظر آتا ہے۔ منگ کا کردار اس عہد کے تمام انگریز افسران کے کردار، بالخصوص ان

کی جنسی زندگیوں کی بھرپور عکاسی کرتا ہے۔ البتہ ناول میں اس کی اپنی انفرادی خوبیاں بھی اجاگر ہیں۔ جو لازماً ہر انگریز اور خاص طور پر اسٹیٹ انڈیا کمپنی کے ابتدائی دور میں پیدا ہونے والے نو دولیتے انگریز طبقے میں موجود نہیں تھیں۔ اس کی وجہ منگ کا خاندانی پس منظر ہے۔

اپنے اردگرد کے لوگوں کے ساتھ فیاضی، حسن سلوک، اور طبقہ شرفا کے وہ لوگ جو اس کی ملازمت میں ہوں ان سے اس کا سلوک قابلِ تعریف ہے۔

یہ کرداری ناول ہے جس کو واحد متکلم کے صیغے میں بیان کیا گیا ہے۔ اس کا قصہ سیدھا سادا ہے نہ تو زیادہ پیچیدگی ہے نہ ہی سنسنی خیزی یا بے پناہ دشواریاں اور مہمات ہیں۔ عاشق و معشوق کے درمیان رکاوٹ موجود ہے لیکن قصہ کے ساتھ ساتھ یوں معلوم ہوتا ہے کہ عاشق و معشوق اپنے مقصد میں کامیاب ہو جائیں گے۔ آخر میں ہیرو کی چند معمولی کوتاہیوں کی بنا پر محبت کا ایک المیہ جنم لیتا ہے۔

عاشق و محبوب کے شدید جذبات و احساسات اور لگاؤ کو دیکھتے ہوئے اور پھر ان سوانحات کو دیکھتے ہوئے جن سے نبرد آزما ہونا ہیرو کے لئے کوئی زیادہ مشکل نہ تھا۔ ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ خانم جان کی تقدیر میں یوں ہی لکھا تھا۔

زبان و بیان کے لحاظ سے بھی ناول بہت خوب ہے۔ مصنف نے ہر موقع پر حسبِ حال اشعار بیان کئے ہیں جن سے شدت تاثر میں اضافہ ہوتا ہے۔

میر محسن لکھنوی

محسن لکھنوی کا نام اور خاص طور پر ان کا تذکرہ سراپا سخن جس قدر مشہور ہے۔ اسی قدر ان کے حالاتِ زندگی پردہ گمنامی میں ہیں۔ تذکرہ سراپا سخن تو کئی بار شائع بھی ہو چکا ہے۔ لیکن ان کے کلام کی اشاعت عمل میں نہیں آئی۔ اور نہ کسی ایسے قلمی نسخے کی ابھی تک دریافت ہوئی ہے کہ جس میں ان کا پورا شعری سرمایہ محفوظ ہو۔ ان کا مختصر سا کلام تذکرہ سراپا سخن سے ملتا ہے۔ یہ وہ غزلیں ہیں جنھیں محسن لکھنوی نے سراپا سخن میں تذکرے کی تقسیم کے متعلق موضوعات کے اعتبار سے پیش کرنے کی۔ خاطر لکھا ہوگا۔ تادم تحریر ان کا مطبوعہ کلام کا ماخذ بس سراپا سخن ہی ہے۔ چند متفرق اشعار جو مختلف تذکروں میں ملتے ہیں۔

محسن کے حالاتِ زندگی بھی مختصراً سراپا سخن میں ہی ملتے ہیں۔ محسن لکھنوی، شاہ حسین حقیقت کے لڑکے تھے۔ شاہ حسین کی اولاد کے بارے میں کوئی تفصیل نہیں ملتی۔ لہذا نہیں کہا جا سکتا کہ محسن کے کتنے بھائی اور بہن تھے۔

اپنے مولد و مسکن کا ذکر کرتے ہوئے محسن لکھتے ہیں "والد ماجد (شاہ حسین حقیقت) اپنے نانا حکیم میر محمد نواز صاحب مرحوم کے ساتھ اودھ کے دارالسلطنت لکھنؤ میں آکر مقیم ہوئے۔ اس سبب سے اس خادم کا مولد و مسکن یہاں ہے۔"[1]

۱:۔ تذکرہ سراپا سخن ص ۱ مطبوعہ مطبع مصطفائی لکھنؤ۔

محسن لکھنوی کا صحیح سنہ پیدائش معلوم نہیں ہے۔ البتہ انھوں نے اپنا مولد لکھنؤ بتایا ہے۔ اس بنا پر یہ قیاس کیا جا سکتا ہے کہ ان کی پیدائش ۱۷۸۶ء کے بعد کی ہے۔ کیونکہ اسی سال یا اس سے کچھ عرصہ بعد حقیقت لکھنؤ آئے تھے۔ اس سے پہلے وہ اپنے اپنے برادر بزرگ سید حسن شاہ ضبط کے ساتھ کانپور میں مقیم تھے۔ جہاں ضبط، ایک انگریز افسر منگ کے منشی کے فرائض سرانجام دیتے تھے۔ ہم حقیقت کے حالاتِ زندگی میں یہ بات کہہ آئے ہیں کہ جس وقت شاہ حسن ضبط اپنا سلسلۂ ملازمت منقطع کر کے قصبہ جاج مئو (کانپور) سے لکھنؤ آئے۔ تو اس وقت ان کی عمر پندرہ سولہ برس اور ان کے چھوٹے بھائی حقیقت کی عمر تیرہ چودہ برس تھی۔

حقیقت کے سنہ پیدائش کے سلسلے میں ہم مختلف شواہد کی بنا پر گزشتہ باب میں یہ طے کر چکے ہیں کہ وہ ۱۷۷۱ سنہ عیسوی (۱۱۸۶ سنہ ہجری) میں پیدا ہوئے تھے۔ گویا ۱۷۸۶ء لکھنؤ میں حقیقت کی آمد کا سال ہے۔ اس وقت حقیقت کی عمر چودہ برس کے لگ بھگ تھی۔ اگر اس زمانے کے رسم و رواج کے مطابق ان کی شادی کی عمر اٹھارہ برس قیاس کی جائے تو گویا ۱۷۹۰ سنہ عیسوی کے لگ بھگ حقیقت کی شادی ہوئی ہوگی۔ اس حساب سے ہم ۹۲-۱۷۹۱ء کو محسن لکھنوی کا سنہ پیدائش قرار دے سکتے ہیں۔

محسن لکھنوی کے حالاتِ زندگی کے بارے میں ان کے خاندان کے ایک نامور فرزند میجر جنرل سید شاہد حامد صاحب نے جو معلومات فراہم کی ہیں ان کے مطابق محسن لکھنوی، لکھنؤ کے اٹکی محلے میں پیدا ہوئے تھے۔ مروجہ تعلیم و تربیت پائی تھی۔ شعر و ادب کا ذوق فطری تھا۔

گو شاعری ان کا فن خاندانی تھا۔ لیکن اس زمانے کی عام لکھنوی فضا ہر شخص میں

شعر گوئی اور شعر فہمی کی صلاحیتیں بیدار کر دیتی تھی۔ چنانچہ عنفوان شباب میں، محسن لکھنوی بھی شعر گوئی اور تذکرہ نگاری کی طرف مائل ہوئے۔ وہ اعلےٰ درجے کا علمی ذوق رکھتے تھے۔ چنانچہ بہت سی قدیم علمی کتابیں۔ ان کے ایما یا تحریک پر ناشرین، خاص طور پر مطبع مصطفائی نے شائع کیں۔ ایسی کتب میں خود محسن کے والد، شاہ حسین حقیقت کی بھی بعض کتابیں تھیں۔ خزینۃ الامثال کا دوسرا ایڈیشن انہی کی کوششوں اور ایما سے مطبع مصطفائی سے شائع ہوا تھا۔

محسن لکھنوی نے جب شاعری کی طرف توجہ کی تو رواج کے مطابق، کسی استاد کی تلاش ہوئی۔ سلسلہ ناسخ کے مشہور شاعر وزیر اس زمانے کے ممتاز شعرا میں سے تھے۔ محسن نے ان کے سامنے زانوئے تلمذ تہہ کیا۔ گو کچھ عرصہ کے لئے محسن نے رشک سے بھی استفادہ کیا تھا اسے بھی ایک طرح سے اتادی شاگردی کا تعلق ہی کہا جا سکتا ہے۔ چنانچہ اسی سبب سے بیشتر تذکرہ نگاروں نے محسن کو خواجہ وزیر اور رشک دونوں کا شاگرد لکھا ہے۔ البتہ اتنا ثابت ہے کہ محسن نے قیام کانپور کے زمانے میں، اپنا کلام رشک کو دکھایا تھا۔ یہ بات وثوق سے نہیں کہی جا سکتی کہ آیا اپنے استاد خواجہ وزیر کے بعد انھوں نے رشک سے مشورہ سخن کیا تھا۔ یا عارضی طور پر صرف کانپور کے زمانۂ قیام میں انھیں اپنا کلام دکھاتے اور ان کے مشوروں سے مستفید ہوتے رہے تھے۔

اردو کے تمام تذکروں میں انھیں رشک اور وزیر کا شاگرد لکھا گیا ہے۔ البتہ مشہور فرانسیسی مستشرق گارساں دتاسی اس سلسلے میں غلط فہمی کا شکار ہو گئے اور انھوں نے رشک و وزیر کو محسن لکھنوی کا رشتے دار بتایا ہے۔ چنانچہ وہ لکھتے ہیں۔

"اس تذکرے (سراپا سخن) کے مصنف کا نام محسن ہے۔ یہ حقیقت کے بیٹے اور وزیر کے پوتے ہیں۔ محسن کے باپ اور دادا دونوں اردو کے

مشہور شاعروں میں سے ہوئے ہیں۔ محسن کے خاندان کے دو بزرگوں رشک اور عشقی نے ان کی پرورش کی تھی۔ رشک بھی شعر کہتے تھے اور عشقی نے شعرائے اردو کا ایک تذکرہ لکھا ہے۔"[1]

گارساں دتاسی کو اس سلسلے میں غلط فہمی ہوئی۔ خطبات گارساں دتاسی کے اردو ترجمے مطبوعہ انجمن ترقی اردو میں بابائے اردو ڈاکٹر مولوی عبدالحق نے ایک نوٹ میں اس غلطی کی تردید کی ہے۔ وہ لکھتے ہیں:۔

"مصنف کو غلط فہمی ہوئی ہے۔ محسن وزیر کے پوتے نہیں تھے۔ بلکہ ان سے کسی قسم کا رشتہ بھی نہ تھا۔ البتہ وہ وزیر کے شاگرد تھے۔ اور اس کا ذکر خود انھوں نے اپنے تذکرے میں کیا ہے۔ ان کے دادا کا نام عرب شاہ تھا۔ رشک اور عشقی ان کے خاندان کے بزرگ نہ تھے۔ عشقی ان کے دوست تھے اور رشک سے ان کو تلمذ تھا۔ ان کو رشک اور وزیر کی شاگردی کا فخر حاصل تھا موئف خطبات کو ان صاحبوں کے تعلقات کے سمجھنے میں مغالطہ ہوا ہے۔"[2]

خوش معرکہ زیبا کا مولف لکھتا ہے:۔

"سید خجستہ خصال شیریں مقال غیر ممکن اس سے ممکن، میر محسن علی، تخلص محسن صاحب منش دلیاقت خلف الصدق منشی شاہ حسین حقیقت، سید موصوف نے ایک تذکرہ اشعار تعریف سراپا میں لکھنا شروع کیا ہے۔ الٰہی انجام اس کا بخیر ہو، پہلے وہ شاگرد خواجہ وزیر کے تھے بہ سبب سکونت کانپور کے میر علی اوسط رشک سے تلمذ حاصل ہوا۔"

۱:۔ گارساں دتاسی ص۔ (۲) تذکرہ خوشی معرکہ زیبا از سعادت خاں ناسخ مرتبہ مشفق خواجہ مطبوعہ مجلس ترقی اردو ادب لاہور۔ ص

سلسلۂ معاش

محسن لکھنوی کی ساری زندگی لکھنؤ میں بسر ہوئی۔ لکھنؤ میں ان کا ذریعہ معاش کیا تھا؟ اس سلسلے میں کچھ معلوم نہیں ہے۔ میرا خیال ہے کہ لکھنؤ میں ان کی گزر بسر کا ذریعہ صرف وہ وظیفہ تھا جو ان کے والد اور چچا کی خدمات کے صلے میں ان کی اولاد کو ملتا تھا۔ محسن لکھنوی چونکہ قناعت پسند واقع ہوئے تھے۔ لہٰذا معاش کے سلسلے میں کسی قسم کی بھاگ دوڑ ان کی افتادِ طبع کے خلاف تھی۔ معرکہ زیبا سے معلوم ہوتا ہے کہ ۱۲۶۱ ہجری میں محسن لکھنوی کانپور میں بہ سلسلۂ تجارت مقیم تھے۔ اس زمانے میں سعادت خاں ناصر نگینوی تذکرہ خوش معرکہ زیبا لکھنے میں مصروف تھے۔ محسن لکھنوی اپنا اور دوستوں کا کلام اس تذکرے کے لئے انھیں بھیجتے تھے۔

البتہ کانپور میں انھوں نے اپنے زمانۂ قیام میں تجارت شروع کی تھی۔ یہاں انھوں نے ایک مطبع اور ایک اشاعت گھر قائم کیا تھا۔ تاہم ان کی سادہ لوحی اور شاعرانہ مزاج کی بنا پر یہ تجارت ناکام ہوگئی اور نقصان اٹھانے کے بعد انھوں نے اس کو بند کر دیا۔ اس وقت بعض دوستوں کی بے رخی نے بھی انھیں رنج پہنچایا۔

خراب معاشی حالات اور دوستوں کی بے رخی کے زمانے میں ان کے گہرے دوست شیخ الٰہی بخش عشقی نے ان کی دلجوئی اور دلداری کی۔ شیخ الٰہی بخش عشقی خود بھی اچھے شاعر تھے۔ ان کا کلام محسن کے مرتبہ تذکرہ سراپا سخن کے علاوہ اس زمانے میں لکھے جانے والے دوسرے تذکروں میں بھی ملتا ہے۔ محسن نے انھیں محبِ صادق اور شفیقِ دلی کے القاب سے یاد کیا ہے۔

محسن لکھنوی نے اپنے قائم کردہ اس مطبع سے کونسی کتب شائع کی تھیں۔ ان کے بارے میں بھی کچھ معلوم نہیں ہے۔

شخصی محاسن

محسن لکھنوی پسندیدہ عادات کے مالک تھے۔ اپنے اوصاف حمیدہ، وضعداری و شرافت کے سبب لوگوں میں بہت مقبول تھے۔ اسی سبب سے ان کا حلقۂ احباب بہت وسیع تھا۔ اپنے زمانے میں لکھنؤ کی ادبی محفلوں اور مشاعروں کی زندگی تھے۔ مزاج شاعرانہ اور روش قلندرانہ تھی۔ گو خود بھی مالی طور پر بہت زیادہ خوشحال نہ تھے۔ لیکن اپنی استطاعت سے زیادہ غریبوں اور حاجت مندوں کی مدد کیا کرتے تھے۔ حتیٰ کہ بعض اوقات ضرورت مندوں کو سردیوں کے موسم میں اپنا لحاف اور بستر تک دے دیا کرتے تھے۔

محسن لکھنوی آخری عمر میں تارک الدّنیا ہو گئے تھے اور درویشی اختیار کر لی تھی۔

محسن کی اہلیہ

کم سنی میں ہی محسن لکھنوی کی شادی ہو گئی تھی۔ دونوں میاں بیوی میں بہت زیادہ محبت تھی۔ تنگدستی و مفلسی کے باوجود ان کی ازدواجی زندگی خوشگوار تھی۔ ان کی اہلیہ بھی اس زمانے کے معیار کے لحاظ سے تعلیم یافتہ تھی۔ وہ حافظۂ قرآن بھی تھیں۔ آخری عمر میں کچھ سنک دماغ میں پیدا ہو گئی تھی۔ چنانچہ اوراد و وظائف کثرت سے پڑھا کرتی تھیں۔ اور ساری ساری رات کھڑے ہو کر قرآن شریف کی تلاوت کیا کرتی تھیں۔

اولاد

محسن لکھنوی کے چار لڑکے اور ایک لڑکی تھی۔ سب سے بڑے لڑکے کا نام سید محمد حسین تھا۔ ان سے چھوٹے سید احمد حسین، سید علی حسین، اور سید جعفر حسین تھے۔ لڑکی کا نام کنیزہ فاطمہ تھا۔ ان کی اولاد میں سے دو لڑکے نامور ہوئے۔ ایک سید محمد حسین جو بعد میں سید محمد حسین لندنی کے نام سے معروف ہوئے۔ یہ زراعت کی اعلیٰ تعلیم کے لئے انگلستان بھی گئے تھے۔ جہاں ایک

حادثے میں ان کی ایک ٹانگ ٹوٹ گئی تھی۔ ملکہ وکٹوریہ نے، جن کی رحمدلی مشہور ہے انھیں اپنا منہ بولا بیٹا بنالیا تھا۔ اور انہی کے اخراجات پر محمد حسین لندنی نے تعلیم حاصل کی۔ سید محمد حسین نے زراعت کے موضوع پر کئی کتابیں بھی لکھی تھیں۔

محسن کے دوسرے نامور فرزند خان بہادر سید جعفر حسین لکھنوی تھے۔ انھوں نے بھی اپنی محنت اور جدوجہد سے معاشرے میں قابلِ رشک مقام بنایا۔ اور صوبجات متحدہ کے نامور انجینئر ہوئے۔ سید جعفر حسین کی زندگی کو مرزا رسوا نے اپنے ناول ، شریف زادہ کا موضوع بنایا تھا۔ سید جعفر حسین کو آج کل کی اصطلاح میں (SELF-MADE) کہنا چاہیئے۔ ان کے تفصیلی حالات ہم آئندہ پیش کریں گے۔ محسن کے باقی لڑکوں کے بارے میں تفصیلی حالات نہیں ملتے۔

وفات

محسن کے سالِ وفات کا صحیح تعین نہیں کیا جا سکتا۔ ۱۸۷۱ء کے لگ بھگ ان کا انتقال ہوا۔ تذکرہ شمیم سخن کے مولف مولوی عبدالحئی صفا بدایونی نے ان کا ذکر ان شعرا میں کیا ہے جو ۱۲۸۸ھ (۱۸۷۳ء) تک انتقال کر چکے تھے[1]۔

۱۔ تذکرہ شمیم سخن ص ۲۴

تذکرہ سراپا سخن

تذکرہ نگاری اردو تنقید کی ابتدا ہے۔ قدیم تذکروں میں زیادہ تر تاثراتی تنقید ملتی ہے۔ اور یہ تنقید بھی چند فقروں تک ہی محدود ہوتی ہے۔ تاہم اردو میں لکھے جانے والے تمام تذکروں کی سب سے بڑی افادیت یہ ہے کہ اس میں درجہ اوّل کے شعرا سے لے کر درجہ سوم تک کے شعرا کے مختصر حالاتِ زندگی، اور ان کے نمونہ ہائے کلام دستیاب ہو جاتے ہیں۔

بڑے شاعروں کے کلام کو تاریخِ ادب خود محفوظ رکھتی ہے۔ چھوٹے درجے کے بے شمار شاعران تذکروں کی وجہ سے زندہ ہیں۔

تذکرہ نگاری بھی ایک فن تھا۔ اور اس کی ترتیب کے بھی کچھ اصول و قواعد ہوتے تھے اردو کے زیادہ تر تذکرے دہلی میں ہی لکھے گئے۔

دہلی میں لکھے جانے والے تذکروں میں بالعموم ترتیب کے دو انداز ہمیں نظر آتے ہیں۔

(۱) حروفِ تہجی کے اعتبار سے ترتیب دیئے ہوئے تذکرے۔ ان تذکروں میں تذکرہ ریختہ گویاں، عمدہ منتخبہ، گلشن بے خار وغیرہ شامل ہیں۔

(۲) بااعتبار زمانہ ترتیب دیئے جانے والے تذکروں میں مخزنِ نکات، تذکرہ شعرائے اردو اور طبقات الشعرائے ہند وغیرہ کو پیش کیا جا سکتا ہے۔

جس طرح لکھنوی شاعری کا مزاج، دہلوی شاعری سے مختلف ہے۔ اسی صورت میں

لکھنؤ میں لکھے جانے والے تذکروں کا انداز ترتیب بھی مختلف ہے، اس فرق کو بیان کرتے ہوئے قطعۂ منتخب کے دیباچے میں محمد انصار اللہ لکھتے ہیں۔ "لکھنؤ میں تذکرہ نویسی کے، مختلف انداز ملتے ہیں۔ اس میں وہاں کے مخصوص حالات میں پروان چڑھتے ہوئے مسابقت کے جذبہ کو بھی دخل ہو سکتا ہے۔ کسی نے استادی اور شاگردی کے تعلق کو بنیاد بنا کر تذکرہ منتخب کیا ہے (خوشی معرکہ زیبا) کسی نے ایک موضوع (انسانی کے جسم کے مختلف اعضاء) سے متعلق اشعار جمع کر کے شعراء کے حالات لکھے ہیں۔ (سراپا سخن) اور کسی نے اصناف سخن میں سے کسی ایک کے مختلف نمونے فراہم کئے ہیں۔" (قطعۂ منتخب)

تذکرہ سراپا سخن اپنی نوعیت کا واحد تذکرہ ہے۔ اس میں تذکرہ نگاری کی عام روش کہ مختلف شعراء کا نام مولد و مسکن، سلسلہ تلمذ اور انتخاب اشعار دے دیا جائے، نہیں اختیار کی گئی۔

جیسا کہ اس کے نام سے ظاہر ہے۔ اس میں محبوب کے سراپا یعنی جسم کے مختلف اعضاء کے بارے میں مشاہیر شعراء اور متوسط درجے کے شعراء کا انتخاب نہایت کاوش کے ساتھ مؤلف دار جمع کر دیا گیا ہے۔ اس اعتبار سے اس تذکرے کو لکھنؤی مزاج کی جدت طرازی کا ایک نمونہ کہنا کچھ بے جا نہ ہوگا۔

اس تذکرے میں زمانے کی کوئی قید نہیں ہے۔ متقدمین شعراء کے اشعار بھی اس میں پیش کئے گئے ہیں اور معاصر شعراء کے بھی۔ جب اس منفرد انداز کے تذکرے کی ترتیب و تالیف کا ارادہ محسن نے کیا تو اپنے زمانے کے شعراء کو ان موضوعات پر خانہ فرسائی کی دعوت دی تھی۔

محسن نے سراپا سخن کی تالیف کا کام ۱۸۴۸ء میں شروع کیا تھا۔ دس برس کی محنت

۱۔ قطعۂ منتخب :۔ مرتبہ انصار اللہ نظر مطبوعہ انجمن ترقی اردو پاکستان۔ ص ۱

کے بعد ۱۸۵۸ء میں یہ تذکرہ پایۂ تکمیل کو پہنچا۔ اس عرصے میں ۱۸۵۷ء کا انقلاب بھی اپنی پوری قہر سامانیوں کے ساتھ اہل ہندوستان کے سروں پر سے گزر چکا تھا۔

اس تذکرے کی تکمیل کے وقت شیخ امام بخش ناسخ زندہ تھے۔ عام طور پر کہا جاتا ہے کہ شیخ امام بخش ناسخ نے ہی محسن لکھنوی کو اس نوع کا تذکرہ مرتب کرنے کا مشورہ دیا تھا۔ لیکن ایسا کہنا صحیح نہیں ہے۔ کیونکہ خود محسن کے بیان سے اس دعوے کی تردید ہوتی ہے۔ محسن نے امام بخش ناسخ کو یہ مشورہ دیا تھا کہ ان کے کلام سے ایسے اشعار اور غزلیں منتخب کی جائیں جن میں محبوب کا سراپا بیان ہوا ہو۔ اس پر شیخ امام بخش ناسخ نے انھیں مشورہ دیا کہ صرف ان کے کلام کا ایسا انتخاب چنداں فائدہ مند نہ ہوگا بلکہ اگر وہ ماضی و حال کے تمام شعراء کے ایسے اشعار منتخب کر کے یکجا کر دیں تو بہتر ہوگا۔ چنانچہ ہم محسن لکھنوی کا بیان نقل کرتے ہیں۔

"اسی زمانے میں جناب استاد شیخ امام بخش ناسخ مرحوم کانپور تشریف لائے ہوئے تھے۔ انھوں نے یہ غزل ارشاد فرمائی۔ ؎

جب کبھی پہنا جڑاؤ اس نے زیور کان میں

تو میں نے عرض کیا کہ اکثر غزلیں آپ نے اسی طور کی فرمائی ہیں۔ اگر سب اعضاء میں غزلیں ہو جائیں تو ایک دیوان بطور سراپا ترتیب دیا جائے۔ لیکن اس وقت کوئی جواب ارشاد نہ ہوا۔ لیکن دوسرے دن اس غزل سے محفوظ فرمایا ؎

کیا نسیم صبح لائی ہے مرا دم ناک میں

اور اسی قسم کی اکثر غزلیں اور بھی فرمائیں مگر افسوس کہ ان کی زندگی نے وفا نہ کی۔ اس مہربان نے فرمایا کہ انسان کو فنا ہر حال میں ہے لہٰذا اس

فرصت کو غنیمت سمجھنا چاہیئے اگر تو کمر ہمت باندھے، اشعار شیریں ماضی و حال جمع کر کے تذکرہ " بطور سراپا " لکھے تو غالب ہے کہ یہ نئے رنگ ڈھنگ کا تذکرہ نادر الوجود نایاب ہوگا امید ہے کہ ذوق ادب رکھنے والے احباب کے لئے باعث سرور بلکہ موجب بقائے نام ہوگا۔"

(دیباچہ تذکرہ سراپا سخن)

محسن نے اس تذکرے کی ترتیب میں پندرہ تذکروں سے مدد لی ہے۔ ان کے علاوہ صدہا دواوین اور ہزارہا بیاضوں کا مطالعہ کر کے نہایت محنت اور عرق ریزی سے ۱۲۷ شعرا کا کلام منتخب کیا۔ جو "سراپا" پر محیط تھا۔

اردو میں کم تذکرے ایسے لکھے گئے ہیں جن میں اتنی تعداد میں شعرا کو شامل کیا گیا ہو۔ شعرا کی اس کثرت تعداد کے اعتبار سے بھی یہ تذکرہ اہم اور قابلِ قدر ہے۔

اردو کا کوئی تذکرہ نگار جانبداری کے الزام سے بری الذمہ قرار نہیں دیا جا سکتا۔ لیکن محسن لکھنوی کا تذکرہ اس اعتبار سے بھی ممتاز ہے کہ اس میں کسی قسم کی جانبداری یا تعصب کا خیال نہیں رکھا گیا۔ محسن نے مہذب اور عالمانہ انداز میں اس تذکرے میں شامل شعرا کے ادبی اور ذاتی اوصاف کو بیان کیا ہے۔ گو فن کے بارے میں اظہارِ خیال مختصر ہے۔ لیکن جامع ہے۔ اور ان سے محسن کے تنقیدی شعور اور بصیرت کا اندازہ ہوتا ہے۔

محسن نے یہ کوشش کی تھی کہ ماضی کے شعرا میں سے کوئی شاعر اس تذکرے میں شامل ہونے سے نہ رہ جائے اور نہ ہی معاصر شعرا میں سے کسی کو اس بزم میں آنے سے روکا جائے۔ چنانچہ معاصر شعرا میں اگر کوئی شاعر شامل ہونے سے رہ گیا۔ تو اس کی ذمے داری محسن پر عائد نہیں ہوتی۔ کیونکہ ممکن ہے ایسے شاعر کے دستیاب شدہ کلام میں تذکرے کے موضوع کے مطابق

کوئی شعر دستیاب نہ ہوا ہو۔ یا پھر کسی نے محسن کی بار بار کی مدخواست کو درخور اعتناء نہ سمجھتے ہوئے اس موضوع پر اشعار کہہ کر نہ دیے ہوں۔

دواوین سے ایسے اشعار کے انتخاب اور ہم عصر شعرا سے حصول کلام کے لئے محسن کو کس قدر محنت اور صبر آزما حالات سے گزرنا پڑا، قاری کو اس کا اندازہ محسن کے اس بیان سے ہوگا۔

"پندرہ تذکرے اور صدہا دواوین اور بیاضیں بڑی تلاش و جستجو سے بہم پہنچائیں۔ جب جاکر شعرائے ماضی کا کلام دستیاب ہوا۔ میں نے اور احباب نے دور کے شہروں کے ناظموں کی خدمت میں خطوط لکھوا کے بھیجے۔ حتیٰ کہ چار مطابع اخبار میں بھی یہ خبر چھپوائی۔ جب جاکر اشعار ان حضرات کے میسّر ہوئے۔ اور شعرائے معاصرین کی خدمت میں دوبارہ حاضر ہو کر غزلیں لایا۔ جن کی کوئی غزل اس قسم کی نہیں تھی ان سے کہلوائی اور مشاعروں میں اس طرح کی طرحیں کی۔ غرضیکہ اس تلاش و جستجو سے ۷۰۰ سو شعراء کا کلام فراہم کیا۔ پھر بھی بعض شعراء ہم عصر کا کلام اس وجہ سے باقی رہ گیا کہ کوئی غزل اس قسم کی ان کے کلام سابق میں نہ تھی۔ اور بعض نے بد دماغی سے، عذر تنگ کیا۔ میری طرف سے کوشش میں ہرگز کمی نہیں ہوئی۔"

(دیباچہ سراپا سخن)

سراپا سخن پر بعض اعتراضات بھی کئے جاتے ہیں۔ ایک تو محسن لکھنوی نے ان پندرہ تذکروں کے نام نہیں بیان کئے کہ جن سے اس تذکرے کی ترتیب میں مدد لی گئی تھی۔ اس طرح تذکرے کی افادیت میں اضافہ ہو جاتا۔

۱:۔ دیباچے میں محسن نے شعرا کی تعداد سات سو بیان کی ہے جبکہ اصل تعداد ۷۲۱ ہے غالباً کتابت کی غلطی ہے۔

اس تذکرے میں موضوعات کے علاوہ اور کسی قسم کی ترتیب نہیں پائی جاتی۔ حروف تہجی کے اعتبار سے جدید انداز میں اس کی ترتیب ڈاکٹر سید سلیمان اور پروفیسر اقتدا حسن نے کی ہے لیکن انھوں نے صرف شعرا کے حالاتِ زندگی کو حروفِ تہجی کے اعتبار سے ترتیب دے دیا ہے۔ اور اس اعتبار سے اِن کے اشعار نہیں دیئے ہیں۔

راقم الحروف کے سامنے اس تعارف کے لکھتے وقت وہ نسخہ ہے جو نولکشور پریس شائع ہوا تھا۔ یہی اس کی اولین طباعت ہے۔

سراپا سخن کی تقلید

محسن نے تذکرہ نگاری میں جو جدّت کی تھی اس نے اس زمانے اور بعد میں آنے والے بہت سے تذکروں نگاروں کو متاثر کیا۔ مثال کے طور پر کلکتہ کے منشی عبدالغفور خاں نسّاخ کا تذکرہ قطعۂ منتخب پیش کیا جا سکتا ہے۔ اس تذکرے میں شعرا کے قطعات پیش کئے گئے ہیں۔ شعرا کے حالاتِ زندگی کی حد تک نسّاخ کے تذکرے کا ماخذ، محسن کا تذکرہ سراپا سخن ہے۔ اس سلسلے میں ذیل میں صرف ایک مثال پیش کی جاتی ہے۔

سراپا سخن

"آشفتہ، عظیم الدین خاں عرف بھورے خاں مرحوم۔ آشفتہ عزیزوں میں سعادت خاں بن مکرّم خان کے، باشندہ دہلی، صاحب دیوان اول شاگرد میر محمدی مائل کے، بعدۂ اصلاح شعر میں فرزند علی مضمون سے لی۔ ان کے ہر قطعہ میں مضمون زلف ہوتا ہے۔

قطعۂ منتخب

آشفتہ تخلص، عظیم الدین خاں عرف بھورے خاں دہلوی، عزیز سعادت خاں بن مکرّم خان، شاگرد میر محمدی مائل فرزند علی مضمون ان کے بیشتر قطع میں "زلف" کا مضمون ہوتا ہے۔ صاحب دیوان گزرے ہیں۔"

گویا نساخ نے حرف بہ حرف سراپا سخن سے استعادہ کیا ہے۔ اور کسی قسم کی تحقیق بھی نہیں کی۔ سراپا سخن میں بعض شاعروں کے تخلص غلط دیئے گئے تھے۔ نسّاخ نے اسی تخلص کو بیان کر دیا ہے۔ اوپر دی گئی مثال میں تذکرہ سراپا سخن میں فرزند علی کا تخلص مضمون بیان کیا گیا ہے جبکہ ان کا تخلص موزوں تھا۔ نسّاخ نے بھی ان کا تخلص مضمون ہی لکھ دیا۔

سراپا سخن میں نازنین کا تعارف اس صورت سے تھا۔" نازنین مرزا علی بیگ نازنین تخلص، رنجیتی گو دہلوی.... قطعۂ منتخب میں اسی طرح بیان ہوا ہے۔" نازنین تخلص مرزا علی بیگ رنجیتی گوئے دہلی۔

نسّاخ نے سخن شعرا میں بھی محسن کے سراپا سخن سے استفادہ کیا ہے۔ اسی طرح ارنعان گوکل پرشاد بھی سراپا سخن کی تقلید میں لکھا گیا ہے۔ ارمغان گوکل پرشاد کے مرتب ڈاکٹر فرمان فتح پوری لکھتے ہیں۔ "ارمغان گوکل پرشاد اردو شعرا کا ایک اہم اور نادر و نایاب قدیم تذکرہ ہے۔ اپنے مخصوص موضوع، نہج اور ترتیب کے لحاظ سے اردو شعرا کے سارے تذکروں میں منفرد حیثیت حاصل ہے۔ صرف "سراپا سخن"، مولفہ سید محسن علی محسن ایک ایسا تذکرہ ہے جو "ارمغان گوکل پرشاد" کے رنگ روپ اور موضوع سے ملتا جلتا ہے لیکن جامعیت اور بعض دوسری خصوصیات کے لحاظ سے وہ بھی ارمغان کے مرتبے کو نہیں پہنچتا۔[1]"

ڈاکٹر صاحب موصوف نے اپنے دیباچے میں کئی جگہ ارمغان گوکل پرشاد کا موازنہ سراپا سخن سے کیا ہے۔ اور ارمغان کی تعریف میں مبالغہ آرائی سے کام لیتے ہوئے سراپا سخن کے مولف کی کاوشوں کو کم کرنے کی کوشش کی ہے۔ جبکہ حقیقت یہ ہے کہ سراپا سخن کو نہ صرف

۱۔ تذکرہ ارمغان گوکل پرشاد مرتبہ ڈاکٹر فرمان فتح پوری۔ ص ج مطبوعہ انجمن ترقی اردو پاکستان کراچی۔

اس نوع کے تذکروں میں ادبیت کا درجہ حاصل ہے بلکہ سراپا سخن ہر لحاظ سے جامع بھی ہے۔ سراپا سخن میں بس ایک ہی بات کھٹکتی ہے کہ تمام شاعروں کے نام اور حالاتِ زندگی کی تکرار پائی جاتی ہے۔ اس حد تک ڈاکٹر صاحب موصوف کا اعتراض بجا ہے۔ ورنہ ارمغان گوگل پرشاد کے مقابلے میں سراپا سخن میں تراجم کا معیار بھی بلند ہے۔

مخزن نکات اور اس کا ترجمہ

ترجمۂ مخزن نکات

مخزن نکات فارسی زبان میں لکھا ہوا اردو شاعروں کا تذکرہ ہے۔ اس کے مصنف قائم چاندپوری ہیں۔ قائم چاندپوری کا شمار اردو کے ممتاز شعرا میں ہوتا ہے۔ مخزن نکات تاریخی نام ہے جس سے اس کا سنہ تصنیف ۱۱۶۸ھ یا ۱۷۵۵ء برآمد ہوتا ہے۔

قائم چاندپوری نے اسے شمالی ہند کا پہلا تذکرہ کہا ہے۔ لیکن میر اور گردیزی کے تذکروں کی موجودگی میں یہ مسئلہ بحث طلب ہے۔ بہر حال تذکرے کی افادیت اور اہمیت اپنی جگہ مسلّم ہے۔

اس تذکرے میں سوا سو کے قریب شعرا کے حالاتِ زندگی اور نمونہ ہائے کلام دیئے گئے ہیں۔ قائم نے تذکرے کو تین حصّوں میں تقسیم کیا تھا۔ طبقہ اوّل میں شعرائے متقدمین طبقہ دوم میں متوسطین، اور طبقہ سوم میں شعرائے متاخرین کے حالاتِ زندگی اور نمونہ ہائے کلام دیئے گئے تھے۔ یہ تذکرہ اس لحاظ سے بھی اہم ہے کہ اس میں دکن کے شعرا کو بھی جگہ دی گئی ہے۔ گو میر کے تذکرے نکات الشعرا میں بھی دکنی شاعروں کے حالات دیئے گئے ہیں۔ لیکن ان کی تعداد مخزن نکات کے مقابلے میں بہت کم ہے۔

محسن لکھنوی نے قائم چاندپوری کے اس تذکرے کا اردو ترجمہ کیا تھا۔ یہ ترجمہ کتابی

مسرت میں شائع نہ ہو سکا۔ اس کے کسی دوسرے نسخے کے بارے میں بھی کچھ معلوم نہیں ہے۔ اس ترجمے کا ایک قلمی نسخہ رامپور لائبریری میں موجود ہے۔ اس ترجمے کی دریافت کا سہرا، مشہور محقق جناب امتیاز علی عرشی کے سر ہے۔ انھوں نے ہی سب سے پہلے رسالہ اردو میں اس ترجمے پر ایک تعارفی مضمون لکھا تھا۔

اس قلمی نسخہ کی ایک مصدقہ نقل جناب مشفق خواجہ کے ذاتی کتب خانے میں موجود ہے۔ اور زیرِ نظر مضمون لکھتے وقت وہی نسخہ مصنف کے پیشِ نظر ہے۔

اس ترجمے میں کہیں بھی مترجم نے اپنا نام نہیں لکھا ہے۔ ممکن ہے مخطوطے کا پہلا ورق ضائع ہو گیا ہو۔ تاہم بعض شاعروں کے حالاتِ بیان کرتے ہوئے مترجم نے تذکرۂ احیا کے مولف کو اپنا والد بتایا ہے جو شاہ حسین حقیقت کا لکھا ہوا ہے۔ لہٰذا اس بات کے تسلیم کرنے میں کسی قسم کا تامل باقی نہیں رہتا کہ اس کے مترجم محسن لکھنوی ہیں۔ ایک اور جگہ محسن نے اپنے چچا شاہ حسن ضبط کا ذکر کیا ہے اور ان کا کلام دیا ہے۔

محسن لکھنوی کو اس کا مترجم قرار دیتے ہوئے مولانا عرشی لکھتے ہیں۔

"کتاب میں مترجم کا نام نہیں ہے۔ لیکن خاتمے میں مقام لکھنؤ لکھا ہے جس سے یہ نتیجہ نکالا جا سکتا ہے کہ وہ لکھنؤ کا باشندہ تھا۔ نیز اس نے ورق ۹ ب پر تذکرۂ احیا کے مولف کو اپنا والد بتایا ہے اور ورق ۲۸ ب پر اپنے عمو صاحب کا ذکرِ شعر فہم اور شعر اُسے واقف شخص کی طرح کیا ہے۔ نیز شیخ ناسخ کو ورق ۱۸ ب پر "امام الکلا فخر الاساتذہ، شیخ امام بخش ناسخ مغفور" لکھا ہے۔ اور انھیں قواعد زبان اردو کا موجد قرار دیا ہے۔ میں نے تذکرہ بدستور الفصاحت کے دیباچے میں مخزنِ نکات پر بحث کرتے ہوئے لکھا تھا کہ "کتاب خانے

ہیں اس کے پہلے دو طبقوں کا اردو ترجمہ قلمی شکل میں موجود ہے۔ میرا خیال یہ ہے۔ کہ محسن علی مصنف سراپا سخن اس کے مترجم ہیں۔" اس خیال کی بنیاد اوپر ذکر کی ہوئی باتوں پر تھی۔ اس لئے کہ مصحفی نے تذکرہ ہندی (ص ۸۷، ۸۶) میں شاہ حسین حقیقت کو جو محسن کے والد ہیں۔ ایک تذکرے کا مولف بتایا ہے اور اپنے عمو صاحب سید حسن شاہ ضبط مولف مراۃ الحیدری وغیرہ کا ذکر خود محسن نے سراپا سخن (ص ۱۷۱) میں کیا ہے: نیز اپنے آپ کو میر علی اوسط رشک کا شاگرد بتایا ہے جو ناسخ کے ارشد تلامذہ میں شمار ہوتے ہیں[1]۔"

ترجمہ مخزن نکات کے مخلوطے کا سائز عرشی صاحب کے بقول یہ ہے۔

" خطِ نستعلیق معمولی روشنائی سیاہ و شنجرفی اور کاغذ باریک ولایتی ہے اوراق قدرے کرم خوردہ ہیں جلد نئی ہے کتاب ناقص ہے اور یہ نقصان خود کاتب کی طرف سے ہے کہ اس نے نقل کرتے کرتے چھوڑ دیا ہے۔ نیز ہر صفحہ دو کالما ہے۔ اوراق ۳۹، سطور ۲۴ اور ناپ ۳۲ × ۱/۲۲۱ سینٹی میٹر ہے[2]۔"

یہ ترجمہ نامکمل صورت میں ہے۔ قائم چاندپوری نے مخزنِ نکات کو تین طبقات میں تقسیم کیا تھا۔ لیکن زیرِ نظر ترجمے میں قائم کے تذکرہ کے دو طبقات تو شامل ہیں۔ البتہ طبقہ سوم میں صرف شاہ عالم ثانی تخلص آفتاب کا تذکرہ ہے جبکہ اصل میں شاہ عالم ثانی آفتاب کا نام شامل نہیں ہے۔ غالباً اس نام کو بھی مترجم شامل کرنا چاہتا تھا۔ محسن یا تو طبقہ سوم کے پورے حصّے کا ترجمہ نہ کر سکے یا ترجمہ کئے جانے کے بعد باقی صفحات مخلوطے سے علیحدہ ہو گئے ہیں۔ اس ترجمے کے قلمی نسخے میں املا کی بے شمار غلطیاں پائی جاتی ہیں۔ جس سے یہ اندازہ ہوتا ہے کہ یہ

۱:۔ رسالہ اردو جلد ۴۳ شمارہ ۲ اپریل ۱۹۶۷ء

مصنف کا لکھا ہوا نہیں ہے۔ اور نہ ہی کتابت ہونے کے بعد مصنف نے اس کی نظر ثانی کی تھی قلمی نسخے میں مترجم نے کسی جگہ بھی سنہ نہیں دیئے ہیں۔ اکثر سنہ کی جگہ خالی چھوڑ دی گئی ہے۔

طبقہ اوّل کے بارے میں حمد و صلوٰۃ کے بعد محسن لکھتا ہے۔

"ترجمہ طبقۂ اوّل تذکرہ محمد قائم، قائم چاندپوری مسمّٰی بہ مخزن نکات کہ نام تذکرے کا تاریخی ہے (ورق ۱/الف)

طبقہ دوم کے آغاز میں مترجم لکھتا ہے۔

"ترجمہ طبقہ دوم تذکرہ محمد قائم قائمؔ اس طبقے میں اشعار اور احوال ان شعرا کا ہے جو بعد ولی کے آخر زمانہ اورنگ زیب عالمگیر بہادر سے تا ابتدائے عہد دولت محمد شاہ بادشاہ کے دارالخلافت شاہ جہاں آباد اور سائر بلاد ہندوستان میں ہوئے اور راقم نے ہر تذکرے سے مقابلہ کر کے زیادہ اور بھی لکھ دیئے ہیں۔" (ورق ۱۶ الف)

طبقہ سوم میں محسن نے ابتدا میں لکھا ہے۔

"مخفی نہ رہے کہ زمانہ مرزا رفیع سودا مغفور اور میر تقی میر اور خواجہ میر درد میں طرزِ کلام میں تغیر آیا اور بہت الفاظ متروک (متروک) ہو گئے اور رنجیتہ میں اور نگ کی پختگی آئی۔ اس واسطے اوس زمانے کے شعرا کو اس طبقہ سوم میں ترجمہ تذکرۂ احبا سے راقم لکھتا ہے کہ اہلِ تمیز فرق کلام کو دریافت کریں اور حال اور اشعار ہر شاعر کا زیادہ کر دیا ہے۔ کہ ناظرین کا موجب مسرّت ہو۔" (ورق ۳۹ ب)

ترامیم واضافے دونوں تذکروں کا موازنہ کرنے سے اندازہ ہوتا ہے کہ مترجم نے اس کا لفظی ترجمہ نہیں کیا بلکہ اصل کتاب کے مطالب کو اپنے الفاظ میں ادا کیا ہے۔

مترجم نے ترتیب میں فرق کر دیا ہے۔ بعض شعرا کو ایک طبقے سے نکال کر دوسرے طبقے میں جگہ دی ہے۔ اور شعرا کے ناموں کو حروف تہجی کے اعتبار سے پیش کیا ہے۔ مترجم نے بعض تذکرہ نگاروں پر تنقید بھی کی ہے۔ مثال کے طور پر آبرو کے ذکر میں سعادت خان ناصر نگینوی نے ایک روایت اپنے تذکرے میں نقل کی تھی۔ جس کے بارے میں مترجم نے تنقید کی ہے۔

ماخذ مخزن نکات کے ترجمے میں محسن لکھنوی نے جن کتابوں اور تذکروں کی مدد سے شعرا کے حالاتِ زندگی میں اضافے کئے ہیں۔ اور کثیر تعداد میں نئے شاعروں کو شامل کیا ہے۔ ان کے حالات کے سلسلے میں محسن نے مندرجہ ذیل پندرہ تذکروں سے مدد لی تھی۔

(۱) گلشن بے خار از نواب مصطفیٰ خان شیفتہ۔

(۲) نکات الشعرا از میر تقی میر۔

(۳) تذکرۂ احبا از شاہ جین حقیقت۔

(۴) تذکرہ میر حسن دہلوی۔

(۵) نتائج الافکار از مولوی قدرت علیخاں گوپاموی۔

(۶) خازن الشعرا (مخزن) از شاہ میراں جان اللہ آبادی۔

(۷) آتشکدۂ لطف از علی آذر۔

(۸) تذکرہ دولت شاہ سمرقندی۔

(۹) حدیقۃ الاقالیم از مرتضےٰ حسین بلگرامی۔

(۱۰) مخزن الواصلین از محمد فاضل اکبر آبادی۔

(۱۱) نفحات الانس از مولانا جامی۔

(۱۲) ریاض الشعرا از علی قلی خاں والہ داغستانی۔

(۱۳) گلشن سخن از مرجان علی خان متبلا دہلوی۔

(۱۴) مجمع النفائس از خان آرزو اکبر آبادی۔

(۱۵) تذکرہ مصحفی (تذکرہ فارسی) و تذکرہ ہندی۔

(۱۶) تذکرہ خوش معرکہ زیبا از سعادت علی خاں ناصر۔

(۱۷) تذکرہ بے نظیر از میر عبدالوہاب۔

(۱۸) تذکرہ اعظم الادلہ سرور۔

(۱۹) مجموعہ اشعار طبع بمبئی۔

(۲۰) سبعہ سنابل از شاہ عبدالواحد بلگرامی۔

(۲۱) سرو آزاد از میر غلام علی آزاد بلگرامی۔

اضافے

اب ہم ذیل میں بعض شاعروں کے حالاتِ زندگی اصل اور ترجمہ دونوں میں سے پیش کریں گے۔ تاکہ اندازہ ہو سکے کہ مترجم نے کس قدر اضافے کئے ہیں۔ اور اگر ان اضافوں کو پیشِ نظر رکھا جائے تو کہا جا سکتا ہے کہ محسن ان اضافوں کے سبب خود ایک نئے تذکرے کے مولف کہلائے جانے کے حقدار ہیں۔

آبرو و آرزو

شاہ مبارک آبرو مردی بود درویش منش قلندر مشرب متوطن گوالیار از فرزندان حضرت محمد غوث۔ به عالم حسن پرستی اشتہار تمام داشت۔ چنانچہ مثنوی قریب صد و پنجاہ بیت درباب تعلیم آرائش خوبان روزگار بسیار به سلاست موزوں کردن است۔ بالجملہ شعر دیختہ بوضع خود بسیار مربوط می گفت و مشق سخن بخدمت سراج الدین علی خاں آرزو می کرد کہ بالفصل در فضل و کمال عدیلش از جنس محال است۔ حق تعالیٰ سلامتش دارد! و زیادہ برین از کمالات آن بزرگوار من، ہیچمہ اوچہ نویسد کہ شمار قطرات باران نمودن و ساحت افلاک به وجب پیمودن است ہر چند دماغ، ہیچو شخصی به ریختہ سنجی دفا نمی کند لیکن وسعت اخلاقش تا بحدیست کہ شعر میان آبرو را به نظر اصلاح ملاحظہ می نمودہ بلکہ به پاس خاطر او خودش دو سہ بیت ازین قبیل می فرمودہ۔ ابن چند بیت از آرزو است۔

اس کے بعد آرزو کے آٹھ اشعار دیئے گئے ہیں۔

ان آٹھ اشعار کے بعد یہ فقرہ، لکھ کر " دشعری کہ بعد ازیں قلمی میگردد" از شاہ مبارک آبرو دست"، اکیاون شعر آبرو کے دیئے ہیں۔

محسن نے اول تو دونوں شاعروں کا تذکرہ علیحدہ علیحدہ اور تفصیل سے کیا ہے۔ نیز تذکرہ احبا اور دیگر تذکروں سے اضافہ بھی کیا ہے۔ محسن نے آبرو کے ذکر میں جو کچھ لکھا ہے۔

وہ قائم کے اصل تذکرے سے زائد ہے۔ چنانچہ ملاحظہ ہو:۔

"آبرد تخلص، شیخ نجم الدین عرف شاہ مبارک شطاری درویش منش قلندر مشرب متوطن گوالیار نواسے محمد غوث گوالیاری کے اور عالم میں حسن پرستی اس کی مشہور ہے۔ چنانچہ ایک مثنوی قریب ایک سو پچاس بیت کی واسطے تعلیم آرائش خوبان کے اور دیوان ذ ضیم (ضخیم) اون کا ہے۔ اور مشق سخن سراج الدین علی خاں آرزو سے رکھتے تھے۔ بلکہ سراج الدین علیخاں آرزو (ان کی خاطر سے گاہ گاہ فکر ریختہ فرماتے تھے (یہ حصہ حاشیے پر درج ہے) اور سعادت خاں ناصر اپنے تذکرے "خوش معرکہ زیبا" میں لکھتے ہیں کہ چشم راست اون کی بہ سبب گل کے نور بصارت سے عاری تھی۔ مرزا مظہر جان جاناں سے مکابرہ ہوا۔ چنانچہ طرفین کے شعر پوچ لکھتے ہیں۔ لکھنا اون کا ترک آداب تھا۔ اس واسطے درج نہیں کرتا۔ اور ادب بزرگوں کا ایک طرف عقل سلیم کسی عاقل کی باور نہ کرے گی۔ کہ مرزا مظہر ایسے باوضع اور عالی دماغ نکتہ دان صاحب علم وفضل عارف باللہ برگزیدہ خدا تارک الدنیا رہبر اہل صفا یہ سخن پوچ زبان پر لائیں۔ ضرب شیر بچہ کہ باعث شہادت کا ہوا کہ یہ قصّہ اپنے مقام پر تحریر ہے۔ اوس وقت نواب نجف خاں نے کہلا بھیجا کہ بعد تحقیق کے قصاص قاتل سے لیا جائے گا۔ اوس کے جواب میں فرمایا کہ میں نے معاف کیا تم بھی معاف کرو۔ جائے انصاف ہے کہ جو شخص عیوض ایسے امور عمدہ کا نہ چاہے۔ وہ سخن پوچ زبان پر لائے یا ایسے شخص کے حق میں جو کوئی اہل وضع کچھ کہے۔ اگر کوئی بد وضع کی نسبت میں یہ سخن ہوتا تو شاید کوئی باور کرتا ایسی بات کے لکھنے سے مشقت تالیف غارت اور برباد ہوتی ہے۔ چنانچہ ظاہر ہے کہ تذکرہ خان صاحب کا کسی اہلِ انصاف کے منظورِ نظر نہیں ہوا۔ شعر سعدی علیہ الرحمتہ اس جا پہ خوب مناسب ہے۔" (ورق ۱۶: الف) مخطوطہ۔ اس کے بعد سعدی

کا جو شعر لکھا ہے۔ اس کا مصرعہ ثانی نامکمل ہے۔

"بدی را بدی سہل باشد جزا اگر مرد ....."

اس تفصیل کے بعد محسن نے آبرو کے ۹ نم اشعار بطور نمونہ کلام لکھے ہیں۔ جبکہ قائم کے تذکرے میں شاہ آبرو کے صرف تین اشعار دیئے گئے ہیں۔

قائم:- زندگی ہے سراب کی سی طرح !
باڈ بندی حباب کی سی طرح
تجھ اُپر خون بے گناہوں کا !
چڑھ رہا ہے شراب کی سی طرح
کون چاہے گا گھر بسے تجھ کو !
مجھ سے خانہ خراب کی سی طرح

مترجمہ مخزن نکات:- زندگی ہے سراب کی سی طرح
باڈ بندی حباب کی سی طرح
کون چاہے گا گھر بسے تجھ کو !
مجھ سے خراب خانہ کی سی طرح
تجھ اُپر خون بے گناہوں کا
چڑھ رہا ہے شراب کی سی طرح

اشعار کی ترتیب میں بھی فرق ہے:-

قائم کے تذکرے میں مندرجہ ذیل تین اشعار جن کے مصرع ہائے اولین نیچے درج کئے جاتے ہیں دیئے گئے ہیں۔ لیکن ترجمے میں یہ اشعار موجود نہیں ہیں۔

آج پھر ہم سے کر دیا ہے اداس ص ۳۸

بیچ تیرے کے شوق میں چھوڑا ص ۳۸

غیر صحبّت میں اب لگا جانے ص ۳۸ ترجمے میں صرف یہ شعر موجود ہے۔ ص ۶۷

؎ معطیوں سے یہ روز ملتا ہے ص ۳۸

یارو ڈرو کمر سے مروڑو نہ بھر کے انگ ص ۳۸

گلی اکیلی ہے اور سو طرح کی باتیں ہیں ص ۳۹

بیل سینگوں پہ لٹو ہیں مصر مردگی کی راہ ص ۳۹

قائم کے تذکرے میں بعض مقامات پر اشعار بے ترتیبی سے دیئے گئے ہیں۔ محسن نے بھی ان اشعار کو اسی بے ترتیبی کے ساتھ لکھ دیا ہے۔

رستم اس مرد کی کھاتے ہیں قسم زوروں کی

مصرع بالا کی غزل میں تین اشعار ہیں۔ لیکن دو اشعار کے بعد مترجم نے دوسری غزل کا مندرجہ ذیل شعر لکھ دیا ہے۔

زلف کی شان مکھ اپر آ دیکھو

کہ گویا عرش میں لٹکتی ہے!

شعر کے بعد پھر دوسری غزل کا ایک شعر دے دیا ہے اور اس کے بعد زلف کے مصرعے والا شعر لکھا ہے۔ ؎

کیا بُری طرح بھوں مٹکتی ہے

کہ میرے دل میں آ کھٹکتی ہے!

قائم کے تذکرے میں مندرجہ ذیل تین شعر ہیں۔

دشمن جان ہے تشنۂ خوں ہے
شوخ بانکا ہے نکبت بھوں ہے
دل کے چھلنے کو یہ ٹک چلنا
سحر ہے ٹوٹکا ہے افسوں ہے
شیخ خرقے میں جب مراقب ہو
گریہ مسکیں ہے، موئی جوں ہے

ترجمے میں مندرجہ بالا دو اشعار موجود ہیں لیکن یہ شعر موجود نہیں ہے۔

دشمن جان ہے تشنہ خوں ہے
شوخ بانکا ہے نکبت بھوں ہے ص۱۱-۶۸ (مخطوط)

یہ شعر ترجمے میں موجود نہیں ہے:-

یوں آبرو بنا وے دل میں ہزار باتیں
جب روبرو ہو تیرے گفتار بھول جاوے

ترجمے میں مندرجہ ذیل شعر بھی موجود نہیں ہیں۔

جیونا مثل حباب اس جگ میں دم کا پیچ ہے
یہ گرہ کھل جا تو دیکھے زندگانی ہیچ ہے!
معشوق ہے وہی کہ جو اپنی کہی کرے
فوجیں منع کریں تو نہ مانے وہی کرے
تبسم سے مجھے، اس کو نظر سے
کیا تیں دو کو راضی کس ہنر سے

علاوہ ازیں قائم کے تذکرے میں آبرو کے دو فحش اشعار بھی موجود ہیں۔ ان اشعار کو مترجم نے حذف کر دیا ہے۔ اب ان اشعار کے مصرع ہائے اولین دیئے جاتے ہیں۔ جن کا اضافہ آبرو کے ذکر میں مترجم نے کیا ہے :۔

۱ مجھ ناتواں کی حالت وہاں جا کہے ہے اکثر
۲ مشاق عذر خواہی نہیں آبرو تو کیا
۳ ان لبوں کو یقین مصری جان
۴ دھمکاوتی ہیں ہم کو کمر باندھ باندھ کر
۵ تب ہو آرام میرے جی کے تئیں
۶ نکلے ہم آصبا کی طرح جب چمن میں پھول
۷ دل کب آوارگی کو بھولا ہے
۸ نالے بہ میرے دل کے غم سا گواہ بس ہے
۹ زلف کے عقدے کھلے اب ادھی مشکل ہوئی
۱۰ عاشق زیادہ تجھ سستی کیا آزو کرے
۱۱ صنم بتان میں تمھارا بڑا ہی کافر تھا
۱۲ شجاعت مال سے نامرد کو حاصل نہیں ہوتی
۱۳ دہقاں پسر نے کھیت رکھا آنسوؤں کو دیکھ
۱۴ کریں جو بندگی آدمی گنہ گار
۱۵ شوق سے جس گھر میں ہو تو جلوہ گر
۱۶ دور خاموش بیٹھ رہتا ہوں !

عہ سر سے لگا کے پاؤں تلک دل ہوا ہوں میں

عہ نہ دیوے لیکے دل وہ جو مشکیں

عہ شور ہے اس کی اشک باری کا

قائم نے آرزو اور آبرو دونوں کا بیان نہایت اختصار کے ساتھ ایک ہی مقام پر کیا ہے۔ جس کا اقتباس ہم گزشتہ صفحات میں آبرو کے ذکر کے ساتھ دے آئے ہیں۔ اب مترجم نے آرزو کے بارے میں جو کچھ اضافہ کیا ہے۔ وہ " ملاحظہ ہو:۔

آرزو

آرزو تخلص :۔ نام نامی سراج الدین علی خاں محمد قائم قائم نے جس سنہ میں اپنا تذکرہ تالیف کیا۔ خاں موصوف زندہ تھے۔ حال مفصل تحریر نہیں کیا۔ فقط اس قدر لکھا ہے۔ فضل و کمالات میں ماتوف اس کے متصور نہیں۔ حق تعالیٰ اس کو سلامت رکھے۔ اور زیادہ ان سے میں ہیچ مداں کیا لکھوں کہ شمار قطرہ باراں اور سیاحت افلاک کمال ہے دماغ ایسے عالی دماغ کا کب وفا کرتا ہے کہ ریختہ گوئی پر مائل ہو مگر یہ وہ مست اخلاق ہے کہ شعر شیخ نجم الدین آبرو بنظر اصلاح ملاحظہ کرتے ہیں بلکہ بپاس خاطر میاں مذکور خود بھی دو چار بیت گاہے۔ ریختہ میں موزوں فرماتے ہیں۔ راقم الحروف (یعنی محسن لکھنوی) تذکرہ احبا اور تذکرہ خازن الشعرا تالیف فرمودہ شاہ میر نجان صاحب اور نتائج اذکار سے مفصل تحریر کرتا ہے۔ اکثر خان آرزو کو اکبر آبادی و بعض گوالیاری لکھتے ہیں۔ مگر غلام ہمدانی مصحفی مرحوم نے ان کے بزرگوں کو متوطن اور (کذا) لکھا ہے۔ عہ

ببیں تفاوت رہ از کجاست تا بکجا

واللہ اعلم سلسلہ ان کے اجداد کے نسب کا حضرت شیخ کمال الدین علیہ الرحمتہ

خواہر زادہ خواجہ نصیر الدین محمود چراغ دہلوی قدس سرہ سے ملتا ہے۔ اور ناہنائی نسب شیخ محمد غوث گوالیاری شطاری عطاری روح اللہ سے آمیزش رکھتا ہے۔ چونکہ نسب شیخ محمد غوث کا شیخ فریدالدین عطار نیشاپوری عطر اللہ مرقدہ سے ملتا ہے۔ اس جہت سے ان کو عطاری کہتے ہیں۔ اور محمد غوث ممدوح اولیا کامل صاحب اشغال اذکار اور علم یکسر میں یکتا تھے۔ یہ گویا ان کو ورثہ اپنے جد عطار ممدوح کا ملا تھا۔ ولادت خان آرزو کی اوائل سنہ (۱) ہجریہ میں واقع ہوئی۔ نشو و نما گوالیار میں پایا۔ علم وہیں تحصیل کیا بلکہ اوائل سلطنت بادشاہ دین پناہ فرخ سیر شہید میں بعض خدمت گوالیار ان سے متعلق ہوئی۔ سنہ ہجری میں وارد دارالخلافہ شاہ جہاں آباد ہوئے۔ ازبسکہ ان سے اردا ندوز مرام مخلص وکیل اعتماد الدولہ نواب قمرالدین خاں سے نہایت دوستی اور اتحاد تھا۔ اس کے وسیلے سے جاگیردار بادشاہی اور خطاب ملک الشعرائی سے سرفراز ہوئے تا مدت دراز بہ عزت و آبرو وہاں (کذا) بسر کئے مقبول وضع و شریف رہے اور تمام اراکین شاہی اُن کا اعزاز و اکرام کرتے تھے بعد وفات معتمن الدولہ محمد اسحاق خاں شوستری اور نجم الدولہ کہ قدردان اہلِ زبان تھے ہمراہ سالارِ جنگ برادرِ نجم الدولہ مرحوم کے دہلی سے صوبہ اودھ شہر فیض آباد میں اپنی سعی سے سالارِ جنگ کے تین سو روپے مشاہرہ سرکار کے نواب شجاع الدولہ بہادر کے نوکر ہوئے۔ اور صاحب تذکرہ بے نظیر میر عبدالوہاب یہ لکھتے ہیں کہ وفات نواب صفدر جنگ بہادر ساختر ۱۱۶۷ھ میں تیردیں (کذا) ذی الحج میں ہوئی۔ آرزو بعد ان کے حضور میں نواب شجاع الدولہ بہادر دو برس کذا کم یا زیادہ رہے اور جمادی الاخر ۱۱۶۹ھ میں وفات پائی اور صاحب تذکرہ خازن الشعرا وفات خان آرزو سوم شہر ربیع الثانی لکھنؤ لکھتے ہیں۔ بہرحال لاش ان کی زمین میں سپرد کی بعد ایام معہود

۱:۔ مخطوطے میں ہر جگہ سنہ غائب ہے۔

۲:۔ " " " " " "

شاہجہان آباد کو لے گئے اور وہاں دفن کیا۔ ہر چند اقوال مختلف اس میں ہیں لیکن صحیح یہی ہے میر غلام علی آزاد بلگرامی نے تاریخ ان کی وفات کی جو لکھی ہے۔ وہ یہ ہے[1]۔

خان والا شان سراج الدین علی — شمع رونق بخش بزم گفتگو
زد رقم آزاد سال رحلتش — رحمت کامل بروح آرزو

سراج الدین علی خاں نادر عصر — زمرگ او سخن را آبرو رفت
اگر جوید کسے سال وفاتش — بگو آں جان معنی آرزو بود!

عمر آرزو کی طویل ہوئی تھی۔ طبیعت میں ظرافت بلکہ (کذا) ہزل نہایت تھا۔ کہ وقت اختصار قریب مرگ ایک شخص مشتاق ملاقات کے لئے آئے۔ اور کہا کہ مجھ کو مدت سے آرزو سے ملاقات تھی۔ خان آرزو نے کہا کہ آج آرزو آپ کی آخر ہوتی ہے تصانیف اور تالیف ان کی نہایت کثرت سے ہیں کہ ہر ایک سے ان کا مایۂ علم و فضل ظاہر ہوتا ہے۔ من جملہ ان (کے) سوال اللغات مع مصطلحات سند اشعار اساتذہ سے ہر علم میں ایک دو کتاب ان کی ہے۔ اور ہر ایک ان کے فضل و کمال پہ دال ہے اور ایک رسالہ ابتذال اشعار شیخ علی حزیں مسمی بہ تنبیہ الغافلین کہ پانچ سو شیخ کے شعر مبتذل (کذا) نکالے تھے۔ اور وہ شیخ کی نظر سے بھی گزرا تھا۔ شیخ نے بھی جواب اس کا (خوب لکھا) میاں مصحفی نے (اپنے تذکرہ میں) میں لکھا ہے کہ یہ شورش آرزو کی بظاہر تھی وگرنہ وہ مرتبۂ شیخ سے خوب آگاہی رکھتے تھے۔ طرفہ یہ ہے کہ اس فضل و کمال پر ایسے شراب خور اور عیاش تھے کہ حضرت مرزا مظہر جان جاناں علیہ الرحمۃ فرماتے

۱۔ قلمی نسخہ ورق ۱۷ الف مملوکہ جناب مشفق خواجہ

تھے کہ خان آرزو کو شب و روز عیاشی سے تو فرصت نہیں جائے حیرت ہے کہ یہ تصانیف کیونکر سے وقت کرتا ہے۔

آخری عمر میں خان آرزو نے شراب خواری سے توبہ کی اور آرزو کا مذہب اثنا عشریہ تھا اور غلو سے مذہب ان کی تصانیف سے ظاہر ہے شاہ میر نجات صاحب "تذکرہ مخزن الشعرا" میں لکھتے ہیں۔ خان آرزو کے والدین اور تمام بزرگ طریقہ اہل سنت والجماعت رکھتے تھے۔ معلوم نہیں انھوں نے کیونکر مذہب تشیع (تشیعہ اصل) اختیار کیا۔ اور نظم و نثر خان آرزو کہ معدن فصاحت و بہت ہے شمار میں نہیں آسکتی۔ دیوان شفیعاں اثر اور دیوان فغانی کا قافیہ بقافیہ جواب کہا ہے۔ میر حسن حسن صاحب مثنوی بدر منیر اپنے تذکرے میں لکھتے ہیں کہ سات (ساتھ اصل) دیوان فارسی کے ان سے یادگار ہیں اور مشق شعر میر عبدالصمد سخن سے رکھتے تھے اور کبھی کبھی واسطے تفنن طبع کے خاطر سے میاں آرزو کے فکر ریختہ بھی فرماتے تھے۔ چنانچہ سعادت خاں صاحب ناصر نے اپنے تذکرے میں یہ لکھا ہے۔ ؎

رکھے سیپارۂ دل کھول آگے عندلیبوں کے
چمن میں آج شاید پھول ہیں تیرے شہیدوں کے

بعد یہ لکھتے ہیں کہ اگرچہ قافیہ عندلیب کا غریب ہو سکتا ہے مگر چند نسخے میں یہی دیکھا ہے۔ اللہ اللہ خاں آرزو کہ تمام عالم پر دست تصرف اس کا دراز اور اس مطلع میں کہ ایطائے جلی ہے اس سے بے نیاز، راقم الحروف عرض کرتا ہے۔ ہر چند خوردہ گیری خاں صاحب کی بجا ہے۔ مگر خطائے بزرگاں گرفتن خطاست۔

ظاہر ہے کہ خان آرزو بہر حال علم و فضل میں خان صاحب سے افضل ہیں خصوصاً علم شعر میں ان کو ان سے کیا مقابلہ ان کے نزدیک اس وقت میں فکر ریختہ بدتر ہزل سے تھا۔

اس کے عیوب پر ان کو کیا توجہ ہوتی۔ اور دوسری وجہ یہ ہے کہ زبان اردو میں بیش ازیں کوئی عیب، عیوب شاعری میں سے رائج نہ تھا۔ اور دلیل اس توجیہہ پر یہ ہے کہ جس کا جی چاہے کلام شعرائے ماسبق کو نظر تعمق سے دیکھے یقین ہے کہ سب طرح کے عیب موافق قواعد مروجہ نی زمانہ کے اب نکل آئیں گے۔ الیطاً تو ایک طرف مرزا رفیع سودا کہ استاد الاستاد خاں صاحب کے ہیں۔ باوصف ادائے شاعری اور ملک الشعرائی کے الفاظ صحیحہ میں اپنا تصرّف کرکے اور اس کو غلط بنا کے موزوں کیا ہے جیسا کہ اس بند میں مرثیہ کے موجود ہے۔ (ص ۱۷ ب)

وہ ناز کی روح بنی کو ہوا تھا خلق — یا اس لئے کہ ذبح کرے اسکو تشنہ حلق
جس سینہ پر مگس ہو تو زہرا کو ہوئے خلق — واں بیٹھے شمر کاٹنے کو سر کے واسطے

اور یہ قواعد جو اردو میں نی زمانا رائج ہیں ان کے موجد امام الکلا فخر الاساتذہ شیخ امام بخش ناسخ مغفور ہوئے ہیں انہی کے صدقے سے خاندان کے اور لوگ بھی واقف ہو گئے اور تتبع انھیں کا کرنے لگے۔ اور ایسے حد سے بڑھے کہ فخریہ کلمائے ماسبق کو برا کہنے لگے ورنہ یہ لوگ اور ان کے استاد ایسی باتوں سے کیا واقف تھے۔ نہ سابق میں ایسی فصاحت بلاغت بیان میں تھی نہ کوئی عیوب شاعری پر نگاہ کرتا تھا اور نہ یہ نظریں الیطائے جلی کی اور بھی لکھی جاتی ہیں۔ (یہاں نظریں درج نہیں کی ہیں)

الحاصل جب میر اور مرزا کہ طبقہ سوم میں ہیں ان کو خیال نہ ہو تو صاف معلوم ہوا کہ یہ باتیں قواعد ضروریہ میں نہ تھیں اگر خان آرزو کہ طبقہ دوم میں ہیں انھوں نے نہ خیال کیا۔ تو نہ خیال کیا کیا مضائقہ ہے راقم کو نہیں من الوجوہ خان آرزو سے علاقہ نہیں کلمہ حق بلا جانبداری زبانِ قلم سے نکل گیا۔ زیادہ، زیادہ۔"

آرزو کے یہ اشعار جن کے مصرعے درج ذیل ہیں۔ ترجمے میں بھی موجود ہیں۔

ع مے خانے بیچ جاکر شیشے تمام توڑے

ع ہرگز نظر نہ آیا ہم کو سجن ہمارا

ع تیرے دہن کے آگے دم مارنا غلط ہے

یہ شعر بھی اصل میں موجود نہیں ہے۔

ع جان تم پہ کچھ اعتماد نہیں
زندگانی کا کیا بھروسہ ہے!

مخزن نکات کے بعض وہ شعر جنھیں ترجمے میں نقل نہیں کیا گیا ہے ان کے مصرعے مندرجہ ذیل ہیں۔

ع وعدے تھے سب خلاف جو اس لب سے ہم سنے

ع مرے شوخ خرابی کی کیفیت نہ کچھ پوچھو!

ع دیکھے سیاہ دل کھول آگے عندلیبوں کے

ع دریا عرق میں ڈوبا تجھ سیم تن کے آگے

مخزن میں قائم نے اس شعر کو یوں لکھا ہے:۔

آتا ہے ہر سحر کو تیری برابری کو کیا دن لگے ہیں یارو خورشید خاوری کو

ترجمے میں یہ شعر اس طرح لکھا ہوا ہے:۔

ہر صبح آوتا ہے تیری برابری کون کیا دن لگے ہیں دیکھو خورشید خاوری کون

اسی طرح ولی دکنی کے حالات میں مخزن کے علاوہ محسن لکھنوی نے تذکرہ احیا اور تذکرہ میر حسن سے بعض اشعار کا اضافہ کیا ہے اور اس اضافے کی صراحت کی ہے۔

تذکرہ احبا

دیکھیں یہ جیسے وہ مبتلا ہے — خوباں کی نگاہ میں بلا ہے
طالب نہیں مہر و مشتری کا — دیوانہ ہوا جو تجھ پری کا
دیکھ لینا صبح تجھ رخسار کا ! — ہے مطالعہ مطلع انوار کا !
دل کو دیتا ہے تمھارے پیچ و تاب — پیچ مرے طرّہ طرّار کا !
صحن گلشن میں جب خرام کیا — سرو آزاد کو غلام کیا
اے سرو خراماں تو نہ جا باغ میں چل کر — مت قمری و شمشاد کے سودے میں خلل کر
ترا مکھ مشرقی حسن انوری جلوہ جمالی ہے — حامی نہیں فردوسی وہ ابرو ہلالی ہے

تذکرہ میر حسن

جب آیا مست ساقی جام لیکر — گیا یکبارگی آرام لے کر !
نجانوں خط ترا کس بے خطا پر — چلا ہے آج فوج شام لے کر
میں اوسکو جوں نگیں کرتا ہوں سجدہ — جو کوئی آتا ہے تیرا نام لے کر
چوں گل شگفتہ رو ہیں سجن کے چمن میں ہم — جوں شمع سر بلند ہیں تری انجمن میں ہم
اک بار ہنس کے بول سمن ورنہ حشر تک — جوق برق بے قرار رہیں گے کفن میں ہم
سن کے احوال مرا ناصح مشفق نے ولی — ہاتھ سلے ہاتھ ملا درد سے سنا کوٹا
اصل مخطوطے میں یہ جگہ سادہ ہے — پھر گویا ان تلوں میں تیل نہیں
عجب کچھ لطف رکھتا ہے شب خلوت میں مہرو سے — سوال آہستہ آہستہ جواب آہستہ آہستہ
اک بار مری بات اگر گوش کرے تو — ملنے کو رقیبوں کے فراموش کرے تو
دل چھوڑ کے یار کیوں کہ جاوے — زخمی ہے شکار کیوں کہ جاوے

ہے حسن ترا ہمیشہ یکساں جنت سے بہار کیوں کہ جادے
غنیمت بوجھ ملنے کو دلی کے نگاہ پاک باز اے کیمیا ہے!
باغ ارم سے بہتر موہن تری گلی ہے ساکن تری گلی کا ہر آن میں ولی ہے

امیر خسرو نہایت اہم شاعر ہیں۔ لیکن قائم چاندپوری نے نہایت اختصار کے ساتھ ان کے حالاتِ زندگی لکھے ہیں۔ اور سعدی اور امیر خسرو کا تذکرہ ایک ساتھ کیا۔ اور بطورِ تبرک ان دونوں کے دو دو اشعار لکھے ہیں۔ خسرو کے حالات زندگی بالکل نہیں لکھے صرف ان کے درج ذیل تین اشعار دیئے ہیں۔

ترحال مسکیں مکن تغافل درائے نیناں بنائے بتیاں !!
چو تاب ہجراں نہ دارم اے جاں نلیو کاہے لگائے چھتیاں
زرگرد پسرے چو ماہ پارا کچھ گھڑیے سنواریے پکارا
نقد دل من ربود و بشکست آخر نہ گھڑا نہ کچھ سنوارا!

اب محسن کے ترجمے سے خسرو کے حالات نقل کئے جاتے ہیں۔ قارئین خود فیصلہ کر لیں کہ آیا اسے ہم ترجمہ کہیں یا اسے محسن کا طبعزاد تذکرہ قرار دیں۔

خسرو دہلوی

"محمد قائم نے اپنے تذکرے میں یہ سبب ان کی شہرت کے ان کا حال کچھ بھی تحریر نہیں کیا۔ مگر راقم الحروف اور تذکروں سے لکھتا ہے۔ مولوی قدرت علیخاں گویاموی اپنے تذکرے "نتائج الافکار" میں لکھتے ہیں۔ ابوالحسن یمین الدین نام ولد امیر سیف الدین اصل ان کی ہزارہ بلخ قبیلہ لاچین سے ہے۔ جب وقت شور انگیز چنگیز خاں کا ہوا ان کے بزرگ اپنا وطن چھوڑ کر ہند میں آئے اور قصبہ پٹیالی کہ توابع دہلی ہے سکونت اختیار کی والد ان کے در سلک امرائے بارگاہ سلطان شمس الدین التمش

ہیں منسلک تھے اور دختر نواب عمادالملک کہ امرائے نامدار تھے ان کے نکاح میں آئی۔ چنانچہ حضرت امیر خسرو ان کے بطن سے سنہ ہجری میں پیدا ہوئے اسی وقت ان کے والد خدمت میں ایک مجذوب یا خدا کے قریب مکان کے رہتے تھے ان کو لے گئے بمجرد ملاحظہ کے فرمایا کہ تو ایسے شخص کو گود میں لایا ہے کہ دو قدم آگے خاقانی سے بڑھ جائے گا۔ آٹھ برس کا سن تھا لہ مد بھائی اور یہ ہمراہ اپنے والد کے دہلی میں آئے اور خدمت میں سلطان المشائخ حضرت نظام الدین اولیا بدایونی قدس سرہ کہ آغاز اون کے ظہور کا تھا ملازمت حاصل کی اور نو برس کے سن میں ان کے والد بزرگوار نے کہ ہفتاد سالہ ان کا سن تھا معرکہ (اصل میں مارکہ) کفار میں شہادت کو پہنچے۔ امیر خسرو نے ان کے مرثیہ میں کہا ہے۔ ؎

حیف از کرم گزشت دل من دو دینم ماند
دریائے خوں رواں شد و در یتیم ماند!

بعد ان کے عمادالملک ان کے نانا نے ان کو پرورش کیا۔ تھوڑے عرصے میں خداوند عالم نے جمیع علوم میں ان کو کمال دیا ایسا کہ شہرہ ان کی فصاحت کا اور بلاغت کا عالمگیر ہوا۔ ملتان میں ملازم شہزادہ سلطان محمد خلف سلطان غیاث الدین بلبن کے جاکر ہوئے اور مرتبہ عالی کو پہنچے کہ سب امرائے عصر سے عزت اور رتبہ ان کا زیادہ ہوا مگر جو کچھ صلہ قصیدہ وغیرہ میں انھیں حضور شاہ زادہ سے مرحمت ہوتا تھا۔ واسطے خرچ فقرائے خانقاہ سلطان المشائخ کے بھیج دیا کرتے تھے۔ کبھی اس کو آپ صرف نہیں کیا۔

ایک روز ابھی آغاز مشق شعر تھا کہ خدمت میں حضرت شیخ کی قصیدہ کہہ کر لائے آکر پڑھا۔ حضرت شیخ نے ارشاد فرمایا کہ خسرو کیا صلہ چاہتا ہے؟ عرض کیا کہ شیرینی کلام

فرمایا کہ طباق شکر کا پلنگ کے نیچے رکھا ہے لے کر اپنے سر پر ڈال لے اور تھوڑی سی کھا لے حسب الحکم ایسا ہی کیا عذوبت کلام خسرو اسی ارشاد کے سبب سے ہے۔ حضرت امیر خسرو کو تمام عمر تاسف رہا کہ شیخ سے شیریں کلام کے عیوض اور کچھ میں نے طلب کیوں نہ کیا۔ علم اور فضل ان علامہ کا ان کی تصانیف سے ظاہر ہے۔ حاجت بیان کی نہیں جسب اتفاق ایک روز دہلی میں شیخ سعدی شیرازی سے ملاقات ہوئی چنانچہ خود امیر خسرو فرماتے ہیں۔

خسرو پیر مست اندر ساغر معنی بر بخت
شیوہ از خم خانہ سعدی کہ در شیراز بود

باایں ہمہ اشتغال شعر و سخن اور مصاحبت سلاطین زمن صاحب ذوق اور بہ مست باڈہ شوق یاد الٰہی رہے مدام شورش عشق حقیقی سر میں اور سوز و گداز محبت دل و جگر میں رکھتے تھے۔ چالیس برس صائم الدہر رہے اور کئی حج ہمراہ اپنے پیر و مرشد کے ادا کئے اور بہت ریاضت اور مجاہدے موافق شریعت اور طریقت کے تمام عمر کیا کئے اور خدمت گزاری اور بجاآوری احکام پیر و مرشد کی اس درجہ کی کہ کمتر کسی مرید نے کی ہوگی کہ ضرب المثل خلائق ہے اور حضرت سلطان المشائخ کو جو محبت اور توجہ امیر خسرو سے تھی کسی مرید سے نہ تھی۔ اور ان کے حضور میں خصوصیت خسرو کی ان کے ارشاد سے ظاہر ہے چنانچہ فرماتے ہیں۔ رباعی ارشاد فرمودہ شیخ المشائخ:۔

خسرو کہ بشاعری نظیرش کم خواست — در ملک سخنوری شہی خسرو راست
ایں خسرو ما ست ناصر خسرو نیست — زیرا کہ خدائے ناصر خسرو ماست!
گر برائے ترک ترکم آدہ بر تارک ہند — ترک تارک گیرم و ہرگز نگیرم ترک ترک

اور بارہا فرمایا کہ خداوند عالم مجھ کو بہ طفیل سوز سینہ اس ترک کے بخش دینا اور ایسے

کلمے شفقت آمیز اکثر فرماتے الحق کہ ان سے خصوصیت اور زیادہ کیا ہوگی جب حضرت سلطان المشائخ نے اس عالم سے رحلت فرمائی امیر خسرو لکھنوتی میں ہمراہ تغلق شاہ کے گئے ہوئے تھے۔ جب مراجعت کی اور حال معلوم ہوا ترک لباس ظاہری کر کے کمال بے حلادتی سے زندگی بسر کی حتیٰ کہ بعد چھ مہینے کے سنہ ہجری (اعداد ندارد) میں جوارِ رحمت الٰہی میں جاگزیں ہوئے اور پائیں مزار مبارک شیخ کے ان کو مدفون کیا۔ مزید یہ حکایت (برحاشیہ) کتاب "سبعہ سنابل" میں لکھی ہے۔ امیر خسرو کی خبر وفات سن کر حضرت شیخ رکن الدین ابوالفتح سہروردی نے اپنے یاروں سے فرمایا کہ ہم وارد دہلی ہیں چل کر تجہیز و تکفین میں خسرو کے شریک ہوں اور اس کے واسطے دعائے مغفرت کریں کہ وہ مداح سلاطین تھا۔ جب ان کے جنازہ پر آئے امیر خسرو اٹھ بیٹھے اور کہا کہ خداوند عالم نے اپنے فضل سے اور میرے پیر کے طفیل مجھ کو بخش دیا۔ اب حاجت سفارش نہیں اور "تذکرہ احبا" والد ماجد راقم کے لکھتے ہیں کہ عین شباب میں امیر خسرو نے لکھ کھا روپیہ راہ خدا میں لٹا کے دنیا کو ترک کیا۔ اور مرید سلطان المشائخ کے ہوئے۔ علم ظاہری سب طرح کا حاصل تھا۔ علم باطنی میں بھی کمال حاصل کیا۔ اور تصانیف متعدد ہر علم اور ہر فن میں ان سے یادگار ہیں۔ چنانچہ ایک روز ان کے پیر نے فرمایا کہ خسرو تیری تالیف اور تصنیف کس قدر ہیں عرض کیا کہ ہزار جلد فرمایا کہ ایک کم کر دے کہ خسرو لفظ ہزار بظاہر سبک ہے تاکہ نو سو تو سے تو کہنے میں آئیں۔ اور ہر علم و فن میں ایجاد و اختراع ایسا کیا ہے کہ آج تک ان کی تقلید ہر اوستاد کرتا آیا ہے۔ اعجاز خسروی اس پر دلیل باہر ہے۔ اور علم موسیقی میں قول اور دوبولہ چوبولہ وغیرہ ان کا ایجاد کیا ہوا ہے۔ نقل ہے کہ دہلی میں دکن سے ایک استاد گانے والا آیا حضور میں بادشاہ کی اس نے عرض کی کہ جس کو اس

فن میں دعویٰ ہو میرے مقابلے کے واسطے اس کو بلوایئے۔ کسی نے اس کے مقابلے کا اقرار نہ کیا۔ بادشاہ کو ملال ہوا کہ ہمارے شہر کی ہتک ہوتی ہے۔ حضرت امیر خسرو نے فرمایا کہ میں اس کا مقابلہ کروں گا۔ یہ پہلے کچھ گاتے جو اس نے گایا اس کا پیرایہ بدل کر انھوں نے اسے گایا اس نے کہا کہ چیز تو ہماری ہے مگر ہم نہیں کہہ سکتے کہ یہ ہماری ہے۔ ایسی صورت اس کی بدل گئی ہے۔ جب امیر خسرو نے قول اپنا ایجاد کیا ہوا گایا وہ حیران ہو گیا اور بادشاہ سے عرض کیا کہ یہ اوتار ہیں ہم ان کا مقابلہ نہیں کر سکتے۔ اور قوال اور الفاظ بے معنی ٹیٹو انھیں کا ایجاد ہے۔ پہیلی اور چیستان اور معما اور دیوانِ فارسی معہ قصائد ان سے یادگار ہے۔ چوں کہ ابتدا ریختہ گوئی کی تھی۔ گاہے ریختہ بھی کہا ہے۔ تاریخ وفات امیر خسرو کہی ہوئی محمد فاضل اکبر آبادی:۔

خسرو مہلی بحکم خدا ! بشب جمع شد ز دار فنا
عمر ہفت دو پنجاہش بود کانتر مان شد بدرگہ سبود
آخر دہم بود از مہ شوال ! کہ گزشتند ازیں جہان ملال
سال ترحیل افصح الشعرا گفت ہاتف بہشتی ابدا

ایک روز امیر خسرو حضرت شیخ کے حضور میں حاضر ہوئے۔ کلاہ شیخ کے سر پر کج رکھی ہوئی دیکھی یہ شعر فرمایا۔

ہر قوم راست راہے دینے و قبلہ گاہے
من قبلہ راست کردم بر سمت کج کلاہے

زرگر چہرے چو ماہ پارا ! کچھ گھڑیے سنوارئے پکارا
نقد دل من زبود و شکست آخر نہ گھڑا نہ کچھ سنوارا !

زحالِ سکین مکن تغافل تو رائے نیناں برائے بتیاں !
کہ تاب ہجراں نہ دادم ایجان نہ لیہو کاہے لگا ہے چھتیاں

چوں شمع سوزاں چو درہ حیران ہمیشہ گریاں بعشق آں
نہ نیند نیناں نہ انگ چینا نہ آپ آویں نہ بھیجیں پتیاں

شبان ہجراں دراز چوں زلف و روز وصلش چو عمر کوتاہ
سکھی پیا کو جو میں نہ دیکھوں تو کیسے کاٹوں اندھیری رتیاں

یکایک از دل بصد فریبم بردچشمش قرار و تسکین
کسے پڑی ہے جو جا سنائے پیارے پی کو ہماری بتیاں

مرثیہ میں شیخ کے خسرو نے ہر زبان میں بہت شعر کہے ہیں ازاں جملہ یہ دوھری بہت لطیف تھی راقم کو پسند آئی لکھ دی۔

وہ گئے بالم وہ گئے بالم ندیا کنار کنار اپنی یار اتر گئے ہم چھاندی دردار
گوری سوئے سیج پر مکھ پر ڈالے کیس چل خسرو گھر اپنے کہ شانجھ بھئی چودیس[2]

نقل ہے کہ خسرو نے دیکھا اپنے پیر کو کہ گلستان اور بوستان سعدی شیرازی کی سیر بہت کیا کرتے ہیں۔ ایک کتاب تصنیف کی نام اس کا بہارستان رکھا اور اس کو لا کر سب کتابوں کے اوپر رکھ گئے۔ شیخ نے اس کو سرسری ایک بار ملاحظہ فرمایا۔

دوسری بار توجہ نہ فرمائی۔ خسرو نے، اور ایک کتاب تصنیف کی اس کا نام نگارستان

۲۔ محظوظ میں اسی صورت سے ہے۔

رکھا اس کو لا کے اسی طرح رکھ گئے۔ شیخ نے ایک بار دیکھ کے پھر نہ دیکھا۔ غرض کہ چند بار خسرو نے یہی کہا۔ شیخ کو معلوم ہوا کہ خسرو کو میرے ہر روز کے دیکھنے سے سعدی گلستان پر رشک آیا ہے۔ فرمایا خسرو آنکھیں بند کر جب خسرو نے مراقبہ کیا۔ دیکھا کہ حضور سرور عالم صلی اللہ و علیہ وسلم تشریف فرما ہیں۔ اور سعدی بھی حاضر ہیں۔ حکم ہوا کہ سعدی پڑھ، سعدی نے یہ شعر نعت پڑھا۔

بلغ العلےٰ بکمالہٖ ! ! ! کشف الدجیٰ بجمالہٖ !

حسنت جمیع خصالہٖ صلوا علیہ و آلہٖ !

ارشاد ہوا پھر پڑھ، پھر پڑھ۔ چند بار تواتر ارشاد ہوا بعد مراقبہ کے حضرت شیخ نے فرمایا کہ خسرو مقبول ہو جانے میں کسے اجارہ نہیں۔"

ترتیب میں تبدیلی

محسن نے شاعروں کے عہد کو تذکروں کی روایت کو ملحوظ رکھنے کے علاوہ، ان شاعروں کے طرزِ کلام کی بنا پر بھی انھیں مختلف طبقات میں جگہ دی ہے۔ لیکن جہاں جہاں انھیں دیگر تذکرہ نگاروں کی رائے سے اختلاف تھا۔ اس کا اظہار بھی کر دیا ہے۔ مثلاً ورق ۱۲ الف پر شعوری نام کے شاعر کے حالات کو متقدمین شعرا کے باب میں لکھا ہے۔ کیونکہ میر حسن کے تذکرے میں بھی ایسا ہی تھا۔ لیکن اس کی شاعری کے مطالعے کے بعد انھیں یہ شک ہے کہ یہ شاعر متقدمین میں سے نہیں ہے چنانچہ لکھتے ہیں:۔

"شعوری تخلص .... میر حسن حسنؔ نے متقدمین لکھا ہے۔ ہر چند کلام ان کا متقدمین میں نہیں ملتا مگر بموجب لکھنے میر موصوف طبقہ الف میں ان کو لکھا۔" (ورق ۱۲۔ الف)

طبقہ اوّل کی طرح طبقہ دوم میں بھی مترجم نے اپنی طرف سے نئے شاعروں کے اضافے کئے ہیں اور ان شعراؔ کے حالاتِ زندگی اور انتخابِ کلام میں بھی اضافہ کیا ہے جو اصل میں موجود ہیں۔

بیدل عظیم آبادی

بیدل عظیم آبادی جو طبقہ متقدمین کے شاعر ہیں اپنی شاعرانہ خوبیوں کی بنا پر اس بات کے مستحق تھے کہ ان کے حالاتِ زندگی زیادہ تفصیل سے بیان کئے جاتے۔ قائمؔ کے تذکرے میں ہم عام تذکروں کی روایت کے مطابق بعض اہم شعراؔ کے حالاتِ زندگی کو اختصار سے پاتے ہیں۔ جب کہ محسن کی یہ خصوصیت ہے کہ اس نے ان نامور شعراؔ کے حالاتِ زندگی کو نہایت تفصیل سے بیان کیا ہے۔ اور اس سلسلے میں تذکروں کی عام روایت یعنی اختصار پسندی کو ملحوظ نہیں رکھا۔

چنانچہ بیدل عظیم آبادی کے احوال میں مترجم نے تذکرۂ احبا مصنفہ شاہ حسین حقیقت اور تذکرہ نتائج الافکار مصنفہ مولوی قدرت علیخاں گویاموی سے استفادہ کیا ہے۔ قائمؔ نے بیدل جیسے اہم شاعر کا تذکرہ، دلی کے ساتھ ایک ہی مقام پر کر دیا ہے۔ چنانچہ ملاحظہ ہو۔

بیدلؔ :۔ چنانچہ قدوۃ السالکین زبدۃ الواصلین میرزا عبدالقادر بیدل رحمتہ اللہ علیہ نیز دریں زبان غزلی گفتہ کہ مطلع و مقطع اش اینست :۔

مت پوچھ دل کی باتیں وہ دل کہاں ہے ہم میں
اس جنس بے نشان کا حاصل کہاں ہے ہم میں

جب دل کے آستاں پر عشق آن کر پکارا !
پردے سے یار بولا، بیدل کہاں ہے ہم میں

بیدل کا یہ تذکرہ بھی، دلی کے تذکرے کے ذیل میں آیا ہے۔

ترجمے میں محسن لکھنوی نے بیدل کو علیحدہ عنوان کے تحت بیان کیا ہے اور بیدل

کی اہمیّت کے پیشِ نظر اس میں اضافے کئے ہیں۔ ان کا ماخذ تذکرۂ احیا، اور نتائج الافکار ہیں۔

بیدلے :۔ مرزا عبدالقادر فارسی گو شہور (کذا) ان کا آخر عہد حضرت عالمگیر بادشاہ غازی کے ہوا تھا۔ اور زمانہ ان کا آخر شروع عہد محمد شاہ بادشاہ میں ہے۔ اس واسطے صاحب تذکرہ نے ان کو طبقہ اول میں لکھا ہے۔ اس تذکرہ میں ان کا کچھ حال تحریر نہ تھا تذکرے (کذا) احیا اور تذکرے تاریخ انکار (کذا) مولوی قدرت اللہ خاں گویاموی سے لکھا جاتا ہے اصل ان کی قوم ارلاس (کذا) چغتائی ہے اور ولادت ان کی عظیم آباد، اکثر اوقات دیار بنگالہ میں بسر ہوئی۔ اوائل حال میں ملازم شہزادہ محمد اعظم بن عالمگیر بادشاہ غازی اور منصبدار ہوئے۔ اور بہت عزت، امتیاز اور مرتبہ قرب حاصل ہوا۔ باوجود تعلق تجرد منش اور وارفتہ مزاج تھے۔ چنانچہ ایک روز حضور شہزادہ میں کسی مصاحب خاص نے بہت تعریف مرزا صاحب کی بیان کی۔ حکم ہوا کہ قصیدہ مدح یا بدولت ملاحظہ میں گزرانو (کذا) بعد دریافت مائیہ علم اور رنگ طبع منصب زیادہ کیا جائے گا۔ چونکہ وارفتہ مزاج تحمل اور دماغ فرمائش کمتر رکھتے ہیں۔ یہ سخن گراں گزرا ترک روزگار کیا۔ دار الخلافہ شاہجہان آباد میں آکر گوشہ نشین ہوئے اور ترک تعلق کیا بقیہ حیات مستعار کمال توکل اور استغنا سے بسر کی حق سبحانہ جلّ شانہ نے امرا اور ارکان سلطنت کو ان کا مسخر کر دیا۔ نواب شکر اللہ خاں اور تمام عزیز و اقربا ان کے آشفتہ محبت تھے۔ اور کمال معتقد تھے اور نظام الملک آصف جاہ بہ سبب تلمذ مرزا ممدوح کے یہ قدردانی کرتے تھے۔ اگر کبھی مرزا صاحب ان کے دولت خانے پر جاتے تھے۔ یہ پر بیٹھتے تھے اور وہ پائیں مسند۔ آخر الامر معلوم شہر صفر ۱۱۳۳ھ

میں راہی ملک بقا ہوئے۔ صحن خانہ خود واقع شاہجہان آباد مدفون ہوئے۔

حکایت :۔ میر عبدالولی عزلت بیان کرتے ہیں کہ میں مرزا صاحب کے عرس میں شریکِ محفل ہوا کہ کلیات ان کا موافق دستور کے باہر نکالا گیا۔ میں نے اس کو اس نیت سے کھولا کہ آیا۔ مرزا صاحب ہمارے آنے سے خبردار ہوئے یا نہیں۔ یہ شعر صفحے کے سرے پر نکلا۔

چہ مقدار خون در عدم خوردہ باشم
کہ بر خاکم آئی و من مردہ ہاشم !

حاضرین معترف کرامات ہوئے۔ نثر طویل اور دیوان اور قصائد اور مثنوی وغیرہ قریب لاکھ شعر کے ان سے یادگار ہے۔ ریختہ گوئی دون مرتبہ ان کا ہے۔ لیکن بطریق تفنن طبع فرماتی ہے۔

مت پوچھ دل کی باتیں یہ دل کہاں ہیں ہم ہیں !
اس جنس بے نشان کا حاصل کہاں ہے ہم ہیں !
جب دل کے آستان پر عشق آن کر پکارا
پردے سے یار بولا بیدل کہاں ہے ہم ہیں۔"

اسی طرح شاہ حاتم کے تذکرے میں، قائم چاندپوری نے اختصار سے کام لیا ہے۔

حاتم :۔" محمد حاتم، حاتم تخلص، ہم صحبت میاں مضمون و آبرو است۔ اصل دی شاہ جہاں آباد است۔ در روزگار سلطنت۔ محمد شاہ بہ منصب ندیمی و خدمت بکاولی نواب عمدۃ الملک مغفور پایۂ امتیاز داشت، بعد

فوت او ترک روزگار نمودہ باکمال آزادگی می گزرانید، کلیاتش ضخیم است و قریب چہار ہزار بیت کہ ازاں برسبیل انتخاب برآوردہ، وآں را بہ "دیوان زادہ" موسوم ساختہ است۔ چندی پیشتر از نظر گزشتہ، شعر خوب جستہ جستہ می برآید، بافقیر آشنا است، حق تعالیٰ سلامت دارد۔" (ص ۵۹-۶۰-مخزن)

دلوں کی راہ میں خطرے پڑے ہیں کیا یارو
کہ چند روز سے موقوف ہے سلام و پیام
مت عاشقوں پہ جور و ستم اس قدر کرو
عالم کا ڈر نہیں تو خدا کا تو ڈر کرو! (ص ۶)

محسن نے حاتم کے بیان میں بالکل ہی اختصار سے کام لیا ہے۔ چنانچہ وہ لکھتے ہیں۔

"حاتم تخلّص.... سید حاتم علیخاں..... (۱) مولدان کا جونپور دارد دہلی شاگرد شرف الدین مضمون معاصر شاہ مبارک آبرو۔ من کلام...

شاید محبّت اب کے زمانے سے اٹھ گئی
آتی نظر نہیں جو کسی آشنا کے بیچ!"

قائم چاندپوری نے میر جعفر زٹلی کے حالاتِ زندگی نہایت اختصار کے ساتھ پیش کئے ہیں ص ۳۰ پر صرف چار سطریں ہیں۔ اور ص ۳۱ پر بھی آدھا صفحہ ہے جس میں چھ شعر بھی درج ہیں) جبکہ اصل کے برخلاف محسن لکھنوی نے نہایت تفصیل سے میر جعفر زٹلی کے حالاتِ زندگی اور نمونہ کلام دیا ہے۔

جعفر زٹلی کا تذکرہ اصل مخطوطے کے ورق ۳ الف/ (ورق ۲ ب سادہ ہے) سے شروع ہو کر ورق ۴ الف سے ورق ۷ ب تک چلا گیا ہے۔ اس مخطوط کی جو تمائب شدہ نقل

ہے اس کے مطابق میر جعفر زٹلی کا بیان ص ۱۱ سے ص ۳۳ تک پھیلا ہوا ہے۔ اس تمام صفحے کو نقل کرنا تو مناسب نہیں ہے۔ البتہ صرف ان عنوانات کو رقم کر دیا جاتا ہے۔ قائم نے جعفر زٹلی کے بیان میں حالاتِ زندگی پر مشتمل جو عبارت لکھی ہے۔ محسن نے اس کا ترجمہ کرنے کے بعد اس پر اضافہ بھی کیا ہے۔ ملاحظہ ہو صفحہ ۳۲۷

اس کے بعد تمام تر اضافہ محسن لکھنوی نے کیا ہے۔ قائم نے میر جعفر زٹلی کی نثر کا بھی ایک اقتباس پیش کیا ہے۔

"خانِ صاحب مہربان سلامت! دختر حمید الدین چٹاخہ، بارہ بالی و پٹاخہ، شادمانی است گوہران بید و جوہر بے چید، آٹھوں گانٹھ اصیل جوبن بے تمثیل، پاہو ہالہ سیزدہ سالہ، پراگ لوچن و دل دبوچن، ساجدہ دربار آراست پذیر فتن (کذا) مبارک و برخاست۔" ص ۳۲ مخزن نکات)

محسن لکھنوی نے میر جعفر زٹلی کی نثر نگاری کے جو اقتباسات مختلف عنوانات کے تحت پیش کئے ہیں۔ وہ خاصے طویل ہیں۔ لہذا یہاں صرف ان عنوانات کو لکھا جاتا ہے۔ جس سے محسن کی جانب سے کئے جانے والے اضافے ظاہر کرنا مقصود ہیں۔

(۱) نثر در شکایت نفز (ص ۳ ب)

قولہ تعالی..... کچھ مثلیں درج ہیں (ورق ۲ ب)

(۲) عرض در شکایت بوشگلی (ص ۳ ب)

(۳) (ایضاً) (عرضی) در شکایت سزا (ورق ۲ ب، ۴ الف)

(۴) در تلازمہ ترکاری (ورق ۴ الف)

(۵) عرض داشت در تلازمہ میوہ (ورق ۴ الف، ۴ ب)

(۶) فرمان در تلازمہ محبت ترکاری (ورق ۴ الف، ۴ ب)

(۷) مچلکہ (ورق ۴ ب، ورق ۵ الف)

(۸) رقعہ تقرر نسبت بہ جلال الدین خاں (ورق ۵ الف)

(۹) اخبار دربار شرارت (ورق ۵ الف، ۶ الف)

(۱۰) نسخہ چوبن بہ ضمہ طعام و امساک (ورق ۶ الف، ورق ۶ ب)

(۱۱) تمسک۔ ورق (۶ ب) اس میں دو صفحات پر فارسی و اردو کے اشعار درباره تمسک بھی درج ہیں (ورق ۶ ب)

بعدازاں ورق ۶ ب کے کچھ حصّے سے لے کر ورق ، ب تک میر جعفر زٹلی کے اشعار کافی تعداد میں دیئے گئے ہیں۔

محسن کاکوروی نے بعض جگہ زٹلی کے غیر مہذب۔ ناشائستہ اور فحش اشعار بھی کثرت سے دیئے ہیں۔ اسی طرح نثریں بھی ایسے اقتباسات موجود ہیں جن میں فحش الفاظ کی بھرمار ہے۔

اب ان اختلافات کا ذکر کیا جائے گا جو ہر دو متن میں پایا جاتا ہے۔

طبقہ اوّل :۔ اعظم شاہ محمد :۔ اس شاعر کا تذکرہ مخزن نکات ص۲۹ پر موجود ہے۔ جبکہ ترجمے میں یہ شاعر موجود نہیں ہے۔

تجرد :۔ اصل میں طبقہ سوم (شعرائے متاخرین) میں بیان ہوا ہے محسن نے طبقہ اوّل میں اس شاعر کو رکھا ہے۔

تمکین صلاح الدین :۔ قائم نے اس شاعر کو طبقہ سوم (ص۱۲۴) میں رکھا تھا محسن نے اس کو طبقہ دوم (ص۹۶) میں رکھا ہے۔

تقی میر گھاسی :۔ مخزن نکات میں طبقہ سوم (ص۱۶۷) میں اور ترجمے میں طبقہ دوم میں ص ۹۶-۹۵ رکھا گیا ہے۔

کرم اللہ خان درد :۔ مخزن نکات میں طبقہ سوم (۱۱۶) میں اور ترجمے میں طبقہ دوم (۱۱۶) میں تذکرہ ہے۔

رسوا آفتاب رائے :۔ اصل میں طبقہ سوم (ص۱۶۸) پر رکھا گیا ہے۔ اور ترجمے میں طبقہ دوم میں رکھا ہے۔ (ص ۲۳-۱۲۱)

زار (ذکی) فضل بیگ :۔ اصل میں طبقہ سوم (ص۱۶۸) اور ترجمے میں طبقہ دوم ص ۲۵-۱۲۳)

سلام نجم الدین :۔ اصل میں طبقہ سوم (ص ۱۶۴) اور ترجمے میں طبقہ دوم (ص ۱۳۲)

مشاغل شاگرد بسمل :۔ اصل میں طبقہ سوم (ص۱۶۶) اردو ترجمے میں طبقہ دوم (ص ۱۲۴)

شاکر محمد :۔ اصل میں طبقہ سوم (ص۱۹۹) ترجمے میں طبقہ دوم (ص ۱۳۲)

شوق میر حسن علی :۔ اصل میں طبقہ سوم (ص ۱۲۵-۱۲۴) ترجمے میں طبقہ دوم (ص ۱۲۴-۱۲۵)

عارف محمد عارف :۔ اصل میں طبقہ سوم (ص۱۶۵) ترجمے میں طبقہ دوم ص ۱۴۲)

عاقل رائے سنگھ :۔ اصل میں طبقہ سوم (ص۱۷۱) ترجمے میں طبقہ دوم (ص ۴۴-۱۴۳)

فراق مرزا مرتضیٰ قلی بیگ :۔ اصل میں طبقہ سوم (ص۱۴۱) ترجمے میں طبقہ دوم (ص ۱۴۷)

کمترین :۔ اصل میں طبقہ سوم (ص۷۹) ترجمے میں طبقہ دوم (ص ۱۵۳)

گرامی میرزا گرامی :۔ اصل میں طبقہ سوم (ص۷۸) ترجمے میں طبقہ دوم (ص ۵۳-۱۵۲)

ہادی دہلوی :۔ اصل میں طبقہ سوم (ص۱۷۰) ترجمے میں طبقہ دوم (ص ۱۶۹)

اب ان شعراء کے نام لکھے جاتے ہیں جن کا تذکرہ، اصل میں موجود نہیں ہے۔ لیکن ترجمے میں موجود ہیں۔ گویا محسن نے ان شاعروں کا اضافہ کیا ہے۔

بے چارہ، طبقہ اوّل (ص۳) بے قید، فضائل علی خاں طبقہ اوّل (ص۶)
بے کل عبدالوہاب، طبقہ اوّل (ص۵) حیا، طبقہ..... (ص.....)
خاکی.....(ص.....) عاقل، عاقل شاہ (طبقہ دوم۔ص ۱۴۵-۱۴۴) عزامی (شاعر
دکنی۔طبقہ دوم) (ص ۱۴۶-۱۴۵)

اب ان شعرا کے نام بیان کئے جاتے ہیں کہ جن کا ذکر قائم چاندپوری کے تذکرے میں تو موجود ہے لیکن محسن لکھنوی کے ترجمے میں یہ شعرا موجود نہیں ہیں۔یہ بات حیرت ناک ہے کہ آخر کیوں ان شعرا کو محسن نے ترجمے میں شامل نہیں کیا ہے؟ ایسے شعرا میں سودا جیسے اہم شاعر تک کو نظر انداز کر دیا گیا ہے۔ حذف شدہ شعرا کے ناموں کا یہ مسئلہ اور زیادہ حیرت میں ڈالتا ہے کہ جب ہم دیکھتے ہیں کہ محسن نے کم و بیش ۲۹ شعرا کا اضافہ کیا ہے۔ نیز قائم کے بیان کردہ بہت سے شعرا کے واقعات، اشعار وغیرہ میں دوسرے تذکروں سے اضافے کئے ہیں۔

وہ شعرا جو ترجمے میں موجود نہیں ہیں۔

اعظم شاہ محمد طبقہ اوّل ص۲۹، اکرام خواجہ ص۱۷۶ (طبقہ سوم)
آرام طبقہ سوم (ص۱۸۳) آشنا۔ طبقہ سوم (ص۱۸۴) خاکسار طبقہ سوم (ص ۱۴۲)
درد خواجہ میر (طبقہ سوم (ص۱۰۲) دردمند محمد فقیہ طبقہ سوم (ص۱۳۳)
تاباں میر عبدالحئی طبقہ سوم (ص۱۲۵) خاکسار میر محمد یار طبقہ سوم (ص.....)
راقم لالہ بندرابن ص۱۴۹ طبقہ سوم۔ رند مہربان خاں طبقہ سوم (ص۲۰۰)
سلیمان ص۱۷۷ (طبقہ سوم) سودا مرزا رفیع طبقہ سوم ص۸۶، سوز میر محمد (سوم) ص۱۳۱
سید میر یادگار علی طبقہ سوم (ص۱۸۵) شاداب، طبقہ سوم (ص۱۸۷) ضیا میر ضیاء ص۱۶۰ (طبقہ سوم)

علیم ص ۱۳ طبقہ اول۔ فرحت، فرحت اللہ ص ۱۶۹ (سوم) فرخ، میر فرخ علی ص ۱۱۷ (طبقہ سو
فغانی اشرف علیخاں فغان طبقہ سوم (ص ۱۵۷) فقیر محمد شمس الدین طبقہ سوم ص ۸۲
قائم، قیام الدین علی ص ۲۰ طبقہ سوم، قدرت شاہ قدرت اللہ ص ۱۶۱ طبقہ سوم
قلندر بدھ سنگھ (طبقہ سوم) ص ۱۲۵، کاشی لالہ کاشی ناتھ (طبقہ سوم) ص ۱۶۴،
کافر دجنوں میر علی تقی طبقہ سوم (ص ۱۸۶) حکیم محمد حسین طبقہ سوم (ص ۱۱۳)
مائل میاں محمدی (طبقہ سوم) ص ۱۷۸، مجذوب غلام حیدر (طبقہ سوم) ص ۱۸۶
محسن، محمد محسن (طبقہ سوم) ص ۱۵۴، مخلص میرزا محمد حسین (طبقہ دوم) ص ۵۵
مظہر مرزا جان جاناں طبقہ سوم (ص ۸۲) ممتاز حافظ فضل علی طبقہ سوم (ص ۱۸۲)
منت قمر الدین طبقہ سوم (ص ۱۹۸) منعم، طبقہ دوم (ص ۴۶) میر محمد تقی (سوم) ص ۱۲۱
نثار میر عبدالرسول طبقہ سوم ص ۱۷۵، نظام، طبقہ سوم ص ۱۴۸، وحشت میر ابوالحسن
طبقہ سوم (ص ۱۶۲) وفا لالہ تولی رائے (طبقہ سوم) ص ۱۸۸
ہدایت میاں ہدایت اللہ طبقہ سوم ص ۱۱۸، ہم رنگ دلاور خاں طبقہ سوم (ص ۱۶۶)
یقین، انعام اللہ خاں (طبقہ سوم) ص ۱۳۴۔

ترجمے کی ایک خصوصیت

محسن کے ترجمے کی ایک خاص خوبی یہ ہے کہ قائم اور ان کے پیشرو بعض تذکرہ نویسوں نے، دکنی شاعروں کا ذکر کم کیا ہے۔ محسن کے ہاں بطورِ خاص ایسے شعرا کی تعداد کافی ہے کہ جن کا تعلق دکن سے تھا۔ مترجم نے کن شعرا کے اضافے، اصل سے زیادہ کئے ہیں ان کے نام لکھے جاتے ہیں۔

طبقہ اول:۔ احمد (شاعر قدیم) ص ۲، امجد شاعر قدیم (ص ۲) بے چارہ دکھنی (ص ۳) بے قید (فضائل یلیخاں) ص ۶، بے کل عبدالوہاب (ص ۵)، جلیل میر عبدالخلیل (ص ۶) حبیب (شاعر

حیدرآباد دکن) ص۳۲ ، خاکی (عہد جہانگیر ص۴) خوشنود دکنی (ص۴) شعوری (ص۵)
صبائی (متوطن حیدرآباد) ص۵۱ ، عبداللہ قطب شاہ (ص۵۲) عزیز اللہ (ص۵۳) غوامی ص۵۴
مرزا محمد ص۵۸ ، ملک دکنی ص۵۸ ، نامی (شاعر دکن) ص۶۰ ، یونس حکیم یونس ص۶۴
طبقہ دوم :- آزاد، خواجہ زین العابدین (ص۸۶) ، احسن علی احسان خاں ص۸۶ ، اشرف
محمد اشرف ص۸۰ ، افغان الف خاں ۸۷-۸۶ ، افغان بیگن خاں ص ۸۷ ، افکار (باشندہ
دہلی) ص ۸۶ ، افکار میر جیون (۹۰-۸۹) اکبر مرزا اکبر قلی ص۸۶ ، جرات قلندر بخش
۹۸-۹۷ ، جنون ص۹۷ ، جوہر مرزا احمد علی ص۹۷ ، حبا ص۹۹ ، داؤد مرزا داؤد بیگ
ص۱۲۰ ، دار کریم اللہ خاں ص ۲۱-۱۲۰ ، ذہین میر مستعد ص۱۲۱ سعادت، سعادت اللہ
ص۱۲۲ - سید میر امام الدین ص۱۲۳ - شوقی (سقہ) ص۱۲۶ ، شہید شاہ غلام حسین ص۱۲۶-۱۲۵
صابر، صابر شاہ ص۲۹-۱۲۸ - صادق میر جعفر علیخاں (ص۱۲۹) صادق ہیت رام ص۱۳۷
صفدری حیدرآبادی ص۱۳۸ - صمصام نواب صمصام الدولہ ص۱۳۷ - صفت مغل علیخاں ص۱۳۸ -
صواب شیخ محمد اشرف ص۳۷-۱۳۶ - ضیاء ضیاالدین ص۴۰-۱۳۹ - ضیا مرزا ضیا بیگ
طالع شمس الدین ص۱۴۰ - ظہور باشندہ دہلی ص۱۴۰ - عاجز عارف الدین ص۴۲-۱۴۲
عاشق مولوی جلال الدین ص۴۵ - عاقل، عاقل شاہ ص۴۵-۱۴۴ - عمدہ جعفر علیخاں ص۱۴۱

محسن لکھنوی کی شاعری محسن لکھنوی اپنے زمانے کے نامور شاعر تھے۔ ان کا شمار سلسلۂ ناسخ کے مشہور شاعروں میں ہوتا تھا۔ لیکن افسوس ان کا دیوان شائع نہ ہو سکا۔ اور نہ ہی قلمی صورت میں کہیں موجود ہے۔

محسن لکھنوی نے ایک ایسے گھرانے میں آنکھ کھولی تھی جہاں شعروادب کا بہت چرچا تھا۔ پھر لکھنؤ جیسے شہر میں پرورش پائی۔ ان کے زمانے کے لکھنؤ میں

ابھی مصحفی و انشاء کی شاعرانہ چشمکوں کی داستانیں زندہ تھیں۔ اور جرأت کی معاملہ بندی لوگوں کو مرغوب تھی۔ شیخ ناسخ کی استادی نے الگ اپنا رنگ جما رکھا تھا جس کی تقلید میں لکھنؤ کے تمام شعراء اسی انداز کی شاعری کرنے کی کوشش کر رہے تھے۔ محسن لکھنوی اس ادبی صورت حال سے متاثر ہوئے۔

محسن لکھنوی نے اپنے والد شاہ حسین حقیقت کی مختلف تصانیف کو تو از سرِ نو بعض مطبعوں سے شائع کرایا تھا۔ لیکن خود اپنے دیوان کی اشاعت کی طرف کبھی متوجہ نہیں ہوئے۔ ان کی زندگی میں صرف ان کا ترتیب دیا ہوا ایک تذکرہ "سراپا سخن" کے نام سے مطبع مصطفائی سے شائع ہوا تھا۔ اس تذکرے میں محبوب کے مختلف اعضا کے بارے میں کہی ہوئی ان کی غزلیں بھی موجود ہیں۔

فی الوقت اسی کو ان کا کل شعری سرمایہ سمجھنا چاہیے۔

دیسے قیاس ہے کہ ۱۸۵۷ء میں ان کا اصل شعری سرمایہ ضائع ہو گیا۔ گردش روزگار کے سبب رفتہ رفتہ محسن کی طبیعت شعر و سخن اور دنیاوی دل چسپیوں سے اٹھتی چلی گئی۔ اور انھوں نے قلندری اختیار کر لی۔ لہٰذا یہ ممکن ہے کہ انھوں نے خود شعری مجموعے کی اشاعت کی طرف توجہ نہ دی ہو اور اسے محفوظ نہ رکھا ہو۔

محسن کے کلام کے محفوظ نہ رہنے کے سلسلے میں ایک اور پہلو سے بھی سوچا جا سکتا ہے۔ مرزا رسوا نے اپنے ناول "شریف زادہ" میں مرزا عابد حسین کے کردار کو پیش کیا ہے۔ یہ کردار لکھنؤ کی اس پر تعیش اور شاعرانہ زندگی کی ضد معلوم ہوتا ہے اور بالکل ایک ایسا مشینی کردار ہے جو خود کو بدلتے ہوئے حالات کے سانچے میں ڈھالنا چاہتا ہے۔ اور گزشتہ لکھنؤ کی تہذیبی زندگی کے ایسے عناصر کو

ناپسندیدگی کی نگاہ سے دیکھتا ہے جو قوم کی تباہی کا باعث ہوئے۔ شعر و شاعری کو بھی وہ انھیں عناصر میں شمار کرتا ہے۔ یہ کردار دراصل، سید جعفر حسین کا نمائندہ ہے۔ جو محسن لکھنوی کے بڑے صاحبزادے تھے۔ انھوں نے اپنی جدوجہد اور کاوش سے اپنی زندگی بنائی تھی۔ مرزا رسوا اسی زندگی کو ایک آئیڈیل زندگی سمجھتے تھے۔ یہ دراصل لکھنؤ کی پہ تصنع اور کاہلی میں ڈوبی ہوئی زندگی کا فطری ردعمل تھا۔ ہو سکتا ہے اسی بنا پر ان کے صاحب زادے نے والد کے کلام کو شائع کرنا پسند نہ کیا ہو۔

محسن کے کلام کے نہایت مختصر نمونے ایک دو اشعار کی صورت میں بعض تذکروں میں ملتے ہیں۔ ان کا کہا ہوا ایک قطعہ، مولوی عبدالغفور خاں نسّاخ کے مرتب کردہ قطعۂ منتخب میں بھی ملتا ہے۔ ؎

صاف ہے ہر شجر گل پہ عروسانہ بہار
ہر چمن باغ میں عشرت کا بنا کاشانہ
دودھا گل چیں ہے بنات آج چُنی جاتی ہے
پھول مصری ہے سر شاخ دلہن کا شانہ

محسن لکھنوی نے درج ذیل اعضاء پہ غزلیں کہی ہیں :-

(۱) سر (۲) بال (۳) زلف (۴) جبیں (۵) ابرو (۶) آنکھ (۷) پلکیں (۸) مژہ (۹) ناک (۱۰) گال (۱۱) پھونٹ (۱۲) لب (۱۳) دانت (۱۴) زبان (۱۵) دہن (۱۶) کان (۱۷) لو (۱۸) منہ (۱۹) گلا (۲۰) گردن (۲۱) دوش (۲۲) شانہ (۲۳) بازو (۲۴) کلائیاں (۲۵) ہاتھ (۲۶) پہونچا (۲۷) ہتھیلیاں (۲۸) انگلیاں

(۲۹) ناخن (۳۰) چھاتیاں (۳۱) بغل (۳۲) دل (۳۳) روح (۳۴) ناف
(۳۵) پشت (۳۶) کمر (۳۷) پاؤں (۳۸) پا (۳۹) ایڑیاں (۴۰) ٹخنے ۔

محسن لکھنوی کا سلسلہ شاعری جیسا کہ عرض کیا جا چکا ہے۔ شیخ امام بخش ناسخ سے ملتا ہے۔ وہ شیخ ناسخ کے شاگرد خواجہ وزیر وزیر کے شاگرد تھے۔ ناسخ نے اردو شاعری کو ایک نیا رنگ و آہنگ اور اردو شعر و زبان کو ایک نیا قالب عطا کیا۔ اُن کی شاعری کا تعلق دل سے زیادہ دماغ سے تھا۔ اُن کا شاعرانہ مزاج باطن سے زیادہ ظاہر سے منسلک تھا۔ جسے عام طور پر "خارجی کیفیت" سے منسوب کیا جاتا ہے۔

لکھنوی شاعری اسی خارجی کیفیت کی شاعری ہے۔ ایک پر تصنّع تہذیب میں جو جو خرابیاں فرد میں پیدا ہو سکتی ہیں ان سب کا عکس لکھنوی شاعری میں نظر آتا ہے۔ دربار داری اور عام لکھنوی مذاق سخن نے ان شاعروں کو بھی متاثر کیا جو دہلی سے لکھنؤ آ بسے تھے۔ میر تقی میر بڑھاپے میں دہلی سے لکھنؤ آئے تھے۔ ان کی شاعری میں داخلیت اور اعلیٰ شاعری کی اقدار اس قدر گہری تھیں کہ لکھنوی شاعری کا ماحول اور وہاں کے سماجی، تہذیبی اور عام مقبولیت کے تقاضے بھی ان کا انداز نہ بدل سکے۔

متوسط درجے کے جن شاعروں نے لکھنوی مزاج کو اپنایا۔ ان میں جرأت، انشاء وغیرہ کے نام قابل ذکر ہیں۔ مصحفی نے ان کے مقابل وہ مقبولیت نہیں پائی۔ لیکن ان کا سب سے بڑا کمال یہ ہے کہ ذہنی طور پر وہ قدما کی روایت سے متعلق رہے۔ اگرچہ اکثر انھیں لکھنؤ میں زندگی گزارنے اور انشاء اللہ خاں انشاء سے ٹکر لینے کے لیے مروّجہ انداز بھی اختیار کرنا پڑا۔ جرأت کے بارے میں میر تقی میر کا نقرہ مشہور ہے۔ لیکن جرأت کے کلام میں کم از کم سادگی تو ملتی ہے۔ اور ان کی غزلوں کی روایتیں یقیناً نامانوس اور

ثقیل الفاظ لیے ہوئے نہیں ہوتیں۔ ان کی شاعری میں ہوس ناکی کے ساتھ کہیں کہیں وہ عشق بھی نظر آجاتا ہے جو شاعر کے صاحب درد ہونے کی طرف اشارہ کرتا ہے لیکن یہ سچا عشق ان کی شاعری کا غالب عنصر نہ بن سکا، اس لیے اُن کی ہوس ناکی نے معاملہ بندی کی صورت اختیار کرلی۔

اس کے بعد ناسخ کا دور آتا ہے۔ ناسخ کے ہاں بھی علوئے تخیل موجود نہیں ہے۔ ان کی تمام شاعری تصنع اور بوجھل اور ثقیل تراکیب و الفاظ سے بھری ہوئی ہے۔ اور اس شاعری سے محظوظ ہونے کے لیے خاصی ذہنی مشقت کی ضرورت ہے۔

اچھی اور بڑی شاعری میں تخیل کی بلندی اور شاعر کے طرز بیان کو بہت دخل ہوتا ہے پوری لکھنوی شاعری تشبیہات اور استعارات کے انوکھے پن اور پیش پا افتادہ باتوں کو نئے رنگ، ڈھنگ سے کہنے کی کوشش ہے جس سے مراد قاری کو چونکانا ہے۔

شعراء لکھنؤ نے مختصر غزلوں کی بجائے طویل غزلیں کہنا شروع کیں اور زیادہ سے زیادہ اور مشکل قافیوں کے استعمال کو اپنی قابلیت اور قدرت بیان کے اظہار کے لیے استعمال کیا۔ اس میں شاعری کی اصل روح غائب ہوگئی۔

داخلی کیفیات کی عکاسی لکھنوی شاعری میں مفقود ہے۔ عشق کی دردمندی اور گھلاوٹ ان شعراء کی غزلوں میں کم یاب ہے۔ ہاں محبوب کی کنگھی، چوٹی، زلف، خط و خال، انگیا، محرم، ناف، اور اسی قسم کے دوسرے موضوعات کی کثرت ہے۔

محبوب کے سراپا کے بارے میں اشعار نہیں دہلوی شعراء اور اردو کے ممتاز شعراء کے ہاں بھی ملتے ہیں لیکن اشعار میں ایک دل گدازی اور اثر آفرینی و گھلاوٹ ہے۔ اور ان میں محبوب کے سراپا کی جو تعریف کی جاتی تھی وہ سُننے والے کو ناگوار لگنے کے بجائے

ان کے جمالیاتی احساس کو حظ پہنچاتی تھی۔ میر ہی کے شعر لیجئے ؎

نازکی اس کے لب کی کیا کہئے　　پنکھڑی اک گلاب کی سی ہے۔

یا

میر ان نیم باز آنکھوں میں　　ساری مستی شراب کی سی ہے

ولی دکنی کا شعر ہے ؎

تجھ لب کی صفت لعل بدخشاں سے کہوں گا　　جادو ہیں تیرے نین غزالاں سے کہوں گا

لکھنوی رنگ سخن کو انتہا تک پہنچانے والے شیخ امام بخش ناسخ ہیں۔ اور ہم شروع میں کہہ آئے ہیں کہ محسن لکھنوی لکھنؤ کے عام رنگ سے متاثر اور شیخ امام بخش ناسخ کے دبستان فکر کے مقلد ہیں۔ اور شیخ ناسخ کے لئے بہت اچھی رائے رکھتے تھے اور جگہ جگہ اپنے تذکرے میں انھیں امام الاکملا لکھا ہے۔

محسن لکھنوی کی تنقیدی صلاحیت بہت اچھی تھی۔ اس کا اندازہ ان کی ان آراء سے ہوتا ہے جو قائم کے تذکرے مخزن نکات کے ترجمے کے وقت انھوں نے ظاہر کی تھیں لیکن انھوں نے اپنی اس تنقیدی بصیرت سے خود اپنی شاعری کو کوئی خاطر خواہ فائدہ نہ پہنچایا۔ اور قدما بالخصوص ناسخ کی تقلید ہی کو کمال جانا۔

محسن کی جو غزلیں دستیاب ہوئی ہیں ان میں روایتی مضامین ہیں۔ ہوسناکی ہے، اور محبوب کے اعضا کے بارے میں صرف ایسے ہی اشعار ملتے ہیں جو خارجی کیفیت کے مظہر ہیں۔ علوئے تخیل یکسر ناپید ہے۔ البتہ یہ اندازہ ہوتا ہے کہ شاعر اپنے تاثرات اور حسن کی آرائش و زیبائش کو بیان کرنے پہ خاص قدرت رکھتا ہے اور محبوب کے ظاہر کا مشاہدہ اُس نے خاصی محنت سے کیا ہے۔ رعایت لفظی بھی اشعار میں موجود ہے۔ شاعری سپاٹ اور بے روح ہے اور سیدھی سادی حقیقت نگاری ہے

محسن لکھنوی ۔ زبان و بیان کے سلسلے میں خاصے محتاط ہیں نشست الفاظ اور بندش کے استعمال پہ انھیں پوری قدرت ہے ۔ اکثر موقعوں پہ تشبیہات و استعارات بھی خوبصورت اور اچھے لے آتے ہیں لیکن فکر اور جذبے کی بلندی مفقود ہے جب کہ شاعری جذبات ہی کی زبان ہے ۔ اسی لیے ان کے اشعار میں وہ بات نہیں ملتی جو ایک شعر کو اچھا شعر کہلواتی ہے ۔ اشعار یکسر آورد اور تصنع معلوم ہوتے ہیں اور اس سے ان کی استادانہ ریاضت کا اندازہ ہوتا ہے لکھنوی شاعری میں شکوہ الفاظ عام ہے محسن کے ہاں بھی ہم شکوہ الفاظ پاتے ہیں ۔ ان ساری باتوں کے باوجود محسن کے دستیاب شدہ کلام میں بعض ایسے شعر بھی ہیں، جو قاری کو اپنی طرف متوجہ کر لیتے ہیں ۔ ایسے ہی چند شعر درج کیے جاتے ہیں ۔

انتخاب اشعار

رات کو مہر درخشاں نظر آیا محسن
یار نے دست حنائی کو جو رکھا سر پہ

رہرو ملک عدم مجھ کو کیا پیری نے
یہ سفیدی نہیں ہے گرد سفر بالوں میں

خواب غفلت سے ہو بیدار کہ پیری آئی
صاف ظاہر ہے سفیدی سحر بالوں میں

چین جبیں کو ہم نے خدنگ تمنا کیا
غصے میں دیکھ لی جو تمہاری کہیں جبیں

سونے میں ہاتھ شب کو جو رکھے وہ نازنیں
ہو ماہ زیر ابر تہہ آستیں جبیں

دیکھنا آرزوئے دید اسے کہتے ہیں
کھولے ہیں حلقۂ آغوش تمنا آنکھیں

قید ہستی سے رہائی نہ ہوئی وائے نصیب
ہم نظر بند رہے جیسے ہوئیں وا آنکھیں

صورت اشک رواں حسرت دیدار میں ہوں
طے کریں پائے نگہہ سے ابھی رستہ آنکھیں

تشبیہ چراغوں سے اگر دوں تو بجا ہے
جلتی ہیں یہ آنکھیں کہ شرر بار ہیں پلکیں

آتش رنگ حنا سے نقش پا جلتا ہے کیا
اے پری آتا ہے دود نقش حا دو ناک میں

نہ ان سے سبزۂ بیگانہ آشنا ہو کبھی
شگفتہ مثل گل تر رہیں تمھارے گال

ہر ایک کو شفق صبح رُخ کا شبہ ہوا — غضب سے لال ہوئے گر کہیں تمہارے گال

حرف سخن گراں جو نزاکت سے ہو گئے — مانند غنچہ تنگ ہوئے وہ ہلا کے ہونٹ

محسن جفائیں سہتا ہے کرتا نہیں گلا — گویا کہ سی دیئے ہیں ترے باوفا کے ہونٹ

کس کو ملا ہے اوس دہن تنگ کا نشاں — یہ وہم ہے جو ہم کو ہوا ہے خیال لب

کہتے نہیں ہو فرط نزاکت سے تم سخن — گویا دہن پہ مہر خموشی ہے خال لب

مستی کا رنگ شب ہے سفیدی بیاض صبح — دکھلا رہے ہیں جلوہ میل و نہار دانت

قاتل ذرا کس مزے سے میں کرتا ادائے شکوہ — میرے دہان زخم میں ہوتی اگر زبان

مثل بوئے گل کہو جامے سے باہر کیوں ہوئے — کیا ہوا خواہوں نے اے گل آج پھونکا کان میں

پیری کا لطف بادجوانی سے مٹ گیا — دامان شب سے بجھ گئی شمع سحر کی لو

سمجھے پیام موت کو بھی ہم پیام یار — ایسی لگی ہوئی تھی ہمیں نامہ بر کی لو

زاد سفر کا میں سفر میں رہے خیال — دل کو لگی رہے جو اودھ کے سفر کی لو

اوس کا زنہار نہ ہو کس طرح دوبالا محسن — پایا بت توڑنے کو جس نے نبیؐ کا شانہ

زندگی بھر نہ کبھی وہ گل تر ہاتھ آیا — بس یہی نخل محبت کا ثمر ہاتھ آیا

چرخ نے صورت سیار ٹھہرنے نہ دیا — اتفاقاً جو کوئی درہم زر ہاتھ آیا

ہنس کے کہتے ہیں وہ عاشق کا جو سر ہاتھ آیا — شاخ شمشیر سے یہ ہم کو ثمر ہاتھ آیا

ناز سے کہتے ہیں وہ اکثر دکھا کر چھاتیاں — سنگ دل جیسے ہیں ہم ویسی ہی پتھر چھاتیاں

دل کو سودائے زلف نے ایسا بسا دیا — ہم سمجھے کوئی نافۂ آہو بغل میں ہے

کبھی سنے نہ حقیقت وہ تند خو دل کی — جو چھیڑ دوں کبھی پہلو سے گفتگو دل کی

کسی کے کوچۂ گیسو میں ڈھونڈا اے محسن — عبث ہے سینۂ سوزاں میں جستجو دل کی

وحشت یہ ہو جو دیکھ لے آنکھوں کو یار کی — ٹھہرے کبھی نہ چشم غزال ختن میں روح

تذکرہ مخزن نکات

میر جعفر، جعفر تخلّص، سید صحیح النسب بود، چوں اساس سخنوری اکثر بہ ہزل گذاشت بناءً علیہ زٹلیش می گفتند و ازاں جا کہ کلامش در عوام شہرت تمام می یافت اعزہ ہای آں زماں بپاس آبروی خویش بادی بہ سلوک شائستہ پیش می آمدند۔ گویند روزے بہ خدمت میرزا عبدالقادر بیدل وارد شد۔ ایشاں بعد استماع نظم و نثرش چند اشرفی بہ طریق انعام مرحمت فرمودند۔ بہ وقت رخصت ایں مصرع در مدحیہ اش خواند۔ مرخص شد؛

ظہوری و عرفی بہ پیش تو پیش

(ص ۳۱-۳۰)

ترجمہ مخزن نکات

میر جعفر باشندہ دہلی، سید صحیح النسب (نسب کذا) کلام ان کا اعجوبہ روزگار، ہندی فارسی عربی آمیز اکثر بطور ہجو بے سروپا بھا کا آمیز اس واسطے زٹلی مشہور۔ نظم و نثر کا ایک حال کلام اس کا ہر شہر و دیار میں موجود۔ امرائے اس وقت کے [واسطے حفظ و آبرو اپنی کے اس کو دوست رکھتے تھے۔ اور ہر طرح پہ مسلوک ہوتے تھے] [ایک روز واسطے ملاقات مرزا عبدالقادر بیدل کے آئے اور نظم و نثر اپنا کہا ہوا ان کے روبرو پڑھا کئی اشرفی بطریق انعام مرزا صاحب نے دیں۔ بروقت رخصت یہ مصرع (۱) ان کی تعریف میں بدیہہ کہا ع

ظہوری و عرفی بہ پیش تو پیش

(ورق ۳ الف) ص ۱۱

خان بہادر سیّد جعفر حسین

علی گڑھ تحریک کا ایک مجاہد

کارلائل نے کہا ہے کہ دنیا میں ہر انسان اس قابل ہے کہ اس کی سوانح عمری لکھی جائے۔ اس قول کی توجیہ غالباً یہ ہو سکتی ہے کہ بڑی اور تاریخ ساز شخصیات کے علاوہ جنھوں نے کسی نہ کسی شعبہ ہائے حیات میں کارہائے نمایاں سرانجام دیئے ہوں، عام انسان کی زندگی میں بھی اس کے عہد کے معاشرتی، تمدنی اور تہذیبی اثرات کا سراغ لگایا جا سکتا ہے۔

خان بہادر جعفر حسین کی شہرت لامحدود نہ سہی، لیکن ان کی زندگی اس قابل ہے کہ اس کو صفحہ قرطاس پر پیش کیا جائے۔ عام انسانی حیثیت سے بھی ان کی زندگی کی جد و جہد کی داستان آنے والی نسلوں کے ان افراد کے لئے شمع کی مانند ہے جن کی ہمت ابتدائی زمانے میں حالات کی نامساعدت، اور راہ کی دشواریاں توڑ دیتی ہیں۔ ان کا تعلق ہماری زندگی کے ایک ایسے دور سے ہے کہ جب ہندوستان کے مسلمان زوال اور غلامی کی راہوں میں بھٹک رہے تھے اور

سرسید احمد کی علی گڑھ تحریک انھیں روشنی دکھا رہی تھی اور ان کی اولوالعزمی راہ سجھا رہی تھی۔ لوگوں کو نئی منزل کے لئے آمادہ سفر کرنے کا آغاز کر چکی تھی۔

خاں بہادر جعفر حسین نے ۱۸۵۶ء کے لگ بھگ لکھنؤ میں ایک شریف اور شاندار روایات کے حامل خاندان میں آنکھ کھولی۔ اس وقت تک جاہ وحشمت اس خاندان سے رخصت ہو چکا تھی البتہ خاندانی شرافت و نجابت باقی تھی۔

اس زمانے میں لکھنؤ خود عبرت کا مرقع بننے والا تھا۔ ایک برس بعد، لکھنؤ کی بادشاہت کا وہ دور بھی ختم ہونے والا تھا کہ جس کو پورے لکھنؤ کی تہذیبی زندگی کا محور کہنا چاہیئے۔ امرأ و روسأ اور طبقہ شرفا کی زندگیاں بے عملی، اور مثبت سوچ کے فقدان کا شکار ہو چکی تھیں اور بیشتر لوگ پدرم سلطان بود کے مصداق صرف ماضی کی عظمت رفتہ اور شوکت وحشمت کے دل خوش کن تذکروں میں مصروف تھے اور اپنی تباہی کا، اپنے خاندان کے شاندار ماضی سے موازنہ کر کے پھر خواب غفلت میں سو جانے کے عادی ہو گئے تھے۔

لکھنؤ کی عام مجلسی زندگی کے منفی اثرات خانوادہ امیر کلال کے اس نوزائیدہ بچے پر بھی پڑنا فطری معلوم ہوتا ہے لیکن سید جعفر حسین نے اپنے خاندان کے شاندار ماضی کی راکھ سے ققنس کی طرح ایک نئی زندگی حاصل کی اور اپنی محنت و کاوش اور بے پناہ عملی قوت کے سبب آپ اپنا جہان پیدا کیا۔

سید جعفر حسین، مشہور شاعر اور تذکرہ سراپا سخن کے مصنف میر محسن لکھنوی کے فرزند تھے جن کا سلسلہ حضرت امیر کلال سے جا ملتا ہے جو حسینی سید تھے۔ میر محسن لکھنوی اپنی خاندانی شرافت، شاعری اور علم کے سبب لکھنؤ اور دوسرے علاقوں میں مشہور تھے۔ محسن لکھنوی نے ایک طویل عرصے تک نہایت معروف زندگی گزاری تھی اور زمانے کے

گرم و سرد کو دیکھنے کے بعد کچھ تو عام لکھنوی فضا اور پھر طبعاً شاعر ہونے، اور ایک مشہور صوفی خاندان کے فرزند ہونے کے سبب، دنیا سے قطع تعلق کر کے، فقیرانہ روش اختیار کر لی تھی۔ ایسی صورت میں انکی توجہ دنیاوی بکھیڑوں اور اولاد کی تعلیم و تربیت کی طرف کم ہی رہی اور پھر سید جعفر حسین کے بچپن میں ہی ان کے والد انتقال بھی ہو گیا تھا۔

محسن لکھنوی کے تین لڑکے تھے، ایک سب سے بڑے جو عمر میں سید جعفر حسین سے سترہ اٹھارہ برس بڑے تھے۔ پرتاپ گڑھ میں اسکول ماسٹر تھے۔ دوسرے سید محمد حسین تھے۔ جنھوں نے لندن جاکر زراعت اور انجینئرنگ کی تعلیم حاصل کی، اور ملکہ وکٹوریہ نے ان کے تعلیمی اخراجات برداشت کئے اور ان سے اپنے بیٹے کی طرح سلوک کیا۔ اس تعلق کی وجہ یہ ہے کہ سید محمد حسین، شاہی محل کے نیچے سے گزر رہے تھے۔ وہاں غالباً کچھ تعمیر کا کام ہو رہا تھا۔ اتفاق سے چند اینٹیں نیچے سید محمد حسین پر آگریں اور ان کی ٹانگ ٹوٹ گئی ملکہ وکٹوریہ کو معلوم ہوا تو اپنی مشہور زمانہ نیکی اور رحمدلی کے سبب سید محمد حسین کی عیادت کے لئے ہسپتال میں گئیں اور جب انھیں ان کے حالات معلوم ہوئے لندن میں قیام اور تعلیم کے تمام اخراجات ملکہ نے خود برداشت کرنے کا وعدہ کیا۔ سید محمد حسین نے بعد ازاں بہت ترقی کی، اور حیدرآباد و کانپور میں دیوان رہے، برطانوی حکومت ہند میں بھی اعلیٰ عہدوں پر فائز رہے۔ زراعت کے موضوع پر کئی بلند پایہ کتابیں بھی ان سے یادگار ہیں۔

برصغیر میں سرسید احمد خاں کی تحریک کا آغاز ہو چکا تھا اور ہندوستان کے طول و عرض میں اس تحریک کے حامیوں اور مخالفوں میں سرسید اور ان کی درسگاہ کا شہرہ تھا۔ لکھنؤ میں بھی بہت سے نوجوان جدید تعلیم کی طرف متوجہ ہو رہے تھے گو ابتدائے عمر سے لیکر زندگی کی آخری سانسوں تک سید جعفر حسین سرسید کی تحریک کے سرگرم حامیوں میں سے رہے لیکن یہ بات

یقین سے نہیں کہی جاسکتی کہ آیا انجنیئرنگ کی تعلیم کے حصول کی خواہش، ان میں سرسید احمد خاں کی تحریک کے سبب پیدا ہوئی تھی یا بدلتی ہوئی زندگی کا شعور اور یہ خیال کہ مستقبل میں کس نوع کی تعلیم ہندوستان کے لوگوں کے لئے سودمند اور کارآمد ہوسکتی تھی انھیں رڑکی انجنئرنگ کالج تک لے گیا۔

انجنیئرنگ کالج رڑکی میں داخلہ لینے کے سلسلے میں ان کے خاندان میں دو روایات مشہور ہیں ایک تو یہ کہ مروجہ تعلیم کے حصول کے بعد انھوں نے اپنی والدہ سے دس روپے مانگے اور رڑکی کالج میں داخلے کے لئے لکھنؤ سے روانہ ہو گئے۔

دوسری روایت یہ ہے کہ سید جعفر حسین کا قیام، اپنے بڑے بھائی کے پاس تھا جو شادی شدہ تھے اور ان سے عمر میں سترہ اٹھارہ برس بڑے تھے ان کے یہ بھائی اسسٹنٹ انسپکٹر آف اسکولز تھے اور پرتاب گڑھ میں تعینات تھے۔ سید جعفر حسین ان کے ساتھ ہی رہا کرتے تھے۔ اور وہیں انھوں نے مڈل تک تعلیم حاصل کی، اور انگریزی زبان سیکھی۔ ہر چند کہ اسکول پابندی سے نہیں جاتے تھے لیکن اپنی خداداد ذہانت اور بے مثال قوت حافظہ کے سبب اسکول میں باقاعدہ جانے والے ہم جماعتوں سے زیادہ اچھے نمبروں میں پاس ہوتے تھے اکثر اسکول جانے کے لئے گھر سے نکلتے لیکن راستے میں ایک پل کے نیچے بیٹھ کر مختلف قسم کے نقشے بناتے رہتے تھے۔ جب بڑے بھائی کو اس بات کی خبر ہوئی تو وہ ناراض ہوئے بھاوج نے بھی کہا کہ پڑھتے لکھتے نہیں ہو کیا خالی لکیریں کھینچ کھینچ کر روٹی کما سکو گے؟

بھائی کی بات کا تو شاید اس قدر اثر نہ ہوتا لیکن بھاوج کی بات ناگوار گزری اور گھڑا اور چنے لے کر پیادہ رڑکی کی جانب چل دیئے جہاں اس وقت انجنیئرنگ کالج تھا۔ دو مہینے میں پیدل چل کر رڑکی کالج پہنچے اور داخلہ لے لیا۔ اور بہت محنت کے ساتھ پڑھا اور امتحان

میں اوّل آئے۔

افراد اپنے اردگرد کے لوگوں کو متاثر کرتے ہیں اور اپنا اچھا یا بُرا تاثر دوسروں پر قائم کرتے ہیں۔ لیکن میرے خیال میں اگر کوئی شخص اپنی ذات سے کسی بڑے ادیب یا دانشور کو متاثر کر دے تو اس کی شخصیت کے مکمل ہونے میں کسی قسم کا شک و شبہ باقی نہیں رہ جاتا۔ سید جعفر حسین بھی ایک ایسی ہی شخصیت ہیں جنھوں نے اپنی جدوجہد اور قوت عمل سے اردو کے عظیم ناول نگار مرزا ہادی رسوا کو متاثر کیا اور انھوں نے سید جعفر حسین کی زندگی پر ایک پورا ناول لکھ ڈالا۔ جو شریف زادہ کے نام سے مشہور ہے۔

لکھنؤ کے زوال پذیر معاشرے میں جہاں کا ہر فرد پدرم سلطان بود بنا ہوا تھا۔ مرزا ہادی رسوا نے سید جعفر حسین کے کردار میں وہ خصوصیات پائیں جس کا تعلق بے عمل زندگی سے نہیں تھا اور جو زندگی کی مثبت قدروں کا حامل تھا۔

یہاں سوال کیا جا سکتا ہے کہ اس بات کا کیا ثبوت ہے کہ شریف زادہ کے ہیرو کی زندگی دراصل سید جعفر حسین کی زندگی ہی ہے بعض ہم عصر شہادتوں کے علاوہ شریف زادہ کے ہیرو کے کردار میں بیشتر باتیں اور واقعات ایسے ہیں جو سید جعفر حسین کی زندگی میں پیش آمدہ واقعات سے مماثلت رکھتے ہیں

تعلیم و تربیت و پیدائش

میجر جنرل سید شاہد حامد صاحب کا بیان ہے کہ ان کے دادا سید جعفر حسین نے اسّی برس کی عمر پائی اور ۱۹۳۶ء میں ان کا انتقال ہوا۔ اس حساب سے ان کا سن پیدائش ۱۸۵۶ء قرار پاتا ہے۔ سید شاہد حامد صاحب اور منشی عبدالغفور خاں اترولوی کے بیان کے مطابق

جو رڑکی انجینئرنگ کالج میں سید جعفر حسین صاحب سے دو[۲] سال پیچھے تھے۔

سید جعفر حسین نے ۱۸۸۶ء میں انجینئرنگ کا امتحان پاس کیا تھا۔ گویا ان کے سنہ پیدائش اور رڑکی انجینئرنگ کالج سے فارغ التحصیل ہونے کے وقت ان کی عمر تیئس[۲۳] برس قرار پاتی ہے لیکن سید شاہد حامد صاحب کا بیان یہ بھی ہے کہ سید جعفر حسین نے پندرہ یا سولہ برس کی عمر میں انجینئرنگ کالج میں داخلہ لیا تھا۔ بہر حال انجینئرنگ کالج کا زمانہ تعلیم چار برسوں پر مشتمل تھا۔ اس لحاظ سے اگر ۱۸۵۶ء کو ان کا صحیح سنہ پیدائش مان لیا جائے تو پھر یہ تسلیم کرنا پڑے گا۔ کہ انھوں نے تقریباً ۲۶ برس کی عمر میں کالج میں داخلہ لیا تھا۔ دوسری طرف اگر داخلے کے وقت پندرہ سولہ برس کی عمر فرض کر لی جائے تو اس حساب سے ان کا سنہ پیدائش ۱۸۶۶ء کے لگ بھگ قرار پاتا ہے اس سلسلے میں اگر مذکورہ روایت کو بھی ذہن میں رکھا جائے کہ سید جعفر حسین مڈل کے امتحان کے بعد کالج میں داخلے کے لئے گئے تھے تو اس اعتبار سے داخلے کے وقت پندرہ سولہ برس کی عمر صحیح معلوم ہوتی ہے۔

مولوی عبدالغفور خاں اترولوی کے بیان کے مطابق سید جعفر حسین کا سال پیدائش ۱۸۵۰ء یا ۱۸۵۵ بنتا ہے، وہ لکھتے ہیں۔

"۱۹۱۰ء کے شروع میں ان کی عمر ۵۰ اور ۶۰ سال کے درمیان پہنچ گئی تھی۔ نہایت ناموری کے بعد ملازمت سے ریٹائرڈ ہو گئے۔"

ان تمام بیانات سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ وہ ۱۸۵۰ء اور ۱۸۵۵ کے درمیانی برسوں میں پیدا ہوئے ہوں گے۔

۱۔ سوانح عمری مولوی عبدالغفور خاں اترولوی مطبوعہ برقی پریس آگرہ ص ۵۵

۲۔ سوانح عمری منشی عبدالغفور خاں اترولوی مطبوعہ برقی پریس آگرہ ص ۵۶-۵۵

رڑکی انجینئرنگ کالج میں داخلہ

والدہ سے رخصت ہوکر جس وقت رڑکی پہنچے تو پا پیادہ مسافت طے کرنے کے سبب لباس گرد آلود تھا۔ لیکن وہ اسی حالت میں پرنسپل کی خدمت میں حاضر ہو گئے۔ جوان کے ذوق و شوق کو دیکھکر بہت متاثر ہوا۔ اور فوراً ہی انھیں داخلہ دے دیاگیا۔ سید جعفر حسین نے جلد ہی اپنی محنت، دیانت اور ایمانداری کے سبب طلبہ میں امتیازی مقام حاصل کرلیا۔ اور تمام اساتذہ بھی ان کی طرف خاص طور پر متوجہ ہو گئے۔ ان کے کالج فیلو مولوی عبدالغفور خاں اترولوی کے بیان کے مطابق کالج کے زمانہ طالب علمی میں اپنے اخلاقِ حمیدہ کی بناء پر وہ تمام طلبہ میں ممتاز و محبوب تھے اور اساتذہ بھی ان سے شفقت سے پیش آتے تھے۔

کالج کے زمانہ قیام کے دوران سب سے بڑا مسئلہ تعلیمی مصارف کا تھا۔ اوّل تو گھر کے معاشی حالات ایسے نہ تھے کہ وہ رقم گھر سے منگوا سکتے۔ دوسرے اپنی بھاوج کے طعنے سن کر جس عزم کو لے کر وہ گھر سے رخصت ہوئے تھے، ایسی صورت میں ان کی غیرت نے بڑے بھائی کے آگے ہاتھ پھیلانا گوارا نہ کیا۔ چنانچہ ان کا قیام تو کالج کے ہوسٹل میں تھا لیکن اپنے اخراجات کے لئے تعلیمی مصروفیات سے وقت نکال کر رات کے وقت مقامی تاجروں کا حساب کتاب لکھتے تھے اور اس کے معاوضے سے اپنے تعلیمی مصارف برداشت کرتے تھے۔

رڑکی انجینئرنگ کالج کے زمانہ تعلیم میں ان کا معمول یہی رہا اور وہ اس قدر انہماک اور توجہ کے ساتھ مطالعے میں مصروف رہے کہ والدہ کے جو خطوط ان کے نام آتے تھے، انھیں پڑھے بغیر ہی ایک گھڑے میں ڈال دیا کرتے تھے کیونکہ انھیں ڈر تھا کہ کہیں گھر کے حالات کے سبب، یا ماں کی محبّت کی بنا پر انھیں تعلیم ادھوری نہ چھوڑنا پڑ جائے یا وہ پوری دلجمعی کے ساتھ اپنی پڑھائی کی طرف توجہ نہ دے پائیں گے چنانچہ جب امتیاز کے ساتھ

انجینیرنگ کا امتحان پاس کرلیا تو اس کے بعد والدہ کے تمام خطوط ایک ساتھ پڑھے۔

یو پی میں جن پہلے دو مسلمانوں نے انجینیرنگ امتحان پاس کیا ان میں سے ایک سید جعفر حسین تھے جنھیں یہ امتیاز بھی حاصل تھا کہ وہ امتحان میں اوّل آئے تھے۔

سرکاری ملازمت

امتحان پاس کرتے ہی ان کا تقرر محکمہ انہار میں ہوگیا۔ اور پہلی تعیناتی نیپال کی ترائی میں ہوئی تھی۔ صوبجات متحدہ آگرہ و اودھ میں وہ پہلے مسلمان تھے جن کا تقرر بحیثیت انجنیئر کیا گیا تھا۔ ہر کام کو پوری توجہ اور ایمانداری سے انجام دینے کے نتیجے میں جلد ہی ان کی شہرت اعلیٰ حکام تک جا پہنچی اور ملازمت کے اوائل میں ہی انھیں ایک قابل اور باصلاحیت انجنیئر تسلیم کرلیا گیا۔

ان کے ایک کالج فیلو اور رفیق کار منشی عبدالغفور خاں اترولوی نے اپنی سوانح عمری میں بحیثیت انجنیئر ان کا تقرر حیدرآباد دکن میں بتایا ہے لیکن وہ غلط فہمی کا شکار ہو گئے ہیں۔ سید جعفر حسین تمام زندگی صوبجات متحدہ میں ہی مختلف خدمات سرانجام دیتے رہے۔ زمانہ ملازمت میں جس انداز میں مختلف اوقات میں جہاں جہاں وہ تعینات رہے ہیں اس کی تفصیل یہ ہے۔

۱۸۸۶ء میں ملازمت کا آغاز کیا۔

۱۸۹۵ء میں بلند شہر ڈویژن میں تعینات ہوئے۔ مارٹ ٹینکس ڈویژن آپ کی زیر نگرانی تعمیر ہوا۔ منشی عبدالغفور خاں اترولوی لکھتے ہیں۔

" ۱۸۹۵ء میں سید صاحب چند روز کے واسطے بلند شہر ڈویژن میں سب ڈویژنل آفیسر رہے تھے اور مجھ کو ماٹ برینچ نہر کے ہیڈ پر ان کی ماتحتی میں

۱:۔ سوانح عمری منشی عبدالغفور خاں اترولوی صـ ۴۷ تا ۵۰

قریب ایک ہفتہ کام انجام دینے کا موقعہ ملا تھا۔ اور منشی پربھودیال کی دراندازیوں سے واقف ہو گئے تھے.... میرے ہم درد تھے اور مجھکو ذہین اور ہونہار خیال کرتے تھے۔ فتح پور ڈویژن میں بھی چند ماہ یکجائی قیام کا موقعہ ملا تھا۔ ٹینکس (TANKS) ڈویژن کا چارج لینے کے بعد سید صاحب نے مجھکو للت پور سے جھانسی تبدیل کرالیا اور میری وقعت میری حیثیت سے زیادہ کرنے لگے.....

سید صاحب نے چارج لینے کے بعد کنٹرکشن کا کام عملاً میرے سپرد کر دیا اور خود تالابوں کے جدید سائٹ تلاش کرنے میں مصروف ہو گئے..."

۱۸۹۸ء موضع گرڈھ متو جھانسی میں گنجس کینال بنایا۔ چیف انجینئر سٹر میکلوڈ نے ان کے کام کی تعریف کی اور حکومت کو سفارشات پیش کیں چنانچہ اس کے نتیجے میں انھیں خاں بہادر کا خطاب ملا۔

علاوہ ازیں فتح پور ڈویژن، ڈڈ ڈیر ڈویژن، ٹینکس ڈویژن کے انچارج کی حیثیت سے خدمات سرانجام دیں۔

سید جعفر حسین نے گنجس کینال کا جو منصوبہ پیش کیا تھا اسے حکام بالا نے پسند کیا تھا۔ اس سلسلے میں ہم صوبجات متحدہ کی حکومت کے ایک خط کا اردو ترجمہ پیش کر رہے ہیں۔

گورنمنٹ صوبہ جات متحدہ۔ یکم جون ۱۹۰۶ء

گورنمنٹ ہاؤس نینی تال

ڈیر سید جعفر حسین

جھانسی کے نزدیک گرلھو میٹو کے مقام پر ایک بڑے آبی ذخیرے کی تعمیر کے سلسلے

میں آپ کی مجوزہ تجویز کو مسٹر میکلوڈ میسر علم میں لاتے ہیں۔ مجھے امید ہے کہ یہ بند ھیلکلنڈ میں ایک بہترین جھیل ہوگی اور آپ کے نام کو ملک کے محسن کے طور پر دوام بخشے گی۔ میں اس عظیم الشان منصوبے کی تعمیر پر آپ کو انتہائی مبارکباد پیش کرتا ہوں۔ مجھے امید ہے کہ مذکورہ تعمیر اس نوع کے مزید کئی منصوبوں کی ایک کڑی ہوگا۔

آپ کا خیر خواہ

جے۔ ڈی۔ لاٹوش

۱۸۹۹ء۔ ریاست گوالیار کو ایک ایسے انجنیئر کی ضرورت تھی جو ریاست میں مختلف نوعیت کے تعمیراتی منصوبوں کی تیاری اور تکمیل کرا سکے اس سلسلے میں برطانوی حکومت ہند سے کسی قابل انجنیئر کی خدمات مستعار حاصل کرنے کے لئے درخواست کی گئی تھی۔ چنانچہ حکومت ہند نے سید جعفر حسین کی خدمات ڈیپوٹیشن پر ریاست گوالیار کو دے دیں۔ یہ تعیناتی پانچ سال کے لئے تھی اس وقت سرکار برطانیہ میں وہ صوبجات متحدہ آگرہ و آودھ میں ڈپٹی مجسٹریٹ محکمہ انہار کی حیثیت سے فرائض سرانجام دے رہے تھے[1]۔

ریاست گوالیار میں سید جعفر حسین کو مورار میں ڈویژنل انجنیئر کے عہدے پر فائز کیا گیا تھا۔ وہ چار سال گوالیار میں تعینات رہے۔

۱۹۰۳ء۔ اس سال نواب محسن الملک آنریری سیکرٹری ایم۔ اے۔ او۔ کالج علی گڑھ کی درخواست پر ان کی خدمات لفٹیننٹ گورنر صوبجات متحدہ نے علی گڑھ کالج کو مستعار دے دی تھیں۔ جہاں سید جعفر حسین کی زیر نگرانی دن ریلی فنڈ کی اسکیم اور بعض نئے بلاکوں کی تعمیر کی

۱۔ بحوالہ مکتوب محسن الملک سیکرٹری ایم اے او کالج علی گڑھ بنام لیفٹیننٹ گورنر صوبجات متحدہ

جلنے والی تھی۔

۱۹۰۵ء:- اس سال سید جعفر حسین نے بینٹا نہر (BENTA CANAL) تعمیر کرائی۔

۱۹۰۷ء- سائیوار (SAIWAR) ٹینک تعمیر کرایا۔ یہاں سید جعفر حسین کا قیام چار سال رہا۔

۱۹۰۸ء :- میں بردا ساگر بنوایا۔

۱۹۱۰ء :- میں ریٹائر ہوئے۔

اپنی سرکاری ملازمت کے دوران سید جعفر حسین نے بے شمار چھوٹی بڑی تعمیرات کیں لیکن ہم نے مذکورہ بالا صفحات میں صرف ان کے چند بڑے بڑے کارناموں کا تذکرہ کیا ہے۔

ہر شعبۂ حیات میں انسان کچھ ایسے کام کرتا ہے کہ اپنے بعد اپنے نقوش ثبت چھوڑ جاتا ہے سید جعفر حسین بھی ایسے ہی لوگوں میں سے تھے ان کی زندگی کے دو نقش خاص طور پر باقی رہنے والے ہیں ایک تو ان کی وہ خدمات ہیں جو انھوں نے مسلمانوں کی تعلیم اور علی گڑھ کالج کے سلسلے میں سرانجام دیں اور ان کا دوسرا نقش وہ عمارتیں، آبی ذخیرے اور نہریں وغیرہ ہیں جو انھوں نے سرکاری ملازمت کے دوران بنوائیں۔

ایک مصنف کی یادگار اس کی تصانیف ہوتی ہیں۔ سورماؤں اور فاتحوں کی بہادری اور کارناموں کی تفصیل تواریخ یاد رکھتی ہے یہی حال تعمیرات کا ہے کہ ان کا وجود اس کے خالق کی یاد دلاتا رہتا ہے۔ مولانا شبلی نے اپنی نظم خوابِ کہن میں کہا ہے کہ اگر تاریخِ عالم سے مسلمانوں کا نام حذف بھی کر دیا جائے تو ان کی بنوائی ہوئی عمارتیں ان کے وجود کی گواہی دیں گی۔

اس صورت میں صوبجات متحدہ کے وہ آبی ذخیرے، عمارات اور نہریں:

اس کے بنانے والے کا نام زندہ رکھیں گی اور اپنے بنانے والے کی

پیشہ ورانہ مہارت کی گواہ بن رہیں گی۔

ایک ماہر کی رائے

گنجیس کینال (GANGAS CANAL) کے سلسلے میں ہم گزشتہ صفحات میں سید جعفر حسین کے ایک افسر اعلیٰ کا تعریفی خط پیش کر چکے ہیں ممکن ہے بعض طبائع اس رائے کے صائب اور حقیقت پر مبنی ہونے میں کسی قسم کے شک و شبہ کا اظہار کریں کیونکہ عام مشاہدہ یہ ہے کہ بعض اوقات افسران بالا کے اس قسم کے خطوط ماتحتوں کے خوشامد یا تملق کے سلسلے میں بھی مل جاتے ہیں۔

چنانچہ اس شک کو دور کرنے کے لئے ہم مولوی عبدالغفور خاں اترولوی کی سوانح عمری سے ایک اقتباس پیش کرتے ہیں۔ یہ ایک ماہر فن کی رائے بھی ہے اور اس میں تفصیل سے انھوں نے سید جعفر حسین کے اس کارنامے کا تذکرہ کیا ہے جس پر انھیں خاں بہادر کا خطاب ملا تھا۔

عام مشاہدے میں یہ بات آئی ہے کہ آدمی بہت کم اپنے ہم پیشہ کی تعریف کرتا ہے لہذا ان کی تعریف کو حق بجانب تسلیم کر لینے میں کوئی عذر نہیں ہونا چاہیئے۔ اس تعریف کے سلسلے میں بھی ایک گمان یہ گزر سکتا ہے کہ مولوی عبدالغفور خاں اترولوی سید جعفر حسین کے ماتحت تھے لہذا انھوں نے اس قدر تعریف بر بنائے خوشامد کی ہو۔ لیکن واضح ہو کہ موصوف نے اپنی سوانح عمری اپنی ریٹائرمنٹ اور سید جعفر حسین کے انتقال کے کافی عرصہ بعد لکھی تھی۔ چنانچہ ہم ان کے بیان کی صداقت پر یقین کر سکتے ہیں۔ وہ لکھتے ہیں۔

"موضع گڑھ میٹو کے قریب دو اونچے پہاڑوں کے اتصال سے ایک قدرتی مثلث پیدا ہو گیا تھا۔ جس کی لمبائی ایک میل چھ فرلانگ اور قاعدہ چھ فرلانگ تھا۔ اور اس میں پانی تقریباً پچاس فٹ گہرائی تک جمع ہو جانے کا امکان تھا۔ مگر (CATCHMENT) ایریا بالکل ناکافی تھا۔ سید صاحب

نے فوق العادت محنت اور جستجو کر کے ایک بڑا نالہ گڑھ میٹو ٹینک میں ڈائیواٹ (DIVERT) کر دیا سپلیمنٹری بند کی۔ لائن بے حد جدوجہد اور کاوش سے تقریباً تین میل لمبی تجویز کی اور درمیان میں راستہ پر ایک پل تقریباً تین سو فٹ لمبا تجویز کر دیا۔ اس طرح مندرجہ بالا پیمائش کا تالاب لبریز ہونا ممکن ہو گیا۔ جس کی گہرائی پچاس فٹ اور آب پاشی میں کام آنے کے قابل پانی کی گہرائی ۳۶ فٹ تھی۔ اس تالاب کی کیپٹی (CAPACITY) غالباً .. ۴ ملین فٹ مکسر سے زیادہ تھی جو ۱۸ میل لمبی نہر کو سیراب کرنے کے واسطے کافی تھی۔ اس تمام پروجیکٹ کا تخمینہ چار لاکھ روپیہ ہوا۔

جس وقت یہ پروجیکٹ قریب الاختتام تھا جھانسی میں سید صاحب نے مجھ کو دکھایا اور ضروری تشریح کی، میں نے جواب دیا کہ اگر آپ کوئی اور بڑی اسکیم یہاں تیار نہ کر سکیں تو بھی یہی ایک کارنامہ ڈویژنل افسری کے جواز کے واسطے زندہ سرٹیفکیٹ ہے۔ سید صاحب نے خوش ہو کر نسیم کا یہ شعر پڑھا۔

دی اس طرح سے نسیم نے داد سخن
شک مجھے بھی اپنی بے کمالی میں ہوا

یہ پروجیکٹ بعد تکمیل گورنمنٹ کو بھیجا گیا۔ مسٹر میکلوڈ کی تحریک سے جواب چیف انجنیئر ہو گئے تھے گورنر صاحب بہادر یوپی نے اپنا خاص دستخطی خط سید صاحب کے نام بھیجا جس میں دیگر تعریفوں کے بعد یہ فقرہ بھی درج تھا۔

IT WILL HAND YOUR NAME TO
AS A BENIFACTOR OF COUNTRY

اور پھر اس سلسلے میں سید صاحب کو "خاں بہادر" کا خطاب ہوا۔ اور ہم سب کو بے حد مسرّت ہوئی[1]۔"

ایک اور مقام پر اپنی سوانح عمری میں مولوی صاحب خان بہادر سید جعفر حسین کی تعریف ان الفاظ میں کرتے ہیں۔

"خود دیانتدار تھے۔ جفاکش اور بے حد متحمل مزاج تھے۔ تالابوں کی تجویز میں ایکسپرٹ (EXPERT) تھے اور نہایت دوراندیش تھے[2]۔"

مسلمان ریاستیں اور ہر وہ علاقہ جہاں مسلمان رہتے تھے۔ خان بہادر خاص طور سے اس علاقے میں نہایت توجہ اور دلچسپی کے ساتھ کام سرانجام دیتے تھے۔ چنانچہ ریاست بھوپال میں بھی کئی واٹر ورکس اور تالاب خاص اپنی نگرانی میں تعمیر کرائے تھے۔

اسی طرح اپنے آبائی شہر لکھنؤ کے کئی واٹر ورکس خاص اپنی نگرانی میں بنوائے۔ اور اس سلسلے میں کوئی معاوضہ طلب نہیں کیا۔ لکھنؤ میں شاہی زمانے کی نہروں کو از سر نو درست کرایا اور کئی منصوبے بنائے۔ ہیوٹ انجینئرنگ کالج کا نقشہ بھی انھوں نے ہی بنایا تھا اور اس کی تعمیر بھی اپنی نگرانی میں کرائی تھی

اس وقت کی انگریزی حکومت نے ان سے مختلف اسکیمیں بنوائیں۔ ان میں سے ایک

ELECTRIFICATION OF GIP RAILWAY

FROM JHANSI TO BOMBAY.

خاص طور پر قابلِ ذکر ہے۔ اس زمانے میں اس اسکیم پر عمل درآمد نہ ہو سکا۔

اب سنا ہے کہ آزادی کے بعد حکومت ہند نے اس اسکیم کو عملی جامہ پہنایا ہے۔

۱:۔ سوانح عمری مولوی عبدالغفور خاں اترولوی مطبوعہ برقی پریس آگرہ صہ ۴۷ تا ۵۰

۲:۔ " " " " صہ ۴۷

کاغذی تیاریوں کی تکمیل کے بعد جب معاوضہ کی ادائیگی کا وقت آیا تو خان بہادر سید جعفر حسین نے کوئی معاوضہ قبول کرنے سے انکار کر دیا اور اس خواہش کا اظہار کیا کہ جب یہ اسکیم نافذالعمل ہو جائے تو اس کی آمدنی کا ایک حصّہ ان کے خاندان والوں کو دے دیا جائے۔

جب ہندوستان میں پُرفضا مقامات کو ہل اسٹیشن کے طور پر بنایا جانا مقصود ہوا تو دیگر مقامات کے علاوہ نظر انتخابات نینی تال پر بھی پڑی۔ چنانچہ نینی تال کو ہل اسٹیشن بنانے کی غرض سے اس علاقے کے سروے کا کام سید جعفر حسین کے سپرد کیا گیا۔ سید صاحب نے نہایت محنت سے اس کام کو سرانجام دیا۔ اس خدمت کے صلے میں انگریزی حکومت نے انھیں نینی تال میں ایک پہاڑی دینا چاہی لیکن انھوں نے یہ کہکر انعام لینے سے انکار کر دیا کہ جنگل میں زمین لیکر کیا کروں گا۔"

کچھ عرصے کے لئے آپ کو گورنمنٹ انجینئرنگ اسکول کا پرنسپل بھی مقرر کیا گیا تھا آپ نے اسکول کے نظم و نسق کو پہلے سے بہت بہتر کر دیا تھا اور حسنِ سلوک اور شفقت و مہربانی کے سبب طلبہ میں بہت مقبول ہوئے۔

سید جعفر حسین کے خاندانی کاغذات اور ان کے سروس ریکارڈ پر جن مختلف انگریز افسران کے ریمارک ہیں ان سے بھی سید جعفر حسین کی پیشہ ورانہ مہارت اور قابلیت و اہلیت کی تصدیق ہوتی ہے۔

لکھنؤ میں خان بہادر سید جعفر حسین نے جو خدمات انجام دی تھیں ان کے بارے میں سر این ایم میکلوڈ ممبر بورڈ آف ریونیو لکھتے ہیں۔

"خان بہادر صاحب نے لکھنؤ کے شہر کو خوبصورت بنایا اور پانی فراہم کیا۔"

صوبجات متحدہ کے ایک مشہور انگریز چیف انجینئر نے ان کے بارے میں اس خیال

کا اظہار کیا تھا۔

"خان بہادر سید جعفر حسین سے بہتر انجینئر میں نے نہیں دیکھا..."

لندن کے "انسٹیٹوٹ آف سول انجینیرز" کے ایک اجتماع میں سر چارلس اسٹیورٹ بیلی گورنر بہار واڑیسہ نے خان بہادر سید جعفر حسین کو ان الفاظ میں خراج تحسین روا کیا۔

"خان بہادر سید جعفر حسین نے ہند ہیلکمنڈ کی نہروں کو بنوانے میں ایک زبردست نمایاں کام کیا ہے اور ملک ان کا مشکور ہے..."

سر بی گارڈن کا خیال ہے کہ:۔

"خان بہادر سید جعفر حسین نے محکمہ نہر کے لئے جو کام انجام دیئے ہیں اس کا کوئی جواب نہیں ہے..."

(GANGIS CANAL) گنجیس کینال کی تیاری پر خان بہادری کے خطاب کے علاوہ وائسرائے ہند نے بھی انھیں مبارکباد دی اور سر جان بیٹسن نے ریاست گوالیار میں ان کی خدمات کی تعریف کی۔

ایمانداری

برصغیر کے اکثر دفاتر میں یہ بات دیکھنے میں آئی ہے کہ حکومت کے پیسے کو بے دریغ اور بے رحمی سے خرچ کیا جاتا ہے اور اس بات کا خیال نہیں رکھا جاتا کہ وہ قومی سرمایہ ہے۔ اس سلسلے میں جو محکمے بدنام ہیں، ان میں تعمیرات کا محکمہ سرفہرست آتا ہے۔

لیکن سید جعفر حسین سرکاری رقومات کو بھی اس انداز میں اور نہایت ایمانداری کے ساتھ خرچ کرتے تھے جیسے ان کا ذاتی پیسہ ہو۔ اس سلسلے میں وہ کسی قسم کی بے ایمانی برداشت نہیں کر سکتے تھے اور نہ ہی ٹھیکیدار وغیرہ کو ناجائز حد تک منافع لینے دیتے تھے۔ پوری زندگی

انھوں نے کم سے کم سرکاری روپے میں زیادہ سے زیادہ کام کرنے کی کوشش کی۔ اس احتیاط میں ان کے مدِ نظر ہمیشہ یہ بات رہی کہ ہر چند حکومت غیر ملکی ہے لیکن دولت تو ہندوستانی قوم کی ہے سید جعفر حسین ہمیشہ اس بات کی کوشش کرتے تھے کہ سرکاری کام تخمینے کی حدود میں ختم ہو جائے یہاں ایک واقعہ خالی از دلچسپی نہ ہوگا۔ جب آپ فتح پور میں تعینات کیے گئے تو سید صاحب کے چارج سنبھالنے سے قبل وہاں کے انگریز انجنیر نے سرکاری روپے میں غبن ہو جانے کے سبب خودکشی کر لی تھی۔ سید جعفر حسین نے چارج لینے کے فوراً بعد تمام ٹھیکیداروں اور اپنے ماتحتوں کو بلایا اور اس خواہش کا اظہار کیا کہ مزید سرکاری روپیہ ضائع نہ ہو اور کام اسی تخمینے میں پورا ہو جائے۔ انھوں نے ٹھیکیداروں سے کہا کہ گو اس میں منافع کی شرح کم ہو جائے گی لیکن بہر حال یہ قربانی دینا ہی ہوگی۔ سید جعفر حسین کی اس دردمندی اور قومی دولت کے ضیاع کو روکنے کے اس جذبے کو ٹھیکیداروں نے بھی سراہا اور کم منافع لینے پر آمادہ ہو گئے چنانچہ غبن ہو جانے کے بعد جو سرکاری رقم بچ گئی تھی۔ اسی میں کینال کی تعمیر کا کام پورا ہو گیا۔

سید جعفر حسین اور علی گڑھ کالج

سر سید احمد خاں نے خان بہادر سید جعفر حسین کو بہت زیادہ عقیدت تھی وہ انھیں ہندوستانی مسلمانوں کا نجات دہندہ سمجھتے تھے۔ سید جعفر حسین کو چونکہ مسلمانوں کی زبوں حالی، معاشی بدحالی اور تعلیمی میدان میں ان کی پستی کا شدید احساس تھا۔ لہٰذا سر سید احمد خاں سے ان کی محبت و عقیدت میں بھی یہی جذبہ کارفرما تھا۔ علاوہ ازیں ان کا مشن وہی تھا جسے لے کر سر سید احمد خاں اٹھے تھے۔

سید جعفر حسین اپنی ذاتی حد تک مقامی سطح پر ان مسائل کے حل کی کوششوں میں لگے رہتے تھے۔ حتیٰ کہ سر سید احمد خاں تک ان کی شہرت جا پہنچی اور سر سید احمد خاں نے ملاقات

کے لئے بلوایا۔ اور پہلی ہی ملاقات میں دونوں کے درمیان جو رشتہ محبت استوار ہوا وہ تازندگی قائم رہا اور اس دن کے بعد سے سید جعفر حسین بھی سرسید کی تحریک کے ایک سرگرم اور نامور کارکن بن گئے۔

سرسید کی مشاورت

سرسید احمد خاں نے ان کے خیالات اور پیشہ ورانہ مہارت کے پیشِ نظر انھیں علی گڑھ اسکول کے سلسلے میں کی جانے والی تعمیرات کا انچارج بنا رکھا تھا۔ اسکول اور بعدازاں کالج کے بلاکوں یا دوسری عمارتوں کا کوئی منصوبہ ایسا نہ ہوتا تھا جس میں سرسید احمد خاں پہلے ان سے مشورہ نہ کر لیتے ہوں۔ اور سید جعفر حسین یہ سارا کام بلامعاوضہ سرانجام دیتے تھے۔

جب نئے بلاکوں کی تعمیر شروع کی جانے والی ہوتی تو وہ اپنی ملازمت سے بلاتنخواہ رخصت لے کر سرسید کی آواز پر لبیک کہتے ہوئے علی گڑھ چلے آتے تھے۔ سرسید احمد کو کالج کے کلّی اور جزئی امور کی طرف توجہ دینے کی جو عادت تھی اس سے تمام لوگ آگاہ ہیں لیکن تعمیرات کی نگرانی وغیرہ کا کام سید جعفر حسین کے سنبھالتے ہی، سرسید احمد خاں خود کو اس سے بری الذمہ سمجھتے تھے۔

سرسید احمد خاں نے انھیں کالج کے کورٹ کا ممبر اور ٹرسٹی مقرر کیا تھا اور تازندگی وہ اس کے ممبر اور ٹرسٹی رہے۔ کالج کے لئے فنڈز کی فراہمی کے سلسلے میں بھی سید جعفر حسین نت نئی ترکیبیں نکالتے رہتے تھے۔ سرسید احمد خاں نے پہلی ہی ملاقات میں جو ان کی حسبِ خواہش ہوئی تھی، سید جعفر حسین سے کہا تھا کہ قوم کو ان کی ضرورت ہے۔ چنانچہ انھوں نے کہا کہ جو خدمت بھی انھیں سونپی جائے گی وہ بسر و چشم اس کو قبول کریں گے۔

علی گڑھ میں تعمیر کی جانے والی مختلف عمارتوں کی ایک ایک اینٹ ان کے سامنے رکھی

جاتی تھی۔ نقشے بھی وہ خود بناتے تھے اور سردی گرمی سے بے نیاز خود کھڑے ہو کر کام کی نگرانی بھی کرتے تھے۔ جب انھیں آرام کا مشورہ دیا جاتا تھا تو وہ کہتے تھے کہ یہ غریب قوم کا پیسہ ہے۔ اس کا مصرف صحیح ہونا چاہیئے۔ وہ اپنی اس قومی خدمت کے لئے اپنی تنخواہ کا نقصان کر کے بھی خوش رہتے تھے۔ اور علی گڑھ کی انتظامیہ سے کسی خاص امتیازی سلوک کے طلبگار نہیں ہوتے تھے طلبا کے ہوسٹل کے ایک کمرے میں ہی اپنا بستر لگوا لیتے تھے اور طلبا کے لئے جو کھانا پکتا تھا اسی میں سے کھا لیتے تھے۔

ایک دلچسپ واقعہ

سید جعفر حسین صاحب بتایا کرتے تھے کہ جب انھیں ٹمبرائٹ وغیرہ کے سلسلے میں سرسید احمد خاں سے گفتگو کرنا ہوتی تھی تو وہ دو تین گھنٹے قبل ریلوے اسٹیشن پر چلے جاتے تھے۔ سرسید احمد خاں کی عادت یہ تھی کہ وہ ہمیشہ گاڑی آنے سے ایک ڈیڑھ گھنٹہ قبل اسٹیشن پر آجایا کرتے تھے۔ چنانچہ سید جعفر حسین تعمیری امور کے بارے میں اکثر ان سے تفصیلی گفتگو اسٹیشن پر ہی کیا کرتے تھے جہاں اور جگہوں کے علاوہ سرسید احمد خاں کو نسبتاً زیادہ مہلت ہوتی تھی اور وہ بہت تفصیل سے بات چیت کر سکتے تھے۔

سرسید احمد خاں کے انتقال کے بعد انھوں نے یہ تجویز پیش کی تھی کہ کالج کو یونیورسٹی کا درجہ دینے کے لئے جو مصارف ہوں گے ان کے لئے "دس روپی فنڈ" کی مہم کا آغاز کیا جائے۔ ان دنوں سید جعفر حسین ریاست گوالیار میں ڈیپوٹیشن پر کام کر رہے تھے چنانچہ علیگڑھ کالج کے آنریری سیکرٹری نواب محسن الملک نے لیفٹیننٹ گورنر صوبجات متحدہ کو ایک چھٹی لکھی تھی جس میں سید جعفر حسین کی خدمات علی گڑھ کالج کے لئے مستعار مانگی گئی تھیں اس خط میں سید جعفر حسین کا ذکر نواب محسن الملک نے نہایت محبت اور احترام سے کیا ہے۔

نواب محسن الملک کا خط

خط بنام پرائیویٹ سیکرٹری برائے لیفٹیننٹ گورنر صاحب صوبجات متحدہ۔ ہند۔

جناب عالی! میں آپ کا از حد مشکور ہوں گا اگر آپ مندرجہ ذیل مصروضات عالی جناب لیفٹیننٹ گورنر صاحب کی خدمت میں پیش فرمادیں:۔

گزشتہ اگست میں ہز آنر کی علیگڈھ میں تشریف آوری کے موقعہ پر آں جناب کے علم میں یہ بات لائی گئی تھی کہ ہمیں ایک ایسے مسلمان شخص کی ضرورت ہے کہ جو سر سید میموریل فنڈ کے جمع کرنے کے کام کی نگرانی کامیابی اور ہوشیاری کے ساتھ کر سکے۔ علاوہ ازیں کالج کے بلڈنگ ڈپارٹمنٹ کی بھی کماحقہ نگرانی کر سکے جس کی دیکھ بھال اور باقاعدہ تنظم وضبط کی شدید ضرورت ہے۔ مطلوبہ شخصیت ایسی ہونے چاہیئے جس میں اہلیت اور جفاکشی و جانفشانی کے ساتھ ساتھ کالج سے محبت اور اس کے مفادات کی نگہداشت کا جذبہ بھی موجود ہو۔ نیز اسے مسلمانوں کا اعتماد بھی حاصل ہو اور وہ ان کے لئے واجب التعظیم ہو۔

چنانچہ میں ہز آنر کے حضور سید جعفر حسین کا نام پیش کرنے کا اعزاز حاصل کر رہا ہوں جو صوبجات متحدہ کے محکمہ انہار میں ڈپٹی مجسٹریٹ ہیں اور ان دنوں ریاست گوالیار میں ڈیپوٹیشن پر کام کر رہے ہیں۔

کالج کے معاملات میں ان کے ذوق وشوق اور سرکاری فرائض کی بجاآوری میں ان کی نیک نامی کے پیش نظر میں اور میرے تمام ساتھی اس بات پر پورا یقین رکھتے ہیں کہ ہماری موجودہ ضروریات کے لئے وہ انتہائی موزوں اور سودمند شخصیت ہیں۔

ایک تجربہ کار اور قابل سرکاری افسر ہونے کے علاوہ انھیں مسلمان قوم کا بھرپور اعتماد حاصل ہے یہاں میں کالج کے سلسلے میں ان کی حالیہ خدمت کا تذکرہ کروں گا جو انھوں نے دس روپی فنڈ کی اسکیم کو منظم اور آغاز کر کے سرانجام دی ہے۔ اور یہ یقیناً ان کی انتھک محنت، ہمت اور لگن کا نتیجہ ہے کہ مذکورہ فنڈ میں اب تک چودہ ہزار روپیہ جمع ہو چکا ہے۔ میں یہاں یہ بھی عرض کرنے کی جسارت کروں گا کہ اگر حکومت اجازت دے دے گی۔ تو شخص مذکور کالج کی ذمے داری سنبھالنے کے لئے مکمل طور پر آمادہ ہیں۔

لہٰذا میں ملتمس ہوں کہ ہز آنر علیگڑھ کالج کے لئے سید جعفر حسین کی خدمات کی منتقلی منظور فرمائیں گے۔ شخص مذکور اور علیگڑھ کالج کے حکام کے درمیان شرائط کار سرکاری ضوابط کے دائرہ کار میں طے ہوں گی۔

سید جعفر حسین کو ریاست گوالیار میں پانچ سال کے لئے ڈیپوٹیشن پر بھیجا گیا تھا۔ اس مدت میں سے چار برس مکمل ہو چکے ہیں۔ اگر حکومت ازراہ عنایت ان کی خدمات علیگڑھ کالج کو مستعار دینے پر رضامند ہو تو وہ اپنی واپسی کی درخواست حکومت میں پیش کرنے کو تیار ہیں۔۔۔۔"

دستخط محسن الملک آنریری سیکرٹری۔

دس روپی فنڈ کے سلسلے میں سید جعفر حسین کی تحریک کو کتنی اہمیت دی گئی تھی۔ ایک اقتباس ملاحظہ ہو:-

ONE RUPEE FUND

SYED JAFFAR HUSSAIN, A CANAL

MAGISTRATE IN U.P. THEN ON DEPUTATION WITH. THE GOVERNMENT OF GWALIOR OUT LINED A BOLD SCHEME, WHICH HE CALLED "THE ONE RUPEE FUND." HE UNDERTOOK TO COLLECT A LAKH OF RUPEES A YEAR, FOR THE PROPOSED UNIVERSITY THE RATE OF A RUPEE PER INDIDUAL. BY DECEMBER 31, 1903, HE HAD COLLECTED RS, 18, 824, WHICH WENT UPTO RS, 26,000 IN AUGUST, 1904, TOTAL REALISATIONS FOR BULLDING CONSTRUCTION AND THE "ONE RUPEE FUND" FROM APRIL 1898 TO SEPTEMBER 30, 1904, AMOUNTED TO RS. 4,05,708

علیگڑھ میں قیام کی خواہش

علی گڑھ کی درسگاہ سے انھیں غیر معمولی دلچسپی تھی۔ چنانچہ وہیں مستقل قیام کا ارادہ تھا۔ اور اس خیال سے علی گڑھ میں بھی ایک خوبصورت گھر تعمیر کرایا تھا اور اس کا نام جعفر منزل رکھا تھا۔ بعدازاں یہ گھر ایم۔ اے۔ او۔ کالج کو دے دیا تھا۔

ساری عمر نہایت پابندی کے ساتھ اپنی تنخواہ کا دسواں حصّہ ایم۔ اے۔ او۔ کالج کو بطور عطیہ دیتے رہے۔ اپنے دوست، احباب، عزیز و اقربا سب کو ہمیشہ تلقین کیا کرتے

تھے کہ وہ حسبِ استطاعت کچھ نہ کچھ عطیات ایم۔ اے۔او کالج کو دیا کریں۔ خود بھی لوگوں سے چندہ وصول کر کے کالج بھیجا کرتے تھے۔

علیگڑھ کا سالانہ ڈنر

سید جعفر حسین کی ملاقاتیں ہندوستان کے نامور مسلم اشخاص سے رہا کرتی تھیں۔ یہ تمام شخصیات کورٹ کے ممبروں کے سالانہ اجتماعات میں شرکت کے لئے علی گڑھ آیا کرتی تھیں۔ انہی اجتماعات میں ان کے مراسم پشاور کے صاحبزادہ سر عبدالقیوم سے بھی ہوئے۔ کورٹ کے ممبروں کے اس سالانہ اجتماع میں، ایک ڈنر بھی ہوا کرتا تھا جس میں علیگڑھ کے طلبا اور کورٹ کے تمام ممبر شریک ہوتے تھے اور وہ طلبا کے مسائل اور ان کی سوچ اور فکر سے آگاہ ہوا کرتے تھے۔ سید جعفر حسین بھی اس سلسلے میں پیش پیش ہوتے تھے اور طالب علموں کے مسائل سے آگاہی حاصل کرتے تھے۔

ہندوستان کے یہ مختلف مسلم زعما جن کی شناسائی سید جعفر حسین سے ہو جاتی تھی۔ ان کے خلوص اور بے غرض محنت کے دل سے معترف ہو کر جاتے تھے۔ خود سر سید احمد خاں اور ان کے بعد نواب محسن الملک اور وقار الملک وغیرہ نے بھی بارہا اپنے ایڈریسوں اور تقاریر میں سید جعفر حسین کی خدمات کو سراہا تھا۔

آل انڈیا مسلم ایجوکیشنل کانفرنس کے جلسوں کے انعقاد کے سلسلے میں بھی سید جعفر حسین بے پناہ دلچسپی دکھاتے تھے اور عملی طور پر اس کانفرنس کے انعقاد کے لئے کام کرتے تھے۔

غریب طلبہ کی امداد

جس زمانے میں علیگڑھ میں اپنا ذاتی مکان جعفر منزل بنوایا تھا تو علیگڑھ میں قیام کے دوران اسی

مکان میں رہتے تھے۔ جن طلبہ کو بورڈنگ ہاؤس میں جگہ نہیں ملتی تھی یا مہ تعلیمی مصارف برداشت نہیں کر سکتے تھے تو انھیں سید جعفر حسین اپنے مکان میں ٹھہرالیا کرتے تھے اور ان کی ہر ممکن مدد کرتے تھے۔

علی گڑھ میں نئے لڑکوں کی آمد کے موقع پر انھیں اپنے ہاں ڈنر پر بھی مدعو کرتے تھے اس سلسلے میں ایک اقتباس ملاحظہ ہو:۔

OLD COLLEGE STUDENTS WERE SENT TO THE RAILWAY STATION TO RECEIVE THE NEW COMMERS AND CONDUCT THEM PRIVAT. BOARDING HOUSES. THIS ARRANGE_ MENT WERE HOWEVER SOON DIS CONTINUED FROM NOV, 15, 1908. THERE WARDS WERE_ SHIFTED TO JAFAR MANZIL AND TO PAHASU HOUSE WHOSE RESPECTIVE LANDLORDS VOLUNTARILY OFFERD TO ACEOMMODATE THEM. SYED JAFFR HUSAIN, EXECUTIVE ENGINEER, WHO WAS HOLDING AT ALIGARAH WELCOME THE STUOENTS ON THERE ARRIVAL, WITH A DINNER."

ایک غریب لڑکا

اگر کسی غریب لڑکے میں واقعی حصول علم کی سچی لگن اور تڑپ پاتے تو اپنی جیب سے اس کے تعلیمی مصارف برداشت کرتے تھے اور اپنی اولاد کی طرح اس کا خیال رکھتے تھے۔ ایک بار علی گڑھ میں ٹھہرے ہوئے تھے کہ دس گیارہ سال کا ایک لڑکا ان کے پاس آیا۔ اور ان سے ملنے کی خواہش کی، ملاقات پر لڑکے نے بتایا کہ میں پنجاب سے آیا ہوں جہاں میری ماں چکی پیس پیس کر مجھے تعلیم دلاتی رہی ہے۔ اب اس کے انتقال کے سبب آگے پڑھنے سے مجبور ہو گیا ہوں اگر آپ میری مدد کریں تو بہت شکر گزار ہوں گا۔ سید جعفر حسین بہت متاثر ہوئے اسی وقت اپنے بیٹے کے کپڑے اسے پہنائے اور تعلیم دلانے کی حامی بھر لی۔ اس لڑکے کا نام نذیر احمد تھا۔ بہت ذہین اور محنتی تھا چنانچہ ایک مہینے میں ہی انگریزی کی کئی کتابیں پڑھ لیں۔ سید صاحب اس لڑکے کی تعلیمی ترقی سے بہت خوش ہوتے تھے اور ہر آنے جانے والے سے اس کی ذہانت اور تحصیل علم کے شوق کی تعریف کرتے تھے اس لڑکے کو انجینئرنگ کی تعلیم دلائی۔ بعد میں وہ انجینئر کے عہدے پر فائز ہوا۔

اعتراف خدمت

سید جعفر حسین کو علی گڑھ سے کس درجہ محبت تھی۔ اور علی گڑھ کالج کے لئے وہ کیا کیا پروگرام اور منصوبے بناتے رہتے تھے اس کا حال رسالہ اولڈ بوائے سے معلوم ہوتا ہے۔ ہم ذیل میں رسالہ ہذا سے چند اقتباسات پیش کرتے ہیں۔

۱۹۱۰ء میں جب خان بہادر سید جعفر حسین سرکاری ملازمت سے ریٹائر ہو گئے تو ہر چند کہ قویٰ اضمحلال کی جانب گامزن تھے لیکن علی گڑھ کی درسگاہ کی خدمت کے لئے ان میں ایک نیا جوش اور ولولا پیدا ہو چکا تھا۔ چنانچہ وہ اپنی محبوب درسگاہ میں آکر قیام پذیر ہو گئے درج ذیل اقتباس سے معلوم ہوتا ہے کہ "اولڈ بوائے" میں سید جعفر حسین کا تحریر کردہ کوئی ایسا

مضمون شائع ہُوا ہوگا جس میں انھوں نے بعض منصوبوں کو بروئے کار لانے کا اظہار کیا ہوگا۔

۱۹۱۱ء ہمارے مخدوم دوست سید جعفر حسین کی قومی ہمدردی اور آئندہ نیک ارادوں کا ذکر ہے۔ ہم کو اس سے کلیتاً اتفاق ہے اور جناب خان بہادر صاحب کا علی گڑھ میں تشریف لانا باعثِ خوشی ہے۔ چونکہ یہ ایک نہایت ہوشیار اور ہمدرد اور قابل آدمی ہیں اور امید ہے کہ جس کام پر وہ مامور ہوں گے آئندہ وہ کام عمدگی اور کفایت سے ہوگا ...“

اولڈ بوائے لاج کے نقشوں کی تیاری اور تعمیر

”سالانہ جلسے کے حالات جو ہم نے کسی دوسری جگہ شائع کئے ہیں۔ ان میں ایک بات خوشی سے دیکھی جائے گی کہ اولڈ بوائے لاج کا سنگِ بنیاد عرصہ کے انتظار کے بعد نواب وقار الملک کے دستِ مبارک سے رکھ دیا گیا ہے۔ اس خبر کو سن کر اولڈ بوائز اور زیادہ مسرور ہوں گے کہ خان بہادر سید جعفر حسین صاحب نقشوں کی درستگی میں مصروف ہیں۔ انشاء اللہ بہت خوبصورت عمارت ہماری ایسوسی ایشن کے شان کے شایان ہوگی۔[۲]

اولڈ بوائے لاج کمیٹی

اولڈ بوائے لاج کمیٹی کے ممبر مقرر ہونے پر اولڈ بوائے میگزین میں یہ اطلاع شائع ہوئی

”خان بہادر سید جعفر حسین اولڈ بوائے لاج کی کمیٹی پر مقرر ہوئے ...[۳]

منٹو سرکل

منٹو سرکل کی تعمیر کے سلسلے میں اولڈ بوائے میں خان بہادر سید جعفر حسین کا ذکر ان لفظوں میں کیا گیا:-

---

۱:- علی گڑھ اولڈ بوائے شمارہ فروری ۱۹۱۱

۲:- علی گڑھ اولڈ بوائے شمارہ نومبر ۱۹۱۱

۳:- ” ” شمارہ جون ۱۹۱۲

"منٹو سرکل کے قریب قریب چاروں بلاک تیار ہو گئے ہیں۔ اور ہم سید جعفر حسین اور سرفراز خان کو مبارک باد دیتے ہیں کہ انھوں نے اس جانب خاص توجہ فرمائی۔ نیو بیرک کے دو[2] کمرے پختہ ہو گئے ہیں۔ باقی بھی انشاءاللہ جلد تیار ہو جائیں گے[1]..."

رسالہ علی گڑھ اولڈ بوائے کی جولائی ۱۹۲۵ء کی اشاعت میں لکھا ہے۔

"نواب اسحاق خاں مرحوم کی جماعت کے سرگرم رکن خواجہ عبدالحمید تھے جو اپنی ذکاوت و کاوش کے علاوہ جوانان علی گڑھ میں ایک خاص مرتبہ و منزلت رکھتے تھے بحیثیت اولڈ بوائے ایسوسی ایشن کے سیکرٹری ہونے کی حیثیت سے مولانا شوکت علی کی جانشینی کا فخر بھی انھیں حاصل تھا دوسری جانب مائی لارڈ[2] سید جعفر حسین اپنی قابلِ رشک ہمت و جوش سے سرگرم پیکار تھے۔ اور مستقلاً اس کام کے لئے تمام اطراف ہند کے دورہ پر نکلے تھے..."

سید جعفر حسین کا سراپا

خاں بہادر سید جعفر حسین کے خاندان کے گل سر سید جنرل (ریٹائرڈ) سید شاہد حامد صاحب نے اپنے دادا جان کی شکل و صورت اور اخلاق و عادات کے بارے میں جو کچھ بتایا ہے انھیں سطور ذیل میں بیان کیا جاتا ہے۔

سید جعفر حسین کا قد چھ فٹ سے زیادہ تھا۔ ان کی ناک ستوان تھی۔ اور منہ پر گھنی اور لمبی داڑھی، بڑھاپے میں یہ داڑھی سفید ہو گئی تھی جس کے سبب ان کے چہرے کی خوبصورتی میں اور اضافہ ہو گیا تھا۔ اور وہ نورانی شکل و صورت کے بزرگ معلوم ہوتے تھے۔

۱۔ ' ایڈیٹر علی گڑھ اولڈ بوائے شمارہ اکتوبر (۲) اس کی وضاحت آئندہ صفحات میں ہوگی۔

ہمیشہ اپنا ہاتھ جس میں چھڑی پکڑی ہوئی ہوتی تھی، کمر کے ساتھ رکھتے تھے انتہائی شریف، حلیم اور منکسر المزاج تھے، وضعداری اور خوش اخلاقی کا نمونہ تھے۔ باوضع، مہذب اور شرمیلے تھے۔ یہاں تک کہ بہت کم نگاہیں اٹھا کر بات کرتے تھے۔

اکثر و بیشتر خود فراموشی کے عالم میں اور اپنی دھن میں مگن دکھائی دیتے تھے چنانچہ ان سے پہلی ملاقات میں ہمیشہ ملنے والے پر یہی تاثر قائم ہوتا تھا۔ وہ بہت کم گو تھے اور زیادہ بات چیت کرنا پسند نہیں کرتے تھے۔ ہمیشہ اختصار سے اور نفس مضمون سے متعلق بات کرتے تھے گو وہ ایک محبت بھرا دل رکھتے تھے۔ لیکن اپنی اس محبت یا تعلق خاطر کا اظہار بہت کم کیا کرتے تھے۔

بچوں سے بھی بہت کم گفتگو کرتے تھے البتہ بچوں کو کھیلتے ہوئے دیکھتے رہتے اور ان کی معصوم اور بھولی بھالی باتوں سے لطف اندوز ہوتے تھے اور گھنٹوں محویت اور محبت کے عالم میں بچوں کو شرارتیں کرتے دیکھتے رہتے تھے۔

سید شاہد حامد صاحب کا بیان ہے کہ " مجھے اب بھی وہ منظر یاد ہے کہ میری دو بہنیں جو اس زمانے میں بہت کم سن تھی۔ آپس میں لڑ رہی تھیں اور میرے دادا جان ان کو نہایت دلچسپی اور محویت کے عالم میں لڑتا ہوا دیکھ رہے تھے۔ جب میری والدہ محترمہ نے ان بچیوں کو دادا کے سامنے لڑتے جھگڑتے اور شور کرنے سے منع کیا تو انھوں نے میری والدہ کو روکا اور کہا کہ منع مت کرو میں تو ان کی باتوں سے محظوظ ہو رہا ہوں۔

" میرے والد اکثر ان سے کہا کرتے تھے کہ اب وہ مستقلاً گھر میں قیام کریں لیکن انھوں نے ہمیشہ ان کی اس خواہش کو ماننے سے انکار کر دیا۔ وہ بغیر کسی اطلاع کے اپنے بیٹے کے گھر تشریف لے آیا کرتے تھے۔ چند دن قیام کرتے اور پھر یہ بتلائے بغیر کہ وہ کہاں اور کتنے دن

کے لئے جارہے ہیں گھر سے چلے جاتے تھے۔ گھر میں ان کے لئے ایک کمرہ مخصوص تھا جو ہمیشہ مقفّل رہتا تھا بس ان کی آمد کے موقع پر کھولا جاتا تھا۔

ایک دن والد محترم کے بے حد اصرار پر انھوں نے جواب دیا تھا کہ اگر میں یہاں مستقل قیام کروں تو عدم مصروفیت کی بنا پر مر جاؤں گا۔

" ان کے دوستوں کا ایک خاص حلقہ تھا جن میں سے اکثر و بیشتر کا تعلق کسی نہ کسی صورت سے علی گڑھ سے ضرور تھا۔ غالباً ان میں سے بیشتر علی گڑھ کورٹ کے ممبر اور ٹرسٹی تھے۔ میں اکثر اپنے دادا جان کے پاس ان لوگوں کو آتے جاتے اور بیٹھتے ہوئے دیکھتا تھا ایسے لوگوں میں سے مولوی طفیل احمد منگلوری، خاں بہادر حبیب اللہ، میر ولایت حسین وغیرہ کے نام مجھے اب بھی یاد ہیں۔

" ہم بچوں کے لئے ان بزرگوں کی یہ محفل حیرت و استعجاب اور لطف سے خالی نہ ہوتی تھی۔ وہ تمام لوگ گہرے خیالوں میں محو اور سر جھکائے بیٹھے ہوتے تھے۔ غالباً اس وقت بھی ان کے پیش نظر مسلمان قوم اور علی گڑھ کی فکر دامنگیر ہوتی تھی۔"

" یہ کہنا قطعی مبالغہ نہ ہوگا کہ انھوں نے اپنی ساری عمر خدمتِ خلق میں گزار دی تھی ایک بار انھوں نے مجھ سے فرمایا تھا کہ جب کبھی کسی شخص کی بھلائی اور بہتری کے لئے کوئی کام کرو تو کبھی اس کا تذکرہ دوسروں سے مت کرنا۔ ہمیشہ نہایت خاموشی سے لوگوں کی خدمت کرو اور فراموش کر دو۔ وہ فرمایا کرتے تھے کہ سب سے بڑی عبادت، خدمت خلق ہے۔ اور اس سلسلے میں ان کے قول و فعل میں کوئی تضاد نہیں تھا۔"

"گورنمنٹ کی بعض اسکیموں کے سلسلے میں مشوروں کا جو معاوضہ انھیں ملا کرتا تھا اس رقم کے متعلق اہل خاندان میں سے کسی کو کچھ معلوم نہ ہوتا تھا کہ اس کا کیا ہوا۔ اگر

میرے والد ماجد اس سلسلے میں کبھی ان سے دریافت بھی کرتے تھے تو وہ نہایت معصومیت اور بے نیازی سے جواب دیتے کہ کسی شخص کو اس رقم کی شدید ضرورت تھی میں نے اسے دے دی ہے۔

" اتنے اعلےٰ عہدوں پر فائز رہنے کے باوجود انھوں نے کبھی کچھ پس انداز نہ کیا۔ دولت کی طرف سے ہمیشہ بے نیاز رہے کوئی بنک بیلنس نہ تھا۔ حقیقت میں دنیاوی سرمایے کی ان کے نزدیک پرکاہ کے برابر اہمیت نہ تھی۔

" ان کی پوری زندگی کا سرمایہ ٹین کا ایک صندوق تھا۔ ان کے پاس دو شیروانیاں تھیں۔ ایک پہنے رہتے اور دوسری شیروانی ان کے صندوق میں رہتی تھی۔ اس کے علاوہ چند جوڑے کرتے پاجامے اور ضرورت کی معمولی چیزیں ہوتی تھیں۔

" اچھے سے اچھے درجے میں سفر کرنے کی استطاعت رکھنے کے باوجود ہمیشہ تھرڈ کلاس میں سفر کرتے تھے۔ اپنے کسی نوکر وغیرہ کو بھی ساتھ نہیں رکھتے تھے۔ اور اپنا سامان خود اٹھایا کرتے تھے۔ اٹنا ٹے سفر میں کریم بسکٹ اور بٹر چیز کے علاوہ کچھ نہ کھاتے تھے یہ چیزیں انھیں پسند بھی بہت تھیں۔ اکثر سفر میں اپنی کوئی نہ کوئی چیز بھول جاتے تھے۔ اور بعد میں ہنس کر فرمایا کرتے تھے کہ چلو کسی غریب کا بھلا ہو گیا ہوگا۔

" جب میں فوج میں کمیشن ملنے کے بعد سنیدھرسٹ جا رہا تھا تو میرے دادا مرحوم بھوپال اسٹیشن پر تشریف لائے تھے انھوں نے مجھے ایک ہزار روپوں کی تھیلی عنایت کی لیکن تاکید کی تھی کہ میں اس رقم کا تذکرہ اپنے والد سے نہ کروں۔"

" حقیقت میں وہ فرشتہ خصلت انسان تھے۔ اہل خاندان، دوست احباب اور عام ملاقاتی سب کہی ان کی ذات پر بڑا اعتماد تھا۔ ہمیشہ خلوصِ دل سے لوگوں کے آڑے

وقت میں ان کے کام آنے کی کوشش کرتے تھے۔اس سبب سے تمام لوگوں میں بے حد مقبول تھے ان کا حافظہ بھی حیرت انگیز تھا۔اپنے زمانہ ملازمت میں جو تعمیرات انھوں نے کرائیں تھیں ان کی جزئی تفصیلات بڑھاپے تک انھیں یاد تھیں.

"ایک بار میرے والد کو بھی کوئی ایسا ہی کام سونپا گیا جس نوع کے کام کو میرے دادا اپنے زمانہ ملازمت میں انجام دے چکے تھے. میرے والد نے ان سے بعض آبی ذخیروں (RESERVIORS) کے بارے میں کچھ دریافت کیا۔ دادا جان مرحوم نے جو تخمینے وغیرہ بتائے۔جب انھیں باقاعدہ کاغذ پر جوڑ کر دیکھا گیا تو وہ بالکل صحیح تھے۔ لاہ چھورا (LAH CHURA) کا ڈیم جو پورے صوبجات متحدہ میں مشہور ہے انہی کا بنوایا ہوا تھا۔انجینئرنگ کے تمام شعبوں سے ان کو کمال آگاہی تھی۔وہ اپنے رہنما اور استاد خود تھے اور ہمیشہ اپنے موضوع اور دیگر علوم پر بھی مطالعہ کرتے رہتے تھے.

مشاغل

سید صاحب کو شکار کا بہت شوق تو نہ تھا لیکن کبھی کبھی جنگلوں میں شکار کھیل لیا کرتے تھے۔انھیں باغ لگانے اور اس میں نت نئے پھل پھول لگانے کا بہت شوق تھا.

مولوی عبدالغفور خاں اترولوی نے ایک ایسے ہی شکار کا ذکر اپنی کتاب میں کیا ہے. جس میں مصنف، سید جعفر حسین اور ڈاکٹر سر ضیاءالدین شریک تھے۔ایک اور شکار کا حال مولوی عبدالغفور لکھتے ہیں۔

"سید صاحب موصوف کے ہمراہ چوبیس میل سفر کرکے پورا کلاں ٹینک کنڑکشن کا معائنہ کیا۔دونوں کی بندوقیں ہمراہ تھیں۔ واپسی میں تال بہت سے چار پانچ میل دور سید صاحب نے کہا کہ تمام دن بندوقیں ساتھ لئے پھرے

مگر شکار نظر سے بھی نہ گزرا۔ میں نے کہا ان جنگلوں میں جس مقام پہ دیکھا جائے ہمیشہ شکار موجود پایا جاتا ہے۔ ہم ایک چھوٹی پہاڑی پر چڑھ گئے۔ اور چاروں طرف نظر ڈالی۔ دور دو تین گلہ ہرنوں کے نظر آئے مگر تھکان تھا، ہم نے فاصلہ پر جانے کی کوشش نہیں کی۔ اتفاقاً قریب ہی چند چکارہ دوڑتے ہوئے نظر آگئے۔ بندوق کی زد سے باہر تھے مگر سید صاحب نے فائر کر دیا۔ قضارا ایک چکارہ شکار ہو گیا۔ سید صاحب بہت خوش ہوئے کیونکہ وہ عادتاً شکار کے واسطے کم محنت کرتے تھے۔[1]"

باقاعدہ شکار وغیرہ کے لئے نہیں جاتے تھے البتہ جب سرکاری کاموں کی انجام دہی میں کیمپوں میں رہتے تھے تو شکار وغیرہ بھی کر لیا کرتے تھے۔ آم لگانے کا بہت شوق تھا۔

ان کی عادت تھی کہ ہر موسم کا پھل منڈی سے ڈھیریوں کی تعداد میں خرید کر لایا کرتے تھے۔ اور یہ پھل گھر میں بلا تخصیص سب کو تقسیم ہوتا تھا اور گھریلو ملازموں کو اپنے ساتھ بٹھا کر کھلاتے تھے۔

طبیعت میں رحمدلی کا مادہ بہت تھا۔ ماتحت یا ملازمین سے کوئی قصور کبھی سرزد ہو جاتا تھا اول تو کچھ کہتے ہی نہیں تھے اگر کبھی ڈانٹ ڈپٹ دیا کرتے تھے تو بعد میں حسن سلوک سے

۱:۔ سوانح عمری مولوی عبدالغفور خاں ماتندولوی مطبوعہ آگرہ برقی پریس آگرہ صہ ۲۳۵-۲۳۶

اس کی تلافی کر دیا کرتے تھے۔ مزدوروں سے نرمی کا برتاؤ کیا کرتے تھے۔ اور اگر کبھی کام میں تساہل یا غفلت کی بنا پر ڈانٹ دیتے تو کام ختم ہونے سے قبل جلیبیاں منگوا کر اس مزدور کو کھلاتے تھے۔ اکثر کام کی نگرانی کرتے ہوئے خود بھی مزدوروں کے ساتھ کام میں شامل ہو جاتے تھے۔ کام کرتے کرتے کپڑے اور ہاتھ پاؤں مٹی میں اٹ جاتے لیکن وہ اسی صورت سے کام میں مصروف رہتے۔ چنانچہ 1919 میں جب لکھنؤ میں اپنی کوٹھی جعفر منزل اور اس کے قریب ہی اپنی بیٹی کا گھر بنوا رہے تھے تو خود بھی مزدوروں کے ساتھ کام میں مصروف تھے اتفاق سے ایک شخص جو اس سے پہلے کبھی نہیں ملا تھا۔ ملاقات کی غرض سے آ گیا جب اس نے کام کرنے والوں سے سید جعفر حسین کے بارے میں دریافت کیا اور انھیں عام مزدوروں کی طرح کام کرتے دیکھا تو بہت حیران ہوا۔

بھکارن کا واقعہ

ایک بار میرٹھ میں اپنی بیٹی کے ہاں گئے ہوئے تھے مگر میں ایک اندھی بڑھیا بھیک مانگنے آئی آپ نے فوراً کھانا منگوا کر اپنے ہاتھ سے اس کو دیا۔ گرمی کا موسم تھا اور بڑھیا کے ارد گرد بے تحاشہ مکھیاں بھنبھنا رہی تھیں جس کی وجہ سے وہ مسلسل چلا رہی تھی۔ خاں بہادر سید جعفر حسین سے بڑھیا کی یہ کیفیت دیکھی نہ گئی۔ پنکھا لے کر اس بڑھیا کی مکھیاں اڑانے لگے پھر اپنی بیٹی سے کہا کہ یہ بڑھیا روز تمہارے ہاں کھانا کھائے گی اور تم بیٹھ کر اس کی مکھیاں اڑایا کرنا۔

بھولنے کی عادت بہت تھی بعض اوقات اس عادت سے نہایت دلچسپ صورتحال پیدا ہو جاتی تھی۔ ایک بار گورنمنٹ ہاؤس میں پارٹی تھی جس میں سید صاحب کو بھی مدعو کیا گیا تھا۔ انھوں نے لباس تو تبدیل کر لیا لیکن جوتا پہننا بھول گئے۔ بازار میں پہنچ کر معلوم ہوا کہ جوتا پہننا تو بھول ہی گئے چنانچہ اسی وقت دکان سے ایک نیا جوتا خرید کر پہنا اور پارٹی میں شریک ہوئے

جب کبھی کسی کام میں مصروف ہوتے۔ تو دنیا و مافیہا سے بے خبر ہو جاتے تھے ایک بار عینک کھو گئی جس کی تلاش گئی گھر پورے گھر میں کہیں نہ ملی۔ آخر خود یاد آیا کہ جو کنٹوپ ہوا تھا اس کے بیچ میں رکھکر بھول گیا تھا۔

پوشاک

زندگی حد سے زیادہ تھی۔ دنیاوی شان و شوکت سے بے نیاز تھے لباس بہت معمولی پہنتے تھے کہ پہلی نظر میں کوئی شخص یہ باور نہیں کر سکتا تھا کہ وہ حکومت ہند کے انجنیئر ہیں۔

مولوی طفیل احمد منگلوری نے لکھا ہے کہ " ان کی ظاہری وضع قطع کو دیکھتے ہوئے زیادہ سے زیادہ ان پر ایک سب اوورسیر ہونیکا گمان گزرتا تھا۔۔۔"

دلچسپ واقعات

سید صاحب کی سرکاری ملازمت کا کافی عرصہ مختلف جنگلوں اور کیمپوں میں گزرا، جہاں اکثر انھیں دلچسپ واقعات پیش آتے رہتے تھے۔ اکثر بہت سے ایسے دلچسپ واقعے سنایا کرتے تھے۔ ایسے ہی دو واقعے یہاں بیان کئے جاتے ہیں۔

" ان کا پہلا تقرر نیپال کی ترائی میں ہوا تھا۔ جو شیروں اور دوسرے جنگلی درندوں سے بھری ہوئی تھی۔ وہاں رہنے کے لئے ایک جھونپڑی بنوالی تھی۔ دن بھر تو کام کاج میں مصروف رہتے البتہ دن میں کبھی کبھار اس جھونپڑی میں آرام کر لیا کرتے تھے لیکن رات کے وقت غیر محفوظ ہونے کے سبب درخت پر چڑھ کر بیٹھ جاتے تھے۔ اس زمانے میں پگڑی باندھا کرتے تھے لہٰذا نیند کے عالم میں گر جانے کے خوف سے اسی پگڑی کو درخت اور اپنے گرد باندھ لیا کرتے تھے۔

ایک شام درخت پر بیٹھے ہوئے انھوں نے شیر کو دیکھا جس نے ایک جانور کا شکا
کر رکھا تھا اور اسے کھا رہا تھا۔ کھانے کے دوران تھوڑی دیر کے بعد شیر ایک درخت تک
آتا اور اس کی لکڑی کو چبانے کے بعد دوبارہ آکر شکار کھانے لگتا تھا۔ سید جعفر حسین نے صبح
اس درخت کی لکڑی چبا کر دیکھی تو فوراً بھوک لگنے لگی غرض جس چیز کو بھی کھانے کے
اس لکڑی کو چبایا جاتا تو وہ فوراً ہضم ہو جاتی تھی چنانچہ جب کبھی مزدوروں کے پیٹ میں
وغیرہ ہو جاتا تو اسے وہی لکڑی چبانے کو دی جاتی تھی۔

"ایک مرتبہ جنگل میں قیام تھا کسی چیز نے ان کو کاٹ لیا جس کی وجہ سے نیند بہت
آنے لگی خیال ہوا کہ شاید سانپ نے کاٹ لیا ہے چونکہ کوئی دوا پاس نہ تھی لہذا
زندگی سے مایوس ہو گئے البتہ اس وقت بھی گھبرائے نہیں۔ نہایت اطمینان و سکون
کے ساتھ وصیت کی اور سب لوگوں کو جو وہاں موجود تھے۔ الوداع کہی اور پلنگ
پر دراز ہو گئے۔

صبح سو کر اٹھے تو بھلے چنگے تھے کہنے لگے غلط فہمی ہو گئی تھی اس وقت جو
لوگ وہاں موجود تھے۔ ان کا بیان ہے کہ اس نازک وقت میں کہ جب موت سامنے
تھی انھوں نے نہ تو آہ فاری کی اور نہ ہی گھبرائے بلکہ ایک سچے مسلمان کی طرح نہایت
صبر و ضبط اور خاموشی و وقار کے ساتھ اپنی تقدیر پر شاکر رہے۔۔۔۔"

قومی ہمدردی کا ایک واقعہ

مسلمان قوم کے اجتماعی اور انفرادی فائدے
وہ کس قدر خیال رکھتے تھے اس کا اندازہ ا
واقعہ سے ہوگا۔ یہ واقعہ یوپی کے ایک ریٹائرڈ چیف انجینئر خاں بہادر عبدالعزیز کے سا
پیش آیا۔ وہ بتایا کرتے تھے کہ جس وقت مجھے انجینئرنگ کالج سے فارغ التحصیل ہونے

سرکاری ملازمت کا پروانہ ملا۔ تو اسی وقت میرے ایک ہم جماعت ہندو کا بھی تقرر ہوا۔ چنانچہ
سیکھنے اور رپورٹ دینے کے لئے ہمیں سید جعفر حسین کے پاس بھیجا گیا جو اس وقت جھانسی میں
ات تھے جب ہم وہاں پہنچے تو خاں بہادر سید جعفر حسین آؤٹ ڈور ڈیوٹی پر کیمپ میں تھے
ول نے وہیں سے حکم بھیج دیا کہ مسلمان کو تو وہیں دفتر میں رپورٹ کرنے دو اور ہندو انجینئر کو
رے پاس بھیجدیا جائے۔ مجھے یہ بات بہت بُری لگی کہ خاں بہادر صاحب نے مجھے تو دفتر
ی تعینات کر دیا اور ہندو کو اپنے پاس بلالیا۔ لہٰذا وہ تو کام سیکھ جائے گا اور میں دفتر میں یونہی
بیکار ہوں گا۔ دراصل اس طرح سید جعفر حسین کا مقصد مسلمان انجینئر کو فائدہ پہنچانا تھا۔ چنانچہ
ہندو انجینئر دو دن بعد کیمپ میں رپورٹ دے سکا اور یوں مسلمان سینئر ہو گیا اور تمام زندگی ترقی
ے ہر موقع پر سنیارٹی کے لحاظ سے اس کو پہلے ترقی ملتی رہی۔

جہل مرکب

یہ چند ہم خیال لوگوں کا ایک گروہ تھا۔ جنھوں نے اپنی مجلس کا نام جہل مرکب رکھا ہوا تھا اس کے ممبران میں سید جعفر حسین بھی شریک تھے۔ اس کا ہر ممبر مائی لارڈ کہلاتا تھا۔ اور ہر ممبر دوسرے کو اسی خطاب سے مخاطب کرتا تھا۔ ا۔م۔ (علیگ) لکھتے ہیں۔

> "کچھ لوگ ایسے بھی تھے جو علی گڑھ سے منسلک رہ کر بھی اپنی انفرادی حیثیت کو قائم رکھنا چاہتے تھے یہ مائی لارڈز کا وہ گروپ تھا جنھوں نے اپنی مجلس کا نام جہل مرکب رکھ چھوڑا تھا۔ خدا معلوم صاحبزادہ آفتاب احمد خاں اور ڈاکٹر ضیاء الدین جو انگریزی لباس پہنتے، کانٹا چھری کے ساتھ میز پر کھانا کھاتے اور کبھی کبھار کھڑے ہو کر پیشاب بھی کر لیا کرتے تھے۔ کس طرح ان لوگوں میں جا

۱:۔ رسالہ تہذیب الاخلاق (پاکستان) جولائی ۱۹۶۸ء

پہنے جو سب اچھی خاصی داڑھی رکھتے، سادہ کیا بالکل ہی معمولی قسم کا لباس پہنتے تھے اور گو اپنی قابلیت اور عہدوں کے لحاظ سے کتنے ہی بلند ہیں لیکن بادی النظر میں مزدور نہیں تو کسی معمولی حیثیت کے فرد ضرور نظر آتے تھے غالباً داڑھی قدر مشترک تھی....."

جہل مرکب کے ممبران کے نام یہ تھے۔

(۱) صاحبزادہ آفتاب احمد خاں (۲) ڈاکٹر سر ضیاء الدین، (۳) مولانا ابوالبشر (جو چھوٹے سرسید کہلاتے تھے) (۴) نظامی (جنھوں نے دیوان غالب کا اولین جاذب نظر ایڈیشن شائع کیا تھا) (۵) مولوی طفیل احمد منگلوری (رسالہ سود متد کے بانی اور "مسلمانوں کا روشن مستقبل" کے مصنف) (۶) خاں بہادر حبیب اللہ خاں (۷) میر ولایت حسین (۸) خاں بہادر سید جعفر حسین (جو ایگزیکٹو انجنیئر ہونے کے باوجود اچٹتی نظر میں معمولی سب اور سیر معلوم ہوتے تھے) اور (۹) نثار حسین تھے۔

مضمون کے مصنف نے جہل مرکب کی اس مجلس کے اراکین کی قدر مشترک داڑھی بیان کی ہے لیکن ہمارے خیال میں ان سب میں ایک اور قدر مشترک بھی تھی سب کے سب علیگڑھ تحریک کے متوالوں میں سے تھے۔

"جہل مرکب" نامی مضمون کے مصنف نے جو خاص خاص خوبیاں بیان کی ہیں ان کے مطابق بے قاعدگی ان بزرگوں کا طرۂ امتیاز تھی۔ جہل مرکب کے اجلاس بھی بے قاعدہ ہی منعقد ہوتے تھے اور اجلاس سے قبل کسی قسم کا ایجنڈا بھی پہلے سے تیار نہ ہوتا تھا۔ وقت، مقام، جگہ کسی چیز کی کوئی قید نہ تھی جس جگہ بھی دو چار ممبر مل بیٹھتے، جہل مرکب کا اجلاس شروع ہو جاتا تھا۔ یہ ممبران کرسیوں کے بجائے پلنگوں پر بیٹھ کر، یا گھاس کے کسی قطعے پر درخت کے

نیچے بیٹھ کر اجلاس منعقد کرتے تھے یہ سب ممبران ایک دوسرے کو مائی لارڈ سے مخاطب کرتے تھے۔اس سلسلے میں ایک لطیفہ ملاحظہ ہو:۔

"نواب محسن الملک کا زمانہ تھا۔آل انڈیا مسلم ایجوکیشنل کانفرنس کا سالانہ اجلاس رنگون میں ہونے والا تھا۔اور تمام عمائدین مع نواب صاحب ایک جہاز میں کلکتہ سے رنگون جا رہے تھے۔زیادہ تر ممبر فرسٹ کلاس کے مسافر تھے لیکن یہ لوگ ڈیک پر سفر کر رہے تھے اس لئے جماؤ زیادہ تر وہیں رہتا تھا۔جہاز کا کپتان ایک ایرلینڈ انگریز تھا جو اردو سمجھ تو لیتا تھا لیکن بول نہ سکتا تھا۔اس نے جب ان لوگوں کی باتیں سنیں تو دل ہی دل میں ان کی قابلیت اور ذہانت کا معترف ہو گیا یہ صاحبان ایک دوسرے کو مخاطب کرتے تو "مائی لارڈ" کا لفظ استعمال کرتے تھے۔اس لئے کہ ان کو علی گڑھ کی اصطلاح میں مائی لارڈ گروپ کہا جاتا تھا یہ طرز تخاطب اس انگریز کی سمجھ میں نہ آتا تھا جس کے ملک میں لارڈ ہونا تمول اور اعلیٰ تہذیب کی نشانی سمجھا جاتا تھا۔آخر نہ رہا گیا تو ایک دن صاحبزادہ صاحب سے پوچھ ہی بیٹھا کہ یہ لوگ اتنے کم حیثیت ہیں پھر ایک دوسرے کو مائی لارڈ کیوں کہتے ہیں۔صاحبزادہ کہتے تھے کہ میرے دل میں اس سوال سے گدگدی پیدا ہوئی اور میں نے بہت سنجیدہ صورت بنا کر کہا کہ یہ سب لوگ شیتنی ہیں اعظم ہیں اور مغلیہ سرکار سے ان کے آبا و اجداد کو خطاب ملا ہوا تھا لیکن غدر کے زمانے میں تمھاری سلطنت نے ان کی جائیدادیں ضبط کر لیں اور یہ غریب ہو گئے۔قوم کے دل میں ان کی اب بھی عزت ہے اور سلطنت نے ان کے خطاب

۱۔جہل مرکب،مصنفہ ا۔م (علیگ) مطبوعہ رسالہ تہذیب الاخلاق (لاہور) جولائی ۱۹۶۸ء

سے تعرض نہیں کیا۔ اس لئے یہ لوگ اب بھی ماٹی لارڈ کہلاتے ہیں۔ یہ سن کر کپتان پر ایک سکتہ طاری ہو گیا۔ بہت دیر تک ان کی حالت پر افسوس کرتا رہا پھر فرداً فرداً ہر ایک کو نہایت ادب سے ٹوپی اتار کر سلام کیا۔ رات کو اپنی کیبن میں کھانے پر مدعو کیا اور بہت عزت سے پیش آیا۔ اس کے بعد تو یہ حال ہو گیا کہ صبح اٹھ کر سب سے پہلے ان کو سلام کرتا اور خیریت پوچھتا کبھی پھل اور میوے پیش کرتا اور ان کے سامنے بچھا جاتا تھا۔ سفر ختم ہونے پر معذرت کی کہ میں آپ کی خاطر خواہ خدمت نہ کر سکا۔ ان لوگوں کو حیرت تھی کہ کپتان میں یہ تبدیلی یکایک کس طرح پیدا ہو گئی۔ آخر کانفرنس کے دوران جب یہ راز افشا ہوا تو لوگوں کے پیٹ میں ہنس ہنس کر بل پڑ پڑ گئے ....."

سر سید احمد خاں اور علی گڑھ تحریک سے تو سید جعفر حسین کو عشق کی حد تک لگاؤ تھا ہی لیکن اس کے علاوہ بھی اگر ہندوستان میں کسی جگہ مسلمانوں کی کوئی تنظیم یا کوئی فرد کوئی درسگاہ قائم کرتا تھا تو سید جعفر حسین اس کی اعانت بھی دامے، درمے قدمے سخنے کرتے تھے۔

اسلامیہ اسکول و کالج اٹاوہ

اٹاوہ کے مولوی بشیر الدین تعلیمی میدان کی ایک معروف شخصیت گزرے ہیں۔ جنھوں نے اپنی بساط بھر مسلمان قوم کی تعلیمی خدمت کی۔ انھوں نے اٹاوہ میں ایک مسلم اسکول قائم کیا تھا جو بعد میں ترقی کرتے کرتے انٹر کالج بنا اور سینکڑوں مسلمان گھرانوں کے بچوں نے ان اداروں میں تعلیم پائی۔ اس اسکول کے قیام کے زمانے سے لے کر اسے کالج کی سطح تک لے جانے میں مولوی بشیر الدین کا جن لوگوں نے ہاتھ بٹایا ان میں سید جعفر حسین کا نام سرفہرست ہے۔ جب اس اسکول کو کالج بنائے جانے کا مرحلہ آیا تو سید جعفر حسین نے دل مدپی فنڈ کے ذریعے ایک لاکھ مدپے

چندہ جمع کرنے کا منصوبہ بنایا تھا۔ اس قسم کا منصوبہ وہ علی گڑھ کالج کے سلسلے میں بھی بنا چکے تھے اور اسے کامیابی سے ہمکنار کرا چکے تھے۔

ملازمت کے دوران علیگڑھ کے علاوہ اٹاوہ بھی جاتے رہتے تھے اور اس اسکول اور کالج کی خدمت کرتے۔ اٹاوہ میں ان کا قیام مہینوں رہتا تھا۔ حتیٰ کہ انتقال سے کچھ عرصہ قبل بیماری کی حالت میں بھی اٹاوہ میں مولوی بشیر الدین کے پاس ہی اس تعلیمی ادارے کے کام کے سلسلے میں ٹھہرے ہوئے تھے جہاں سے ان کے صاحبزادے سید حامد حسین با اصرار لکھنؤ لے گئے تھے۔

انتقال

جس زمانے میں اسلامیہ کالج اٹاوہ کے سلسلے میں اٹاوہ میں مقیم تھے تو ان کے صاحبزادے، سید حامد حسین انجینئر انھیں با اصرار لکھنؤ اپنی کوٹھی میں لے آئے تھے جہاں علاج معالجے کے بعد مکمل طور پر صحت یاب ہو گئے تھے۔

ایک دن بیٹے نے فرمائش کی کہ کوٹھی کے باغ میں آم کے پودے لگوا دیں۔ بیٹے کی اس فرمائش کو پورا کرنے کے لئے سید جعفر حسین کاکوری اور ملیح آباد گئے جہاں تمام دن صرف کر کے آم کے چالیس پودے منتخب کر کے آئے اور آتے ہی کوٹھی میں آم لگانا شروع کر دیئے ہر چند کہ مالی موجود تھے لیکن انھوں نے اپنے ہاتھ سے ہی ان پودوں کو لگانا پسند کیا۔ کام کرتے کرتے رات ہو گئی تو ان کی بہو نے درخواست کی کہ رات ہو گئی ہے باقی پودے کل لگا لئے جائیں گے لیکن انھوں نے جواب دیا زندگی کا کیا اعتبار ہے، میں اسی وقت یہ تمام پودے لگا ڈالوں گا۔

چنانچہ رات گئے تک تمام پودے لگا دیئے۔ نہایت ہشاش بشاش اور خوش تھے۔ اس رات صبح صادق کے وقت داعی اجل کو لبیک کہا۔ جب نوکران کا حقہ تازہ کرنے کی غرض سے ان کے بستر کے قریب گیا تو معلوم ہوا کہ اس عالم فانی سے عالم جاودانی کو سدھار گئے ہیں۔ تمام زندگی کبھی سے کوئی خدمت نہیں لی تھی چنانچہ زندگی کے آخری لمحوں میں بھی کسی کو تکلیف دیئے

بغیر نہایت خاموشی سے سفرِ آخرت اختیار کر گئے۔ اِنَّا لِلّٰہِ اِنَّا عَلَیْہِ رَاجِعُوْن۔

اعترافِ خدمت

خاں بہادر سید جعفر حسین کے انتقال پر مولوی بشیر الدین نے اپنے رسالے البشیر میں جو کچھ تحریر کیا تھا اسے یہاں من وعن نقل کیا جاتا ہے یہ ایک ایسے آدمی کی گواہی ہے جو خود بھی طویل عرصے سے قومی بھلائی اور بالخصوص مسلمانوں کی تعلیمی خدمت کے اہم اور قابلِ قدر کام میں مصروف تھا۔ یہ سطور ان کے ایک رفیقِ کار مخلص دوست اور صاحبِ دل شخص کا ہدیۂ تبریک بھی ہے اور اعترافِ خدمات بھی، نیز ان سطور میں قومی خدمت سے معمور ان کی زندگی کا ایک اجمالی خاکہ بھی موجود ہے۔

"نہایت افسوس کے ساتھ یہ خبر درج کی جاتی ہے کہ خاں بہادر سید جعفر حسین پینشنر ایگزیکٹو انجینیر نے اسّی (۸۰) برس کی عمر میں اس دنیائے فانی سے رحلت فرمائی۔ مرحوم بہت اچھے اوصاف کے آدمی تھے۔ ان کی ابتدائی تعلیم اگرچہ بہت معمولی ہوئی تھی تاہم وہ اپنے شوق سے پرانے زمانے کی سب اوورسیری کے امتحان کی تیاری کے لئے رڑکی کالج میں داخل ہوئے۔ اس ادنےٰ درجے کے امتحان پاس کرنے کے بعد وہ ڈرافٹ مین ہوئے بعد ازاں سب اوورسیر مقرر ہوئے۔ پھر ترقی پاکر ضلعدار اور اس کے بعد ڈپٹی مجسٹریٹ نہر مقرر ہوئے۔ ڈپٹی مجسٹریٹی کے بعد وہ ذمہ دار ایگزیکٹو انجینیر مقرر ہوئے اگرچہ ان کی تعلیم بہت معمولی درجے کی تھی۔

لیکن انجینیری سے چونکہ ان کو خاص شوق تھا لہذا اپنے شوق اور انہماک کی وجہ سے ان کا شمار اعلےٰ درجے کے انجینیر میں کیا جاتا تھا۔ میکینک کی اگرچہ

۱۔ از مولوی بشیر الدین ایڈیٹر البشیر ۲۱ر جولائی ۱۹۳۶ء

انھوں نے کوئی خاص تعلیم نہ پائی تھی لیکن بوجہ شوق کے اس میں بھی انھوں نے اعلیٰ دستگاہ حاصل کرلی تھی جب سے سرسید علیہ الرحمتہ نے علی گڑھ کی تحریک شروع کی یہ شروع سے اس تحریک کے حامی رہے۔

سرسید کے معتقدین میں ان کا نمبر بہت زیادہ بڑھا ہوا تھا۔ان کے دل میں علی گڑھ کالج کی محبت اور اس کی ترقی کے متعلق غیر معمولی شغف موجود تھا وہ جہاں رہتے اور جہاں جاتے اپنے حلقۂ اثر میں لوگوں کو سرسید کا مقصد بتلاتے اور علی گڑھ کی اعانت پر آمادہ کرتے تھے۔

غرضیکہ مرحوم کی ذات سے علیگڑھ کالج اور آل انڈیا مسلم ایجوکیشنل کانفرنس کو اخلاقی اور مادی ہمیشہ فائدہ پہنچتا رہا وہ علیگڑھ کالج کے پرانے ٹرسٹی تھے اور جب کالج یونیورسٹی کے درجے پر پہنچا تو اس کے کورٹ کے ممبر رہے۔انھوں نے یہ ارادہ کیا تھا کہ علیگڑھ میں مستقل سکونت اختیار کریں اور اس غرض سے انھوں نے علیگڑھ میں ایک کوٹھی جعفر منزل کے نام سے بنوائی تھی۔لیکن بعض خانگی مجبوریوں کی وجہ سے وہ علیگڑھ میں قیام نہ کرسکے۔

اسلامیہ ہائی اسکول اٹاوہ جبکہ ایک مکتب کی شکل میں تھا جب سے وہ اسکول کے ہمدرد اور اس کے معاون رہے۔اسلامیہ ہائی اسکول اٹاوہ کی ترقی کے لئے انھوں نے کئی مرتبہ اٹاوہ میں سکونت اختیار کرنے کا ارادہ بھی کیا۔یہاں آکر کئی کئی ماہ تک وہ رہے لیکن بعض خانگی مجبوریوں کی وجہ سے ان کو باہر جانے کی ضرورت پیش آئی۔اگست ۱۹۳۵ء میں وہ آخری مرتبہ پھر اٹاوہ تشریف لائے اور اس ارادے سے آئے تھے کہ "دس روپی فنڈ" کے ذریعہ سے اسلامیہ ہائی

اسکول اٹاوہ کو انٹر کالج بنانے کے لئے ایک لاکھ روپیہ جمع کریں گے۔

چنانچہ انھوں نے اس تجویز کو کامیاب بنانے کے لئے مختلف قسم کے رجسٹر تجویز کئے لیکن اسکول کی بدقسمتی سے وہ ایک ماہ بھی کام نہیں کر پائے تھے کہ سخت علیل ہو گئے اس سخت علالت کی حالت میں بھی وہ لیٹے لیٹے کام کرتے تھے یہاں ان کے مرض میں افاقہ ہو گیا تھا۔ تو ان کے لڑکے خاں بہادر حامد حسین ایگزیکیوٹو انجینئر ان کی اور میری مرضی کے خلاف ان کو زبردستی لکھنؤ لے گئے اور بلرام پور ہسپتال کے یورپین وارڈ میں ان کو داخل کر دیا۔

کئی ماہ تک ہسپتال میں علاج ہوا جب تک ان کے ہاتھ میں لکھنے کی سکت رہی وہ "دن روپی فنڈ" کے متعلق اپنے خیالات اور تجاویز لکھ کر بھیجتے رہے۔ جب ہسپتال میں فائدہ نہ ہوا تو وہ حامد حسین کے مکان میں اُٹھ آئے۔ اور ہومیوپیتھک علاج شروع کیا۔

پہلے خبر آئی کہ ان کو روز بروز آرام ہو رہا ہے لیکن یکایک حامد حسین کا تار آیا کہ مرحوم نے ۱۶ تاریخ کو اس دار فانی سے انتقال کیا (انا للہ وانا الیہ راجعون)

مرحوم نہایت جفاکش محنتی آدمی تھے۔ میں نے اپنی تمام عمر میں سید جعفر حسین کے برابر کسی دوسرے شخص کو محنتی اور جفاکش نہ پایا۔ گرمی سردی میں وہ برابر مثل مزدوروں اور قلیوں کے کام کرتے تھے۔ باوجودیکہ وہ حقہ پینے اور پان کھانے کے عادی تھے لیکن جب کام میں مصروف ہوتے تھے تو نہ ان کو حقہ پینے کا خیال ہوتا تھا اور نہ پان کھانے کا نہ اپنی بیماری کا خیال کرتے تھے۔ حتیٰ کہ سخت بیماری کی حالت میں بھی وہ تندرست آدمی سے زیادہ محنت کرنے کے عادی تھے۔

مسلمانوں کے افلاس کی ان کے دل پر ایک چوٹ لگی ہوئی تھی۔ وہ اپنے غریب عزیز دل اور دوسرے لوگوں کی مالی امداد اس خاموشی کے ساتھ کرتے تھے کہ کسی کو کانوں کان خبر نہ ہوتی تھی۔

یہی وجہ تھی کہ باوجود معقول تنخواہ اور سادہ زندگی کے وہ ہمیشہ تہی دست رہتے تھے۔ وہ ہمیشہ اس ادھیڑبن میں رہتے تھے کہ کس طرح مسلمانوں کی حالت کو بہتر سے بہتر بنایا جائے چنانچہ سینکڑوں ایسے نوجوانوں کو جنھوں نے بہت کم تعلیم حاصل کی تھی ان کو سب اوورسیری کی تعلیم دیتے تھے اور اپنی کوشش سے بہت سے ایسے نوجوانوں کو نوکر بھی کرا دیتے تھے۔

چنانچہ آج ان میں سے بہت اچھے عہدوں پر ہیں۔ ان کی یہ خدمت ایسی تھی کہ جس کی کسی کو کانوں کان خبر بھی نہ ہوتی تھی۔ انگریزی تعلیم یا علی گڑھ کالج کے جو لوگ مخالف تھے وہ ہمیشہ کوشش کر کے ان کے بچوں کو مقامی اسکولوں میں داخل کرا دیتے تھے۔ یا علی گڑھ کالج یا اسلامیہ ہائی اسکول میں تعلیم دلانے کے لئے ان کے والدین کو آمادہ کرتے تھے۔

میری ان سے دوستی کو پچاس برس گزر چکے ہیں۔ میرے ساتھ ان کو جو محبت تھی وہ اعتدال سے بڑھی ہوئی تھی۔ ان کو میرے ساتھ اس وقت سے محبت ہوئی ہے جب کہ ان کی پوزیشن زمانہ کے اعتبار سے بہت اچھی تھی اور میں ہر اعتبار سے پست اور ادنیٰ حالت میں تھا۔ ان کو میری ذات کے ساتھ نہ صرف محبت تھی بلکہ میری ذات سے ان کو ضرورت سے زیادہ حسن ظن اور حسن عقیدت تھی اور یہ حالت آخر عمر تک قائم رہی۔ ایسے زمانے میں جبکہ میری بدقسمتی نے مجھے

ساتھ محبت کرنے والے اور میری نسبت اچھی رائے قائم کرنے والے ایک کے بعد دوسرے اٹھتے جاتے ہیں ان کی موت کا مجھ کو سخت صدمہ ہوا ہے اس قسم کے اندوہ ناک واقعات کو زیادہ عمر پانے والا برداشت کرتا ہے کہ اس کی آنکھوں کے سامنے اس کے عزیز اور دوست مرتے چلے جاتے ہیں اور جو عزیز مرتا ہے اس کی جگہ لینے والا کوئی دوسرا نہیں ہوتا۔

میں خدا سے دعا کرتا ہوں کہ اور کوئی صدمہ مجھکو برداشت نہ کرنا پڑے اور خدا سے مرحوم سید جعفر حسین کی مغفرت کی دعا کرتا ہوں جب سید جعفر حسین صاحب کی وفات کی خبر اٹاوہ پہنچی تو اسلامیہ ہائی اسکول اٹاوہ کے طلبا اور اسٹاف کا ایک تعزیتی جلسہ ہوا۔ ہیڈ ماسٹر صاحب نے مرحوم کے اوصاف بیان کئے۔ جمعہ کی نماز کے بعد بورڈنگ ہاؤس کی مسجد میں قرآن خوانی کر کے مرحوم کی روح کو ایصال ثواب پہنچایا گیا.....“

خان بہادر سید جعفر حسین کے انتقال پُر ملال پر مختلف اخباروں، رسالوں اور انجمنوں نے انھیں خراج تحسین پیش کیا۔ جن مسلمان زعما نے ان کے بارے میں اپنے خیالات و جذبات کا اظہار کیا۔ ان میں سر رضا علی اور سر یعقوب کے نام قابل ذکر ہیں۔

خان بہادر سید حامد حسین

خان بہادر سید حامد حسین، خان بہادر سید جعفر حسین لکھنوی کے سب سے بڑے صاحبزادے تھے۔ سید جعفر حسین کے کل چھ بچے تھے جن میں چار لڑکیاں اور دو لڑکے تھے۔ سید حامد حسین اپنے بہن بھائیوں میں سب سے بڑے تھے۔ اور سید جعفر حسین کے بہت چہیتے اور لاڈلے تھے۔

امیر کلال علیہ رحمتہ کا خاندان تاریخ کے مختلف ادوار میں زمانے کے نشیب و فراز سے گزرتا رہا ہے۔ کبھی اس خاندان کے افراد کا شمار صاحب ثروت لوگوں میں ہوتا تھا تو کبھی یہ لوگ تہی دست اور مفلس ہو جاتے تھے۔ لیکن ہر دور میں شرافت و نجابت اس خاندان کا طرۂ امتیاز رہا۔ گو ہر دو چار نسلوں کے بعد سایۂ ہما ان کے سروں سے اٹھ جاتا تھا، لیکن خاندانی شرافت و نجابت کا گوہر تابدار ہمیشہ اس خاندان کے پاس رہا۔

خان بہادر سید جعفر حسین نے جن کو آجکل کی اصطلاح میں سلف میڈ انسان کہنا چاہیئے اپنے زور بازو سے دنیاوی مناصب کو حاصل کیا تھا جس وقت سید حامد حسین پیدا ہوئے تو گھر میں دولت کی ریل پیل تھی۔ اس اعتبار سے کہا جا سکتا ہے کہ حامد حسین چاندی کا چمچہ منہ میں لے کر پیدا ہوئے تھے۔ لیکن اس کے باوجود بے پناہ محنت کے عادی تھے۔ چنانچہ وہ مزدوروں کی طرح کام کرتے تھے اور کہا کرتے تھے کہ آدمی کو پوری پوری کوشش کرنی چاہیئے اور نتائج خدا پر چھوڑ دینے چاہئیں۔

تعلیم وتربیت

خان بہادر سید جعفر حسین نے بہت محنت اور جدوجہد سے اپنی زندگی بنائی تھی۔ اور نہایت مشکل سے تعلیم حاصل کی تھی اور خود بھی سرسید احمد خان کی تحریک سے متاثر تھے۔ سرسید احمد خان اور ان کے رفقائے کار نے مسلمانوں کو انگریزی تعلیم کی جانب توجہ دلائی تھی۔ گو آغاز میں اس کی مخالفت ہوئی تھی لیکن جلد ہی مسلمانوں نے سمجھ لیا کہ ہوا کا رخ کدھر کو ہے۔ لہٰذا اب مسلمانوں میں ایسے لوگوں کی کمی نہیں تھی جو اپنے بچوں کو سرسید کے قائم کردہ تعلیمی ادارے میں بھیجتے تھے۔ پھر سید جعفر حسین تو خود مغربی تعلیم کے حق میں تھے۔ لہٰذا ان کی دلی تمنا تھی کہ ان کا بیٹا اعلیٰ تعلیم حاصل کرے۔ اور اس سلسلے میں انھوں نے ہر ممکن کوشش کی۔

چنانچہ ۱۹۰۴ء میں سید حامد حسین نے علی گڑھ سے میٹریکولیشن کا امتحان پاس کیا۔ گو ان کے والد کی تربیت اور نگہداشت سخت تھی اور سید حامد حسین جس درجے تک بھی اعلیٰ تعلیم حاصل کرنا چاہتے، انھیں اس کے مواقع حاصل تھے۔ لیکن سید حامد حسین کی دلچسپی کھیل کود میں زیادہ تھی۔ اس بناء پر انھوں نے میٹرک کے بعد تعلیم کا سلسلہ منقطع کر دیا۔ سید جعفر حسین کی خواہش تھی کہ بیٹا اعلیٰ تعلیم کے سلسلے میں کالج میں داخل ہو۔ لیکن سید حامد حسین نے بصد احترام اپنے محترم والد کا حکم ماننے سے انکار کر دیا۔ میٹرک کی تعلیم بھی انھوں نے طالب علموں کی روایتی محنت و مطالعہ کے ساتھ حاصل نہیں کی تھی۔ ان کی تمام تر توجہ کرکٹ کی طرف مبذول تھی جس کے وہ اپنے زمانے کے بہترین کھلاڑی سمجھے جاتے تھے۔ جیسا کہ مشاہدے میں آیا ہے کہ عموماً کھیل کود میں اپنا زیادہ تر وقت گزارنے والے بچے، شاندار تعلیمی نتائج اس لئے حاصل نہیں کر پاتے کہ وہ تعلیم کی طرف پوری توجہ اور انہماک ظاہر نہیں کرتے۔ لیکن ایسے بچے انتہائی ذہین اور طباع ہوتے ہیں۔ چنانچہ سید حامد حسین بھی انتہائی ذہین اور طبّاع تھے۔

شادی

خان بہادر سید حامد حسین کی شادی کم سنی میں ہی کردی گئی تھی۔ لیکن ان کی بیوی کا انتقال ہوگیا تھا۔ پہلی بیوی سے صرف ایک لڑکا تھا۔ پھر انھوں نے دوسری شادی کی جس سے میجر جنرل شاہد حامد صاحب اور ان کے بہن بھائی ہوئے۔

ملازمت

سید حامد حسین کے فرزند میجر جنرل (ریٹائرڈ) سید شاہد حامد صاحب کا بیان ہے کہ میٹرک کے امتحان کے بعد میرے دادا جان کے اصرار اور خواہش کے باوجود وہ آگے پڑھنے پر آمادہ نہ ہوئے۔ بلکہ ملازمت کے خواہش مند تھے چنانچہ میرے دادا نے انھیں خود انجینیرنگ کی تعلیم دی اور صوبجات متحدہ کے محکمہ انہار میں ملازم کرادیا۔ یہ عام مشاہدہ ہے کہ بیٹا، باپ کے پیشے کو نہیں اپناتا۔ لیکن سید حامد حسین کا آئیڈیل ان کے عظیم والد تھے۔ اور انھوں نے اسی پیشے کو اپنانے کی آرزو کا اظہار کیا۔ اور بعد میں وہ خود بھی محکمہ انہار کے ایک نامور انجینیر ہوئے۔ چنانچہ انجینیرنگ سے فطری مناسبت اور ذوق و شوق کے سبب انھوں نے جلد ہی محکمہ میں اپنا مقام بنالیا اور افسران بالا نے ان کی قابلیت کا اعتراف کرتے ہوئے جلد ہی انھیں سب ڈویژنل آفیسر بنا دیا۔

قیام ہالدوانی

۱۹۱۰ء میں سید حامد حسین کا تبادلہ ہالدوانی کردیا گیا۔ یہ بہت دلکش جگہ تھی۔ یہ مقام نینی تال جاتے ہوئے راستے میں نیپالی قبیلے کے پاس واقع تھا۔ یہاں انھوں نے اپنی پیشہ ورانہ زندگی کا سب سے پہلا کارنامہ انجام دیا۔ اس جگہ دریا پر بند باندھ کر اس سے ایک نہر نکالا جانا تھی۔ ایک جانب اس نہر کو ایک محراب نما بند باندھ کر روک دیا گیا تھا۔ یہ ایک بہت بڑی کنکریٹ کی محراب تھی۔ جو دریا کے دونوں کناروں پر واقع تھی۔ اس کی تعمیر کا کام ۱۹۱۱ء میں اختتام کو پہنچا۔ ہالدوانی میں یہ آج بھی پکنک کے اعتبار سے سب سے دلکش مقام سمجھا جاتا ہے۔

نگینہ

اس بند کی تعمیر کے بعد سید حامد حسین کا تبادلہ نگینہ میں کر دیا گیا۔ یہاں ان کا قیام کافی عرصہ تک رہا۔ یہاں کے خاص و عام میں وہ ہر دلعزیز تھے۔ چنانچہ ایک طویل عرصے تک قیام کرنے کے بعد جب ان کا تبادلہ ہونے لگا تو ضلع نگینہ کے لوگوں نے حکومت کو درخواست دی کہ سید حامد حسین کا تبادلہ منسوخ کر دیا جائے۔ اس درخواست پر کثیر تعداد میں لوگوں کے دستخط تھے۔ اور ضلع نگینہ کے تمام بڑے بڑے جاگیرداروں، زمینداروں اور بلند سماجی حیثیت کے لوگوں نے اس پر دستخط کئے تھے۔

سید حامد حسین کو خود بھی یہ علاقہ بہت پسند تھا۔ کیونکہ اس جگہ شکار وغیرہ کی افراط تھی اور شکار ان کا پسندیدہ مشغلہ تھا۔ جب وہ سرکاری دورے پر جاتے تو سرکاری فرائض کی بجا آوری کے بعد اپنا فرصت کا وقت سیر و شکار میں گزارتے تھے۔ چونکہ ضلع بجنور کا علاقہ اس اعتبار سے ان کے لئے جنت سے کم نہیں تھا لہٰذا وہ یہاں سے تبدیل کئے جانے کے خیال سے ہی مضطرب ہو جاتے تھے۔ چنانچہ جب ان کا تبادلہ بجنور سے ہونے کے احکامات آ گئے تو وہ کافی پریشان ہوئے۔ ادھر شہر کے معزز افراد بھی چاہتے تھے کہ ان کا تبادلہ منسوخ ہو جائے۔ شہر کے رؤسا اور امرا نے صوبجات متحدہ کی حکومت کے نام ایک مشترکہ درخواست بھیجی جس میں لکھا گیا تھا۔ "ہم نگینہ کے شہریوں نے سنا ہے کہ سید حامد حسین کو بجنور سے تبدیل کر دیا گیا ہے۔ لہٰذا ہم ملتمس ہیں کہ ان کے تبادلے کے احکامات منسوخ کئے جائیں۔ مسٹر سید حامد حسین کی ذات اس شہر اور ضلع کے لوگوں کے لئے بہت مفید اور ہمدرد ہی ہے۔ ملیریا کے خلاف مہم میں انھوں نے نہایت توجہ اور انہماک سے کام کیا ہے۔ بحیثیت میونسپل کمشنر کے بھی ان کی شخصیت سے اس علاقے کے لوگوں کو فائدے پہنچے ہیں۔ وہ شہر کے ہر طبقے کے تمام لوگوں میں یکساں مقبول ہیں۔ اریگیشن کے کاموں میں ان کے زمانۂ قیام کے دوران معتدبہ اضافہ ہوا ہے۔ جس سے کاشت کا رقبہ

کو بہت زیادہ فائدہ پہنچا ہے۔ عوام اور خاص طور پر اس علاقے کے زمینداروں کو ان پر خاص اعتماد ہے۔ ہم یہاں ان تمام کارناموں اور خدمات کو بیان نہیں کر سکتے جو موصوف نے اس ضلع کی بہبود کی لئے کئے ہیں۔ نہ صرف محکمہ انہار میں بلکہ اس ضلع کے اور دوسرے شعبوں میں بھی ان کی مساعی و جدوجہد اور خدمات قابلِ قدر اور کثیر التعداد ہیں۔ انھوں نے نہایت خوبصورتی اور فہم و فراست سے اس علاقوں کے لوگوں کی دیرینہ باہمی رنجشوں اور آویزشوں کو بھی دور کرا دیا ہے۔ وہ کلب کے آرگنائزر بھی ہیں اور اس کی نگرانی اور انتظام کا کام بھی ان کے ہی سپرد ہے۔"

لیکن حکومت کے احکامات اس زمانے میں نادری ہوا کرتے ہیں۔ چنانچہ اس درخواست کا بھی کوئی اثر نہ ہوا اور ان کے تبادلے کے احکامات منسوخ نہیں کئے گئے۔ لوگوں میں اضطراب کی ایک کیفیت تھی۔ ان لوگوں کی محبت صرف دکھاوے کی نہیں تھی کہ جو افسران کو خوش کرنے کے سلسلے میں کی جاتی ہے۔ بلکہ جب تبادلے کے احکامات منسوخ نہ ہو سکے تو شہر کے لوگوں نے سید حامد حسین کو مشورہ دیا کہ وہ ملازمت سے مستعفیٰ ہو جائیں۔ علاقے کے لوگوں نے متفقہ طور پر یہ فیصلہ بھی کیا تھا کہ وہ انھیں صوبائی لیجسلیٹو کونسل کے الیکشن میں، جو ہندوستان میں اس زمانے میں پہلی بار ہو رہے تھے، اپنے علاقے سے ممبر منتخب کریں گے۔

ایک طرف لوگوں کا اصرار اور خلوص تھا۔ دوسری طرف سید حامد حسین عجیب گومگو کی حالت میں تھے نہ تو ان سے ایسے مخلص اور محب لوگوں کی بات ٹالتے بن رہی تھی اور نہ ہی وہ ملازمت ترک کرنے کو کوئی دانش مندانہ اقدام سمجھتے تھے۔ بالآخر ایک شدید کشمکش کے بعد انھوں نے فیصلہ کیا کہ وہ نوکری جاری رکھیں گے۔ کیونکہ انھیں سیاست سے کوئی دلچسپی نہیں تھی۔ تاہم حکومت نے شہریوں کی درخواست کے جواب دیتے ہوئے اس بات پر مسرت کا اظہار کیا تھا

لہ سید حامد حسین نے جو حکومت کے ایک افسر تھے، لوگوں کی ایسی شاندار خدمات انجام دیں تھی۔

ایک انعام

جنگِ عظیم اوّل میں سید حامد حسین نے بہت سے ہندوستانیوں کو برطانوی فوج میں بھرتی کرایا تھا۔ اس خدمت کے صلے میں جنگ کے اختتام پر حکومت ہند نے انھیں ایک قیمتی بندوق انعام میں دی تھی اور ہر قسم کے آتشیں اسلحہ کے لائسنس سے مبرّا قرار دیا تھا۔

سارڈہ کینال ہیڈ ورکس

۱۹۲۱ء میں صوبجات متحدہ کے چیف انجینئر نے ایک تقریب میں کہا تھا کہ حکومت کو سارڈہ کینال ہیڈ ورکس کی تعمیر کے لئے ایک انتہائی قابل اور ذہین و محنتی افسر کی ضرورت ہے اور حکومت کی نگاہِ انتخاب اس سلسلے میں سید حامد حسین پر ہے۔ لہٰذا انھیں نئی ذمہ داری قبول کرنے کے لئے تیار رہنا چاہیئے۔ سید حامد حسین نے اس حسنِ انتخاب کا حق ادا کر دیا۔ چنانچہ ۱۹۲۱ء سے ۱۹۲۸ء تک کہ جب سارڈہ کینال ہیڈ ورکس مکمل طور پر تیار ہوا۔ انھیں مختلف خدمات کی بجاآوری کے سلسلے میں افسران کے توصیفی خطوط موصول ہوتے رہے۔

۱۹۲۰ء میں سید حامد حسین ہالدوانی میں دوبارہ تعینات کئے گئے تھے۔ جہاں سے تھوڑے عرصے کے بعد انھیں پیلی بھیت میں تبدیل کر دیا گیا۔ اس زمانے میں ہی برصغیر کا دوسرے سب سے بڑے آبرسانی کے منصوبے سارڈہ کینال ہیڈ ورکس کا آغاز ہوا تھا۔ ایک عظیم دریا سارڈہ پیلی بھیت سے چالیس میل کے فاصلے پر بن باسا کے مقام پر بہتا تھا۔ یہ دریا نیپال سے بہتا ہوا اس مقام پر آتا تھا۔ چنانچہ اسی مقام پر اس دریا پر ایک ڈیم بنائے جانے کا منصوبہ تیار کیا گیا تھا۔ یہ آبی منصوبہ اس وقت کے غیر منقسم ہندوستان میں سکھر براجیکٹ کے بعد دوسرے نمبر پر آتا تھا۔ آبرسانی کے اس منصوبے کی تعمیر کا بنیادی مقصد ضلع اودھ

کو پانی کی فراہمی تھی۔

اس ڈیم کے سروے کا آغاز ۱۹۲۰ء میں کیا گیا تھا۔ اس کی تعمیر میں کل آٹھ برس صرف ہوئے اور ۱۹۲۸ء یا ۱۹۲۹ء کے اوائل میں اس ڈیم نے کام کرنا شروع کیا تھا۔ جس وقت سروے کا آغاز ہوا تو سید حامد حسین کا ہیڈ کوارٹر پیلی بھیت میں واقع تھا جو بن باسا سے جہاں ڈیم تعمیر کیا جانا تھا، چالیس میل کے فاصلے پر تھا۔ ابتدائی دنوں میں سید حامد حسین صبح کی ٹرین سے بن باسا چلے جایا کرتے تھے اور شام کی ٹرین سے واپس اپنے ہیڈ کوارٹر آجاتے تھے۔ ٹرین یہ فاصلہ ڈیڑھ گھنٹے میں طے کرتی تھی۔ سید شاہد حامد صاحب کا بیان ہے کہ ہم بچوں کے لئے یہ منظر بھی خوب ہوتا تھا۔ روزانہ صبح کے وقت ٹرین ہمارے سرکاری بنگلے کے سامنے سے گزرتی تھی۔ ہمارے والد صاحب ہاتھ ہلا کر انڈین ڈرائیور کو گاڑی روکنے کا اشارہ کرتے تھے۔ اور ٹرین میں سوار ہو جاتے تھے۔ واپسی میں بھی یہی ہوتا تھا۔ بن باسا بہت گھنے جنگلوں میں واقع تھا۔ اور ان جنگلات میں ہر قسم کی جنگلی مخلوق بکثرت پائی جاتی تھی۔

دیبا پر ڈیم تعمیر کئے جانے سے قبل ملازمین کے لئے بنگلے، سڑکیں، ہلکی ریلوے لائن اور مزدوروں کے رہائشی علاقوں کی تعمیر کی گئی تھی۔ ان تعمیرات کے ساتھ ساتھ اس علاقے کا تفصیلی جائزہ بھی جاری تھا۔

۱۹۲۲ء میں سید حامد حسین بن باسا منتقل ہو گئے۔ تاکہ کام کی براہِ راست نگرانی میں کوئی رکاوٹ نہ پڑے اس علاقے میں مچھر اور سانپ بکثرت تھے۔ مچھروں کی کثرت کی بنا پر گرمی کے موسم میں اس علاقے میں رہنا ناممکن ہو جاتا تھا۔ اس سبب سے یہاں سارا سال کام نہیں کیا جا سکتا تھا۔ چنانچہ سارے کام جون یا جولائی کے اواخر میں بند کر کے عملہ نینی تال منتقل ہو جاتا تھا۔ اکتوبر میں دوبارہ کام شروع ہوتا تھا۔

سارده ہیڈورکس کی تعمیر اس زمانے میں ہندوستان کا ایک نہایت زبردست آبی منصوبہ تھا یہ بات شاید آج ناقابل یقین نظر آئے کہ اس عظیم الشان منصوبے کی تعمیر میں ذرائع نقل وحمل کا کام گدھوں سے لیا گیا تھا۔ شروع میں کھدائی اور مٹی کو باہر پھینکنے کے لئے مشینری استعمال کی گئی تھی لیکن جلد ہی اندازہ ہوا کہ ان مشینوں کی جگہ، گدھوں کو استعمال کرنا مالی اعتبار سے بھی منعفت بخش ہے۔ دوسرے جنگل میں جہاں مشینیں نہیں لے جائی جاسکتی ہیں وہاں ان گدھوں کے ذریعے ہر قسم کا سامان بہ آسانی پہنچایا جاسکتا تھا۔ بے شمار مزدور اور ٹھیکیدار مقرر کئے گئے تھے۔ یہاں کام کرنے والے بیشتر مزدوروں کا تعلق غیر منقسم ہندوستان کے شمالی علاقوں سے تھا۔ ان میں پنجاب کے غریب علاقوں، بلوچستان، کشمیر اور تبت کے مزدور پیشہ لوگوں کی کثرت تھی۔

کام کا آغاز اس علاقے میں پھیلے ہوئے وسیع وعریض جنگلوں کو کاٹنے سے ہوا۔ چنانچہ ان درختوں کو کاٹنے اور پھر وہاں سے ہٹانے میں بہت زیادہ وقت صرف ہوا۔ ایک وقت میں تیس چالیس ہزار مزدور کام کرتے تھے۔ جنگل میں دیکھتے دیکھتے ایک عارضی شہر آباد ہو گیا۔

دریائے سارده کی رفتار انتہائی تیز تھی۔ ہر سال صرف مون سون کے خاتمے کے بعد ہی وہاں کام شروع کیا جاسکتا تھا۔ جسے زیادہ سے زیادہ ماہ اپریل کے اواخر یا مئی کے اوائل تک جاری رکھا جاسکتا تھا۔ تیز و تند دریا کو قابو میں لانے کے لئے پہلے بے شمار چھوٹے چھوٹے ڈیم بنائے گئے تھے۔ اور ایک ریلوے لائن پتھروں وغیرہ کو وہاں تک لانے لیجانے کے لئے بچھائی گئی تھی۔ دریا کو عبور کرنے کیلئے کشتیاں استعمال نہیں کی جاتی تھیں اس مقام پر دریا کو کشتی کے ذریعے عبور کرنا ناممکن تھا۔ درختوں کے بڑے بڑے لٹھوں کو باہم جوڑ کر مشکیزوں سے دریا کو پار کیا جاتا تھا۔ یہی سب سے تیز رفتار اور محفوظ طریقہ تھا۔ بسا اوقات ہاتھیوں

کے ذریعے بھی دریا کو عبور کیا جاتا تھا۔ سردے کے سلسلے میں بھی ہاتھیوں کو ہی استعمال کیا جاتا تھا۔ اس دریا میں مچھلیاں بھی بکثرت تھیں۔

اس عظیم الشان ڈیم کی تکمیل کے بعد دریا سے پانچ بڑی بڑی نہریں نکالی گئیں۔ جن میں سے ایک نہر کے پل پر سنگ مرمر کی ایک لوح آج بھی نصب ہے اس پر سید حامد حسین کا نام لکھا ہوا۔ اور اس منصوبے کی تمام تفصیلات درج ہیں۔

۱۹۲۴ء میں چیف انجینئر نے انھیں ایک خط لکھا جس میں کہا گیا تھا کہ ہز ایکسیلنسی گورنر صاحب بہادر صوبجات متحدہ سید حامد حسین کے کام کو بہ نظر تعریف دیکھتے ہیں اور انھوں نے اپنے جذبات سے سید صاحب کو مطلع کرنے کا حکم دیا ہے۔ چیف انجینئر نے آگے چل کر اسی خط میں لکھا تھا کہ میں آپ کی خدمات کو قدر کی نگاہ سے دیکھتا ہوں۔ ان چھ سات برس کی مدت کے درمیان لکھے ہوئے اور بہت سے ایسے خطوط ہیں جن میں ان کی خدمات کو سراہا گیا تھا۔

۱۹۲۶ء میں چیف انجینئر نے انھیں ایک اور خط بھیجا جس میں لکھا تھا۔" دریائے بن بلسا میں آنے والی حالیہ طغیانیوں میں سید حامد حسین نے جو خدمات انجام دی ہیں۔ حکومت نے مجھے ہدایت کی ہے کہ میں اس سلسلے میں ان سے اظہار تشکر کروں۔"

۲۹-۱۹۲۸ء میں اس عظیم الشان منصوبے کا افتتاح ہوا۔ تمام درجے کے سرکاری افسروں اور صوبجات متحدہ کے گورنر، محکمہ انہار کے چیف انجینئر اور اس علاقے کے ممتاز لوگوں نے اس تقریب افتتاح میں شرکت کی تھی۔ یہ تقریب تین دن تک جاری رہی۔ اس

تقریب کے اختتام پر سید حامد حسین کو حکومت کا ایک خط موصول ہوا جس میں اس حسن و خوبی کے ساتھ تقریب کا اہتمام کرنے پر ان کی تعریف کی گئی تھی۔ گورنر صوبجات متحدہ نے بھی اس تقریب کے اختتام پر اپنی ذاتی حیثیت میں سید حامد حسین کو تعریف کا ایک خط بھیجا تھا۔ علاوہ ازیں گورنر کے ماتحت اعلیٰ سرکاری افسران نے انھیں اپنے خطوط ارسال کئے تھے جس میں نہ صرف خان بہادر سید حامد حسین بلکہ ان کے تمام رفقائے کار کا شکریہ ادا کیا گیا تھا۔

مشہور شاعر عزیز لکھنوی نے اس موقع کے لئے مندرجہ ذیل نظم لکھی تھی۔

قطعۂ تاریخ افتتاح نہر سارده

سنہ ۱۹۲۸ء

نہر در آغوش تھا ہر صوبہ ہندوستاں
تھا فقط محروم شادابی اودھ کا بوستاں

شکر منعم ہے کہ نہر سارده جاری ہوئی
چپہ چپہ پر اودھ کے آج گلکاری ہوئی

مدتوں نقشے بنے پیمائشیں ہوتی رہیں
فکر کے میدان میں افزائشیں ہوتی رہیں

سخت مشکل سے نظیر آفاق میں جن کی ملے
خوش نصیبی تھی کہ ایسے ہی معاون بھی ملے

نو برس کی جو مسلسل سعی تھی مشکور ہے
سچ ہے دیر آید درست آید مثل مشہور ہے

بخت کی خوبی ملا سر مالکم ہیلی کا دور
جن کے دست فیض گستر سے بڑھی عزت کچھ اور

کار مشکل حل نہر راحت افزا سے ہوا
افتتاح چشمۂ فیض ایک دریا سے ہوا

کی عزیز لکھنوی نے منزل تاریخ طے
فیض نہر سارده سے سب اودھ فردوس ہے

سارده کینال ہیڈ ورکس، خان بہادر سید حامد حسین کی زندگی کا سب سے بڑا کارنامہ ہے جس پر وہ بجا طور پر فخر کرتے تھے۔ سکھر بیراج کے بعد یہ سب سے بڑی نہر تھی۔

خان بہادر کا خطاب

سارده کینال ہیڈ ورکس کی تعمیر کے زمانے میں ہی ۱۹۲۵ء میں سید حامد حسین کو خان بہادر کا خطاب ملا۔

یوپی کی صنعتی و زرعی نمائش

۱۹۳۶-۳۷ء میں صوبہ جات متحدہ کی پہلی عظیم الشان صنعتی و زرعی نمائش لکھنؤ میں کی گئی اس کی مجلس منتظمہ اور مجلس استقبالیہ کے ایک رکن خان بہادر سید حامد حسین بھی تھے۔ اس نمائش کے سلسلے میں قطعۂ زمین کا انتخاب اور اسٹالوں کی ترتیب وغیرہ کی نگرانی کا کام بھی بحیثیت انجینئر انہی کے سپرد تھا۔ اس نمائش کے لئے پانچ سو ایکڑ جگہ مخصوص کی گئی تھی۔

سید حامد حسین نے اس سلسلے میں جو قطعہ زمین منتخب کیا تھا اس کی حیثیت تاریخی تھی۔ یہ وسیع و عریض میدان ایک جانب امام باڑے سے شروع ہو کر دریائے گومتی کے دائیں جانب تک پھیلا ہوا تھا۔ اس کی پوری پلاننگ اور نقشوں کی تیاری خاں بہادر سید حامد حسین نے کرائی تھی۔ پورے قطعہ اراضی کو مختلف بلاکوں میں بانٹ دیا گیا تھا۔ کل چودہ بلاک تھے۔ ان میں جو خاص پویلین تھے۔ ان میں وائسرائے پویلین اور گورنر پویلین قابلِ ذکر تھے۔

دوسرے خاص اسٹالوں میں زراعتی اسٹال، زراعتی استعمال میں آنے والی اشیاء کا اسٹال، کیمیکلز اسٹال، ٹیکسٹائل میوزیم، آرٹس اسٹال، ہینڈی کرافٹس اسٹال، ہارٹی کلچر پویلین، جیولری آپیسی لینڈ اسٹال (JEVELLERY ESPLANADE STALL) ارجنٹ موڈل روڈمز، لیدر کرافٹ اسٹال، میوزک کانفرنس پنڈال، میٹل سکیشن اسٹال، میسور

گورنمنٹ پویلین، رامپور اسٹیٹ پویلین، شوگر فیکٹری، شوگر اسٹال، وغیرہ قابلِ ذکر ہیں۔

اس موقع پر نمائش میں ٹیلی فون کا لکھنؤ نمائش سب ایکسچینج بھی قائم کیا گیا تھا۔ ہز ایکسلنی سر ہیری ہیگ نے ہفتہ کی سہ پہر میں اس یادگار نمائش کا افتتاح کیا تھا۔ آنریبل ڈاکٹر سر جوالا پرشاد سر استوا وزیر صنعت حکومت ہند نے خطبہ استقبالیہ پڑھا تھا۔ سر ہیگ نے ڈائریکٹر آف انڈسٹریز مسٹر شیو دیسانی اور انجینئر انچارج خان بہادر سید حامد حسین کی خدمات کو سراہا۔

اس نمائش کو لکھنؤ میں تمام لوگوں نے پسند کیا اور اردگرد کے شہروں اور دیہاتوں کے لوگ بھی کثیر تعداد میں نمائش دیکھنے آتے رہے۔

اخبارات میں بھی خصوصی مضامین اس نمائش کے بارے میں شائع ہوتے رہے۔

لکھنؤ کا تبادلہ

بن باسا میں سارده ہیڈ ورکس کینال کے منصوبے کے پایۂ اختتام کو پہنچنے پر خان بہادر سید حامد حسین کا تبادلہ لکھنؤ کا ہو گیا تھا اس مقام کو چھوڑتے ہوئے انھیں کچھ رنج سا محسوس ہوا۔ ایک تو اس وجہ سے کہ اپنی زندگی کے بہترین دن انھوں نے یہاں اس ڈیم کی تعمیر میں گزارے تھے۔ دوسرے بن باسا میں شکار کھیلنے کی بہت آسانیاں تھیں۔ اور شکار ان کا محبوب مشغلہ تھا۔ لکھنؤ تبدیل کئے جانے کے بعد وہ سیر و شکار کی ان بڑی مہمات سے تو محروم ہو گئے تھے۔ لیکن جلد ہی اس آبائی شہر میں ملازمت کے بعد دوسرے مشغلوں میں وہ مصروف ہو گئے۔

لکھنؤ آنے کے بعد پہلی بار وہ جعفر منزل میں مقیم ہوئے۔ یہ وہ مکان تھا جو ان کے نانو والد سید جعفر حسین نے اپنی ذاتی نگرانی میں تعمیر کرایا تھا۔ جعفر منزل کے برابر ہی انھوں نے اپنا ایک مکان بنوایا تھا۔ اور اس کا نام حامد منزل رکھا تھا۔

مرزاپور کا تبادلہ

لکھنؤ میں کافی عرصہ قیام کے بعد ان کا تبادلہ مرزاپور کا ہوگیا۔ غالباً اس تبادلے کے محرک وہ خود تھے۔ شکار کے اعتبار سے مرزاپور کا ضلع بہت اچھا سمجھا جاتا تھا۔ مرزاپور الہ آباد سے چالیس میل کے فاصلے پر واقع ہے۔ اسی طرح بنارس سے بھی قریب ہی واقع ہے۔ اس ضلع میں بہت سی چھوٹی چھوٹی نہریں اور آبی ذخیرے موجود تھے۔ اور بہت سے آبی ذخیروں کی تعمیر اور نہروں کی کھدائی کا کام تقریباً تمام سال ہی جاری رہتا تھا۔ یہ بہت بڑا ضلع تھا، اور اس کی حدود بہت سی ہندوستانی ریاستوں سے ملی ہوئی تھیں۔

مرزاپور کے قیام کے دوران ہی ان کے سب سے بڑے بیٹے سید شاہد حامد کو انڈین آرمی میں کمیشن ملا۔ جو بعد میں ترقی کرتے کرتے پاکستان کی مسلح افواج میں میجر جنرل کے عہدے تک پہنچے اور اسی عہدے سے ریٹائر ہوئے۔

ریٹائرمنٹ

مرزاپور سے خان بہادر صاحب کا تبادلہ دوبارہ لکھنؤ کا ہوگیا تھا۔ جہاں سے تھوڑے عرصے کے بعد وہ ملازمت سے ریٹائر ہوئے۔ ریٹائرمنٹ کے بعد انھوں نے لکھنؤ میں گورنمنٹ ہاؤس کے بالکل قریب اپنی کوٹھی بنوائی جو پورے لکھنؤ میں فیروز کوٹھی کے نام سے معروف تھی اس کوٹھی کا نام انھوں نے اپنی اہلیہ کے نام پر رکھا تھا۔

ریٹائرمنٹ کے بعد انھوں نے آرکیٹکٹ اور انجینئر کی حیثیت سے اپنا ذاتی کام شروع کیا تھا۔ لیکن اپنی فطری بے نیازی کے سبب وہ اس کاروبار میں کامیاب نہ ہو سکے۔ یا تو وہ اپنے سیر و شکار کے مشغلے اور طبیعت کی بے نیازی کی بنا پر بل بھیجنا بھول جاتے تھے یا پھر ان کے بہت سے دوست احباب جو اپنے نقشے بنوا کر لے جاتے تھے

ان کو معاوضہ کی رقم ادا نہیں کرتے تھے۔

لکھنؤ میں جو بھی آدمی اپنا مکان بنوانے کا ارادہ کرتا تھا وہ خان بہادر سید حامد حسین کے پاس نقشہ بنوانے اور دوسرے مشورے لینے ضرور آتا تھا۔ اور بغیر معاوضے کا مطالبہ کئے خان بہادر صاحب انھیں تمام ضروری چیزیں بنا کر دے دیتے تھے۔ اکثر اوقات ان کی اہلیہ کہتیں کہ یہ سب لوگ جو آپ سے پلان بنوا کر لے جاتے ہیں صاحبِ حیثیت لوگ ہیں۔ آپ ان سے اپنا حق محنت کیوں نہیں وصول کرتے یا ان کے گھر پر بل بھجوا دیجئے۔ تو وہ ہنس کر جواب دیتے۔ بھئی وہ میرے دوست ہیں۔ لکھنؤ کا شاید ہی کوئی قابلِ ذکر آدمی ہوگا جو ان کو نہ جانتا ہو یا جس کے ان سے مراسم نہ ہوں۔ وہ لکھنؤ کی ہر دلعزیز شخصیت تھے۔ اکثر اوقات شام میں برج کھیلنے کے لئے کلب جایا کرتے تھے۔ وہ برج کے بڑے اچھے کھلاڑی تھے۔

فیروز کوٹھی کا پلان اور اس کی تعمیر کے کام کی تمام تر نگرانی انھوں نے بذاتِ خود کی تھی۔ بنیادی طور پر وہ آرکیٹکینٹ نہیں تھے۔ اور محکمہ انہار کے انجینئر تھے۔ لیکن قدرت نے چونکہ انھیں اعلیٰ ذہنی صلاحیتوں سے نوازا تھا۔ لہٰذا وہ انجینئرنگ کے تمام شعبوں میں مہارت رکھتے تھے۔

احباب

خان بہادر سید حامد حسین کا حلقہ احباب بہت وسیع تھا۔ جس سے بھی ایک دفعہ تعلقات استوار ہو جاتے پھر پوری وضع داری سے انھیں نبھاتے تھے۔ ان کے حلقہ احباب میں ہر قسم اور ہر سماجی مرتبے کے لوگ شامل تھے لیکن ان لوگوں سے ان کی دوستی زیادہ تھی جن کے مشاغل ان کے مشاغل سے ملتے جلتے تھے۔ وہ اپنی ملازمت کے زمانے میں جہاں جہاں رہے۔ وہاں سے تبدیل ہو جانے کے

بعد بھی مقامی لوگوں سے ان کے سلوک اور دوستی میں فرق نہ آتا تھا۔

نگینہ اور بجنور میں ان کا قیام بہ سلسلۂ ملازمت طویل عرصے تک رہا۔ اس جگہ سے ان کے تبادلے کے سلسلے میں وہاں کے لوگوں کی خواہشات اور پسندیدگی کا تذکرہ ہم گزشتہ صفحات میں کر آئے ہیں۔ نگینہ سے تبدیل ہو جانے کے بعد بھی اس علاقے کے لوگ برابر پابندی کے ساتھ ان سے ملاقات کی غرض سے آتے رہتے تھے۔ آتے ہوئے موسمی پھلوں اور آموں وغیرہ کی ٹوکریاں بھی خان بہادر صاحب کے لئے لے کر آتے تھے۔ آموں کی فصل کے موقع پر سینکڑوں پارسل بجنور اور نگینہ سے ہر سال آتے رہتے تھے۔

نگینہ ہی میں ان کے برادرانہ تعلقات سید عین الدین صاحب سے قائم ہوئے تھے سید صاحب وہاں تحصیلدار تھے اور سید حامد حسین کے بچوں سے بہت زیادہ پیار کرتے تھے۔ سید شاہد حامد صاحب کا بیان ہے کہ " عین الدین صاحب مجھ سے بالخصوص بہت محبت کرتے تھے۔ چنانچہ میں بھی ان سے مانوس تھا۔ میری عمر تین سال کی تھی لیکن عین الدین صاحب سرکاری دورے پر جاتے ہوئے مجھے اپنے ہمراہ لے جاتے تھے اور میں دو دو تین تین دن تک والدین سے دوران کے ساتھ نہایت خوش و خرم رہتا تھا۔" سید عین الدین صاحب سے سید حامد حسین کے تادم زندگی برادرانہ مراسم رہے۔

خان بہادر سید حامد حسین کے انگریز حلقۂ احباب میں سے ایک مسٹر ٹی ایچ وائرس تھے۔ جو خان بہادر صاحب کے دوست تھے۔ حالانکہ وہ ان کے زمانہ طالب علمی میں علیگڑھ اسکول کے ہیڈ ماسٹر تھے۔ بعد میں علیگڑھ کالج کے پرنسپل بھی ہوئے۔ یہ آکسفورڈ کے فارغ التحصیل تھے اور اکثر اپنے شاگرد سے ملنے ان کے گھر تشریف لاتے تھے۔ ان کے تعلقات استادی شاگردی سے زیادہ دوستی کے تھے۔ مسٹر ٹی ایچ وائرس بعد میں کچھ عرصہ

سندھ مدرسہ کراچی کے بھی پرنسپل رہے تھے۔

اسی طرح مسٹر کونوے ریسی ایک اور انگریز تھے۔ یہ بھی پرنسپل کے عہدے پر فائز رہ چکے تھے۔ آکسفورڈ کے فارغ التحصیل تھے اور نہایت شریف النفس اور خاندانی انگریز تھے۔

ان کے ہندوستانی دوستوں میں نواب بھوپال، نواب سر اسماعیل خان اور نواب زادہ لیاقت علیخاں تھے۔ جو بعد میں پاکستان کے وزیر اعظم بنے۔ ملازمت سے ریٹائر ہونے کے بعد نواب بھوپال نے انھیں ریاست بھوپال آنے کی دعوت دی تھی۔ چونکہ ان کے مراسم نواب صاحب موصوف سے دوستانہ تھے۔ لہذا وہ وہاں جانا نہ چاہتے تھے۔ لیکن نواب صاحب کی لکھنؤ آمد اور ان کے اصرار پر بادل ناخواستہ انھیں بھوپال جانا پڑا۔ یہاں ان کی حیثیت ایک مشیر کی سی تھی۔

بھوپال میں اپنی آمد کے فوراً بعد انھوں نے اپنی رہائش کے لئے ایک خوبصورت بنگلہ بنوایا۔ جو AHINI BUNGLOW کے نام سے مشہور تھا۔ یہ نہایت خوبصورت مقام تھا۔ اور اس کا محل وقوع بھی نہایت دلکش تھا۔ اونچی پہاڑی پر ایستادہ یہ مکان دس بارہ میل سے نظر آتا تھا۔

بھوپال میں ان کا قیام پانچ برس تک رہا۔ یہاں انھوں نے بہت زیادہ کام نہیں کیا۔ بلکہ ان کی حیثیت ریاست کے مشیر تعمیرات اور نواب صاحب کے ذاتی دوست کی سی تھی اکثر رات گئے تک انھیں نواب صاحب کے ساتھ رہنا پڑتا۔ اور چونکہ وہ رات کو دیر تک جاگنے کے عادی نہیں تھے لہذا اس شب بیداری نے ان کی صحت پر خراب اثر ڈالا۔ اور لکھنؤ میں واپسی تک ان کی صحت بہت بگڑ گئی تھی۔

تاہم بھوپال میں اپنے قیام کے زمانے میں انھوں نے کئی محلات، مکانات اور عمارتیں

تعمیر کرائی۔ بھوپال کی سب سے خوبصورت مسجد کا نقشہ ڈیزائن اور تعمیر بھی انھوں نے کرائی تھی۔

بھوپال میں اپنے زمانہ قیام کے دوران انھوں نے لکھنؤ والی اپنی فیروز کوٹھی جناب رفیع احمد قدوائی کو کرائے پر دے دی تھی جو اس زمانے میں یوپی گورنمنٹ میں وزیر تھے۔ بھوپال میں ہی سید حامد حسین صاحب کا دل خوب لگ گیا تھا۔ کیونکہ ریاست بھوپال مناظر قدرت سے مالامال ہے۔ اور یہاں ندی نالے، جھیلیں، جنگلات بکثرت موجود ہیں لیکن ریاست میں شیر کا شکار منع تھا اس کے لئے نواب بھوپال سے خصوصی اجازت حاصل کرنا پڑتی تھی۔

جم کاربٹ

سیر و شکار کی کہانیوں سے دلچسپی رکھنے والا اردو داں طبقہ جم کاربٹ کے نام سے ضرور واقف ہوگا۔ یہ وہ مشہور شکاری ہے۔ جس کی شکار کی داستانیں بہت مشہور ہیں۔ جم نے ہندوستان کے گھنے جنگلوں میں بہت سے خونخوار آدم خور شیروں اور چیتوں کو ہلاک کیا تھا۔ جم کاربٹ نینی تال میں رہتا تھا۔ اور خان بہادر سید حامد حسین سے اس کے گہرے مراسم تھے۔ بعض شکاری مہمات میں خان بہادر اور جم کاربٹ کا ساتھ رہا تھا۔ لیکن جم کاربٹ کوئی عام شکاری نہیں تھا۔ بلکہ وہ صرف ایسے درندوں اور بالخصوص شیروں کا شکار کرتا تھا۔ جنھوں نے اپنے علاقے میں لوگوں میں خوف و دہشت پھیلا رکھی ہو اور جو کم از کم دو سو تین سو آدمیوں کو اپنی خوراک بنا چکے ہوں۔ جن شیروں کو مارنے میں بڑے بڑے ماہر شکاری ناکام ہو جاتے تھے۔ جم کاربٹ ان درندوں سے مقابلے کا بیڑا اٹھاتا تھا۔ اور انھیں ہلاک کرتا تھا۔

جن دنوں بن باسا میں ساردہ ہیڈورکس کی تعمیر کا کام مچھروں، سانپوں اور بارشوں کی کثرت کے سبب بند کر دیا جاتا تھا تو خان بہادر سید حامد حسین اپنے اہل و عیال

کے ہمراہ نینی تال منتقل ہو جاتے تھے۔ یہاں ان کا قیام تین چار ماہ تک رہتا تھا۔ اس عرصے میں اکثر شام کے وقت کبھی خود جم کاربٹ کے گھر ملاقات کے لئے جاتے تھے اور کبھی جم کاربٹ ان کے گھر آتا تھا۔ سید شاہد حامد صاحب جو اکثر ان ملاقاتوں کے وقت اپنے والد کے ہمراہ ہوتے تھے کا بیان ہے۔ کہ نینی تال میں، میں اپنے والد کے ہمراہ ان کے ایک خاص انگریز دوست کے بنگلے پر جایا کرتا تھا۔ یہ عظیم شکاری جم کاربٹ تھا۔ جس سے میرے والد ملنے جایا کرتے تھے۔ یہ وہی شکاری ہے جو بعد میں اپنی عظیم شکاری مہمات کے سبب دنیا بھر میں مشہور ہوا۔ بعد میں وہ ہندوستان چھوڑ کر افریقہ میں جا کر آباد ہو گیا تھا۔ جہاں اس نے اپنا مشہور زمانہ (TREE ، HOUSE) بنوایا تھا۔ جم کاربٹ بالخصوص آدم خور شیروں اور چیتوں کا شکار کیا کرتا تھا۔ اور بعض ایسے شیر اور چیتے بھی اس نے مارے تھے جو دو تین سو آدمیوں کو ہلاک کر چکے تھے۔ حقیقت میں آدم خور شیروں اور چیتوں کے شکار کے لئے بڑے دل گردے کے شکاری کی ضرورت ہوتی ہے۔ کیونکہ ایسے جانور اپنی خونخواری اور عیاری میں عام بپھرے ہوئے جانوروں سے زیادہ خطرناک ہوتے ہیں۔

مشاغل

جیسا کہ ہم ابتدا میں تذکرہ کر آئے ہیں کہ خان بہادر سید حامد حسین کو تعلیم سے زیادہ دلچسپی نہیں تھی۔ بلکہ ان کو کھیل کود اور سیر و شکار سے دلچسپی تھی۔ وہ اپنے لڑکپن میں سارا سارا دن کرکٹ کھیلتے رہتے تھے۔ اور زمانہ طالبعلمی میں کرکٹ کے بہت اچھے کھلاڑیوں میں شمار کئے جاتے تھے۔ علاوہ ازیں برج کے کھیل سے بھی بہت دلچسپی تھی۔ ان کے صاحبزادے سید شاہد حامد صاحب کا بیان ہے کہ برج، کھیلنا انھیں، ان کے والد نے اس وقت سکھایا تھا جب ان کی عمر تیرہ چودہ برس کی تھی۔ ان کا سلوک اپنے بچوں بالخصوص سید شاہد حامد صاحب سے دوستانہ تھا۔ ان کا بیان ہے

جب میں نے فوج میں ملازمت کرلی تھی اس کے بعد بھی جب کبھی چھٹی پر گھر آتا تو سب سے
پہلے میرے ساتھ برج کھیلنا میں مصروف ہو جاتے تھے۔ ایک بار تو جب میں گھر آیا تو والد صاحب
نے میرے ساتھ برج کھیلنا شروع کیا۔ اور اگلے دن اپنی والدہ سے ملاقات کر سکا۔ جاس
ات پر کافی ناراض بھی ہوئیں۔

لیکن ان کو سب سے زیادہ شکار سے دلچسپی تھی۔ اور زندگی بھر جب تک قویٰ مضبوط
ہے وہ برابر شکار کھیلنے کو جاتے رہے۔

نگینہ میں قیام کے دوران وہ برابر سرکاری فرائض کی بجاآوری کے بعد شکار کھیلنے کو جاتے
تھے۔ ان کا نشانہ بہت اچھا تھا۔ اور رائفل اور شوٹ گن دونوں سے شکار کر لیتے تھے۔ نگینہ
ں قیام کے دوران ان کا معمول تھا کہ روزانہ صبح سویرے تین چار بجے بیدار ہو کر جھیل پر
لے جاتے تھے۔ جہاں سپیدۂ سحری کے وقت مرغابیاں اور دوسرے آبی پرندے آتے
تھے۔ اور سید صاحب بہ آسانی انھیں شکار کر لیتے تھے۔

اس زمانے میں ابھی موٹر گاڑی کا رواج نہیں ہوا تھا۔ تمام تر سفر گھوڑوں پر ہوتا تھا۔
سید حامد حسین اعلیٰ درجے کے شہسوار تھے اور دن بھر میں چالیس پچاس میل کا فاصلہ
آسانی طے کر لیتے تھے۔ شکاری تھیلوں کو گھوڑے کی کاٹھی کے ساتھ لٹکا دیتے تھے اور شکار
ان تھیلوں میں بند کر کے گھوڑے پر سوار ہو کر واپس گھر آجاتے تھے۔

نگینہ اور بجنور میں وہ اپنے دوستوں کے ہمراہ جنگل میں شیر کے شکار کو جایا کرتے تھے
اس مہم کے دوران وہ جنگل میں کیمپ لگا لیتے تھے۔ اور ہاتھی پر بیٹھ کر یا مچان پر بیٹھ کر
شیر کا شکار کیا کرتے تھے۔

ان کے گھر کا ہر کمرہ مختلف جانوروں کے سروں، کھالوں وغیرہ سے آراستہ رہتا تھا۔

ان میں سے بیشتر کا انھوں نے خود شکار کیا تھا۔ اسی طرح بہت سی ٹرافیاں بھی ان کے مکان کے مختلف کمروں میں رکھی ہوئی نظر آتی تھیں۔ یہ ٹرافیاں انھیں شکار کے انعام کے طور پر ملی ہوئی تھیں۔

وہ خود ہی اپنی بارہ بور کی بندوق بھرتے تھے۔ اور چونکہ ان کا تعلق محکمہ انہار سے تھا جس کی وجہ سے معائنے کے لئے انھیں نگینہ ضلع کے اندرونی مقامات تک جانا پڑتا تھا۔ لہذا ایسے دوروں کے موقع پر وہ سرکاری فرائض کی بجاآوری کے بعد مختلف شکار پارٹیاں ترتیب دیتے تھے۔ خان بہادر سید حامد حسین کا ایک ملازم نذیر نامی تھا۔ یہ پستہ قد کا آدمی تھا۔ لیکن اس کا نشانہ بہت اچھا تھا بلکہ اس کے ماہر نشانہ باز ہونے کے معترف خود خان بہادر صاحب بھی تھے۔ شکار کے دوران اس کے پاس بھی ایک بندوق ہوتی تھی۔ نگینہ کے سید عین الدین تحصیل دار بھی اکثر ان کے ہمراہ شکار پارٹی میں شامل ہوتے تھے۔ سید عین الدین صاحب بھی بہت ماہر نشانچی تھے۔

چونکہ بن باسا میں شکار کی بہتات تھی لہذا سید حامد حسین کو یہ علاقہ بہت پسند تھا۔ اس جنگل میں شیروں، ہاتھیوں، چیتوں اور ریچھوں کی بہتات تھی۔ یہ جنگلی جانور اکثر راتوں کو بنگلوں کے دراندوں میں ٹہلتے ہوئے آنکلتے تھے۔ حتیٰ کہ بعض اوقات کھانے پینے کی چیزوں کی تلاش میں بنگلوں کے باورچی خانوں تک میں آجاتے تھے۔ اکثر رات کے وقت کمروں کی کھڑکیوں سے ایسے درندوں کو شکار کر لیا جاتا تھا۔ ان گھنے جنگلوں میں شکار کے لئے کسی قسم کی دوڑ دھوپ نہیں کرنا پڑتی تھی۔ جنگل کے اندر قدم رکھتے ہی شکاری کا سامنا کسی نہ کسی خوفناک درندے سے ہو جاتا تھا۔

اس جنگل میں گھاس بہت گھنی اور لمبی تھی۔ اس گھاس کی لمبائی کم از کم دس بارہ

فٹ ہوتی تھی۔ اور اس میں چلنا آسان بات نہ تھی۔ اس سبب سے گھنی گھاس میں پیدل چل کر شکار کرنا بہت دشوار تھا۔ شکار اکثر ریلوے لائن کے قریب کیا جاتا تھا۔ اس جگہ کو صاف کر دیا گیا تھا جنگلی جانور اس مقام تک ٹہلتے ہوئے آ نکلتے تھے۔

اس علاقے کے سب سے بڑے زمیندار دو بھائی منگل خان اور بالا خاں تھے۔ یہ دونوں حقیقی بھائی تھے اور اس جنگل کا بیشتر حصہ ان کی ذاتی ملکیت تھا۔ شکار کی غرض سے یہ دونوں بھائی اس علاقے میں رہتے تھے۔ دونوں بہت زبردست شکاری تھے۔ اور تمام بڑے بڑے سرکاری افسروں سے ان کے دوستانہ مراسم تھے۔ صوبجات متحدہ کے گورنروں سے لے کر ڈپٹی کمشنروں تک سے ان کے دوستانہ مراسم تھے۔ اور یہ لوگ اس علاقے میں شکار کی غرض سے آتے رہتے تھے۔

سید حامد حسین کے بھی ان دونوں بھائیوں سے بڑے گہرے مراسم تھے۔ اور وہ اکثر ان بھائیوں کی فرمائش پر ان کے ہمراہ شکار پارٹیوں میں شرکت کرتے تھے۔ سید شاہد حامد نے ایک ایسے ہی دلچسپ شکار کا حال بیان کیا ہے جس میں وہ اپنے والد کے ہمراہ خود بھی شریک تھے۔ وہ لکھتے ہیں:

"بچپن ہی سے اپنے والد کے ہمراہ میں بھی شکار پارٹیوں میں شریک ہوتا تھا۔ اس موقع پر بہت سے ہاتھی یکجا کر لئے جاتے تھے۔ جس پر شکار میں شریک ہوتے والے تمام لوگ بیٹھتے تھے۔ ایک ایسے ہی شکار کا منظر ابھی تک میری نظروں کے سامنے گھوم رہا ہے۔ اس شکار کے موقع پر ایک غیر ملکی مہمان بھی ہم لوگوں کے درمیان موجود تھا۔ اس کا ایک دس گیارہ برس کا لڑکا بھی اپنی پوائنٹ ۲۲ کی بندوق لئے ہوئے تھا۔ مہم کے دوران ایک شیر کو نشانہ بنایا گیا۔ یہ شیر ایک

مقام پر جاکر ڈھیر ہوگیا۔ یہ اس جگہ سے کچھ زیادہ دور نہ تھا۔ جہاں ہم ہاتھیوں پر سوار تھے۔ جب وہ شیر گر چکا تو اس غیر ملکی مہمان نے اپنے بیٹے سے کہا کہ وہ بھی شیر پر فائر کرے۔ لڑکے نے شیر کا نشانہ باندھا اور گولی شیر کے سر میں پیوست ہوگئی۔ اس کے بعد پارٹی کے تمام آدمی ہاتھیوں سے اتر کر شیر کو دیکھنے اور اس کی جسامت وغیرہ کا اندازہ لگانے کے لئے نیچے اتر آئے۔ شیر کے نزدیک جاکر معلوم ہوا کہ اس چھوٹے بچے کی پوائنٹ ۲۲ کی گولی کے علاوہ جو شیر کے دماغ میں پیوست ہوگئی تھی۔ اس کے جسم پر اور کوئی نشان نہ تھا۔

واقعہ یہ تھا کہ شیر بہت سارے ہاتھیوں کو دیکھ کر چوکنا ہوگیا تھا۔ اور گھبرا کر بھاگتے ہوئے لکڑی کے ایک بہت بڑے لٹھے سے جا ٹکرایا۔ جو وہاں زمین میں پڑا ہوا تھا۔ سر ٹکرا جانے کے سبب زخمی ہونے کے باوجود وہ زندہ حالت میں وہاں موجود تھا۔ ہم لوگ یہ سمجھے تھے کہ شیر ہلاک ہو چکا ہے۔ اس لڑکے کے گولی چلانے تک شیر زندہ تھا۔ اور جس وقت ہم لوگ اس کی جسامت کا اندازہ لگانے کے لئے اس کے قریب جاتے تو وہ حملہ آور ہو جاتا۔ ایسی صورت میں ہم میں سے نہ جانے کتنے اس کا شکار بن جاتے۔ یہ اتفاق ہی تھا کہ اس لڑکے کی بندوق سے نکلنے والی گولی شیر کو موت سے ہمکنار کر چکی تھی۔ اصل صورتِ حال سے واقف ہو جانے کے بعد سب کی رگوں میں خوف کی لہر سی دوڑ گئی تھی۔"

سید شاہد حامد صاحب بن باسا کے دوران قیام کا ایک اور دلچسپ واقعہ بیان کرتے ہیں۔

"ایک بار رات کے وقت گھر کے لوگ کھانا کھا کر فارغ ہوتے ہی تھے کہ ایک شخص میرے والد سید حامد حسین صاحب کے پاس آیا۔ اس نے بتایا کہ ریلوے لائن پر ایک ریچھ بیٹھا ہوا ہے۔ میرے والد نے رائفل اٹھائی اور ٹارچ ہمراہ لے کر باہر نکلے اور تھوڑے فاصلے پر جا کر نشانہ باندھ کر فائر کر دیا یکے بعد دیگرے انھوں نے دو گولیاں چلائیں لیکن ریچھ نے کوئی جنبش نہ کی۔ صاف ظاہر تھا کہ ریچھ ڈھیر ہو گیا تھا۔ جب میرے والد شکار کے قریب پہنچے تو معلوم ہوا کہ کوئی شخص سیاہ کمبل اوڑھے سو رہا تھا۔ یہ دیکھ کر کہ نشانہ بننے والا جانور نہیں بلکہ انسان ہے میرے والد صاحب گھبرا گئے۔ گولیوں کی آواز سن کر بھی وہ شخص نہ جاگا۔ خوش قسمتی سے گولیاں اس کے کمبل کو صرف چھوتے ہوئے گزر گئی تھیں۔ جب اس آدمی کو جگا کر دریافت کیا گیا کہ وہ کیوں اس غیر محفوظ جگہ پر سو رہا ہے تو اس نے بتایا کہ اس کے پاس سونے کے لئے کوئی جگہ نہیں ہے میرے والد نے اسی وقت اس شخص کے سونے کا انتظام کیا۔"

خان بہادر سید حامد حسین اپنی رحمدلی کے سبب بھی بہت مشہور تھے۔ جب بن باسا میں ڈیم کی تعمیر کا کام بند کر دیا جاتا تھا تو خان بہادر صاحب اور ان کا پورا عملہ نینی تال منتقل ہو جاتا تھا۔ اس زمانے میں خان بہادر صاحب کی دلچسپیوں اور مشاغل میں تبدیلی آجاتی تھی۔ اب ان کا زیادہ وقت ٹینس پارٹیوں، ٹی پارٹیوں، ڈنر پارٹیوں، کلب اور برج وغیرہ میں بسر ہوتا تھا۔ اس زمانے میں ہندوستان کے صاحب ثروت افراد نینی تال کے ہل اسٹیشن پر جمع ہو گئے تھے۔ نواب چھتاری سے خاص دوستی تھی۔ اور ان سے نینی تال میں اکثر ملاقات رہتی تھی۔

جب بن باسا میں ڈیم کی تعمیر مکمل ہو جانے کے بعد ان کا تبادلہ پہلے لکھنؤ اور

بعدازاں مرزاپور میں ہوا تو ان کی سیر و شکار کی زندگی دوبارہ عروج پر آگئی۔ مرزاپور بھی اپنے گھنے جنگلوں اور ان میں پائی جانے والی جنگلی مخلوقات کے لئے مشہور تھا۔ یہاں وہ مرزاپور ضلع کے طول و عرض میں پھیلی ہوئی نہروں اور آبی ذخیروں کے معائنے پر جاتے تھے ڈاک بنگلوں میں قیام کیا جاتا تھا۔ اور فرصت کے اوقات میں شکار پارٹیاں ترتیب دی جاتی تھیں۔ ان شکار پارٹیوں میں ان کے بڑے صاحبزادے سید شاہد حامد صاحب بھی برابر کے شریک ہوتے تھے اور مرزاپور ہی میں انھوں نے پہلے شیر کا شکار کیا تھا۔ مرزاپور کے قیام کے زمانے میں ہی ان کے چہیتے بیٹے کو فوج میں کمیشن مل گیا۔ اور وہ برطانوی رجمنٹ کے ساتھ منسلک ہو گئے۔ خان بہادر سید حامد حسین اولاد سے محبت کے معاملے میں بہت زیادہ جذباتی واقع ہوئے تھے۔ اور خاص طور پر سید شاہد حامد صاحب سے تو وہ بہت زیادہ پیار کرتے تھے۔ اور باپ بیٹے ایک جان دو قالب تھے۔ بیٹے کے فوج میں چلے جانے کے بعد، گھنے جنگلوں میں شکار کھیلتے ہوئے انھیں اپنے لائق اور ہونہار بیٹے کی یاد بہت زیادہ آتی تھی۔ ایسے مواقع پر جو خطوط انھوں نے اپنے بیٹے کو لکھے تھے۔ اس سے ان کے جذباتی ہونے کا پتہ چلتا ہے۔

آخر والد کی فرمائش پر ہی سید شاہد حامد صاحب نے اس برطانوی رجمنٹ میں اپنی پوسٹنگ کی درخواست دی، جو اس زمانے میں الہ آباد میں مقیم تھی۔ ان کی درخواست منظور کر لی گئی۔ اس کے بعد گزشتہ دن پھر لوٹ آئے اور سید شاہد حامد صاحب ہر چھٹی کے روز شکار کے لئے اپنے والد کے پاس مرزاپور یا اس زمانے میں ضلع کے جس مقام پر بھی ہوتے تھے۔ جاتے تھے۔ اور اپنے والد کے ہمراہ شکار کھیلتے تھے۔

کرسمس کی تعطیلات میں خان بہادر سید حامد حسین اپنے دوستوں کو ہمراہ لے کر

دس روز کے لئے شکار کے لئے چلے جاتے تھے۔ایک ایسے ہی شکار کے موقع پر جب ان کا محبوب بیٹا ان کے پاس نہیں تھا۔ انھوں نے لکھا تھا۔

"ہم سب الاؤ کے سامنے بیٹھے ہوئے ہیں۔ میں اس منظر سے لطف اندوز ہو رہا ہوں۔لیکن کسی چیز کی کمی شدت سے محسوس ہو رہی ہے اور وہ تمھاری ذات ہے۔میں اپنے چاروں طرف امید بھری نگاہ ڈالتا ہوں کہ شاید میرا چہیتا اور سب سے عزیز بیٹا آ رہا ہو۔ ہر گزرتے ہوئے لمحے میں تمھاری کمی کو شدت سے محسوس کر رہا ہوں۔ گزشتہ سال کا وہ منظر ابھی تک میری نظروں کے سامنے گھوم رہا ہے کہ جب تم جودھ پور کے جنگل میں ہاتھ میں رائفل لئے ہوئے سیاہ بھینسے کا تعاقب کر رہے تھے۔ اس وقت تم نے بغیر جرابوں کے شکاری بوٹ پہن رکھے تھے اور کئی دنوں کا شیو بڑھا ہوا تھا۔ میں پھر ایک بار تمھیں یہی شکار کرتے ہوئے دیکھنا چاہتا ہوں۔"

یادِ ایّام

مرزاپور میں خان بہادر سید حامد حسین کے قیام کے زمانہ میں صوبجات متحدہ کی حکومت نے یہ حکم دیا کہ خان بہادر صاحب، یوپی کی لیجسلو اسمبلی کے اراکین اور بعض دوسرے معززین کو سارودہ کینال ہیڈ ورکس دکھانے لے جائیں۔ ان افراد میں سے بہت سے تو ان کے ذاتی دوست ہی تھے۔ مثلاً راجہ صاحب محمود آباد، نواب چھتاری، سر محمد یوسف، سر سیتا رام، مبشر حسین وغیرہ۔ لکھنؤ میں ان لوگوں نے لنچ کیا۔ اور شام میں پانچ بجے اس عظیم الشان آبی منصوبے پر پہنچے۔ اسی زمانے میں اس بند سے نکلنے والی پانچویں نہر میں کھول دی گئی تھی۔ گو سید حامد حسین نے اس پورے منصوبے کی تعمیر اپنے سامنے کرائی تھی۔

لیکن ان لہروں سے پانی گزرتے ہوئے خود انھوں نے بھی پہلی بار اس موقع پر ہی دیکھا تھا۔ یہ آبشار ۶۸ فٹ کی بلندی سے گر رہی تھی۔ رات کے وقت انتہائی تیز روشنیوں میں اس ہیڈ ورکس کا معائنہ کیا گیا۔ اس وقت برقی روشنیوں کے عکس پانی میں بہت دلکش منظر پیدا کر رہے تھے۔

اس وقت خان بہادر سید حامد حسین کی دلی کیفیت عجیب ہو رہی تھی۔ یہ حقیقت انھیں طمانیت بخش رہی تھی کہ ان کی برسوں کی محنت شاقہ نے ایک عظیم الشان حقیقت کا روپ دھار لیا ہے۔ جو بنی نوع انسان کی بہتری کے لئے ہے۔ اس وقت کی کیفیت کے بارے میں انھوں نے اپنی ذاتی ڈائری میں یہ رقم کیا تھا کہ :۔

"جب سب مہمان ہیڈ ورکس کو دیکھ رہے تھے تو میں ایک جگہ بیٹھ گیا۔ یہ وہی جگہ تھی جہاں میں نے اپنی زندگی کے طویل شب و روز بسر کئے تھے۔ اس خیال کو عملی روپ دینے کے لئے، یہ سوچ کر میری آنکھوں سے آنسوؤں کی جھڑی لگ گئی۔ کہ یہاں میں نے اپنی زندگی کے آٹھ برس گزارے تھے۔ اور یہاں میں وقت سے پہلے بوڑھا ہو گیا تھا۔ اگر میں بن باسا نہ جاتا تو آج نسبتاً جوان ہوتا۔ لیکن اس تاسف کے ساتھ ساتھ ایک فخر کا احساس بھی مجھے ہو رہا تھا۔"

اس پوری بستی کے بارے میں آگے چل کر وہ لکھتے ہیں کہ میرے زمانے کے بنوائے ہوئے بہت سے مکانات گرا دیئے گئے ہیں اور ان کی جگہ نئی تعمیرات بھی کی گئی ہیں۔ تاہم اس مکان کے آگے جہاں میں کبھی رہتا تھا۔ آج بھی گل مہر کے پودے اسی خوبصورتی اور دلکشی کے ساتھ لہلا رہے ہیں جنھیں میں نے وہاں لگایا تھا۔ میں نے گئے دنوں کی یاد اور جوش مسرت میں گل مہر کے ان پودوں کو چوما۔ یہاں ابھی ایسے بہت سے لوگ ہیڈ

درکس پر کام کر رہے ہیں جو میرے زمانے میں میری ماتحتی میں کام کر چکے تھے۔ ان سب سے مل کر گزرے زمانے کی یاد تازہ ہو گئی۔"

خان بہادر سید حامد حسین اپنے ماتحت کام کرنے والوں کا بڑا خیال رکھتے تھے۔ اور اپنے حسن سلوک سے ان کا دل موہ لیتے تھے۔ سارہ ہیڈ درکس کے زمانے میں ان کی ماتحتی میں کام کرنے والا ایک ریٹائرڈ صوبیدار تھا۔ اس کی اچھی عادتوں کی بنا پر سید صاحب اس کو پسند کرتے تھے۔ بعد میں اِن دونوں کے درمیان دوستانہ مراسم قائم ہو گئے تھے۔ یہ صوبیدار پنجاب کے شہر گوجر خاں کا رہنے والا تھا۔ اس کا بیٹا بھی پاکستان کی بری فوج میں ملازم تھا۔ جب اسے کسی طرح معلوم ہوا کہ میجر جنرل (ریٹائرڈ) سید شاہد حامد صاحب خان بہادر سید حامد حسین کے فرزند ہیں، جن کے ساتھ اس کے والد کام کر چکے ہیں۔ اور جن سے اس نے خان بہادر صاحب کے بارے میں بہت سے واقعات اور باتیں سن رکھی تھیں تو وہ سید شاہد حامد صاحب سے ملا۔ اور انھیں اپنے گاؤں آنے کی دعوت دی۔ سید شاہد حامد صاحب کا بیان ہے کہ: "میں اس کے ہمراہ ان کے آبائی گاؤں گیا۔ جہاں اسّی نوے برس کی عمر کے کئی بوڑھوں نے میرے والد کا تذکرہ نہایت اچھے لفظوں میں کیا۔ انھوں نے ہماری بہت خاطر مدارات کیں۔ اور جب تک میں ان کے ہمراہ بیٹھا رہا وہ میرے والد کے بارے میں باتیں کرتے رہے۔"

اولاد سے محبت

خان بہادر سید حامد حسین اولاد سے بے پناہ محبت کرتے تھے۔ پہلی بیوی کی یادگار ایک لڑکا تھا، دوسری بیوی سے سب سے بڑے لڑکے سید شاہد حامد صاحب ہیں۔ سید صاحب کا سلوک اپنے بچوں سے دوستانہ ہوتا تھا۔

بچوں سے لاڈ پیار کرنے کے باوجود ان کی تعلیم کی طرف سے غفلت یا کوتاہی کو برداشت نہیں کر سکتے تھے۔ اس خاندان میں ہمیشہ سے یہ تصور چلا آ رہا تھا کہ پہلے اپنے آپ میں صلاحیت پیدا کرو اس کے بعد تائید ایزدی کے متوقع رہو۔ سید شاہد حامد صاحب کا بیان ہے کہ ہمارے بچپن میں ہمارے دادا جان سید جعفر حسین صاحب بھی تعلیم کے معاملے میں ہر وقت ہمیں سمجھاتے رہتے تھے۔ ان کا کہنا تھا کہ خوب دل لگا کر تعلیم حاصل کرو ورنہ گھسیارے بن کر رہ جاؤ گے۔

خان بہادر سید حامد حسین نے بچوں کی تعلیم کے لئے گھر پر بھی استاد مقرر کر رکھے تھے اپنی سرکاری مصروفیات اور مشاغل کے باوجود برابر بچوں کے اساتذہ سے، ان کی تعلیمی حالت کے بارے میں کرید کرید کر پوچھتے رہتے تھے۔

سید شاہد حامد صاحب کا بیان ہے کہ میں بہت لاڈلا تھا۔ لیکن ایک بار جب میں سات آٹھ برس کا تھا۔ میرے استاد نے جو ریاضی پڑھانے آتے تھے۔ تعلیم میں میری عدم دلچسپی کی شکایت والد سے کر دی۔ میرے والد صاحب کو بہت غصہ آیا اور انھوں نے میرے پاؤں رسّی سے باندھ کر مجھے درخت سے لٹکا دیا۔ میں دو تین منٹ تک اسی طرح لٹکا رہا اور اگر میرے رونے کی آواز سن کر والدہ نہ آجاتیں تو شاید ابھی اور سزا ملتی۔

بچوں اور بچیوں کو کانونٹ اسکولوں میں جدید انگریزی تعلیم دلائی گئی تھی۔ لیکن ان کی مذہبی تعلیم کا بھی خاص خیال رکھا جاتا تھا۔ چنانچہ اسلامیات اور اردو وغیرہ پڑھانے کے لئے الگ اساتذہ مقرر تھے۔ اپنے بچوں، بالخصوص سید شاہد حامد صاحب کو انھوں نے اپنے دوستوں کی طرح پالا تھا۔ تمام مسائل میں ان سے مشورہ کرتے تھے۔ اور ہر موضوع پر بے تکلفانہ گفتگو باپ بیٹے میں ہو سکتی تھی۔ ان کا اصول یہ تھا کہ والد کو بچوں کا معاون بننا چاہیئے اور ان پر

اپنی رائے زبردستی نہیں ٹھونسنا چاہیئے۔ چنانچہ جب سید شاہد حامد صاحب نے اپنی پسندیدہ شریک حیات کو خود منتخب کر لیا تو انھوں نے اپنی اس خواہش کا اظہار اپنے والد سے کیا۔ اس وقت جو محبت بھرا خط انھوں نے جواب میں لکھا ہے۔ اس سے اس کا اندازہ ہوتا ہے کہ بچوں کے معاملات میں وہ کس درجہ فراخ دل تھے اور ان کی رائے کا احترام کرتے تھے۔

"شاہد بیٹے! میں نے طاہرہ کو نہیں دیکھا اور ڈاکٹر بٹ سے بھی بہت کم واقف ہوں۔ تم نے طاہرہ کو دیکھا ہے اور اسے پسند کرتے ہو۔ میرے لئے یہی کافی ہے۔ میرے بیٹے تم اپنے والد کی عادت سے واقف ہو۔ اس نے کبھی اس چیز کو ناپسند نہیں کیا جس کو تم نے پسند کیا ہو۔ کیا تم سمجھتے ہو کہ تمھارا باپ ایک ایسے اہم معاملے میں تمھاری پسند کی مخالفت کرے گا! نہیں بالکل نہیں۔ میری مسرتوں اور خواہشوں کا محور تمھاری ذات ہے۔ میں اپنی جان تک تم پر قربان کرنے کو تیار ہوں۔ تم میری زندگی اور میری عمر بھر کی کمائی ہو۔ اور تمھاری ذات میں مجھے بے پناہ خوشیاں ملتی ہیں۔ میری زندگی کا کل سرمایہ تمھاری ذات ہے۔

شاہد بیٹے! میں نے تمھیں اولاد کی طرح نہیں اپنے دوست کی طرح پرورش کیا ہے۔ تمھاری خوشی میری خوشی ہے۔ کاش میں تمھیں اپنا دل چیر کر دکھا سکتا جس میں تمھاری بے پناہ محبت موجزن ہے۔ میں طاہرہ سے بھی اسی طرح محبت کروں گا جس طرح تم سے کرتا ہوں۔"

زندگی بھر وہ اپنی بہو طاہرہ سے اپنی بیٹی کی طرح محبت کرتے رہے۔

عادات و خصائل

خاں بہادر سید حامد حسین اوصاف حمیدہ کے مالک تھے۔ وہ نہایت ملنسار، منکسر المزاج، اور خندہ پیشانی سے لوگوں سے ملتے تھے۔ ان کے تعلقات اپنے سے کم مرتبہ لوگوں کے ساتھ بھی تھے۔ لیکن ان لوگوں سے وہ اس طرح ملتے تھے کہ انھیں کسی قسم کا احساس نہ ہونے پائے۔ اس طرح بڑے درجے کے لوگوں سے، برابری کے ساتھ ملتے تھے۔

شدید محنت کرنے کی عادت انھیں اپنے والد سے ورثے میں ملی تھی جب کسی کام کی ذمے داری قبول کر لیتے تھے تو پھر جب تک اسے بحسن و خوبی سرانجام نہ دے لیتے، چین سے نہ بیٹھتے تھے۔ چنانچہ بڑھاپے میں بھی ریٹائرمنٹ کے بعد جب نواب بھوپال کے اصرار پر بلول ناخواستہ ریاست بھوپال میں عہدہ قبول کیا تو جوانوں کے سے انداز میں محنت کرتے رہے۔ اور اسی شدید محنت نے ان کی صحت پر خراب اثر ڈالا۔

جو شخص بھی ایک دفعہ ان سے مل لیتا تھا ان کے حسنِ اخلاق کا گرویدہ ہو جاتا تھا۔ غرور و تکبّر ان میں نام کو نہ تھا۔ وہ مشرقی شرافت اور وضعداری کے کامل نمونہ تھے۔

دسترخوان پر تنہا کھانا انھیں پسند نہ تھا۔ وہ اللہ تعالیٰ کی دی ہوئی نعمتوں میں لوگوں کو شریک کرنا پسند کرتے تھے۔ جب ان کے گھر میں کوئی رشتہ دار یا احباب میں سے کوئی شخص یا کافی تعداد میں لوگ آجاتے تھے تو بہت خوش ہوتے تھے۔ مہمانوں کی خاطر مدارات میں کوئی دقیقہ فروگزاشت نہیں کرتے تھے۔ اور یہ چاہتے تھے کہ مہمان زیادہ سے زیادہ دن ٹھہرے رہیں۔

اکثر دعوتوں پر اپنے دوست احباب کو بلاتے رہتے تھے۔ بھول جانے کی عادت بہت تھی۔ انھیں یہ یاد نہ رہتا تھا کہ کتنے لوگوں کو مدعو کیا ہے۔ ان کی بیگم، ان کی اس عادت سے

واقف تھیں لہذا اگر وہ دعوت میں مدعو کئے جانے والے احباب کی تعداد دس بتاتے تو ان کی اہلیہ کم از کم بیس آدمیوں کا کھانا تیار کرتی تھیں۔ کئی دفعہ ایسا ہوتا کہ دوست احباب کو دعوت پر مدعو کر لیتے لیکن گھر میں بتانا بھول جاتے۔ عین وقت پر ان کی اہلیہ کو بڑی پریشانی کا سامنا کرنا پڑتا۔

خان بہادر سید حامد حسین کا جمالیاتی ذوق اعلےٰ درجے کا تھا۔ انھیں تمام حسین اور خوبصورت چیزوں سے محبت تھی۔ اور اپنے اردگرد کوئی بھونڈی اور خراب شے دیکھنا ناپسند کرتے تھے۔

پھولوں کو بہت پسند کرتے تھے اور (HARTICULTURE) پر ان کی رائے مستند سمجھی جاتی تھی۔ اعلےٰ درجے کے خوش پوشاک آدمی تھے نگینوں اور پتھروں سے بھی خاص دلچسپی تھی۔ اپنی بیگم کے لئے انھوں نے زیورات خود منتخب کئے تھے۔ اسی طرح اپنے بچوں کی شادیوں کے موقع پر بھی خاص اپنی پسند کے زیورات بنوائے تھے۔

خان بہادر صاحب کا مطالعہ بہت وسیع اور متنوع تھا۔ اپنے پیشے سے متعلق کتابوں کے علاوہ تاریخ، مذہب، ادب، اور سیاست کے موضوعات پر مختلف کتابیں ہمیشہ ان کے زیر مطالعہ رہتی تھیں۔ صرف اعلےٰ درجے کی اور بڑے مصنفوں کی کتابیں پڑھنا پسند کرتے تھے۔

یہ بات تو ناممکن ہے کہ کسی شخص نے لکھنؤ میں آنکھ کھولی اور پرورش پائی ہو اور وہ شعر و شاعری سے بیگانہ ہو۔ خان بہادر سید حامد حسین کو بھی شاعری کے مطالعے کا بہت شوق تھا۔ لیکن اس سلسلے میں ان کا انتخاب محدود تھا۔ وہ مرزا غالب کے علاوہ اور کسی شاعر کو نہیں پڑھتے تھے۔ غالب کے سینکڑوں شعر ازبر تھے۔ سرکاری دوروں کے وقت اور سیر و شکار

کے وقت گھنے جنگلوں میں بھی دیوان غالب کا ایک خوبصورت نسخہ ہمیشہ ان کے پاس رہتا تھا۔ وہ کہا کرتے تھے کہ اگر آپ غالب کو پڑھ لیں تو پھر آپ کو کسی دوسرے شاعر کو پڑھنے کی ضرورت ہی باقی نہیں رہتی۔۔

وہ نہایت ذہین اور دانا آدمی تھے اور ہر معاملے کی تہہ کو بہت جلد پہنچ جاتے تھے۔ ان کے بیٹے کا بیان ہے کہ میں نے زندگی بھر ان سے کسی کے بارے میں کبھی کوئی ناروا کلمات نہیں سنے۔ ایک بار مجھے یاد ہے کہ ہم لوگ کسی شخص کی برائی کر رہے تھے۔ وہ خاموشی سے سنتے رہے جب بات ختم ہو چکی تو انھوں نے فرمایا تھا کہ تم نے اس شخص کے عیوب تو گنوا دیئے میں اب اس کے محاسن بھی تو بیان کرو!

اپنے مخالفوں کے بارے میں کبھی انھوں نے ایک لفظ تک نہ کہا۔ جب غصہ آجاتا تھا تو وہ خاموش ہو جاتے تھے۔ ان کی اسی خوبی کی بنا پر سب لوگ ان سے محبت کرتے تھے ہمارے خیال میں ان کا کوئی دشمن تھا ہی نہیں۔ وہ کہا کرتے تھے کہ ایک محبت بھرا لفظ لوگوں کے دل جیتنے کو کافی ہوتا ہے۔

سید شاہد حامد صاحب کا بیان ہے کہ ان کے والد کو دوستی نبھانے کا فن خوب آتا تھا۔ اور اپنے دوستوں کے لئے وہ اپنا سکھ چین تک تج دینے کو تیار رہتے تھے۔ کہتے تھے کہ جب کسی کو دوست بناؤ تو زندگی بھر اس کے ساتھ بنا ہو۔ جس زمانے میں خان بہادر صاحب کا تیام بھوپال میں تھا تو وہاں کا ایک ٹھیکیدار ان کا انتہائی گہرا دوست تھا۔ اس کا روپیہ پیسہ سب خان بہادر صاحب کے پاس امانت رہتا تھا۔ اکثر خاں بہادر صاحب اس سے کہتے کہ وہ اس ذمے داری کو قبول کرنے کو تیار نہیں ہیں۔ کبھی گھر میں چوری وغیرہ ہو سکتی ہے۔ لیکن وہ نہیں مانتا تھا۔ وہ خان بہادر صاحب کو اپنے بھائیوں سے زیادہ عزیز

رکھتا تھا۔ جب وہ مرض الموت میں مبتلا ہوا تو اس نے اپنے عزیز و اقارب سے کہا کہ مجھے خان بہادر سید حامد حسین کے گھر پر لے چلو۔ میں چاہتا ہوں کہ میری آخری سانسیں اپنے دوست کے سامنے نکلیں۔ اس کے اعزّہ نے اس کی خواہش کی تکمیل کی۔ اس وقت خان بہادر صاحب کہیں باہر گئے ہوئے تھے۔ ان کے دوست کے لئے فوراً ایک کمرہ مخصوص کر دیا گیا۔ جب خان بہادر صاحب واپس آئے تو وہ اپنے مریض دوست کے کمرے میں آئے اس کے بعد چھ دن تک ان کا دوست موت و حیات کی کشمکش میں مبتلا رہا۔ اس عرصے میں خان بہادر صاحب ایک لمحے کے لئے بھی کمرے سے باہر نہیں گئے۔ اور ان کے دوست نے ان کے بازوؤں میں داعی اجل کو لبیک کہا۔ فی زمانہ ایسی مثالیں نایاب ہیں۔

ایک دلچسپ واقعہ

خان بہادر سید حامد حسین کے ساتھ اگر کوئی شخص تعلّی سے کام لیتا تھا۔ تو وہ مسکرا کر خاموش ہو جاتے تھے یا پھر آہستگی سے کوئی ایسی بات کہہ دیتے جس میں دل آزاری بھی نہ ہوتی لیکن اس شخص کو احساس ہو جاتا کہ خان بہادر صاحب اصل حقیقت خوب سمجھتے ہیں۔ ایک ایسا ہی دلچسپ واقعہ ان کے ساتھ ایک سفر میں پیش آیا۔ خان بہادر صاحب کانپور سے بذریعہ ٹرین لکھنؤ جا رہے تھے۔ ان کے ساتھ کمپارٹمنٹ میں ایک اور شخص بھی سوار تھا۔ دونوں ایک دوسرے کے لئے اجنبی تھے۔ بات چیت شروع ہوئی تو اس شخص نے خاں بہادر صاحب کو بتانا شروع کیا کہ وہ اسٹاف کالج کوئٹہ میں انسٹرکٹر ہے۔ یہ اعزاز بہت کم لوگوں کو ملتا ہے۔ اور وہ ہی واحد ایسا شخص ہے جو اس مرتبے پر فائز ہے وغیرہ وغیرہ، خان بہادر صاحب تمام سفر کے دوران اس شخص کی لن ترانیاں سنتے رہے جب سفر اختتام کو پہنچا تو انھوں نے اس شخص سے کہا کہ میرا بھی ایک بیٹا اسٹاف کالج میں انسٹرکٹر ہے۔ اور انھوں

نے اپنے بیٹے سید شاہد حامد کا نام اسے بتایا۔ یہ سن کر اس شخص پر گھڑوں پانی پڑ گیا اور وہ خان بہادر صاحب سے نگاہیں نہ ملا سکا۔ یہ شخص منشی چودھری تھا جو اس وقت لیفٹیننٹ کرنل کے عہدے پر فائز تھا۔ اور بعد میں بھارت کی افواج کا کمانڈر انچیف بنا۔ جن لوگوں نے ہندوستان کی مسلح افواج کے لیفٹیننٹ جنرل کول کی سوانح حیات ان کہی کہانی (UNTOLD STORY) پڑھی ہے۔ وہ اس بات سے واقف ہوں گے کہ جنرل چودھری کو اپنے بارے میں مبالغہ آمیز باتیں کرنے کی بہت عادت تھی۔

علالت

ساری زندگی خان بہادر سید حامد حسین کی صحت قابلِ رشک رہی تھی لیکن بڑھاپے میں ریاست بھوپال کے پانچ برس کے قیام کے دوران شدید محنت نے ان کے اعصاب پر بڑا برا اثر ڈالا تھا۔ یہیں سے ان کی بیماری شروع ہوئی۔ ریاست بھوپال میں ہی ان کی علالت کی خبر سن کر قائدِ اعظم محمد علی جناح ان کی عیادت کے لئے خان بہادر صاحب کی کوٹھی پر تشریف لے گئے تھے اور کچھ دیر ان کے ساتھ رہے تھے۔ جب صحت زیادہ خراب ہو گئی تو خان بہادر صاحب اپنے وطن لکھنؤ واپس آ گئے۔

لکھنؤ آ کر انھیں دل کی شکایت ہو گئی تھی۔ اور آخر اسی بیماری میں ان کا انتقال ہوا لکھنؤ میں ان کی عیادت کے لئے بڑے بڑے لوگ آئے تھے جن سے ان کی ذاتی دوستی تھی۔

ڈاکٹروں نے نہایت توجہ سے ان کا علاج کیا۔ یہ ڈاکٹر جن کا شمار اس زمانے کے مشہور ڈاکٹروں میں ہوتا تھا، ان کے دوست ہی تھے۔ ڈاکٹر ہکو، ڈاکٹر کرنل برکی، میجر نگم ڈاکٹر ریاض، ڈاکٹر حمید اور ان کے انتہائی قریبی دوست ڈاکٹر حکم نے ان کا علاج کیا۔ لیکن کوئی افاقہ نہ ہوا۔ آخر اسی بیماری کے ہاتھوں انھوں نے ۱۹۴۵ء داعی اجل کو لبیک کہا۔

اپنے زمانہ علالت میں وہ اکثر فرمایا کرتے تھے کہ میں اپنے خدا کا شکر ادا نہیں کر سکتا

جس نے مجھے بے شمار نعمتوں سے نوازا۔ اور مجھے اتنی محبت کرنے والی اولاد عطا کی۔ وہ ایک شاد کام و بامراد زندگی گزار کر ایسے عالم میں دنیا سے سدھارے کہ ان کے تمام بیٹے بیٹیاں دنیاوی اعتبار سے مرفہ الحال تھے۔

مدفن

خان بہادر سید حامد حسین نے اپنی زندگی میں ہی یہ طے کیا تھا کہ وہ اپنے والد کے پہلو میں دفن ہوں گے۔ چنانچہ اپنے آبائی قبرستان میں والد کے پہلو میں آسودۂ خاک ہوئے۔ یہاں دونوں کی قبروں پر نصب لوح مزار پر ان کے نام اور مختصر الفاظ میں ان کی وہ خدمات تحریر ہیں جو انھوں نے زندگی میں سرانجام دیں تھیں۔ ان قبروں کے اردگرد لہلاتے ہوئے پھول اور سبزہ اس بات کی گواہی دیتے رہیں گے کہ ان کے کارنامے زندہ ہیں۔

تعزیتی پیغامات

خان بہادر سید حامد حسین کے انتقال پر جن ممتاز شخصیات نے تعزیتی خطوط لکھے تھے؛ ان میں محترمہ فاطمہ جناح، نواب زادہ لیاقت علی خان، خواجہ ناظم الدین، نواب سر محمد اسماعیل خان، ڈاکٹر سر ضیاء الدین، پروفیسر محمد حبیب، کرنل حیدر خاں۔ سر محمد یوسف، میجر سعید محمد خاں، محسن علی کانپور کے ایس ایم بشیر، ایم اے اصفہانی، سر مہاراج سنگھ، میاں عبدالعزیز، سر پی پرشاد، رفیع احمد قدوائی، سر حسام الدین، مہاراجہ جہانگیر آباد، کرنل سلامت، سردار بہادر موہن سنگھ، نواب بھاول پور، نواب و بیگم بھوپال، سر ایڈورڈ اور ریاست بھوپال کے دیوان کے نام قابل ذکر ہیں۔

علی گڑھ اولڈ بوائز ایسوسی ایشن نے ان کے انتقال پر ایک جلسہ کیا اور قرارداد تعزیت منظور کی۔

محترمہ فاطمہ جناح نے اپنے تعزیتی پیغام میں جو ۲۷ مئی ۱۹۴۵ء کو لکھا گیا کہا :۔

DEAR PIARIE

I WAS EXTEREMELY SORRY TO LEARN THE NEWS OF YOUR FATHER'S DEATH. IT WAS ONLY YESTER DAY THAT I READ THE NEWS IN THE DAWN.

MR. JINNAH JOINS ME IN SENDING YOU OUR DEEPEST SYMPATHY IN YOUR SAD BEREVEMENT.

YOURS SINCERELY

SD/-

FATIMA JINNAH.

نواب زادہ لیاقت علی خان نے اپنے خط میں ان جذبات کا اظہار کیا :-

GAUL-I-RAANA

HARDING AVENUE

NEW DELHI

5.6.45.

MY DEAR SHAHID,

I WAS TERRIBLY SHOCKED TO LEARN THE TRAGIC NEWS OF THE SUDDEN DEATH OF YOUR FATHER ON MY RETURN FROM A TOUR OF ASSAM AND BENGAL.

MY WIFE AND I SEND YOU ALL OUR DEEPEST SYMPNTHY AND CONDO-LENCES. MAY THE DEPARTED SOUL REST IN PEACE AND MAY GOD GIVE YOU ALL ENOUGH COURAGE TO BEAR THIS TERRIBLE LOSS !

YOURS SINCERELY

SD/-

(LIAQUET ALI KHAN)

نواب سر محمد اسماعیل خان نے اپنے تعزیتی خط میں لکھا :

مصطفےٰ کاسل میرٹھ

۲۴ مئی ۴۵ء

مکرمی تسلیم

کل کے " DAWN " میں یہ خبر انتہائی رنج و قلق سے پڑھی کہ خان بہادر صاحب نے اس دار فانی سے کوچ کیا۔ اس حادثہ نے جو کچھ آپ پہ اثر کیا ہو وہ بالکل بجا ہے ۔ ان کے ہر دوست اور ملنے والے کے لیے بھی یہ خبر باعث اذیت ہے ۔ مرحوم بڑی خوبیوں کے مالک تھے۔ میری دلی دعا ہے کہ خدا ان کو جنت الفردوس میں بلند مرتبہ عطا فرمائے اور آپ کے اور مرحوم کے سب بچوں کے دلوں کو صبر و سکون ۔

مشیت ایزدی کے آگے انسان مجبور و لاچار ہے ۔ میں اور میرے خاندان کے سب لوگ دل سے آپ کے غم میں شریک ہیں ۔

اخیر میں پھر خدا سے دعا ہے کہ وہ آپ سب کے دلوں کو صبر عطا فرمائے آمین !

فقط والسلام

دستخط /-

محمد اسماعیل خاں

ڈاکٹر سر ضیاء الدین احمد نے اپنے جذبات کا اظہار کرتے ہوئے لکھا :

VICE CHANCELLOR

MUSLIM UNIVERSITY ALIGARH

DATED. 5.6.45.

MY DEAR COLONEL SHAHID HAMID,

I RECEIVED WITH GREAT SORROW THE SAD NEWS OF THE DEMISE OF YOUR REVERED FATHER. IT IS A GREAT LOSS TO THE FAMILY. MAY GOD GIVE YOU THE STRENGTH TO BEAR THIS LOSS AND MAY HE GRANT HIS SOUL PEACE IN HEAVEN.

YOURS SINCERELY

SD/-

LT. COLONEL ZIA UD DIN AHMAD

S. SHAHID HAMID

FEROZ KOTHI

LUCKNOW.

سیّد رفیق حسین

اُردو کا ایک منفرد افسانہ نگار

سید رفیق حسین اردو کے ایک منفرد افسانہ نگار ہیں۔ ان کی شہرت محدود ہے لیکن ایک بار جو بھی ان کی تحریروں سے متعارف ہو جائے وہ ان کا مدّاح بن جاتا ہے۔

حالاتِ زندگی | سید رفیق حسین، خان بہادر سید جعفر حسین کے چھوٹے بیٹے تھے۔ باپ سے محبت کی وجہ سے اپنے نام کے ساتھ جعفری بھی لکھتے تھے۔ سید جعفر حسین، جن کا تذکرہ گزشتہ صفحات میں تفصیل سے آچکا ہے، یوپی کے محکمہ انہار میں انجینئر تھے۔ ان کے بڑے بیٹے خان بہادر سید محمد حسین بھی محکمہ انہار سے ایگزیکٹو انجینئر تھے۔ سید رفیق حسین بھی پیشہ کے اعتبار سے انجینئر ہی تھے۔ انجینئرنگ کی بنیادی تعلیم انہوں نے اپنے والد محترم سے پائی تھی

سید رفیق حسین کی زندگی تضادات کا مجموعہ تھی۔ ان کے والد نے ان کی والدہ کے انتقال کے بعد دوسری شادی کر لی تھی۔ ہمارے معاشرے میں سوتیلی مائیں، ایسے بچوں سے جو سلوک کرتی ہیں اس سے سب بخوبی واقف ہیں۔ سید رفیق حسین کی زندگی میں اس محرومی نے ایک بڑا خلا پیدا کر دیا تھا۔ اگرچہ وہ باپ کے لاڈلے تھے۔ اور ان کے والد اپنے پانچوں بہن بھائیوں سے بہت محبت کرتے تھے۔ لیکن پھر بھی سوتیلی ماں کی موجودگی نے ان کی شخصیت کو متاثر کیا۔

ان کے خاندان کے بعض لوگوں نے جو مضامین لکھے ہیں[1]۔ ان کے مطابق بچپن میں وہ بہت شریر تھے۔ اور اپنی نت نئی شرارتوں سے گھر والوں کو پریشان رکھتے تھے۔ ایک بار انہوں نے بوتل میں ڈائنامیٹ بھر کر پاس کی پہاڑیوں میں جا کر دھماکہ کر دیا تھا۔ یہ ڈائنامیٹ انہوں نے اپنے والد کے دفتر سے حاصل کیا تھا۔

ان کی زندگی کا ایک اور دلچسپ واقعہ یہ ہے کہ ان کی جوتیاں ٹوٹ گئی تھیں۔ اور بار بار کہنے کے باوجود سوتیلی والدہ منگوا کر نہیں دے رہی تھیں۔ سید رفیق حسین نے ایک رات تمام گھر والوں کی جوتیاں اُٹھا کر قریب بہنے والی نہر میں جا کر ڈال دیں۔ اور صبح کو اپنی اس حرکت کا اقرار کر لیا۔ اس کے نتیجے میں تمام گھر والوں کے ساتھ ان کے بھی جوتے آ گئے۔

سوتیلی والدہ کے اس سلوک کی ان کے والد کو خبر نہیں ہوتی تھی۔ سید رفیق حسین کی بہن کی روایت ہے کہ ان کے بڑے بھائی سید حامد حسین صاحب نے اپنے بھائیوں بہنوں سے کہہ رکھا تھا کہ تم بہن بھائیوں کو جو شکایت ہو مجھ سے کہا کرو ابا کے سامنے نہ کہنا کیوں کہ انہیں اپنی اولاد سے اتنی محبت ہے کہ وہ سوتیلی اماں کو چھوڑ دیں گے۔ اور یوں خاندان کی بہت بدنامی ہو گی۔

سید رفیق حسین ایک آسودہ حال گھرانے میں پل کر بڑے ہوئے۔ اس گھرانے

---

[1] مطبوعہ نیا دور شمارہ ۴۵ ۔ الطاف فاطمہ، فضل قدیر اور مختار اکبر کے مضامین۔ نیز میجر جنرل (ریٹائرڈ) سید شاہد حامد صاحب کے بیان کردہ واقعات، حالات زندگی کے سلسلے میں ماخذ ہیں۔

میں ان کے لیے سب کچھ تھا۔ لیکن سوتیلی ماں کی زیادتیوں نے ان کو بہت زیادہ بے چین کر رکھا تھا۔ پھر وہ بلا کے حسّاس تھے۔ چناں چہ ایک بار انہیں اپنی سوتیلی والدہ کی کوئی بات ناگوار گزری اور انہوں نے اسی رات گھر چھوڑ دیا۔ عرصہ دراز تک کسی کو ان کے بارے میں معلوم نہ ہو سکا۔ آخر کافی عرصہ گزر جانے کے بعد معلوم ہوا کہ سید رفیق حسین بمبئی میں ہیں۔ اور انجینئرنگ کی تعلیم حاصل کر رہے ہیں۔

سید رفیق حسین نے بمبئی میں اپنے ابتدائی زمانے میں بہت تکالیف اُٹھائیں۔ فٹ پاتھوں پہ سوتے اور ایک سائیکل والے کی دکان پہ کام کر کے اخراجات کی سبیل کرتے تھے۔ اور بمبئی کے وکٹوریہ میکنیکل انجینئرنگ کالج میں پڑھتے تھے۔ یہیں سے انہوں نے میکانیکل انجینئرنگ میں ڈپلومہ لیا۔ یہ بیسویں صدی کے اوائل کا واقعہ ہے۔ اس زمانے میں مسلمانوں میں ابھی تعلیم اتنی عام نہیں ہوئی تھی۔ اور بالخصوص فنّی اور تکنیکی علوم کی طرف تو لوگ بہت کم متوجہ ہوتے تھے۔ کالج سے فارغ التحصیل ہونے کے بعد ایک بحری جہاز پہ انجینئر کی حیثیت سے ملازم ہو گئے۔ اسی جہاز کی ملازمت کے دوران وہ ہندوستان سے باہر گئے اور کئی ممالک کی سیر بھی کی۔ اتفاق سے جب یہ جہاز جدہ پہنچا ہے تو حج کا زمانہ تھا۔ چناں چہ سید رفیق حسین نے حج بھی کر لیا۔

سید رفیق حسین لاابالی قسم کے انسان تھے۔ وہ جلد جلد ملازمتیں ترک دینے کے عادی تھے۔ بادی النظر میں اس کو ان کی غیر ذمہ دارانہ روش کہا جا سکتا ہے مگر دراصل ایسا نہیں تھا۔ انہیں اپنی حد درجہ ایمان داری کی وجہ سے ملازمت ترک کرنا پڑتی تھی۔ جس محکمے میں وہ ملازمت کرتے تھے۔ اس میں قدم قدم پہ ناجائز آمدنی کی ترغیبات موجود ہوتی تھیں لہٰذا وہ بے ایمانی پہ آمادہ کرنے والے کا تو کچھ بگاڑ نہیں سکتے تھے۔ خود

ہی ملازمت سے مستعفی ہو جاتے تھے ۔

سید رفیق حسین اپنے بڑے بھائی خان بہادر سید حامد حسین سے بہت ڈرتے تھے ۔ اور ان کے سامنے بالکل بات نہیں کرتے تھے ۔ دونوں بھائیوں میں بہت محبت تھی ۔ لیکن خان بہادر صاحب اکثر انہیں جلد جلد نوکریاں چھوڑ دینے کی وجہ سے ڈانٹ دیا کرتے تھے ۔ سید رفیق حسین کو بڑے بھائی سے جو بات بھی کہنا ہوتی تو وہ سید شاہد حامد صاحب کے ذریعے ہی کہلوایا کرتے تھے ۔

گھر بار سے بے نیاز آدمی تھے ۔ اور گھر کے معاملات میں بالکل دخل نہیں دیا کرتے تھے ۔ سید شاہد حامد صاحب کا بیان ہے کہ کچھ مدت تک ایک جگہ ملازمت کرنے کے بعد جب نوکری چھوڑ کر آتے تو سارا اندوختہ بیوی کے ہاتھ پہ رکھ کر کہتے کہ لو اتنے دن کا خرچ ہے اب اس سے پہلے مجھے تنگ مت کرنا ۔ اس کے بعد اپنے ذاتی دلچسپی کے کاموں میں مصروف ہو جاتے ۔ گھر کے ایک کمرے میں بند ہو جاتے تھے ۔ کئی کئی دن سوئے رہتے ، یا کئی کئی دن جاگتے رہتے ، اور کوئی نہ کوئی دلچسپ کام کیے جاتے ۔ جب پیسے ختم ہو جاتے تو بیوی یاد دلا دیتی ۔ اس کے بعد پھر رزق کی تلاش شروع کرتے ۔ خوش قسمتی سے لیلائے ملازمت ان پہ ہمیشہ مہربان رہتی تھی ۔ چناں چہ جلد ہی پھر کسی جگہ برسرِ کار ہو جاتے ۔ تھوڑے عرصے کے بعد پھر گھر آ کر بیٹھ جاتے ۔

غصہ ان کی ناک پہ دھرا رہتا تھا ۔ ایک بار ایک انگریز انجینئر کے تھپڑ مار دیا تھا ۔

شادی | سید رفیق حسین کی شادی کا واقعہ بھی نہایت دلچسپ ہے۔ اس سے یہ بھی اندازہ ہوتا ہے کہ وہ اپنے والد کا کس درجہ احترام کرتے تھے۔ یہ ابھی بمبئی میں ہی زیر تعلیم تھے کہ خان بہادر سید جعفر حسین اپنی بڑی بیٹی کی شادی میں مدعو کرنے کے لیے اپنے بھتیجوں کے پاس بنارس گئے۔ اپنے بھتیجے صادق حسین سے دوسرے مرحوم بھتیجے کی بچی کے بارے میں دریافت کیا کہ شادی ابھی تک کیوں نہیں کی۔ انہوں نے جواب دیا کہ ابھی تک کوئی اچھا رشتہ ہی نہیں ملا۔ سید جعفر حسین یہ سُن کر چپ ہو گئے۔ اسی وقت بیٹے کو تار دے کر بمبئی سے بلوایا اور مرحوم بھتیجے کی بیٹی سے نکاح پڑھوا دیا۔

ایک بار سید رفیق حسین کے ایک دوست نے انہیں کوئی کھانے کی چیز تحفے میں بھیجی۔ انہیں یہ چیز پسند نہیں آئی لیکن کھاتے بھی رہے۔ اور دوست کو بُرا بھلا کہتے رہے۔ جب ان کی بہو نے ان سے کہا کہ اگر یہ چیز پسند نہیں آرہی ہے تو کیوں کھا رہے ہو۔ اس پر انہوں نے جواب دیا۔ کہ "اس نے مجھے جو دیا ہے کیسے نہ کھاؤں۔ جب وہ اتنا بدمذاق ہے تو میں بھی انتقاماً کھا رہا ہوں"۔

شکار | بچپن میں وہ اپنے والد کے ہمراہ ریاست گوالیار اور ریاست بھوپال میں بھی رہے تھے۔ جو شکار کے اعتبار سے پورے برصغیر میں مشہور علاقے تھے۔ جوانی میں جب انہیں بن باسا کے جنگلوں میں رہنے کا بہ سلسلۂ ملازمت اتفاق ہوا، تو سیر و شکار کی دیرینہ عادت عود کر آئی۔

سید رفیق حسین پر اپنے مضمون میں مختار اکبر نے لکھا ہے کہ وہ بہ سبب تنگدستی کے مچان باندھ کر شکار نہیں کھیلتے تھے۔ درحقیقت ایسا نہیں تھا۔ ان کے بڑے بھائی کے

بیٹے میجر جنرل ریٹائرڈ سید شاہد حامد صاحب کا بیان ہے کہ اصل میں وہ بہت زیادہ نڈر اور بے خوف آدمی تھے اور انہیں اپنے نشانے پر مکمل اعتماد تھا۔ نیز ایک اعلیٰ درجے کے شکاری میں جو خود اعتمادی موجود ہونا چاہیے وہ ان میں موجود تھی۔ لہٰذا کبھی بھی انہوں نے مچان پر بیٹھ کر یا ہاتھی کی پیٹھ پر بیٹھ کر شکار کرنا پسند نہ کیا۔ وہ ہمیشہ زمین پر آمنے سامنے کھڑے ہو کر شیر کا شکار کر لیتے تھے۔ اور بعض اوقات تو یہ فاصلہ بہت ہی کم ہوتا تھا۔

سید شاہد حامد صاحب کا بیان ہے کہ ان کی اپنے چچا سے بہت دوستی اور قربت تھی دونوں میں دوستوں کی سی بے تکلفی تھی۔ اگرچہ عمروں میں کافی تفاوت تھا۔ شکار یاترا میں یہ دونوں ایک ہی خیمہ میں رہتے تھے۔ اور اکٹھے ہی شکار کیا کرتے تھے۔

ملازمت سید رفیق حسین نے سب سے پہلی ملازمت بمبئی میں ایک بحری جہاز پر کی تھی۔ اس کے بعد کچھ عرصہ کے لیے ریلوے میں بھی رہے۔ بعد ازاں ان کا تقرر سب ڈویژنل انجینئر کی حیثیت سے بن باسا ڈویژن میں ہو گیا۔ جہاں اس زمانے میں نہر سارداہ کی تعمیر جاری تھی۔ بن باسا کا یہ علاقہ نیپال کی سرحد کے قریب پیلی بھیت سے چالیس میل کے فاصلے پر واقع ہے۔ یہاں سید رفیق حسین بحیثیت ایگزیکٹو انجینئر کے کام کرتے تھے۔ اور ان ہی کی نگرانی میں اس علاقے میں نہر کی لائنیں بچھانے کا کام سرانجام پایا۔

۱۹۲۶-۲۷ء میں جب نہر سارداہ کی تعمیر مکمل ہو چکی تھی تو انہوں نے اپنے سرمائے سے شکر سازی کا ایک کارخانہ قائم کیا۔ شکر سازی کے کارخانے کی تنصیب وغیرہ کے کام میں بہت مہارت رکھتے تھے۔ اور اس سلسلے میں برصغیر کے دور دراز کے علاقوں کے لوگ بھی اپنی فیکٹریاں لگانے کے لیے ان کی خدمات حاصل کرتے تھے۔ شکر سازی کے اس ذاتی کارخانے کی تعمیر میں انہوں نے اپنا سارا اندوختہ خرچ کر دیا۔ حتیٰ کہ بیوی اور بچی کا تمام

زیور بھی اس فیکٹری کی نہ رہ گیا جب اس قدر مصارف کے بعد بھی رقم کی ضرورت پڑی تو فیکٹری کو رہن رکھ کر ایک بنیے سے قرض لیا لیکن یہ رقم بھی تھوڑی پڑ گئی۔ اس کے بعد یکایک ان کا دل اس سے اچاٹ ہو گیا اور سب کچھ یوں ہی چھوڑ کر چلے گئے۔ بنیے نے اپنی رقم کی وصول یابی کے لیے نالش کر دی۔ اس زمانے میں اوہ کے ایک قرابت دار اس علاقے کے ذمے دار افسر تھے۔ انہوں نے سید رفیق حسین کو بہت سمجھایا اور امید دلائی کہ فیکٹری کے نیلام کے بعد بنیے کے قرض کی ادائیگی کے بعد بھی چار پانچ ہزار روپے کی رقم ان کے لیے بچ جائے گی لیکن سید رفیق حسین نے پھر ادھر کا رُخ نہ کیا۔

اس کے بعد بہار شوگر فیکٹری میں بحیثیت ورک شاپ سپرنٹنڈنٹ ان کا تقرر ہو گیا۔ یہاں کچھ عرصے تک مالکان سے خوب نبھی۔ اور وہ ان کی ایمان داری کی وجہ سے ان کا بہت زیادہ احترام کرتے تھے لیکن کسی بات پہ ناراض ہو کر ملازمت ترک کر دی۔

بجنور میں ایک بڑی مشہور شوگر فیکٹری تھی۔ اس کو مارواڑی سیٹھ نے خرید کر ریاست اودے پور کے مقام کریرا میں منتقل کرنا چاہا۔ چناں چہ اس نے سید رفیق حسین کی خدمات حاصل کیں۔ انہوں نے ہی یہ تمام فیکٹری بجنور سے منتقل کر کے نئے مقام پہ نصب کی اور نہایت سلیقے سے اس کام کو سرانجام دیا۔

ایک واقعہ سید شاہد حامد صاحب کا کہنا ہے کہ یہ واقعہ انہیں سید رفیق حسین نے سنایا تھا۔ "بن باسہ کے قیام کے دوران ایک بار جب وہ سائٹ پر کام کر رہے تھے تو ان کے نوکر نے جو باورچی کا کام بھی کرتا تھا آ کر بتایا کہ کئی دن سے چوں کہ دال سبزی وغیرہ پہ گزارا ہو رہا ہے لہٰذا اگر کوئی شکار کر لیا جائے تو گوشت پک جائے گا۔ سید رفیق حسین نے اپنے ساتھ کام کرنے والے چار پانچ ماتحتوں کو جنگل میں ہانکا لگانے کے لیے بھیج دیا۔

اور خود بھی چار پانچ پچاس قدم جنگل کے اندر جا کر بندوق ہاتھ میں پکڑے ہوئے مٹی کے ایک تودے کے ساتھ ٹیک لگا کر کھڑے ہو گئے۔ خیال تھا کہ جب ہانکا لگایا جائے گا تو جنگلی مرغیاں ادھر سے گزریں گی ان کو شکار کر لیا جائے گا۔ سید رفیق حسین اس وقت بندوق ہاتھ میں لیے اور ایک ٹانگ کو دوسری ٹانگ پر رکھے ہوئے مٹی کے اس تودے سے ٹیک لگائے کھڑے ہوئے تھے۔ اور اپنے پاؤں کو ہلا رہے تھے۔ یکایک انہیں اپنے دائیں طرف گال پر گرم گرم ہوا محسوس ہوئی۔ وہ بہت حیران ہوئے کہ یہ سانس کی سی گرم ہوا کس کی ہو سکتی ہے۔ سید رفیق حسین کہتے تھے کہ جب میں نے سر گھما کر دیکھا تو میرے چہرے کے بالکل اوپر دو تین فٹ کے فاصلے سے شیر ببر اس صورت سے کھڑا ہوا تھا کہ اس کا دایاں پنجہ ہوا میں معلق تھا۔ چند منٹوں تک ایک عجیب سی کیفیت رہی۔ شیر اور میں ایک دوسرے کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالے تھوڑی دیر تک ایک دوسرے کو گھورتے رہے۔ اس کے بعد شیر نے اپنا پنجہ نیچے کیا اور واپس چلا گیا۔ اس جنگل میں آدم خور شیر تھے۔ غالباً مٹی کے تودے کے پیچھے سے پیر ہلاتے دیکھ کر شیر اس طرف چلا آیا۔ سید رفیق حسین کہتے تھے کہ ان کو اس وقت ایسی دہشت ہوئی کہ وہ شکار وغیرہ سب کچھ بھول گئے اسی وقت انھوں نے اپنا بوریا بستر اٹھایا اور لکھنؤ آ گئے۔ وہ کہتے تھے کہ اس کے بعد چھ ماہ تک مجھے جنگل میں جانے کی ہمت نہیں ہوئی"

سیّد رفیق حسین کی افسانہ نگاری

سید رفیق حسین نے اپنے انتقال سے چھ سات برس قبل افسانے لکھنا شروع کیے تھے بہ قول شاہد حامد صاحب کے بیان کے مطابق ان کی ملاقات اتفاق سے شاہد احمد دہلوی سے ہو گئی تھی۔ شاہد احمد دہلوی سے دو چار ملاقاتوں میں سید رفیق حسین نے شکار کے بعض واقعات ان

کو سنائے اور کچھ جانوروں کی نفسیات وغیرہ بھی زیر بحث آئی ۔۔ شاہد احمد دہلوی نے انہیں مشورہ دیا کہ ان تجربات کو اگر وہ افسانے کی صورت میں لکھ دیں تو یہ اردو ادب میں ایک نئی چیز ہوگی ۔ اور وہ انہیں اپنے رسالے 'ساقی' میں شائع کر دیں گے ۔

سید رفیق حسین نے اس پر یہ عذر پیش کیا کہ وہ اردو نثر لکھنے پر قادر نہیں ہیں ۔ اور اردو انہیں واجبی سی آتی ہے ۔ شاہد احمد صاحب نے ان سے کہا کہ وہ اس کی پرواہ نہ کریں نثر وہ خود ٹھیک کر لیں گے ۔ چناں چہ ابتدائی افسانے اور اپنے طنزیہ اور سماجی افسانے انہوں نے لکھ کر شاہد احمد دہلوی کو بھیجے ۔ ان کے خاندان کے لوگوں کا بیان ہے کہ سید رفیق حسین افسانہ آدھا اردو انگریزی الفاظ میں ملا جلا کر پہلے لکھ لیتے تھے ۔ بعد میں اپنی بیٹی قمر النسا کے مشورے سے اس کی زبان تبدیل کرتے ۔ اور انگریزی الفاظ کی جگہ اردو الفاظ لاتے ۔

جدید اردو ادب کی بہت سی قدآور شخصیات کو متعارف کرانے والے شاہد احمد دہلوی ہی تھے ۔

اردو افسانہ نگاری کے موضوعات کچھ بہت زیادہ متنوع نہیں رہے ہیں ۔ اور ماضی میں اگر موضوعات نسبتاً متنوع تھے بھی تو افسانہ نگاری کے جدید دور میں تو موضوعات کا تنوع گھٹ گھٹا کر صرف شہروں کی زندگی کے بیان تک محدود ہو کر رہ گیا ہے ۔

اردو کی ابتدائی افسانہ نگاری کے موضوعات کسانوں کی زندگی، ان کے طبقاتی کردار اور ان کی زندگیوں کی محرومی تک محدود ہیں ۔ البتہ ان میں طبقاتی تضاد اور کش مکش کو ظاہر کیا گیا ہے ۔

چناں چہ ایسے افسانہ نگاروں کی اکثریت اردو کے ابتدائی دور کے افسانوی عہد میں ہی نظر آتی ہے ۔ سدرشن ، اعظم کریوی ، پریم چند وغیرہ کے افسانوں کے موضوعات زیادہ تر

دیہاتی زندگی سے متعلق ہیں ۔ ان افسانہ نگاروں کے ہاں شہری زندگی کے کردار ملتے تو ہیں ۔ لیکن ان کی تمام تر توجہ کا مرکز دیہات اور دیہاتی لوگ ہیں ۔ اس کے ساتھ ساتھ اُردو میں رومانی افسانہ نگاروں کی ایک اور کھیپ بھی نظر آتی ہے لیکن رومانی افسانہ نگاری کا یہ دور نہایت مختصر ہے ۔

ترقی پسند تحریک کے زیر اثر معاشرے میں موجود طبقاتی امتیاز کو نمایاں کرنے اور پس ماندہ طبقوں میں سماجی شعور پیدا کرنے کی کوشش کی گئی چناں چہ اس دور کے افسانوں میں یا تو محنت و سرمایہ کی کش مکش دکھانا مقصود رہی ہے یا پھر محبت کو بھی معاشرے کے معاشی تقاضوں اور دباؤ کے حوالے سے پیش کیا جاتا رہا ہے ۔ اس دور کے افسانوں کا موضوع بھی وہی ہے ۔

چنانچہ اگر اردو کے افسانوی ادب کی اب تک کی تاریخ سامنے رکھی جائے تو سرمایہ و محنت اور طبقاتی کردار، محبت اور دیہات کی زندگی کے موضوعات نمایاں نظر آتے ہیں ۔ فی زمانہ افسانے سے دیہات کا موضوع بھی خارج ہو چکا ہے ۔

پریم چند کے بعد ہمارے افسانہ نگاروں کی اس نسل نے جس نے ۱۹۳۶ء کے بعد ترقی پسند تحریک کے زیر اثر لکھنا شروع کیا تھا، دیہات کے مسائل کو بھی اپنا موضوع بنایا ۔ ان تمام افسانہ نگاروں کے افسانوں کا معتدبہ حصہ دیہات اور دیہاتوں میں بسنے والے کسانوں اور ان کے مسائل کے بارے میں ہے ۔ اس کا سبب یہ بھی ہے کہ ان میں سے بیشتر افسانہ نگاروں کا تعلق دیہاتوں سے تھا ۔ وہ دیہاتوں کی زندگی کے بارے میں بہت زیادہ جانتے تھے ۔ ان کے بعد کے افسانہ نگاروں کا تجربہ شہری زندگی تک محدود ہو گیا ۔ چناں چہ بیس پچیس برسوں میں لکھے جانے والے افسانوں میں ہم دیہاتی زندگی اور دیہاتوں میں رونما ہونے والی تبدیلیوں

کا تذکرہ اردو افسانے میں بہت کم پاتے ہیں ۔ اس عرصے میں ہمارے افسانے کے موضوعات متوسط طبقے کے لوگوں کی محبتوں اور ان کے دوسرے مسائل رہے ہیں. چناں چہ اب افسانوں میں شہروں میں رہنے والے درمیانہ اور نچلے طبقے اور مزدور طبقے کے بارے میں زیادہ لکھا جارہا ہے ۔کیوں کہ ہمارے افسانے نگار کا مشاہدہ اور تجربہ اب شہری زندگی تک محدود ہوگیا ہے.

جنگلی جانوروں کے بارے میں لکھے ہوئے سید رفیق حسین کے افسانے ،اردو افسانے کی ایک نئی جہت کہے جاسکتے ہیں ۔سید رفیق حسین نے جانوروں کی نفسیات کو نہایت خوبی سے بیان کیا ہے ۔ سید رفیق حسین بہت اچھے شکاری تھے ۔ اور کئی کئی مہینے سیر و شکار میں گزارتے تھے. اس دوران انہیں جانوروں کی اور بالخصوص ایسے جانوروں کی نفسیات کو جاننے کا موقعہ ملا کہ جنہیں ہم مہذب دُنیا والے وحشی اور خونخوار درندے کہتے ہیں .

اردو میں اس موضوع پہ نہ تو سید رفیق حسین سے قبل کسی نے قلم اٹھایا اور نہ ان کی موت کے بعد ،جسے آج چالیس سال ہونے آئے ہیں ،کسی نے اس موضوع پہ خامہ فرسائی کی ہے اس کی وجہ وہی مشاہدے اور تجربات کا محدود ہونا ہے ۔

جس طرح ادب کو سنجیدہ اور تفریحی دو اقسام میں تقسیم کیا جاتا ہے. اسی طرح شکار کی کہانیوں کو بھی دو اقسام میں تقسیم کیا جاسکتا ہے ۔ ایک سنجیدہ کہانیاں اور دوسرے تفریحی ،لیکن اس قسم کے امتیاز کا سوال بھی اس وقت اُٹھتا ہے کہ جب سید رفیق حسین کو شکار کی کہانیوں کا مصنف قرار دیا جائے. جب کہ حقیقت یہ ہے کہ سید رفیق حسین نے ان درندوں کی رحم دلی ، انسانیت اور محبت کو اجاگر کرنے کی کوشش کی ہے. جس کو مہذب دُنیا کے انسان وحشی کہتے ہیں. اور جن میں نہاں رحمدلی و محبت

کے جذبات کو ڈھونڈنے کی ضرورت انسان نے محسوس نہیں کی ۔

کہا جاتا ہے کہ دوسری زبانوں کے ادبیات میں بھی اس نوع کی کہانیاں نہیں ملتیں، لیکن اس دعوے کا ثبوت پیش نہیں کیا جا سکتا۔ البتہ یہ حقیقت ہے کہ اُردو میں اس موضوع کی ابتدا کرنے والے سید رفیق حسین ہیں۔ اور وہی اس کے خاتم بھی ہیں ۔

سید رفیق حسین کے ہاں ہمیں دو قسم کی تحریریں ملتی ہیں۔ ایک تو خالصتاً ان کے وہ افسانے ہیں جن کا مرکزی موضوع اور کردار جانور ہیں۔ اس کے علاوہ ان کے بعض افسانوں کا موضوع سماجی اور معاشرتی بُرائیاں ہیں ۔

سید رفیق حسین نے جب لکھنا شروع کیا۔ تو اس وقت تک ترقی پسند افسانے نے اپنی ایک روایت قائم کی تھی۔ چناں چہ جانوروں پہ لکھے جانے والے افسانوں کے علاوہ سید رفیق حسین کے دوسری نوع کے افسانوں میں ہمیں سماجی حقیقت نگاری اور معاشرے کی بُرائیوں کو نمایاں کرنے کا رجحان بھی ملتا ہے۔ ان کے اس نوع کے افسانوں میں "گدھا نہیں بھرتا" بہت نمایاں ہے۔ یہ ایک سماجی موضوع پہ محیط افسانہ ہے۔ اور سرکاری دفاتر کی بدعنوانیوں کو سامنے لاتا ہے۔ لیکن سید رفیق حسین کی بنیادی اہمیت کا باعث ان کے وہی افسانے ہیں جن کا موضوع جانور ہیں ۔

سید رفیق حسین نے ۳۷-۱۹۳۸ء میں لکھنا شروع کیا۔ ان کا پہلا مضمون "امید" تھا۔ یہ بھی رسالہ 'ساقی' میں شائع ہوا تھا۔ لیکن ساقی میں شائع ہونے والی ان کی سب سے پہلی تحریر "میٹھی میٹھی باتیں" تھا۔ جو ۱۹۴۱-۴۲ء میں شائع ہوا۔ اس تحریر کے ساتھ وہ منظر عام پہ آئے۔ اس کے بعد انہوں نے جانوروں کے بارے میں اور ان کی فطری معصومیت کے بارے میں افسانے لکھے۔ اور جلد ہی قارئین کی توجہ اپنی جانب مبذول کرا لی ۔

فضل قدیر صاحب کا بیان ہے کہ سید رفیق حسین کہا کرتے تھے کہ "انسان بہت خوف ناک جانور ہے۔ یہ لیگ آف نیشنز، یہ امن و آشتی کے آدرش، سب ڈھکوسلے ہیں، جانوروں کی معصومیت سے وہ بہت متاثر تھے۔ اور انہیں فطرت کے ان گھڑ کھلونے تصور کرتے تھے۔ جو انجانے انداز میں ..... کا کفارہ بڑی مسکینی سے ادا کرتے ہیں[1]۔

کفارہ، سید رفیق حسین کا نمایندہ افسانہ ہے۔ ایک گھنے جنگل میں بہاری نامی ایک مفرور ملزم قانون کی نگاہوں سے بچ کر روپوش ہے۔ یہ بات اپنی جگہ خود دل چسپ ہے کہ وہ اپنے قتل کو چھپانے کے لیے انسانوں میں نہیں رہ سکتا اور وحشی درندوں کے درمیان آکر آباد ہوتا ہے۔ جنگل کے جانوروں میں ایک اشرف المخلوقات آجاتا ہے، جس کو اب ایک نہیں دو بڑے بڑے خطرے درپیش ہیں۔ ایک تو انسانوں کا اور قانون کے محافظوں کا جو اس کی تلاش میں جنگل میں آتے ہیں لیکن وہ گھنے درختوں میں روپوش ہے۔ دوسری طرف جنگلی درندوں کا۔ کئی بار وہ چاہتا ہے کہ جنگل سے بھاگ جائے اور واپس شہر چلا جائے۔ اس خوف زدہ اور نہتّے انسان کا سامنا کئی دفعہ شیر اور شیرنی سے ہو جاتا ہے لیکن ہر بار شیر اس کی طرف سے بے نیازی سے منہ موڑ کر چلا جاتا ہے۔ چوں کہ اس کی آنکھوں میں بہادری اور شرافت ہے۔ وہ آدم خور نہیں ہے۔ شیرنی ہر بار بہاری کا شکار کرنا چاہتی ہے۔ لیکن شیر آڑے آجاتا ہے۔

جنگل کے اس بادشاہ کی ملکہ یعنی شیرنی اور انسان کے درمیان یہ جنگ اس وقت شدت اختیار کر جاتی ہے۔ جب بہاری شیر کا شکار کیے ہوئے جانوروں سے

---

[1] نیا دور ص ۱۳۰ - شمارہ ۴۵ -

وقتاً فوقتاً اپنے پیٹ کی آگ بجھانے کے لیے گوشت کے پارچے کاٹتا ہے۔ ایک ایسے ہی مرد، سانبھر کا گوشت کاٹتے ہوئے، بہاری کا سامنا شیرنی سے ہو جاتا ہے۔ آخر کار شیرنی اپنے چور کا پتہ لگا لیتی ہے۔ شیر چند قدم دور ہے۔ اور شیرنی غصّے میں بہاری کو جان سے مار ڈالتی ہے۔ شیرنی، شیر جیسی صاحب ظرف نہیں ہے، وہ بہاری کو جان سے مار ڈالتی ہے۔ جو شیر کے خیال میں ناقابل معافی جرم ہے۔ اس کی کوتاہی سے بہاری کا قتل ہو جاتا ہے۔ وہ ہمیشہ ہمیشہ کے لیے شیرنی کو چھوڑ کر چلا جاتا ہے۔ اس کہانی کا ہیرو بہاری نہیں شیر ہے، شیر جس میں تمام تر انسانی صفات موجود ہیں۔ اگر انسان اس کے مقابلے میں نہیں آتا یا اس کو نقصان پہنچانے کی کوشش نہیں کرتا تو ایسی صورت میں وہ اس کے ساتھ جنگل میں بحفاظت تمام رہ سکتا ہے۔ یہی وہ بنیادی جذبہ ہے جو شیرنی کو چھوڑ دینے کا محرّک بنتا ہے۔

اسی طرح کلوا، افسانے میں کُتّے کا کردار دوستی، محبت اور رفاقت کی علامت ہے۔ کلوا، میں سید رفیق حسین کا کردار ایک کُتّا اور چھوٹا سا بچّہ منن ہے۔ منن کُتّے کو پالتا ہے۔ پھر کتا اس سے جُدا ہو جاتا ہے۔ یہی کُتّا ایک اور جگہ محبت تلاش کرتا ہے اور ایک لڑکی اس سے اچھا سلوک کرتی ہے۔ لڑکی کلوے سے بے مہری کا اظہار کرتی ہے لڑکی کی واپس پلٹنے آمد پہ کُتّا جو کچھ محسوس کرتا ہے اس کی نہایت خوب صورت تصویر سید رفیق حسین نے پیش کی ہے۔ لڑکی کے واپس جانے پہ اس کے گھر والے کلوا کو گھر کے اندر تک رہنے کی اجازت نہیں دیتے۔ وہ کئی دن تک سوگوار دروازے کے آگے پڑا رہتا ہے آخر کار تلاش کرتے کرتے، اور دوسری گلیوں کے کُتّوں کی خونخواری سے بچتے ہوئے وہ دوبارہ منن کے گھر پہنچتا ہے۔ اس گھر سے آنے والے خوشبو اس کو مانوس نظر آتی ہے

اس افسانے میں کلوا کی شدید محبت کو موضوع بنایا گیا ہے ۔

سید رفیق حسین کے ایک اور معرکۃ الآرا افسانے گوری ہو گوری کی ہیروئن گوری (گائے) ہے ۔ ایک چھوٹی سی بستی رات کے وقت سیلاب کی زد میں آجاتی ہے ۔ سب لوگ ڈیڑھ دو میل پہ واقع ریلوے لائن پر چلے جاتے ہیں ۔ رمکلیا کی ماں اور بہن بھائی اور اس کا باپ بھی ان آفت رسیدہ لوگوں میں ہیں ۔ رمکلیا کی ماں ایک دوسرے آدمی کے کہنے پر کہ وہ رمکلیا کو اٹھا لائے گا ریل کی پٹڑی کی جانب دوسرے بچوں کو اٹھائے ہوئے چلی جاتی ہے ۔ جب دن نکلتا ہے تو نقصان کا اندازہ لگانے پہ معلوم ہوتا ہے کہ رمکلیا گم ہو گئی ہے ۔ اور چند دوسرے لوگ جو بلاغ میں موجود تھے وہ بھی پھنس گئے ہیں لیکن ان لوگوں کے بارے میں زیادہ تشویش نہیں تھی کیوں کہ وہ تیرنا بھی جانتے تھے اور دوسرے کسی نہ کسی درخت پہ چڑھ کر جان بچا لیتے اس وقت افراتفری کا عالم ہے ۔ رمکلیا کی ماں ، اپنی بیٹی کی جدائی پہ بہت زور زور سے رو رہی ہے ۔ سب اس کو تسلی دیتے ہیں ۔ اس وقت پورے گروہ میں صرف گوری ہی ایسی ہے جو اس درد مشترک میں اس کا ساتھ دے رہی ہے ۔ وہ بھی مالکن کے جواب میں روتی ہے ۔ اس کا بچہ بھی سیلاب میں پھنس گیا ہے ۔ آخر وہ تلاش کے لیے واپس گھر پہنچتی ہے اور اپنے بچے اور رمکلیا کو لے کر آتی ہے ۔ جس وقت گوری واپس اپنے بچے اور رمکلیا کی تلاش میں جاتی ہے ۔ تو وہ پہلے ماتا کے فطری تقاضے کے سبب اپنے بچے کو ہی سیلاب سے بچانا چاہتی ہے ۔ ایسے وقت میں کہ جب انسانوں کو ایک انسان کی جان کی کوئی فکر نہیں ہے ۔ تو ایک جانور ایسے اہم فریضے کو انجام دیتا ہے ۔

سید رفیق حسین کے ان افسانوں میں جن کے موضوعات سماجی ہیں ۔ زبان نہایت پر لطف ہوتی ہے ۔ انہیں طنز نگاری میں بھی کمال حاصل ہے ۔

"گڑھا نہیں بھرتا" میں طنز ملاحظہ ہو :

"یہاں ایک مسئلہ بڑی قابل تعریف عجائبات قدرت میں سے ہوتی ہے (سب اودرسیر۔ کیسے کہوں بگڑ جائیں گے) آپ بابو جی ہیں، بڑے سیدھے بڑے نیک خاکساری آپ کا شیوہ ہے۔ انکساری آپ کی طینت ہے۔ لیکن وہیں تک یعنی صاحب علاقہ صاحب کے "ڈیرے یا بنگلے تک، اس سے ہٹ کر آپ ذرا کھچ ہی جاتے ہیں۔ ذرا تن بھی جاتے ہیں اور ذرا اکڑ بھی جاتے ہیں۔ اور کبھی اگر ایسے ویسے ہی کہہ دو کہ "ہمرتی چکیا بلیا بھی بنائے دیو" تو ان کو "گھبسہ" بھی آجاتا ہے۔ ذرا یہ ہی عادت بُری ہے ویسے آدمی بڑے بھلے مانس ہیں"

ان کی تحریروں میں بعض فقرے بڑا لطف پیدا کرتے ہیں مختلف کرداروں کو سید رفیق حسین صرف ایک فقرے میں نہایت خوبی سے پیش کر دیتے ہیں۔ اور بات اس صورت سے کہتے ہیں کہ پڑھنے والا مسکرائے بغیر نہ رہ سکے۔

"مولوی صاحب۔ برکت نما گول توندیہ معلوم ہوتا ہے کہ علم کی تجوری لیے پھرتے ہیں"

اپنے مضمون "گھریات" میں ان افراد کا نقشہ کھینچا ہے۔ کہ جن کے دم سے گھروں کی رونق ہے۔ اور بعض ایسے کردار بھی پیش کیے ہیں کہ جن کا بظاہر گھر سے تعلق نہیں ہے لیکن اس کے باوجود سب سے زیادہ تعلق کے دعوے دار ہوتے ہیں۔ اور پورے گھر میں انہی کی سب سے زیادہ اہمیت ہوتی ہے۔ مثلاً بیوی کے بھائی کے لیے "سالار جنگ" کی ترکیب گویہ ترکیب عام ہے لیکن اس کردار کے بارے میں جو رنگ سید رفیق حسین بھرتے ہیں وہ قابلِ داد ہے :

"ایک مکمل گھر کے واسطے آپ کا وجود لازمی ہے۔ وہ گھر جس میں سالار نہ ہو ایسا ہی ہے جیسے بے کھونٹے کی چکی۔ بلکہ آپ کی ہستی کھونٹے سے بھی زیادہ اہم ہوتی ہے۔ ان کا شانِ نزول خود اس بات کی دلیل ہے"۔

یاد کریئے وہ دن جب بوئے گُل ہر گوشے سے آتی تھی۔ جب بادِ سحر دامن سے اٹھلاتی تھی، جب دُنیا میں شور مچا تھا جب نغموں میں جوش بھرا تھا۔ ارے جب بادشاہت لٹتی تھی۔ جب آپ بھی ہنستے تھے۔ جب دُنیا بھی ہنستی تھی۔ اس وقت یہ حضرت نمونتہً آپ کو پیش کیے گئے تھے۔ (ہاں آپ کو ہوش کہاں تھا، آپ نشے میں تھے۔) بعد میں بطور تحفہ آپ کو جہیز کے ساتھ ملے۔ آپ نئے نئے آئے تھے تو میاؤں کرنا بھی نہ آتی تھی۔ اب کھاتے ہیں اور غراتے ہیں اور پھر بھی آپ ناز اُٹھاتے ہیں"۔

سید رفیق حسین کے ان فقروں کا اور اس میں مزاح کا جو پُر لطف پہلو ہے۔ اس کی داد نہ دینا زیادتی ہوگی۔ ان کی ادبی زندگی پر فارسی کا یہ مصرعہ صادق آتا ہے۔ ؎

خورشید درخشید ولے شعلہ مستعجل بود

ظفر عمر

اُردو کا پہلا جاسوسی ناول نگار

حالات زندگی | ظفر عمر بی۔ اے کے نام سے دنیائے ادب کا ہر قاری واقف ہے۔ سنجیدہ اور تفریحی ادب پڑھنے والے دونوں قسم کے قارئین ان سے واقف ہیں۔ آج اردو میں جاسوسی ناول لکھنے والوں کی کمی نہیں ہے لیکن اردو زبان میں جاسوسی ناول نگاری کی ابتدا کرنے والے ظفر عمر ہیں۔ ظفر عمر بی۔ اے کے اجداد کا وطن تھانہ بھون ضلع مظفر نگر تھا لیکن ۱۸۵۷ء کے جہاد آزادی کی ناکامی کے بعد یہ خاندان ترک وطن کر کے قصبہ بڑوت میں آکر آباد ہو گیا تھا۔ ظفر عمر نے علی گڑھ سے بی۔ اے پاس کیا۔ ان کا شمار علی گڑھ کے مشہور طلبہ میں ہوتا تھا۔ زمانہ طالب علمی میں نہ صرف ان کا تعلیمی کیریر شاندار رہا بلکہ وہ کھیلوں میں بھی نمایاں تھے اور علی گڑھ یونیورسٹی کی فٹ بال ٹیم کے کپتان بھی رہے۔

علی گڑھ کے زمانہ قیام میں ہی ان کے تعلقات خان بہادر سید جعفر حسین سے ہوئے۔ بعد میں خان بہادر صاحب کی منجھلی صاحبزادی سے ان کی شادی ہو گئی۔

ملازمت | بی۔ اے پاس کرنے کے بعد سب سے پہلے ان کا تقرر نواب محسن الملک کے پرائیویٹ سکریٹری کی حیثیت سے ہوا۔ جو اس زمانے میں ایم۔ اے او کالج علی گڑھ کے سکریٹری تھے۔ بعد ازاں ان کی خدمات بیگم صاحبہ بھوپال نے حاصل کر لیں۔ بھوپال کے زمانہ قیام میں بیگم صاحبہ کے

پرائیویٹ سکریٹری کے فرائض کی بجاآوری کے ساتھ ساتھ انہوں نے نواب حمید اللہ خان کی اتالیقی کے فرائض بھی سرانجام دیئے۔ اسی زمانے میں خان بہادر سید جعفر حسین نے انہیں مشورہ دیا کہ وہ سرکاری ملازمت میں آجائیں۔ چناں چہ وہ پولیس کی ملازمت کے مقابلے کے امتحان میں بیٹھے اور نمایاں حیثیت سے کامیاب ہوئے۔ الہ آباد کے پولیس ٹریننگ اسکول سے تربیت لینے کے بعد ان کا تقرر براہ راست ڈپٹی سپرنٹنڈنٹ آف پولیس کے عہدے پہ ہوگیا۔ اس زمانے میں کسی ہندوستانی کا اس عہدے پر براہ راست تقرر ہو جانا بہت اعزاز کی بات سمجھی جاتی تھی۔

ظفر عمر صاحب نہایت اصول پرست انسان تھے۔ اور اصول کے معاملے میں بڑے بڑے افسران کی بات نہ مانتے تھے۔ چناں چہ اسی سبب سے افسران بالا کی نگاہوں میں ہمیشہ معتوب رہے۔ لیکن ان کا سروس ریکارڈ اتنا اچھا تھا کہ ناراض افسران ان کا کچھ بگاڑ نہیں سکتے تھے۔ البتہ تنگ کرنے کے لیے ہمیشہ ان کا تبادلہ دور دراز کے پرخطر علاقوں میں کر دیا جاتا تھا۔

جب صوبجات متحدہ میں پہلی بار مقامی افراد پہ مشتمل حکومت بنی تو اس کے سربراہ راجہ صاحب محمود آباد ہوئے۔ راجہ صاحب نے ظفر عمر کو ڈیپوٹیشن پہ اپنے ہاں بلا لیا۔ اور ان کو پبلسٹی آفیسر کے عہدے پہ تعینات کیا۔ ظفر عمر کو راجہ صاحب کے مزاج میں بہت دخل تھا۔ اور راجہ صاحب ان کی ایمان داری، خلوص اور احساس ذمے داری کے بہت مداح تھے۔ گو ان کا عہدہ تو پبلسٹی آفیسر کا تھا لیکن کام وہ راجہ صاحب کے پرائیویٹ سکریٹری کا کرتے تھے۔ اور تمام فائلیں اور دیگر سرکاری کاغذات ظفر عمر کے توسط سے راجہ صاحب کی خدمت میں بھیجے جاتے تھے۔ اس زمانے میں ظفر عمر نے پولیس کے محکمے میں اصلاح اور رد و بدل کی بہت کوشش کی جس سے ان کے انگریز افسران بالا ان سے اور زیادہ ناراض ہوگئے۔ چناں چہ جب وہ راجہ صاحب کی خدمت سے سبکدوش ہوئے اور واپس محکمہ

پولیس میں بھیجے گئے تو حالات کو ناسازگار پاتے ہوئے انہوں نے ریٹائر ہو جانے کو قرین مصلحت جانا۔ اس وقت تک وہ ترقی پاکر ایس پی ہو چکے تھے۔

ایک بار شکار کھیلتے ہوئے ایک گولی ان کی داہنی ٹانگ میں آ لگی تھی جس کے سبب ٹانگ کو اوپر تک کٹوانا پڑا تھا۔ اور لکڑی کی ٹانگ لگوالی تھی چنانچہ اسی صورت سے وہ اپنے محکمانہ فرائض سرانجام دیتے رہے تھے۔

۱۹۳۷ء میں ریٹائر ہو جانے کے بعد انہوں نے مستقل طور پر علی گڑھ میں رہائش اختیار کرلی تھی۔ اور اپنا ایک ذاتی مکان بنوا لیا تھا۔ علی گڑھ میں اس زمانے میں انہوں نے علی گڑھ اولڈ بوائز لاج کے سکریٹری کا عہدہ بھی سنبھال لیا تھا۔

قیام پاکستان کے بعد ظفر عمر ۱۹۴۷ء میں لاہور آگئے تھے۔ اور یہاں اپنی مشہور فرم عمر اینڈ سنز قائم کی تھی۔ ان کے بعد ان کے صاحب زادے اس فرم کو چلاتے رہے ظفر عمر کے بڑے صاحب زادے شوکت عمر سے خان بہادر سید حامد حسین صاحب کی صاحب زادی کی شادی ہوئی تھی۔

ظفر عمر بحیثیت ناول نگار ظفر عمر کو اردو میں جاسوسی ناول نگاری کا بانی قرار دیا جا سکتا ہے۔ ان کی ناول نگاری کا آغاز "نیلی چھتری" سے ہوا جسے انہوں نے ۱۹۱۶ء میں لکھا تھا۔ ان کے مشہور جاسوسی ناول نیلی چھتری، بہرام کی گرفتاری، لال کھٹور اور چوروں کا کلب ہیں۔ اس کے علاوہ انھوں نے انگریزی زبان میں ایک کتاب "دی انڈین پولیس مین" بھی لکھی تھی جو ہندوستان کے مختلف پولیس ٹریننگ اسکولوں میں بطور نصابی کتاب کے پڑھائی جاتی تھی۔ ہنگری کے پروفیسر کی ایک شہرہ آفاق کتاب کے ایک باب کا اردو ترجمہ بھی مستقبل اسلام" کے نام سے کیا تھا۔ جو باقاعدہ مصنف کی اجازت سے شائع کیا گیا تھا۔

سید شاہد حامد صاحب کا بیان ہے کہ "صرف ایک ناول "نیلی چھتری" سے اس زمانے میں انہیں پندرہ ہزار روپے لیبور رائلٹی کے وصول ہوئے تھے. جس سے انہوں نے ملی گڑھ میں ایک مکان تعمیر کرایا تھا۔ ریٹائرمنٹ کے بعد ان کا معمول تھا کہ ناشتے وغیرہ سے فارغ ہو کر ناول لکھنے بیٹھ جاتے تھے یا پھر مطالعے میں مصروف ہو جاتے تھے۔"

اس سلسلے میں کوئی حتمی بات نہیں کہی جا سکتی کہ آیا جاسوسی ناول لکھنے کا خیال انہیں انگریزی میں لکھے جانے والے جاسوسی ناول پڑھنے کے بعد آیا تھا۔ البتہ ان کے تمام ناولوں میں مسعود کا کردار ملتا ہے جس کا پیشہ جاسوسی ہے ممکن ہے کہ اس نوع کے کردار تخلیق کرنے کا خیال انہیں سر آرتھر کانن ڈائل کے ناول پڑھنے کے بعد آیا ہو جس کے ناولوں میں بھی ایک ہی کردار "شرلاک ہومز" ملتا ہے۔

نیلی چھتری | نیلی چھتری ظفر عمری۔ اے کا لکھا ہوا اوّلین ناول ہے۔ اس کا ذیلی نام "شاہان دہلی کا خزانہ" بھی ہے۔ یہ کتاب اوّل تا آخر نہایت دل چسپ ہے اور اسی کتاب میں ہم مسعود کے کردار سے پہلے پہل متعارف ہوتے ہیں۔

ناول کا قصّہ | مسٹر سہراب جی دہلی کے ایک متموّل سوداگر ہیں۔ ان کی ایک بیٹی رتن بائی اور بھتیجی فیروزہ بائی ان کے ہمراہ رہتی ہیں۔ مسٹر سہراب جی کے پاس نوادرات کا قیمتی ذخیرہ ہے۔ ایک رات نامعلوم چور، کوٹھی میں آتے ہیں۔ فیروزہ بائی کے پستول سے ایک چور زخمی ہو کر محل کے مقبرے کے پاس جا کر غائب ہو جاتا ہے۔ کوٹھی میں کسی قسم کا سامان بھی چوری نہیں ہوتا پھر چوروں کی آمد کا مطلب کیا ہے؟ اس پر کوئی روشنی نہیں پڑتی۔ پولیس کا عملہ اور خود کوتوال شہر تفتیش کے لیے آتے ہیں لیکن ان کی تفتیش کے نتائج کچھ زیادہ حوصلہ افزا ثابت نہیں ہوتے جائے واردات پر موجود ایک نوجوان پولیس کے لوگوں سے نہایت ماہرانہ انداز میں گفتگو کرتا

ہے۔ پولیس کے حکام شک کی بنا پہ اسے گرفتار کر لیتے ہیں۔ بعد میں بے قصور ہونے پہ اسے رہا کر دیا جاتا ہے۔ چناں چہ اختتام تک... یہ کردار (مسعود) سہراب جی، اور پولیس والوں کی مدد کرتا ہے۔ اور بہت زیادہ شہرت اسے حاصل ہو جاتی ہے مسعود بہادری سے مقابلہ کرتا ہے۔ اور آخر کار نیلی چھتری کے اسرار کا پردہ فاش کرتا ہے۔ بہرام کو شکست کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ اور وہ اپنی ایجاد "رد ثقل" میں بیٹھ کر پولیس کی گرفتاری سے بچ جاتا ہے۔

مسعود کا کردار نیلی چھتری میں دو کردار نمایاں ہیں۔ ایک مسعود اور دوسرے بہرام۔ دراصل اس کہانی کا ہیرو بہرام نہیں مسعود ہے۔ لیکن مسعود کے کردار کی خوبیوں کو اس صورت سے بیان کیا گیا ہے کہ جس سے وہ ایک غیر حقیقی کردار بن کر رہ جاتا ہے۔ بہرام کا کردار بھی صرف اسی وقت سامنے آتا ہے کہ جب وہ مسعود کو کوئی نیا فریب دے دیتا ہے۔ ان دو کرداروں کے علاوہ کوتوال شہر، خفیہ پولیس کا انسپکٹر وقار حسین، اور داروغہ شب سنگھ وغیرہ میں کردار کے اعتبار سے کوئی جان نہیں ہے۔ یہ کردار کٹھ پتلیاں ہیں اور یوں معلوم ہوتا ہے کہ مصنف نے پولیس کے محکمے کی تحقیر کی خاطر انہیں اس انداز میں پیش کیا ہے۔ ان پولیس والوں کو بالکل نااہل دکھایا گیا ہے۔ اور شروع سے آخر تک تمام تر کامرانیوں کا سہرا مسعود کے سر باندھا گیا ہے۔ اصل میں ظفر عمر خود بھی پولیس میں رہ چکے تھے۔ اور چوں کہ اپنے محکمے سے بددل رہے اور افسران سے نا چاقی رہی۔ لہٰذا نفسیاتی طور پہ وہ پولیس والوں کے کردار کو اسی صورت سے پیش کر سکتے تھے۔

مسعود کے کردار کی تعمیر کے جوش میں ناول نگار باقی کرداروں کے ساتھ انصاف نہیں کر پایا ہے مسعود کے کردار کو غیر معمولی اہمیت دینے کی ایک اور وجہ بھی سمجھ

میں آتی ہے مسعود کو علی گڑھ کا طالب علم دکھایا گیا ہے۔ واضح رہے کہ مصنف خود بھی علی گڑھ کا طالب علم رہ چکا ہے۔ اور اپنی پوری زندگی کو علی گڑھ کے لیے وقف کیے ہوئے ہے مصنف یہ بتانا چاہتا ہے کہ علی گڑھ کے طلبہ نے صرف قومی اور سیاسی زندگی میں ہی شاندار خدمات انجام نہیں دی ہیں بلکہ لاقانونیت اور جرائم کو ختم کرانے میں بھی ان کی کوششیں قابل قدر ہیں مسعود ایک موقع پر اس قسم کے خیالات کا اظہار کرتا ہے ملاحظہ ہو

"اسکول میں ہم لوگ شرلک ہومز کے قصے اور اسی طرح کے حیرت انگیز افسانے بکثرت پڑھتے ہیں۔ اور اکثر بھیس بدل بدل کر ان قصوں کی مشقیں کرتے ہیں۔ ہمارے استاد بھی ان باتوں میں ہماری مدد کرتے ہیں۔ چناں چہ ہمارے سابق ہیڈ ماسٹر مسٹر کارنانے ایک قصہ بھی انگریزی نظم میں ہمارے لیے چھاپا ہے۔ ہملٹ اور مرچنٹ آف وینس کی بدولت میاں شفقت اور عین الدین نے اس قدر نام پیدا کیا۔ اب کالج میں دل چسپی کی نظر سے نہیں دیکھے جاتے۔" (ص ۲۶)

یہاں مصنف نے ایک جانب تو طلبہ کے بدلتے ہوئے ذوق کی جانب بھی نشان دہی کی ہے۔ اسی طرح آگے چل کر ایک علیگی ہونے کی بنا پر وہ علی گڑھ کے طلبہ کے سیاست بازی میں ملوث ہونے کے الزام کو اس صورت سے رد کرتے ہیں۔ جب کوتوال شہر مرزا صاحب مسعود سے پوچھتے ہیں۔

"مرزا صاحب:۔ میاں اخبار اور بڑے لوگ تو کہتے ہیں کہ علی گڑھ کے لڑکے رات دن پالیٹکس میں پڑے رہتے ہیں؟"

"مسعود:۔ جی یہ سب غلط ہے۔ بالکل بہتان ہے۔ لوگ جو کچھ پانیئر میں پڑھتے ہیں۔ سچ سمجھنے لگتے ہیں۔ پڑھنے لکھنے سے ہمارا جو وقت بچتا ہے ہم عمدہ کھیلوں اور سراغرسانی کے قصوں میں صرف کرتے ہیں۔" (ص ۲۷)۔

مسعود جس نے یہ تمام کارہائے نمایاں انجام دیئے ہیں۔ دسویں جماعت کا ایک سترہ سالہ لڑکا ہے۔

خداداد ذہانت کے علاوہ اس کے پاس سراغرسانی کی اور کوئی تربیت نہیں ہے۔ اس کا سرپرست کون ہے۔ اور تفتیش میں ہونے والے اخراجات کون ادا کرتا ہے۔ اسی طرح پولیس والوں کا یہ رویّہ بھی حیرت ناک ہے کہ کوتوال صرف مسعود کو اس تمام کام کی ذمے داری سونپ دیتا ہے۔ اور کئی مقامات پر تو وہ اس لڑکے سے ملتجیانہ انداز میں گتھیوں کے حل کرنے کے لیے کہتا ہوا نظر آتا ہے۔ اس کے بارے میں اس کے استاد کی یہ رائے پیش کی ہے: "مسعود تمام علی گڑھ میں معروف ہے اور آگے چل کر ہندوستان کا شرلاک ہومز ہوگا"۔ مصنف نے مسعود کے کردار میں علی گڑھ کے ایک ایڈیل طالب علم کا کردار پیش کیا ہے۔ اس میں حد درجے کی انکساری بھی دکھائی گئی ہے جب ایک مرحلے پر مسعود پولیس والوں کو اپنی ذہانت سے دنگ کر دیتا ہے۔ اور اس کے دعوے کے ثبوت میں سہراب جی کو بلوایا جاتا ہے۔ اس وقت کا منظر ملاحظہ ہو:

"سہراب جی ملاقات کے کمرے میں بلوائے گئے۔ ایسے تجربہ کار افسروں کو حیرت میں ڈالنا مسعود کے لیے کچھ کم کامیابی کی بات نہ تھی۔ لیکن اس پہ فخر کرنے کی بجائے مسعود اپنی نظریں نیچی کیے سہراب جی کا انتظار کر رہا تھا۔ کبھی کبھی کن انکھیوں سے پولیس افسروں کی طرف دیکھ دیکھ کر دل ہی دل میں خوش ہوتا تھا۔" (ص ۴۶)۔

اسی طرح ایک اور جگہ مسعود کو کالج کی آن کی خاطر خطرات میں کودتا ہوا دکھایا گیا ہے۔

"آخرکار مسعود اپنی بات کا پکا ثابت ہوا۔ بہرام کی گیدڑ بھبکیوں سے مرعوب ہو کر مضمون بدل کر چھاپنے کا وعدہ تو کر لیا مگر بعد میں شاید اس نے جواں مردی اور اپنے پیارے کالج کی عزت اور شان کے خلاف سمجھا کہ ایک حق بات محض ایک شاطر چور کی دھمکی میں آکر دوسری طرح بیان کی جائے اور تمام دنیا کو جو اس کے مضمون کا انتظار کر رہی تھی دھوکہ دیا جائے۔" (ص ۱۱۶)۔

مسعود معاملات کی چھان بین کے سلسلے میں تمام پولیس والوں کو پیچھے چھوڑ دیتا ہے مثلاً سہراب جی کی کوٹھی" نورمحل" جہاں بہرام نے قتل کیا ہے اور گولی لگنے کے باوجود مکینوں اور نوکروں کے سامنے غائب ہو جاتا ہے۔ پولیس کو اس سلسلے میں کسی قسم کی معلومات نہیں ہیں۔ یہ مسعود ہی ہے جو" نورمحل" کی تاریخ پر بھی روشنی ڈالتا ہے چناں چہ سہراب جی کی کوٹھی پر روشنی ڈالتے ہوئے وہ سرسید کی کتاب 'آثار الصنادید' کا حوالہ دیتے ہوئے کہتا ہے :

" مسعود :۔ اگر آپ سرسید کی تصنیف 'آثار الصنادید' غور سے پڑھیں تو آپ کو معلوم ہوگا کہ جس جگہ اب نورمحل واقع ہے کسی زمانے میں یہاں جین مذہب کا مندر اور اس کے متعلق پادریوں کے رہنے کے مکانات بنے ہوئے تھے۔ ان مکانات میں جابجا تہ خانے بنے ہوئے تھے۔ جہاں لڑائی اور ہل چل کے زمانے میں یہ لوگ چھپ جایا کرتے تھے۔ یہ عمارت جسے عام طور پہ مقبرہ کہا جاتا ہے اس زمانے کا ایک مندر معلوم ہوتا ہے۔ میرا قیاس ہے کہ اس کے نیچے بھی تہ خانہ ہوگا مگر اب یہ پہلی راہیں سب بند ہوگئی ہیں۔ غالباً بہرام کو ان میں سے کوئی راستہ معلوم ہوگا۔ اور وہ اس تہ خانے میں چھپا ہوگا۔" (ص ۷۷)

بہرام کا کردار بہرام ایک بہادر اور نڈر آدمی ہے۔ وہ معمولی درجے کا چور اچکا نہیں ہے۔ وہ ہر جگہ موجود ہوتا ہے۔ اور چھلاوے کی طرح غائب ہو جاتا ہے۔ بہرام بہادر ہونے کے سبب اپنے بہادر دشمن کا بھی احترام کرتا ہے۔ جب مسعود نیلی چھتری کا راز فاش کر دیتا ہے۔ اور یہ پہاڑوں کے اندر سے بہرام کے پاس پہنچ جاتا ہے۔ اس وقت بہرام اس کے سامنے تمام اسرار پہ سے پردہ اٹھاتا ہے۔ اسے معلوم ہے کہ اب کھیل ختم ہونے والا ہے۔ اور پولیس اس کی تلاش میں تہ خانے کے دروازے یکے بعد دیگرے توڑتی ہوئی چلی آرہی ہے۔ اس وقت

بھی کہ جب اس کے دشمن مسعود کی بدولت اس کی ارضی جنت تباہ ہو رہی ہے۔ وہ مسعود سے نہایت اچھا سلوک کرتا ہے۔ جب کہ وہ اسے بہ آسانی قتل بھی کر سکتا تھا۔ وہ اس کو تمام راز بتاتا ہے۔

بہرام موجد اور خلاق بھی ہے۔ اس نے ایک شیشے کا جسیم کرّہ بنا رکھا ہے جس کو میکانکی انداز میں چلاتا ہے۔ اور اس میں مسعود کو بٹھا کر اپنے تہ خانے سے پولیس کی دسترس سے دور نکل بھاگتا ہے۔ اس جسیم کرّے میں بیٹھ کر وہ مسعود کو اس کی تکنیک سے آگاہ کرتا ہے اپنی اس ایجاد کا نام بہرام نے "روثقل" رکھا ہوا ہے۔ شہر میں ایک مقام پہ مسعود کو اُتار کر بہرام اپنی محبوبہ کے ساتھ اوپر پرواز کر جاتا ہے لیکن بہرام کا کردار مسعود کے مقابلے میں اس قدر نمایاں نہیں بن پاتا۔

عمومی تبصرہ | بلاشبہ اس ناول اور دوسرے تمام ناولوں کے مطالعے سے یہ اعتراف کرنا پڑتا ہے کہ ظفر عمر بی۔ اے میں بے پناہ قوت تخلیق تھی۔ انہیں بات کو نہایت خوب صورتی سے کہنے کا فن آتا تھا۔ اور شروع سے آخر تک ناول میں سنسنی خیزی برقرار رکھتے تھے۔ جو جاسوسی ناول کی ایک نہایت اہم خوبی ہے۔ ان کا فن اس لحاظ سے بھی قابل تعریف نظر آتا ہے کہ جس زمانے میں انہوں نے جاسوسی ناول لکھنے کا آغاز کیا۔ اردو میں جاسوسی ناول کی کوئی روایت موجود نہیں تھی۔ یہ بھی وثوق سے نہیں کہا جا سکتا کہ انہوں نے دوسری زبانوں بالخصوص انگریزی زبان کے جاسوسی ادب کو پڑھا تھا یا نہیں۔ تاہم اگر انہیں اس نوع کے ناول لکھنے اور ایک جاسوسی کردار کو تخلیق کرنے کا خیال انگریزی ناول پڑھنے کے بعد بھی آیا تھا تو بھی اس میں ایسی کوئی بات نہیں ہے۔ اپنے ادب میں اس

نوع کے تجربات کرنا قابل تحسین ہے۔ آج ہم عہد جدید کے جاسوسی ناول نگاروں کو دیکھتے ہیں کہ ان کے بیشتر قصے ماخوذ ہیں۔ اور ان کے ناولوں میں کرداروں کے ناموں کے علاوہ مقامیت کی چھاپ کا دور دور تک پتہ نہیں چلتا۔ جب کہ ظفر عمر کے تمام ناولوں کے کردار اور ان کی فضا تمام تر ہندوستانی ہے اور وہ اس کو پوری طرح پیش کرنے میں کامیاب رہے ہیں۔

پلاٹ بنانے میں بھی مصنف کامیاب نظر آتا ہے۔ واقعات کی کڑیوں کے تسلسل میں کہیں کہیں جھٹکا سا محسوس ہوتا ہے۔ ظفر عمر ناول کو ڈرامائی انداز میں شروع کرتے ہیں اور واقعات کے بیان میں تمہید کے طور پہ غیر ضروری طوالت سے گریز کرتے ہیں۔

ظفر عمر نے اس ناول کی بنیاد بھی چند مفروضوں پہ رکھی ہے بعض تفصیلات کے سلسلے میں سرسید کی آثار الصنادید کا حوالہ دیتے ہیں۔ جو دہلی کی قدیم عمارتوں کے بارے میں تفصیلات فراہم کرتی ہے۔ نیلی چھتری میں سلاطین دہلی سے مغلیہ خاندان تک کے محفوظ دولت کے ذخائر دفن ہیں۔ تاریخ اور افسانے کی باہمی آمیزش سے ظفر عمر نے کہانی کا تار و پود خوب اچھی طرح بنا ہے۔ ظفر عمر کے ناولوں میں گو بعض جگہ واقعات کی کڑیوں میں جھول بھی محسوس ہوتا ہے لیکن ان میں دلچسپی اور سنسنی خیزی اس حد تک ہے کہ ایک بار شروع کر کے بغیر ختم کیے ناول کو رکھنے کو جی نہیں چاہتا۔ عموماً تفریحی ناولوں میں ہیروئن کا کردار ضروری ہوتا ہے۔ جو آخر تک تمام ناول میں اپنی عشوہ طرازیوں سے قارئین کو متوجہ کیے رکھتی ہے۔ لیکن ظفر عمر کے ناولوں میں عشق و محبت کے سہارے داستان آگے نہیں بڑھتی اور اس کے باوجود دلچسپی برابر قائم رہتی ہے۔ ان ناولوں میں عورتوں کے نام بھی آتے ہیں۔ اور ان کے کردار بھی موجود ہیں لیکن یہ کردار بہت نمایاں نہیں ہیں۔ اور پورے ناول میں کہیں

عشق و محبت کا روایتی تعلق نہیں پیدا ہوتا۔ گو آخر میں صرف رستم جی کی بھانجی کے عشق میں بہرام کو گرفتار ہوتے دکھایا ہے۔ یہ واقعہ بھی صرف ضمنی طور پر پیش ہوتا ہے۔

لال کھٹور | ظفر عمر نے تین ناول لکھے تھے۔ نیلی چھتری۔ بہرام کی گرفتاری اور لال کھٹور۔ میری نظر سے صرف دو ناول نیلی چھتری اور لال کھٹور گزرے ہیں۔ اور انہی کا جائزہ ان صفحات میں لیا جا رہا ہے۔ کہانی مختلف ہونے کے باوجود ان ناولوں میں مسعود اور بہرام کے رول مشترک ہیں۔ نیلی چھتری میں بہرام ایک جرائم پیشہ دکھایا گیا ہے۔ ہم اس سے اس وقت رخصت ہوتے ہیں جب وہ اپنی ایجاد "روشقل" میں بیٹھ کر فضا میں غائب ہو جاتا ہے۔ بہرام کی واپسی اس کے دوبارہ جرائم پیشہ زندگی میں لوٹ آنے سے عبارت ہے۔

لال کھٹور کا کردار کنور محراب جنگ، اصل میں بہرام ہی ہے۔ جو جرائم سے تائب ہو کر نیک اور شریفانہ زندگی گزارنا شروع کرتا ہے۔ اور مسعود کو بھی اپنے ساتھ ملا لیتا ہے۔ چناں چہ محراب جنگ، میں محراب کے حروف کو الٹا جائے تو بہرام بن جاتا ہے۔ اس ناول میں یہ لوگ "خدائی فوجدار" کے روپ میں متعارف کرائے گئے ہیں۔ یہ لوگ ان جرائم پیشہ لوگوں کی سرکوبی کرتے ہیں اور انہیں قرار واقعی سزا دیتے ہیں جو پولیس کے ہاتھ سے بچ نکلتے ہیں۔ اس ناول میں ہم مسعود کو بہ اعتبار عمر زیادہ سنجیدہ پاتے ہیں۔

قصّہ | محراب جنگ، لوک بہادر اور مسعود شہر دہلی میں "خدائی فوجداروں" کے نام سے مشہور ہیں۔ دلّی میں ہی مرزا بلگرامی نام کا ایک شخص بمع اپنے گروہ کے رہتا ہے

یہ جرائم پیشہ آدمی ہے لیکن قانون کی نگاہوں سے بچنے کے لیے سماجی کارکن اور مذہبی آدمی کا لبادہ اوڑھے ہوئے ہے۔ اس ناول کا تمام تر قصہ ایک خفیہ خزانے کی تلاش کے گرد گھومتا ہے گھوکھلے نامی ایک مرہٹہ' خدائی فوجداروں' کے پاس اپنی جان کی حفاظت کے لیے آتا ہے گھوکھلے ان لوگوں کو اپنے راز سے آگاہ نہیں کرتا۔ اور دلی آمد کے تیسرے دن ہی سانپ کے کاٹنے سے پارک میں مردہ پایا جاتا ہے۔

ادھر مرزا بلگرامی اپنے اسکول میں مصوری اور کشیدہ کاری وغیرہ سکھانے کے لیے ایک پارسی لڑکی کی ضرورت کا اشتہار دیتا ہے۔ ہیرا بائی میرٹھ میں رہنے والی ایک لڑکی ہے جو اس ناول کی ہیروئن ہے۔ انٹرویو کے لیے آتی ہے اور ملازم ہو جاتی ہے۔ مرزا بلگرامی کا مقصود اصل میں ہیرا بائی کی تلاش ہی تھا۔ ہیرا بائی مرزا بلگرامی اور اس کے ایک جرائم پیشہ ساتھی رستم جی کے ہاتھ چڑھ جاتی ہے لیکن خدائی فوجدار اسے ان لوگوں کے چنگل سے بچانے میں کامیاب ہو جاتے ہیں گھوکھلے کی موت کے بعد سیٹھ بنارسی داس اس کی تلاش میں دہلی آتا ہے اور خدائی فوجداروں سے ملاقات کرتا ہے۔ وہ انہیں ہیرا بائی کے اغوا اور گھوکھلے کے راز سے آگاہ کرنا چاہتا ہے۔ مرزا بلگرامی کا گروہ لالہ بنارسی داس کی کوٹھی پر حملہ آور ہوتا ہے۔ مسعود، محراب جنگ اور پولیس کے افراد کی مدد سے مرزا بلگرامی کے فرستادہ غنڈے پکڑ لیے جاتے ہیں۔ اور تہ خانے سے محراب جنگ اور مسعود کو گھوکھلے کا لکھا ہوا طویل خط لالہ بنارسی داس کے نام ملتا ہے۔ جو تمام راز کی پردہ کشائی کرتا ہے۔

گھوکھلے کی تحقیقات و روایت کے مطابق سرکار بھوپال کے ہاں فریدون نامی ایک انجینئر تھا۔ جس کو سانچی ٹوپ کے جنگلات کا علاقہ حکومت کی خدمت کے صلے میں بارہ سال کی مستاجری پر ملا تھا۔ یہاں لال کھٹور نامی ایک مقام میں کروڑوں روپے

کی سونے کے بُت ہیں۔ فریدوں جی اپنی اس جاگیر پہ دشمنوں کے ہاتھوں مارا جاتا ہے۔ مرزا بلگرامی کو معلوم ہے کہ فریدوں جی کی ایک وارث لڑکی ہے۔ اگر تاریخ ختم ہونے تک وہ لڑکی اس جاگیر کو دوبارہ حاصل کرنے کے لیے درخواست نہ دے سکی تو مرزا بلگرامی اس جاگیر کو مستاجری پہ حاصل کر کے کروڑوں روپے کی دولت کی مالک بن جائے گا۔ اس ضمن میں ہیرا بائی کی تلاش کی جاتی ہے لیکن خدائی فوجدار مرزا بلگرامی اور اس کے ساتھی رستم جی کی تمام کارروائیوں کو ناکام بنا دیتے ہیں۔ آخر وہ جاگیر مسعود اور محراب جنگ کی کوششوں کی بدولت ہیرا بائی کو ہی مل جاتی ہے۔

نیلی چھتری پہ تنقید کرتے ہوئے ہم کہہ آئے ہیں کہ مصنف کو تاریخی واقعات اور بعض علاقوں میں مدفون دولت کے خزینوں سے خصوصی دلچسپی ہے۔ اس کہانی کی بنیاد بھی ایک ایسی ہی داستان ہے۔ کہ سانچی ٹوپ کے جنگلوں میں زیرِ زمین تہ خانوں میں سونے چاندی کے مدفون خزانے ہیں۔ مصنف اس علاقے کو بہت سے بادشاہوں کی رزم آرائیوں کا مرکز بتاتا ہے اور اس سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ یہاں بے شمار خزانہ دفن ہے۔ اس علاقے میں ایک کہاوت مشہور ہے۔

اونچی اٹریا لال کٹور
جس میں گڑے چھپن کروڑ

اسی کو مصنف نے داستان کی بنیاد بنایا ہے۔ اور اس کے اردگرد بہت خوب صورت واقعات کا تانا بانا مہارت سے بُنا ہے۔ کہ قاری اوّل سے آخر تک اس کی دلچسپی میں کھویا رہتا ہے

مرزا بلگرامی کا کردار | نیلی چھتری کے برعکس اس ناول میں مسعود کے علاوہ مرزا بلگرامی کا

کردار کی جیتا جاگتا اور باعمل کردار ہے۔ وہ کٹھ پتلی نہیں ہے۔ اس کردار کے حوالے سے مصنف سماجی برائیوں کی جانب اشارہ کرتا ہے۔ مرزا بلگرامی دلی شہر کی ایک ممتاز سیاسی سماجی اور مذہبی شخصیت ہے۔ لیکن مصنف نے اسے حسن بن سباح کا مماثل قرار دیا ہے۔ اور اس کردار کے روپ میں مصنّف نام نہاد مولویوں، مذہب کے نام لیواؤں اور معاشرے کے ٹھیکیداروں پر طنز کرتا ہے، مذہبی اور تعلیمی معاملات میں مرزا بلگرامی دلچسپی لیتا ہے لیکن اندرونی طور پر وہ ایک سماج دشمن فرد ہے۔ اس کی کامیابی کا راز یہ ہے کہ وہ فرقہ وار افسادات کراتا ہے۔ ایک ایسے ہی موقعہ پہ .... مصنف اس کی زبان سے اس کے باطنی احوال کو یوں بیان کرتا ہے "۔ ہندو مسلمان ایک دوسرے کے خون کے پیاسے اب ایسے نہیں رہے جیسے پہلے تھے۔ اور دونوں قومیں ایک دوسرے کے قریب آتی جاتی ہیں باوجود کوشش کے نہ کہیں بلوے ہوتے ہیں نہ مقدمہ بازی"۔

مرزا بلگرامی اپنے آپ کو حسن بن سباح سے زیادہ با اثر اور کامیاب انسان سمجھتا ہے۔ اس نے سانپ کے زہر کی خاص ترکیب سے گولیاں بنا رکھی ہیں جنھیں پائپ کے ذریعے دشمنوں کے جسم پہ مارتا ہے۔ اور زہر سانسوں میں داخل ہو کر انسان کو قتل کر دیتا ہے"۔ بے شک حسن بن سباح اپنے وقت کا عجیب شخص تھا۔ جس کے خوف سے ممالک کے تاجدار بڑے بڑے مدبّر اور جیّد عالم سب کانپتے تھے۔ اس کے فدائی دائمی بہت پختہ اور وفادار تھے لیکن چھری سے قتل کرنے کا طریقہ بہت بھونڈا اور وحشیانہ تھا۔ آج وہ زندہ ہوتا اور میرے طرز عمل کو دیکھتا تو ضرور میرے شاگردوں کے گروہ میں شامل ہو جاتا۔ اس لحاظ سے مجھے شیخ الجبل پر بڑی فوقیت ہے۔ میرے مقابلے میں حسن بن سباح طفل مکتب کی حیثیت رکھتا ہے۔ حسن بن سباح نے اپنے فدائیوں پر تسلّط حاصل کرنے کے لیے کیا کیا پاکھنڈ پھیلا رکھے تھے۔ ایک مصنوعی بہشت بھی بنائی تھی۔ جہاں خوب صورت اور نوجوان عورتوں کو حوروں کے لباس میں رکھتا تھا۔ اور ان کے عشاق کو اس مصنوعی بہشت میں ان کے نظارے سے متوحش کرتا۔ اور ان سے ملاقات کے وعدے پہ اپنے فدائیوں کے زمرے میں شامل کرتا تھا لیکن

میرے فدائی اور شاگرد کارگزاری کے لحاظ سے شیخ الجبل کے فدائیوں سے کسی طرح کم نہیں۔ میرے اشارے پر کٹھ پتلی کی طرح کام کرتے ہیں۔ اور بڑی خوب صورتی سے لوگوں کو اس دنیائے فانی کے علائق سے آزاد کر دیتے ہیں۔ میں نہ حوروں کی ملاقات کا سبز باغ دکھاتا ہوں۔ نہ ان کی عاقبت درست کرنے کا وعدہ کرتا ہوں۔ انسان کا دماغ بھی عجیب چیز ہے۔ میں اپنی دماغی فوقیت کی بدولت بہ آسانی لوگوں کو مسحور کر لیتا ہوں۔ اور جو چاہتا ہوں کام لیتا ہوں۔ کچھ دنوں بعد جب موجودہ زمانے کی تاریخ لکھی جائے گی تو میرا نام حسن بن صباح کے مقابلے میں سنہرے حروف میں لکھا جائے گا۔" (ص ۶۷-۶۸)

مصنف نے اس انداز میں نہایت خوبی کے ساتھ مرزا بلگرامی کردار کو بھرپور انداز میں پیش کر دیا ہے۔ مرزا بلگرامی کو علم کیمیا کا بھی شوق ہے۔ علاوہ ازیں اس کا مطالعہ وسیع اور متنوع بھی ہے جس سے وہ لوگوں کو متاثر کر لیتا ہے جب وہ اپنے پروردہ بندر نامی غنڈے کو خطرناک زہر دے کر اسے مسعود کے قتل پر اکساتا ہے تو اس کے ضمیر کو مطمئن کرنے کے لیے یہ کہہ کر تسلی دیتا ہے "تم بڑے ناسمجھ ہو۔ یہ قتل کیسا ہوا۔ کیا تم نے نہیں پڑا کہ خدا بڑا انتقام لینے والا ہے۔ فرعون نے خدائی کا دعویٰ کیا۔ اس سے انتقام لینا ضروری تھا۔ خدا نے موسیٰ کے ہاتھ سے انتقام لیا۔ اور اسے غرق کر دیا۔ نمرود کو بھی خدا نے اسی طرح اس کے غرور کی سزا دی۔ ان مثالوں سے ثابت ہوا کہ انتقام لینا نہ صرف جائز بلکہ ضروری ہے میں معاملات کے مذہبی پہلو سے بخوبی واقف ہوں۔ اگر کوئی بات خلاف مذہب ہوتی تو مجھ جیسا خدا پرست اور متقی آدمی کبھی تم سے نہ کہتا۔ مسعود نے تمہارے کوڑے لگائے۔ اس نے میرے معصوم بھائی کو ناحق قتل کیا۔ ایسی حالت میں انتقام لینا بالکل درست اور سراسر جائز ہے۔ اس کے علاوہ اپنے پیر کو خوش کرنا اور اس حکم کی تعمیل کرنا عین عبادت ہے میں تمہاری کامیابی کے لیے دعا کروں گا تم اس خطرناک آدمی کو اپنے اور میرے راستے سے ہٹا دو گے۔"

لال کنٹور میں بھی بہت سے کردار سامنے آتے ہیں مثلاً بکرم سنگھ، مرزا بلگرامی، رستم جی، کملا بائی، ہیرا بائی

مسعود، محراب جنگ، گھوکھلے، لوک بہادر، بنارسی داس، بندو وغیرہ لیکن نیلی چھتری کی طرح اس ناول میں بھی یہی خامی کھٹکتی ہے کہ اس کے بیشتر کردار بے جان ہیں۔ لال کنڈ ور میں صرف مسعود اور مرزا علگرامی زندہ کردار ہیں۔

ناول میں بعض فقروں کی تکرار بہت کھٹکتی ہے۔ یوں معلوم ہوتا ہے کہ مصنف، کو قاری کے ذہانت پر اعتبار نہیں ہے۔ اور اکثر جگہ وہ بار بار ایک ہی بات کہتے ہیں۔ مثلاً مسعود کے کردار کے بارے میں ایک ہی جگہ یہ فقرہ کہہ دینا کافی تھا جس سے اس کردار کی یہ خوبی قاری کے ذہن میں اپنا نقش جما لیتی "مسعود کو دوسرے لوگوں کے انداز گفتگو اور لہجے سے یہ معلوم کرنے کی مہارت حاصل تھی کہ بیان سچ ہے یا غلط" (ص ۶۴) یہ فقرہ بس ایک ہی جگہ شروع میں کردار کی خوبیاں متعارف کراتے ہوئے لکھ دینا کافی تھا لیکن بار بار آتا ہے۔ بحیثیت مجموعی یہ ناول ابھی دلچسپ ہے۔

ہیرا بائی، جو اس ناول کی ہیروئن کہلائی جا سکتی ہے۔ اس کا کردار بھی بہت زیادہ ابھر کر سامنے نہیں آیا وہ بہادر ہے لیکن اس کشمکش میں اس کے کردار کی جدوجہد کو نمایاں نہیں کیا گیا۔ رستم جی کی داشتہ کا یہ فقرہ ہیرا بائی کے کردار کے بارے میں روشنی ڈالتا ہے "۔ ہے تو نوعمر مگر بوڑھوں کی طرح سنجیدہ۔ لڑکیوں کی طرح چہل پہل کی باتیں نہیں کرتی" (ص ۵۵)

ناول کے مطالعے کے دوران جگہ جگہ پولیس والوں کے خلاف ریمارکس ملتے ہیں۔ یہ بات اس لیے اور بھی دلچسپ ہے کہ مصنف خود بھی ایک ذمے دار پولیس افسر رہ چکا ہے۔ اس سلسلے میں چند اقتباسات ملاحظہ ہوں

"اسی خوشی میں اگر مرزا رحیم بیگ (کوتوال شہر) نے مقدمے کے حالات اخبارات کے رپورٹروں سے بھی کہہ دیے۔ اور تمام پولیس افسران کی عادت کے خلاف جو ہر کارروائی کو فدوی کی کوششوں سے

منسوب کیا کرتے ہیں مرزا صاحب نے اس کامیابی کا سہرا مسعود کے سر باندھا"

(ص ۵۹)۔

پولیس کے انداز تفتیش کے بارے میں ایک اور جگہ مصنف کا نقطہ نظر مسعود کی زبان سے یوں ادا ہوتا ہے :۔

مرزا صاحب :" سوچنے کا یہ کون سا موقع ہے۔ پہلے تو اِدھر اُدھر دیکھنا بھالنا لوگوں سے حال پوچھنا۔ اور واقعات معلوم کرنا اور سراغ لگانا چاہیے۔ اس کے بعد سوچنے غور کرنے اور واقعات سے نتیجہ نکالنے کا وقت آتا ہے۔"

مسعود :" جی ہاں، مجھے معلوم ہے پولیس کا یہی دستور ہے لیکن میرا طریقہ اس سے مختلف ہے۔ میں پہلے غور کرتا ہوں تاکہ مقدمے کا خاکہ سمجھ میں آجائے پھر واقعات کی چولیں اس ڈھانچے کے مطابق بٹھانے کی کوشش کرتا ہوں۔" (ص ۶۵)۔

ایک اور جگہ .....

" علاوہ اس کے پولیس کی سست رفتاری اور بے ڈھنگے پن سے معاملہ خراب ہو جانے کا احتمال تھا۔" (ص ۱۳۲)۔

اسی طرح ان کے دوسرے ناول لال کھٹور میں ایک جگہ گھوکھلے مرہٹہ پولیس کی شکایت یوں کرتا ہے :۔

"تم کیسی باتیں کرتے ہو۔ جہاں میں تھا وہاں پولیس کا کہیں پتہ نہ تھا؟ جنگل بیابان تھا۔ علاوہ اس کے پولیس کرتی ہی کیا ہے۔ مجھے پولیس کا تلخ تجربہ ہے۔"

مجموعی طور سے لال کھٹور اور نیلی چھتری دونوں ناول اچھے ہیں۔

مستقبل اسلام | "مستقبل اسلام" مشہور مستشرق پروفیسر وامبری کی کتاب "مغربی تمدن اور مشرقی ممالک" کے آخری باب کا اردو ترجمہ ہے۔ جسے ۱۹۱۰ء میں لاہور کے ایک ناشر نے شائع کیا تھا۔ پروفیسر وامبری مایۂ ناز عالم تھے۔ ان کی ابتدائی زندگی سخت نامساعد حالات میں گزری۔ وہ کئی زبانوں کے ماہر تھے۔ اور مسلم ملکوں کی تاریخ، ملّت اسلامیہ کی تہذیب و ثقافت ان کا پسندیدہ موضوع تھا۔ گزشتہ تین صدیوں میں مسلمان ملکوں میں رونما ہونے والی سیاسی، تہذیبی اور تمدنی تحریکوں کا مطالعہ، مغربی تمدن اور ان ملکوں کے باشندوں پر مغربی تمدن نے کیا اثرات قائم کیے ہیں، ان کی فکر اور قلم کا محور رہی ہے۔

پروفیسر موصوف کو بہت سے اسلامی ملکوں بالخصوص ترکی میں طویل عرصے تک رہنے کا موقع ملا۔ وہ ترکی کے وزیر خارجہ کے سکریٹری بھی رہے۔ لہٰذا اسلامی ملکوں اور وہاں کے باشندوں اور ان کے طرز تمدن پر مغربی تمدن کے مشاہدے کا بھی انہیں موقع ملا

بعض ارباب دانش کا خیال تھا کہ چوں کہ انگلستان مسلمان ملکوں سے دور دراز مقام پر واقع ہے، لہٰذا اس کے تہذیبی و تمدنی اثرات مسلمان ملکوں پر زیادہ اثر انداز نہیں ہو سکتے اور نہ ہی تمدنی اعتبار سے وہ مشرقی ممالک کو متاثر کر سکتا ہے۔ جبکہ روس جو بعض مشرقی ممالک کے بہت قریب ہے۔ وہ تمدنی اعتبار سے ان مشرقی ممالک پر زیادہ اثر انداز ہو سکتا ہے۔ مصنف نے اس نقطہ نظر کو تاریخی حوالوں سے غلط قرار دیا ہے۔

ہمارے خیال میں اس کتاب کے آخری باب کے ترجمہ کرنے کی کئی وجوہ ہو سکتی ہیں پہلی وجہ تو یہ ہے کہ اس کتاب میں پروفیسر وامبری نے مسلمان ملکوں کی تہذیبی، سیاسی اور ثقافتی تحریکوں کو زیر بحث لاتے ہوئے سرسید احمد خان کی تحریک کو بھی ملحوظ رکھا ہے۔ اور ان کی جانب سے کی جانے والی کوششوں اور اقدامات کی تعریف کی ہے۔ چوں کہ مصنف خود بھی ایک عیسائی

تھے۔ اور سرسید احمد خان کے نقطہ نظر سے متفق تھے۔ لہٰذا ان کی ذاتی دل چسپی اس کتاب کے ترجمے کا باعث ہو سکتی ہے۔

اس کی دوسری وجہ سیاسی تھی۔ انگریزوں کو غیر منقسم ہندوستان میں ہمیشہ روس کی جانب سے خوف لگا رہا تھا۔ چوں کہ اس کتاب میں پروفیسر وامبری نے یہ ثابت کرنے کی کوشش کی ہے کہ برطانوی تہذیب و ثقافت نے بالخصوص ہندوستان کے مسلمانوں پر خوش گوار اثرات ڈالے ہیں۔ جب کہ اس کے مقابلے میں روسی تمدن کے اثرات نہ تو برصغیر کے مسلمانوں پر اور نہ ہی وسط ایشیا کے مسلمانوں کے حق میں بہتر ثابت ہو سکتے ہیں۔ اس طرح اس کتاب کا مطالعہ برصغیر کے مسلمانوں کے دلوں میں انگریزی حکومت کے لیے اور زیادہ ہمدردانہ نقطہ نظر پیدا کرنے کا باعث بن سکتا تھا۔ ایک جگہ مترجم لکھتا ہے :

"مؤلف نے انگریزی حکومت کے اثر کا ذکر کرتے ہوئے جا بجا روسی حکومت کے طرز عمل سے مقابلہ کیا ہے۔ اور بالآخر اس نتیجے پر پہنچا ہے کہ انگریزی تمدن کا اثر سرعت کے ساتھ ترقی کر رہا ہے۔ اور بہ نسبت روسی تمدن کے اس کی بنیاد زیادہ مستحکم اور پائیدار ہے[1]"

ظفر عمر بی۔ اے نے یہ ترجمہ مصنف کی اجازت سے کیا تھا۔ مصنف کے خط کو ذیل میں پیش کیا جاتا ہے :-

بوڈاپسٹ

۱۳ر جنوری ۱۹۱۰ء

جناب من! مجھ خیالات آپ نے میری کتاب اور خصوصاً اس حصے کی بابت ظاہر

---

[1] مستقبل اسلام - ص ۱۰-۱۱ -

فرمائے ہیں۔ جو مستقبل اسلام سے متعلق ہیں اسے دیکھ کر بڑی مسرت حاصل ہوئی۔ بڑی خوشی کی بات ہے کہ اسلامی دنیا کے مختلف حصّوں سے آپ جیسے روشن خیال اصحاب نے ابھی قسم کے خیالات کا اظہار کیا ہے۔ مصنّفین کا سب سے بڑا انعام یہ ہے کہ ناظرین ان سے اتفاق آرا کریں۔ ترکی اور ایران کے تازہ ترین واقعات نے میرے خیالات کو بالکل حق بجانب ثابت کیا ہے۔ اور اگر دُنیا جان بوجھ کر اندھی ہونا نہیں چاہتی، تو وہ دیکھ لے گی کہ اسلام باوجودیکہ اس کے جسم پر اس کے سابق فرماں رواؤں نے نہایت کاری زخم لگائے ہیں مرنے والا نہیں ہے۔ اگر آپ میری کتاب کے اس حصّے کا اردو میں ترجمہ کریں تو میں بہت خوش ہوں گا۔ میں اپنی جانب سے آپ کو پوری اجازت دیتا ہوں۔ اور اپنی تصویر بھی پیش کرتا ہوں۔ جب ترجمہ شائع ہو تو مجھے بھی ایک نسخہ عنایت کیجیے۔

نیاز مند

وامبری

مستقبل اسلام تقریباً پونے دو سو صفحات پر محیط ہے۔ اس کے کُل نو باب ہیں۔ مترجم نے نہایت رواں دواں اور سلیس ترجمہ کیا ہے۔

میجر جنرل (ریٹائرڈ) سیّد شاہد حامد

خان بہادر سید حامد حسین کی شادی مرزا محمد فصیح کی صاحبزادی سے ہوئی تھی۔ مرزا فصیح کا شمار لکھنؤ کے ممتاز دکلا میں ہوتا تھا۔ ان کی رہائش قیصر باغ کے ایک عظیم الشان مکان میں تھی جو کسی زمانے میں شاہانِ اودھ کی ملکیت رہ چکا تھا۔ انہی خاتون کے بطن سے میجر جنرل (ریٹائرڈ) سید شاہد حامد پیدا ہوئے۔ سید شاہد حامد صاحب کی نانی، سردار بہادر میر جعفر کی صاحبزادی تھیں۔ سردار بہادر میر جعفر کا شمار اپنے زمانے کے نامور سپاہیوں میں ہوتا تھا۔ ان کی شجاعت اور بہادری کے قصّے عام تھے۔ شروع میں انھوں نے انگریزوں کے خلاف کئی جنگوں میں حصّہ لیا اور دادِ شجاعت دی۔ آخر میں انگریزی فوج میں ملازمت اختیار کر لی تھی۔ مختلف جنگوں میں وہ اٹھارہ بار زخمی ہوئے۔ بہادری و شجاعت کے اعتراف میں انھیں تمغہ بھی ملا تھا۔ جو اپنی اہمیّت کے اعتبار سے وکٹوریہ کراس کے برابر تھا۔

مرزا محمد فصیح کے صاحبزادے مرزا محمد وجیہہ اودھ کے ایک تعلقدار اور انکم ٹیکس کمشنر تھے۔ سید شاہد حامد صاحب کی دادی جان کا تعلق بھی ہندوستان کے ایک معزز اور شریف خاندان سے تھا۔ وہ مشہور صوفی شاہ کلیم اللہ دہلوی کے خاندان سے تھیں۔ جن کا مزار دہلی میں قلعے کے پاس ہی ہے۔

ولادت ۱۹۱۱ء میں لکھنؤ ہی قیصر باغ میں اپنی نانہال کے گھر میں سید شاہد حامد صاحب پیدا ہوئے۔ بچپن کا زیادہ تر حصّہ لکھنؤ میں گزرا۔ قدیم روایات کے حامل ایک ایسے متمول گھرانے میں سید شاہد حامد صاحب نے اپنا بچپن گزرا۔ جہاں مغربی تعلیم کی تازہ ہوا بھی آرہی تھی۔

ہندوستان کے شریف گھرانوں کی روایت کے مطابق سید شاہد حامد صاحب کی مذہبی تعلیم کا سب سے پہلے آغاز ہوا۔ اس کے ساتھ ساتھ انھیں اسکول کی تعلیم بھی دی جاتی تھی۔ گھر میں دینوی اور دینی تعلیم دینے کے لئے مولوی اور ماسٹر مقرر تھے۔ بچوں کی تعلیم و تربیت میں بے جا لاڈ پیار نہیں کیا جاتا تھا۔ چنانچہ سید شاہد حامد صاحب کا بیان ہے کہ ایک بار مولوی صاحب کی شکایت پر ان کے والد نے ان کے ہاتھ باندھ کر درخت سے لٹکا دیا تھا۔ گو بچوں کے لئے آرام و آسائش کے جملہ سامان مہیا تھے لیکن ان کے والد اپنے بچوں کی تربیت اس صورت سے کرنا چاہتے تھے کہ ان میں اپنی ذات پر زیادہ سے زیادہ اعتماد پیدا ہو سکے۔

علیگڑھ اسکول سید شاہد حامد صاحب کے خاندان کی روایت دو نسلوں سے یہ بن چکی تھی کہ بچوں کو تعلیم کے لئے علیگڑھ اسکول اور کالج بھیجا جاتا تھا۔ چنانچہ ۱۹۲۲ء میں سید شاہد حامد صاحب اور ان کے بھائی سید محمود حامد کو علیگڑھ اسکول میں داخل کرا دیا گیا۔ لیکن اس اسکول میں دونوں بھائیوں کو ایک سال تک پڑھنے کے بعد واپس لکھنؤ بلا لیا گیا۔

کلونت تعلقدار اسکول اس اسکول میں سید شاہد حامد صاحب کے چچا بھی زیر تعلیم رہ چکے تھے۔ یہ اسکول صرف تعلقداروں یا طبقہ امرا کے بچوں کی تعلیم کے لئے مخصوص تھا۔ یہ لاہور کے ایچی سن کالج کی طرز کا ادارہ تھا۔

یہ ایک چھوٹا سا اسکول تھا جو تعلقداروں کے بچوں کی تعلیمی ضروریات کو پورا کرنے کے لئے کافی تھا۔ اس اسکول کے اساتذہ زیادہ تر یورپین ہوتے تھے۔

اکثر و بیشتر صوبجات متحدہ کا گورنر اس اسکول کے معائنے کے لئے آتا رہتا تھا۔ کبھی کبھی وائسرائے ہند بھی اس اسکول کے معائنے کے لئے آتا تھا۔ سید شاہد حامد صاحب کا بیان ہے کہ ان کے زمانہ طالب علمی میں مہاتما گاندھی، موتی لال نہرو اور ہندوستان کے دوسرے صف اوّل کے قومی لیڈر بھی اس اسکول میں آتے جاتے رہتے تھے۔

سید شاہد حامد صاحب کے زمانہ طالب علمی میں کلونت تعلقدار اسکول کے پرنسپل مشہور ماہر تعلیم کونوے ریسی تھے۔ جو کسی زمانے میں علیگڑھ اسکول کے پرنسپل بھی رہ چکے تھے سید شاہد حامد صاحب کا بیان ہے کہ اسکول میں شرارتی لڑکوں کے سرگروہ وہ ہوا کرتے تھے چنانچہ جب شرارتوں پر بازپرس ہوا کرتی تو وہ اس کا اعتراف کر لیتے تھے۔ ایک بار ایسے ہی ایک موقع پر پرنسپل نے انھیں کاندھوں سے پکڑ کر جھنجھوڑتے ہوئے کہا تھا کہ شرارتوں میں تو تم اپنے والد سے بھی دو ہاتھ آگے ہو۔ چنانچہ ان کی شرارتوں کے بارے میں ایک خط اِن کے والد کو لکھا گیا۔ والد کے دریافت کرنے پر جب سید شاہد حامد صاحب نے تمام واقعہ سنایا تو وہ مسکرا کر خاموش ہو گئے۔

اسکول کے قانون کے مطابق تمام طلبہ کے لئے بورڈنگ ہاؤس میں رہنا لازمی تھا البتہ ہر طالب علم کو اپنے ذاتی ملازم اور خانساماں رکھنے کی اجازت تھی۔ جو ان کے جملہ کام کرتے تھے

اردو کے استاد کا مشورہ

اس اسکول میں اردو پڑھانے پر ایک نہایت قابل مولوی صاحب مقرر تھے۔ ایک بار جماعت میں انھوں نے طلبہ کو بتایا کہ جب تک انھیں "مناسب صحبت" میسر نہیں آئے گی وہ اردو

میں قابل نہیں ہو سکیں گے۔ تمام جماعت اس بات پر متعجب ہوئی اور جب ان سے دریافت کیا گیا تو انھوں نے فرمایا کہ ان کی مراد "بازارِ حسن" سے ہے۔ بہر حال لڑکوں نے اپنے استاد کے مشورے پر عمل نہیں کیا۔

برجیش سنگھ

تعلقداروں کے بچے تعلیم کی طرف زیادہ توجہ نہیں دیتے تھے یہاں ہندو اور مسلمان تعلقداروں کے بچے پڑھتے تھے۔ اکثر بچے اسکول میں ابتدائی برسوں کے بعد ہی تعلیم ادھوری چھوڑ کر چلے جاتے تھے۔ کم بچے میٹرک تک پڑھنے کی زحمت گوارا کرتے تھے۔ اور جو بچہ اس اسکول سے میٹرک پاس کر لیتا تھا۔ اس کو ساتھیوں اور تعلقدار گھرانوں میں قدر و منزلت کی نظروں سے دیکھا جاتا تھا۔

اسی اسکول میں ایک سکھ تعلقدار کے تین بچے بھی سید شاہد حامد صاحب کے زمانہ طالب علمی میں پڑھتے تھے۔ ان بھائیوں سے سید صاحب کی دوستی تھی۔ ان میں سے ایک جس کا نام برجیش سنگھ تھا۔ ہندوستان کا مشہور کمیونسٹ لیڈر بنا۔ جو بعد ازاں سوویت یونین چلا گیا تھا۔ اور اسٹالن کی بیٹی سوتیلانہ سے شادی کر لی تھی۔ اسی کے انتقال کے بعد سوتیلانہ اس کی راکھ لے کر ہندوستان آئی تھی۔ اور وہاں سے اپنے وطن واپس جانے کے بجائے مستقل طور پر امریکہ چلی گئی تھی۔

علیگڑھ کالج

کالج کی تعلیم کے لئے سید شاہد حامد صاحب علی گڑھ کالج گئے یہ وہی درس گاہ تھی۔ جہاں ان کے خاندان کے دیگر افراد بھی تعلیم حاصل کرنے جاتے تھے۔ اس درس گاہ میں ان کے دادا سید جعفر حسین کی نشانیاں قدم قدم پر تھیں۔ جو سر سید احمد خان کے مشیر تعمیرات تھے۔

علی گڑھ میں طلبہ کی تعلیم و تربیت کی طرف خصوصی توجہ دی جاتی تھی اور تمام لوگ

ایک جذبے کے ساتھ زندگی گزارتے تھے۔ طلبہ کی تعلیم کے ساتھ ساتھ ان کے کھیل کود کی طرف بھی خاص توجہ دی جاتی تھی۔ سید شاہد حامد صاحب کے زمانہ طالب علمی میں علی گڑھ انٹرمیڈیٹ کالج کے پرنسپل عبدالمجید قریشی تھے۔ جو طلبہ میں بہت مقبول ۔اور نظم وضبط کے پابند تھے وہ بہت سی انسانی خوبیوں سے متصف تھے۔

اسی زمانے میں علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے وائس چانسلر ہو جانے کے بعد جب سر راس مسعود انٹرمیڈیٹ کالج میں پہلی بار آئے تو طلبہ کی طرف سے خیر مقدمی تقریر کے لئے سید شاہد حامد صاحب کو منتخب کیا گیا۔ انگریزی کے پروفیسر پوری نے انھیں تقریر لکھ کر زبانی یاد کرنے کے لئے دے دی۔ سید شاہد حامد صاحب کا بیان ہے کہ "میں نے تقریر تو اچھی طرح یاد کرلی تھی۔ لیکن جب تقریر کرنے کھڑا ہوا تو بھول گیا۔ آخر اسی وقت جس طرح ممکن ہوا اپنے الفاظ میں تقریر کی۔"

علی گڑھ کالج کے ٹرسٹی اور مسلمانوں کی تعلیم میں دلچسپی رکھنے والے ہندوستان کے بہت سے لیڈر درس گاہ میں آتے رہتے تھے۔ اور گھنٹوں طلبہ کے ساتھ مل بیٹھ کر ان کے مسائل پر گفتگو کیا کرتے تھے۔ سید شاہد حامد صاحب کا بیان ہے کہ ایک بار میرے دادا دو افراد کے ساتھ میرے کمرے میں آئے۔ ان میں سے ایک صوبہ سرحد کے صاحبزادہ سر عبدالقیوم اور دوسرے مدراس کے سر محمد عثمان تھے۔

علی گڑھ انٹرمیڈیٹ کالج کے سال آخر میں سید شاہد حامد صاحب کو کالج کی ٹیبل ٹینس کی ٹیم کے کپتان ہونے کی وجہ سے برصغیر کے مختلف شہروں اور کالجوں میں جانا پڑا۔ اس سبب سے وہ تعلیم کی طرف خاطر خواہ توجہ نہ دے سکے۔ علی گڑھ کالج کے اس زمانے کے اساتذہ طلبہ پر انفرادی توجہ دیتے تھے اور ان کے مسائل سے باخبر رہتے تھے۔

چنانچہ اساتذہ نے سید شاہد حامد صاحب سے کہا کہ انھوں نے بہت سا وقت کھیل کود میں نکال دیا ہے۔ لہٰذا اب اس کمی کو دور کیا جانا چاہیئے۔ چنانچہ ہر روز سید صاحب ایک ایک استاد کے گھر جاتے اور وہ ان کو پڑھاتے تھے۔ چنانچہ جب نتیجہ نکلا تو اساتذہ کی اس خصوصی اور بے لوث توجہ کے سبب سید صاحب نے نہایت اچھے نمبر حاصل کئے۔

یونیورسٹی میں داخلہ

سید شاہد حامد صاحب کے والد اپنے بیٹے کو انجینئر بنانا چاہتے تھے۔ چنانچہ جب یونیورسٹی میں داخلے کا وقت آیا تو انھیں کلیۂ سائنس میں داخلہ لینے کو کہا گیا۔ اس وقت سید شاہد حامد صاحب نے ریاضی میں کمزور ہونے کے سبب آرٹس میں داخلہ لینا پسند کیا۔

کمیشن

جب بی اے کے سال آخر میں پہنچے تو اپنے والد کی فرمائش پر سید صاحب نے سنیڈ ہرسٹ ملٹری کالج میں داخلے کے مقابلے کی تیاری شروع کر دی۔ سید صاحب کا بیان ہے کہ جب میں نے وائس چانسلر سے اپنی والد کی خواہش کا تذکرہ کیا تو وہ بہت خوش ہوئے اور انھوں نے فرمایا کہ میں اور یونیورسٹی کے تمام اساتذہ تمھاری پوری پوری مدد کریں گے۔ چنانچہ متعلقہ مضامین کے پروفیسر حضرات تین ماہ تک ان مضامین کی تیاری میں میری مدد کرتے رہے اور میں پہلے ہی مرحلے میں اس امتحان میں کامیاب ہو گیا۔" تحریری مقابلے میں تین سو امیدوار شریک ہوئے تھے۔ سید شاہد حامد صاحب تمام امیدواروں میں اوّل نمبر پر آئے۔ اور منتخب ہونے والے اولین دس لڑکوں میں بھی ان کا نمبر پہلا تھا۔

جملہ اہلِ خاندان کو بالعموم اور خان بہادر سید حامد حسین کو بالخصوص اپنے بیٹے کی اس کامیابی پر بہت زیادہ خوشی ہوئی۔

سینڈہرسٹ روانگی اور تعلیم

۱۹۳۲ء میں سید شاہد حامد صاحب لکھنؤ سے روانہ ہوئے۔ بھوپال ریلوے اسٹیشن پر خان بہادر سید جعفر حسین نے جو اس زمانے میں بھوپال میں ملازم تھے۔ انھیں ایک ہزار روپیہ دیا اور تاکید کردی کہ کسی سے اس کا ذکر مت کرنا۔

بمبئی پہنچ کر بذریعہ بحری جہاز سید صاحب اپنے دوسرے ساتھیوں کے ہمراہ انگلستان روانہ ہوئے۔ نیا ملک جس کو دیکھنے کی ہر نوجوان ہندوستانی میں تمنا تھی۔ اپنی پوری جلوہ سامانیوں کے ساتھ ان کے سامنے تھا۔ سینڈہرسٹ پہنچنے کے دوسرے دن ہی سے تربیت کا آغاز ہوگیا۔ سینڈہرسٹ کالج کی زندگی کا ایک ایک پل قواعد وضوابط میں جکڑا ہوا تھا۔ یہاں طلبہ کو تمام من مصروف رہنا پڑتا تھا۔ سخت کوشی کی زندگی تھی۔ اور ابتدائی دنوں میں نوواردطلبہ کا گھبرا جانا فطری بات تھی۔ تاہم صبر وتحمل سے کام لیتے جانے کے بعد دو تین ہفتوں میں ہی انسان اس زندگی کا عادی ہو جاتا تھا۔

سینڈہرسٹ کالج میں پڑھائی کے ساتھ ساتھ سید صاحب کھیلوں میں بھی نمایاں تھے۔ یہاں وہ ہاکی اور ٹینس کھیلا کرتے تھے۔ وہ کالج کی ٹینس کی ٹیم کے رکن تھے اور انھیں ٹینس بلیو کلر ملا ہوا تھا۔

سینڈہرسٹ میں اس زمانے میں بعض انگریز ہم جماعتوں کے گھروں میں بھی سید شاہد حامد صاحب کو آنے جانے کا اتفاق ہوا۔ مشہور ادیب وشاعر اور مجسمہ ساز لارڈ ڈنسینی LORD DUNSANY کے صاحبزادے بھی سید صاحب کے ہم جماعت تھے۔ چنانچہ سید صاحب کو لارڈ ڈنسینی سے بھی ملاقات کا موقع ملا۔

سینڈہرسٹ میں اس زمانے میں جان ماسٹرز بھی زیر تعلیم تھے۔ جو بعد میں بحیثیت

مصنف بہت مشہور ہوئے جان ماسٹرز، سینڈ ہرسٹ کالج کے بورڈنگ ہاؤس میں سید صاحب کے برابر کے کمرے میں رہا کرتے تھے۔ دونوں میں آج بھی دوستانہ مراسم ہیں۔ اور جان ماسٹرز امریکہ سے پابندی کے ساتھ سید صاحب سے خط و کتابت کرتے ہیں۔

پاسنگ آؤٹ پریڈ

سینڈ ہرسٹ ملٹری کالج سے فارغ التحصیل ہونے والے طلبہ کی پاسنگ آؤٹ پریڈ کے معائنے کے لئے ملکہ وکٹوریہ کے بیٹے ڈیوک آف کناٹ تشریف لائے تھے۔ سید شاہد حامد صاحب اور ان کے باقی ساتھیوں کو شہنشاہ جارج پنجم کے دستخطوں سے کمیشن دیا گیا تھا۔

ہندوستان واپسی اور پہلی تقرری

کمیشن ملنے کے بعد جب سید شاہد حامد صاحب واپس ہندوستان پہنچے۔ تو ان کا پہلا تقرر الہ آباد میں ایک انگریزی رجمنٹ میں کیا گیا۔ یہ تقرر ان کی فرمائش پر ہی کیا گیا تھا۔ کیونکہ مرزا پور الہ آباد سے قریب تھا۔ جہاں ان کے والد خان بہادر سید حامد حسین صاحب تعینات تھے۔

ان دنوں الہ آباد برصغیر کی سیاست کا گڑھ بنا ہوا تھا۔ اور فرقہ دارانہ کشیدگی کے مناظر بھی عام دیکھنے میں آتے تھے۔ یہیں سید صاحب کی ملاقاتیں پنڈت موتی لال نہرو اور سر تیج بہادر سپرو سے ہوئیں۔

برطانوی کمپنی کا قیام شہنشاہ اکبر کے تعمیر کردہ عظیم الشان قلعہ میں تھا۔ جہاں لب دریا اکثر پارٹیاں وغیرہ بھی ہوتی تھیں۔ انسان کا مشغلہ پولو کھیلنا تھا۔

تبادلہ

برطانوی رجمنٹ میں تقریباً ایک سال تک سید شاہد حامد صاحب نے فرائض سرانجام دیئے۔ اس کے بعد برطانوی رجمنٹ نے

حکومت سے درخواست کی کہ سید صاحب کا تبادلہ برطانوی فوج کے انڈین یونٹ میں نہ کیا جائے اور انھیں مستقل طور پر اسی رجمنٹ کے ساتھ وابستہ رہنے دیا جائے۔ لیکن جنرل ہیڈ کوارٹرز نے اس درخواست کو نامنظور کر دیا۔

یہاں سے سید صاحب کا تبادلہ تھرڈ کیولری میں ہو گیا۔ تھرڈ کیولری کے افسران کو شاہانہ زندگی گزارنا پڑتی تھی۔ ان کے مصارف ان کی تنخواہوں کے مقابلے میں بہت زیادہ ہوتے تھے۔ چنانچہ اپنے بیٹے کے مصارف کو خان بہادر سید حامد حسین صاحب نے برداشت کیا۔ یہیں ایک بار گھوڑ سواری کے دوران سید شاہد صاحب گھوڑے سے گر پڑے۔ اور ان کا بازو ٹوٹ گیا۔ علاج کی غرض سے سید صاحب کو ویانا جانا پڑا جہاں مشہور ڈاکٹر بولر (BOWER) نے ان کا علاج کیا۔ اور بازو دوبارہ ٹھیک ہو گیا۔

قاضی عیسیٰ

انگلستان کے زمانہ قیام میں سید صاحب کی ملاقات مشہور مسلم لیگی اور قائد اعظم کے قریبی دوست قاضی عیسیٰ سے ہوئی تھی۔ قاضی عیسیٰ انگلستان میں بیرسٹری کی تعلیم حاصل کرنے کے لئے گئے تھے۔ وہیں ان کی ملاقات سید صاحب سے ہوئی۔ بعد میں دوستی کا یہ تعلق بڑھکر رشتہ داری میں تبدیل ہو گیا۔ اور سید صاحب کی بہن سیدہ بیگم کی شادی قاضی عیسیٰ سے ہو گئی۔ سیدہ بیگم خود بھی بہت پڑھی لکھی خاتون ہیں۔ اور انھوں نے تحریک پاکستان کے زمانے میں انگریزی میں ایک کتاب (A NATION BETRAYED) لکھی تھی۔ قائد اعظم کو یہ کتاب بہت پسند تھی۔ اور جب لوگ ان سے پاکستان کے بارے میں کوئی سوال کرتے تھے تو وہ انھیں اس کتاب کے پڑھنے کا مشورہ دیا کرتے تھے۔

سید شاہد حامد صاحب کی ایک اور بہن سیدہ رضیہ بیگم کی شادی جنرل انیس احمد خاں

سے ہوئی تھی۔ جو صاحبزادہ آفتاب احمد خاں کے چھوٹے بھائی تھے۔ اور سیدہ جمیلہ بیگم کی شادی ظفر عمر صاحب کے بیٹے شوکت عمر سے ہوئی تھی۔

قائد اعظم سے پہلی ملاقات

لندن میں سب سے پہلے سید شاہد حامد صاحب اور قاضی عیسٰی کی ملاقات قائد اعظم سے ہوئی تھی چنانچہ اس ملاقات کے بارے میں ان کا کہنا ہے۔" ایک بار میں لندن گیا ہوا تھا۔ اور قاضی عیسٰی اور چند دوسرے دوست لندن کے پارک لین ہوٹل کے ہال میں بیٹھے ہوئے چائے پی رہے تھے۔ یکایک ہماری نگاہیں ہال میں داخل ہونے والے ایک شخص کی طرف بے اختیار اٹھ گئیں۔ جو سیڑھیوں سے اتر کر میزوں کے درمیان چلتا ہوا کسی خالی میز کی طرف جا رہا تھا اپنی وضع قطع اور طور طریق سے نوادر تمام لوگوں میں ممتاز اور منفرد نظر آ رہا تھا۔ ہم لوگوں نے ایک دوسرے سے اس شخص کے بارے میں پوچھا لیکن کوئی بھی اس سے واقف نہیں تھا۔ میرے خیال میں اس شخص نے بھی اندازہ لگا لیا تھا کہ ہم اس کے بارے میں گفتگو کر رہے ہیں۔ چنانچہ وہ ہمارے پاس آ کر ٹھہرا۔ ہم اس کے احترام میں کھڑے ہو گئے اس نے اپنا تعارف کراتے ہوئے کہا۔" میرا نام محمد علی جناح " ہے۔ آپ لوگ کہاں سے تشریف لائے ہیں؟ اور انگلستان میں کس سلسلے میں مقیم ہیں۔ ہم لوگوں نے اپنا تعارف کرایا۔ وہ پانچ منٹ تک ہم لوگوں کے پاس ٹھہرے رہے اور پھر واپس چلے گئے یہ ہماری قائد اعظم سے پہلی ملاقات تھی۔ بعد ازاں قائد اعظم سے گول میز کانفرنس اور مختلف پارٹیوں اور کانفرنسوں میں سید صاحب اور قاضی عیسٰی کی ملاقاتیں ہوتی رہیں۔

علامہ اقبال سے روابط

اسی زمانے میں انگلستان میں سید شاہد حامد صاحب کی ملاقاتیں علامہ اقبال سے بھی ہوئیں۔ علامہ اقبال

نے انھیں وہ نظم اپنے قلم سے لکھ کر دی تھی۔ جو ان کے مجموعہ کلام میں" جاوید کا پہلا خط آنے پر" کے عنوان کے تحت شامل ہے۔

جہانِ شوق میں اپنا مقام پیدا کر — نیا زمانہ نئے صبح و شام پیدا کر
خدا اگر دل فطرت شناس دے تجھکو — سکوت لالہ و گل سے کلام پیدا کر
مرا طریق امارت نہیں! امجت ہے — خودی نہ بیچ غریبی میں نام پیدا کر

اس نظم پر ۱۸ر دسمبر ۱۹۳۲ء کی تاریخ پڑی ہوئی ہے۔ علامہ اقبال نے بعد میں اس نظم کے آخری شعر کے مصرعہ اوّل میں مندرجہ ذیل تبدیلی کی تھی۔

مرا طریق امیری نہیں فقیری ہے

پونا میں تقرری

۱۹۳۹ء میں سید صاحب کا تبادلہ پونا کر دیا گیا۔ اس زمانے میں لندن سے واپسی کے بعد قاضی عیسٰی بمبئی میں وکالت کا آغاز کر چکے تھے۔ اور قائد اعظم بھی ان دنوں بمبئی میں ہی مقیم تھے۔ چنانچہ ہفتہ واری تعطلات میں سید شاہد حامد صاحب اپنے بہنوئی اور گہرے دوست قاضی عیسٰی سے ملنے بمبئی جاتے رہتے تھے۔ اور ہر بار قاضی عیسٰی کے ساتھ قائد اعظم کی خدمت میں بھی حاضر ہوتے تھے۔ سید صاحب کا بیان ہے کہ" اکثر شاموں کو ہم قائدِ اعظم کی خدمت میں حاضر ہوتے۔ ایک ملاقات میں مَیں نے ان سے کہا کہ فوج کے افراد کے لئے ان کا کیا پیغام یا نصیحت ہے؟" قائدِ اعظم نے جواب دیا کہ انھیں چاہیئے کہ اپنے پیشے میں مہارت پیدا کریں۔"

اس زمانے میں دوسری جنگِ عظیم کا آغاز ہو چکا تھا۔ اور جاپانی جنگ میں فتوحات کرتے ہوئے برما تک آ گئے تھے۔

برما کے محاذ پر

دوسری جنگ عظیم کے دوران سید شاہد حامد صاحب کا تبادلہ پہلے فورٹ سنڈیمان کا ہوا۔ اور وہاں سے انھیں برما کے جنگی محاذ پر بھیج دیا گیا۔ جس وقت سید صاحب برما کے محاذِ جنگ پر پہنچے ہیں تو جاپانیوں کا حملہ ہو چکا تھا۔ محاذِ جنگ سے دوبارہ ان کا تبادلہ سٹاف کالج کوئٹہ میں بطور انسٹرکٹر کر دیا گیا۔ اور تھوڑے ہی عرصہ کے بعد دوبارہ محاذِ جنگ پر بھیج دیا گیا۔ جہاں کچھ عرصہ خدمات انجام دینے کے بعد دوبارہ سٹاف کالج کوئٹہ میں تدریسی ذمے داریاں سونپ دی گئیں۔

شادی

کوئٹہ کے ہی دوران قیام ۱۹۴۰ء میں سید صاحب نے ڈاکٹر عطا اللہ بٹ کی صاحبزادی طاہرہ سے شادی کی۔ ڈاکٹر عطا اللہ بٹ علیگڑھ مسلم یونیورسٹی میں میڈیکل آفیسر تھے۔ طاہرہ بیگم آمنہ مجید ملک کی بہن ہیں اور اس رشتے سے کرنل مجید ملک، سید صاحب کے ہم زلف ہیں۔

لکھنؤ میں

۱۹۴۵ء میں جب لکھنؤ میں خان بہادر سید حامد حسین صاحب کا انتقال ہوا تو سید شاہد حامد صاحب کا تبادلہ لکھنؤ کر دیا گیا۔ یہاں کچھ عرصہ تعینات رہے۔ اس کے بعد ۳۹ دیں ڈویژن کے A & O کے حیثیت سے ان کی تعیناتی ہوئی۔

کمانڈر انچیف کے سیکرٹری

۳۹ دیں ڈویژن میں خدمات کی انجام دہی کے دوران سید شاہد حامد صاحب کو افواج ہند کے کمانڈر انچیف کے پرائیویٹ سیکرٹری کے لئے منتخب کر لیا گیا۔ سید شاہد حامد صاحب پہلے ہندوستانی افسر تھے جنھیں اس عہدے کے لئے منتخب کیا گیا تھا۔

اس وقت کمانڈر انچیف فیلڈ مارشل سر کلاڈی آک لنک تھے۔ سید صاحب اس

وقت کرنل کے عہدے پر فائز تھے۔ اس سے قبل نہ تو ان کی کبھی فیلڈ مارشل سے ملاقات ہوئی تھی اور نہ ہی وہ کبھی دلّی گئے تھے اور وہاں کسی کو جانتے تھے۔

تقریباً دو برس تک سید شاہد حامد صاحب کمانڈر انچیف کے سیکرٹری کے عہدے پر فائز رہے۔ یہ برصغیر پاک و ہند کی سیاسی تاریخ کا نازک ترین دور تھا۔ آزادی کی منزل قریب آچکی تھی۔ اس وقت برصغیر میں انگریزی حکومت کی تمام تر قوت کی علامتیں دو تھیں۔ ایک وائسرائے ہند اور دوسرے کمانڈر انچیف۔

اس زمانے میں قائد اعظم بھی دلّی میں منتقل ہو چکے تھے۔ سید شاہد حامد صاحب حالانکہ ایک ذمے دار سرکاری عہدے پر فائز تھے لیکن سیاسی لیڈروں اور کارکنوں سے ملنے جلنے پر کوئی پابندی نہیں تھی۔ مسلم لیگ کے بہت سے زعما اور قائدین سے سید صاحب کے ذاتی اور خاندانی مراسم تھے۔ ان لوگوں میں خواجہ ناظم الدین، لیاقت علیخاں اور سر نواب اسماعیل خاں وغیرہ شامل ہیں۔ یہ لوگ جب دلّی آتے تو سید شاہد حامد صاحب کی سرکاری قیام گاہ پر ہی رہائش اختیار کرتے تھے۔

مشہور کانگریسی لیڈروں پنڈت نہرو، مہاتما گاندھی۔ سر تیج بہادر سپرو، سردار پٹیل، مولانا ابوالکلام آزاد وغیرہ سے بھی اس زمانے میں سید صاحب کو ملنے اور انھیں قریب سے دیکھنے کا موقع ملا۔ برصغیر کے ممتاز کمیونسٹ لیڈروں سے بھی سید صاحب کی ملاقاتیں ہوئیں۔ ان کی ایک بہن سیدہ جمیلہ بیگم اشتراکی خیالات رکھتی تھیں۔ ان کا تعلق انجمن ترقی پسند مصنفین سے تھا۔ اور سجاد ظہیر اور بالخصوص مجاز لکھنوی سے ان کے مراسم تھے اور وہ بہت سرگرم ترقی پسند خاتون تھیں۔ شروع شروع میں وہ قیام پاکستان کے حق میں نہ تھیں۔ چنانچہ ایک بار بہن کی فرمائش پر سید شاہد حامد صاحب انھیں قائد اعظم سے ملاقات کے لئے لے گئے۔ سید صاحب کا بیان ہے کہ قائد اعظم اپنے مخصوص دھیمے دھیمے لہجے میں ان کی بہن کے ہر سوال

کا جواب دیتے گئے۔ حتیٰ کہ ایک موقع ایسا آیا کہ جب مجھے احساس ہوا کہ میری بہن سوالات کرنے میں حد ادب سے بڑھنے لگی ہیں تو میں نے انھیں ٹوکا۔ لیکن قائد اعظم نے مجھے منع فرما دیا اور کہا کہ انھیں آزادی سے سوال کرنے دو۔ بالآخر وہ قائد اعظم کے دلائل سے متاثر ہو کر اٹھیں اور اس دن سے قیام پاکستان کی زبردست حامی بن گئیں۔ اور بعد ازاں خواجہ ناظم الدین کے ہمراہ بنگال میں پاکستان کے لئے بہت کچھ کام کیا۔ افسوس کہ جوانی میں ہی ان کا انتقال ہو گیا۔

دلی میں قائد اعظم سے ملاقات

کمانڈر انچیف کے سیکرٹری کے فرائض کی انجام دہی کے ان دو برسوں کے دوران سید صاحب کو قائد اعظم سے کم و بیش روزانہ ملنے کا موقع ملتا رہا۔ قائد اعظم نے ان سے کہہ رکھا تھا کہ وہ وقت طے کئے بغیر کسی بھی وقت ان سے ملاقات کرنے آ سکتے ہیں۔

سید شاہد حامد صاحب کا بیان ہے کہ ایک بار قائد اعظم نے ان سے دریافت کیا کہ فوجی افسران ان کے بارے میں کیا تاثر رکھتے ہیں۔ میں نے جواب دیا کہ وہ آپ کو بہت کم آمیز خیال کرتے ہیں۔" اس کے بعد میں نے فوج کے افسران سے قائد اعظم کی ملاقات کرانے کے لئے اپنی کوٹھی پر ایک دعوت کا اہتمام کیا۔ جس میں کمانڈر انچیف سمیت ۱۵۰ فوجی افسران نے شرکت کی۔ اس میں ہندو اور مسلمان سب افسران شریک تھے۔ بعض ہندو جنرل بھی اس میں شریک تھے۔ جب قائد اعظم تشریف لائے تو ان کا تعارف قطار میں کھڑے ہوئے تمام فوجی افسران سے کرایا گیا۔ ایک مسلمان فوجی افسر نے تعارف کے بعد قائد اعظم سے دریافت کیا کہ پاکستان میں ہم لوگوں کی ترقی کے کیا امکانات ہیں"۔ قائد اعظم نے اس بات پر سخت ناپسندیدگی کا اظہار کیا۔

سید شاہد حامد صاحب فرماتے ہیں کہ" برطانوی ہائی کمان متعینہ ہندوستان میں

ہونے والے تمام واقعات سے وہ قائدِ اعظم کو ان کی خواہش کے مطابق مطلع کرتے رہتے تھے۔ چنانچہ جب لندن سے اس مضمون کا کیبل آیا کہ تقسیم ہند کو تسلیم کیا جا چکا ہے۔ اور اب براہِ راست قیام پاکستان کے موضوع پر مذاکرت ہوں تو میں اسی وقت (یہ دوپہر کا وقت تھا) قائدِ اعظم کی رہائش گاہ پر گیا۔ قائدِ اعظم اس وقت اوپر جا چکے تھے۔ بہر حال اطلاع ملتے ہی ملاقات کے کمرے میں تشریف لائے اور جب میں نے انھیں صورت حال بتائی تو وہ بہت خوش ہوئے لیکن اس کے ساتھ ساتھ یہ ضرور پوچھا "کیا تمھیں یقین ہے"۔ میں نے جواب دیا کہ "میں خود کیبل کو پڑھ کر آرہا ہوں"۔

کمانڈر انچیف کے ہمراہ سید شاہد حامد صاحب کو برصغیر کے تمام علاقوں کے لیڈروں اور ان علاقوں میں تعینات اعلیٰ فوجی افسروں سے ملنے جلنے کے مواقع ملتے رہے۔ ہر دوسرے تیسرے مہینے انھیں مختلف سرکاری کانفرنسوں کے سلسلے میں کمانڈر انچیف کے ہمراہ انگلستان جانا پڑتا تھا۔

لارڈ ویول اسی زمانے میں سید شاہد حامد صاحب کو لارڈ ویول سے بھی ملاقات کا بارہا موقع ملا۔ ان کے خیال میں "لارڈ ویول ایک عظیم وائسرائے ایک عظیم جرنیل اور ایک عظیم انسان تھا"۔ لارڈ ماؤنٹ بیٹن سے بھی سید صاحب کو ملاقاتوں کا موقع ملا۔ لیکن اس کی شخصیت ان کی نظر میں ناپسندیدہ ہی ٹھہری۔ ان کے خیال میں لارڈ ماؤنٹ بیٹن بہت سطحی آدمی (SHOW BOY) تھا۔ جب ہندوستان میں کیبنٹ مشن آیا تو اس کے اراکین سے بھی سید شاہد حامد صاحب کو ملاقات کا موقع ملا۔ اس طرح انھیں تحریک پاکستان نہایت قریب سے دیکھنے کا موقع ملا ہے۔

فیلڈ مارشل آکن لیک

فیلڈ مارشل لارڈ آکن لیک بھی بہت خوبیوں کا مالک تھا سید شاہد حامد صاحب کو اس کی شخصیت نے بہت متاثر کیا۔ وہ بھی سید صاحب کو بہت زیادہ پسند کرتا تھا۔ اور ان کے بچوں سے بہت محبت رکھتا تھا۔ سید صاحب کا بیان ہے کہ جب بھی وہ ہندوستان یا انگلستان سرکاری کام سے جاتے تو واپسی پر ان کے بچوں کے لئے کھلونے ضرور لاتے تھے۔

تقسیم ملک کے وقت اسے ہندوستانی افواج کا کمانڈر انچیف بنایا گیا تھا۔ چنانچہ اس نے سید صاحب سے کہا کہ وہ ہندوستان ہی میں رہیں اور یہاں ان کی ترقی کے زیادہ مواقع ہو سکتے ہیں۔ لیکن سید صاحب نے اپنے اس معزز کرمفرما کے مشورے کو قبول نہ کیا اور پاکستان چلے آئے۔

پاکستان میں آمد

قیام پاکستان کے فوری بعد سید شاہد حامد صاحب نے رخت سفر باندھا اور جنرل ہیڈ کوارٹرز میں آکر رپورٹ کی۔ بعد میں ان کے اہل خانہ بھی ہندوستان سے پاکستان پہنچ گئے۔

نیشنل گارڈز کی تنظیم

قیام پاکستان کے بعد سید شاہد حامد صاحب کو بریگیڈیر کے عہدے پر ترقی ملی۔ اسی زمانے میں قائد اعظم نے انہیں پاکستان نیشنل گارڈز کو بنانے اور اسے منظم کرنے کی ذمے داری سونپی۔ یہ بڑی ذمے داری کا کام تھا۔ نیشنل گارڈز اپنی اہمیت کے اعتبار سے کسی بھی ملک کی دوسری دفاعی لائن ہوتی ہے۔ سید شاہد حامد صاحب نے اس کی ۵۶ بٹالینیں تشکیل دے دی تھیں۔ لیکن قائد اعظم کے بعد اس زمانے کے بعض ارباب حل و عقد نے اس عظیم اور ضروری اسکیم کو تشنۂ تکمیل ہی چھوڑ دیا۔

پاکستان انٹر سروسز انٹلی جنس کی تشکیل

اس کے بعد سید صاحب کو پاکستان انٹر سروسز انٹیلیجنس کو جدید خطوط پر تشکیل دینے کی ذمے داری سونپی گئی۔ اس زمانے میں یہ بہت دشوار کام تھا۔ بالخصوص ان حالات کی بنا پر کہ بھارت سے تعلقات بہت خراب تھے۔

ماسٹر جنرل آف آرڈیننس

۱۹۵۰ء میں سید شاہد حامد صاحب نے علی الترتیب پشاور بریگیڈ اور کوہاٹ بریگیڈ کی کمان کی ۱۹۵۱ء میں انھیں ماسٹر جنرل آف آرڈیننس کے عہدے پر ترقی دے دی گئی۔ یہاں انھوں نے چھ برس تک خدمات سرانجام دیں۔ یہ کام سید صاحب کے لئے نیا بھی تھا اور دشوار بھی۔ کیونکہ ایک نئی مملکت کی فوج کی تشکیل اور اس کے لئے جملہ ساز و سامان کی فراہمی ایک نہایت دشوار اور کٹھن معاملہ تھا۔ لیکن سید صاحب نے اپنی بے پناہ محنت اور لگن سے کام لیا۔ اس عہدے پر فائز رہتے ہوئے انھوں نے تمام دنیا کا دورہ کیا۔ بالخصوص بڑے ملکوں کے دورے کئے۔ اور پاکستانی فوج کے لئے جدید ترین اسلحہ جات کی خریداری اور فراہمی کے لئے ریاست ہائے متحدہ امریکہ سے حکومت کی ہدایات کے مطابق معاہدے کئے۔

مارشل لاء

۱۹۵۸ء میں جب ایوب خاں نے ملک میں مارشل لاء نافذ کیا تو سید شاہد حامد صاحب اڈجوٹنٹ جنرل اور اسٹاف کے سینئر ترین افسر تھے۔ سید شاہد حامد صاحب کا بیان ہے کہ جب ایوب خان نے مارشل لاء لگایا تو مجھ سے اس بات کو پوشیدہ رکھا۔ کیونکہ ایوب خاں میرے نظریات سے بخوبی آگاہ تھے۔ اور وہ جانتے تھے کہ میں کبھی بھی ان کو آئین کو منسوخ کرنے اور عنانِ حکومت سنبھالنے کا مشورہ نہیں دوں گا۔ چنانچہ میں نے بھی اس ملک کے کروڑوں شہریوں کی طرح صرف ریڈیو پر مارشل لاء کے نفاذ

کا اعلان سنا۔ جب جنرل محمد موسیٰ کمانڈر انچیف کی حیثیت سے آئے تو ان سے بھی اختلافات رہے۔ چنانچہ ایک روز ایوب خاں نے بحیثیت صدرِ پاکستان مجھے بلا کر دریافت کیا کہ آیا میں موجودہ عہدے پر فائز رہتے ہوئے ان کے ساتھ کام کرنا پسند کروں گا"۔ میرے انکار پر انھوں نے مجھے اسمال انڈسٹریز کارپوریشن کو منظم کرنے کا کام سونپ دیا۔ اور میں نے اس نئی ذمے داری کو قبول کرتے ہوئے فوج سے علیحدگی اختیار کر لی۔

سید شاہد حامد صاحب کا بیان ہے کہ جب اسمال انڈسٹریز کو منظم کر چکا تو اس کے بعد دوبارہ صدر ایوب خاں سے میرے اختلافات ہو گئے۔ اور میں نے اس ذمے داری سے بھی استعفیٰ دے دیا۔

ان کا کہنا ہے کہ ایوب خان سے تا زندگی میرے دوستانہ مراسم رہے اور اقتدار سے علیحدگی کے بعد بھی میری ان سے برابر ملاقاتیں ہوتی رہتی تھیں۔ ایوب خان اپنے حلقہ احباب میں کہا کرتے تھے کہ "سید شاہد حامد وہ تنہا آدمی ہے کہ جس نے نہ تو کبھی میرے زیرِ کمان رہتے ہوئے کچھ مانگا اور نہ ہی جب میں صدرِ مملکت ہوں تو کبھی کسی چیز کا طلب گار ہوا ہے"۔

اولاد

سید شاہد حامد صاحب کے سب سے بڑے صاحبزادے حسن حامد ہیں ان کی تعلیم کیمبرج اور مانچسٹر میں ہوئی۔ اور لندن اسکول آف اکنامکس کے فارغ التحصیل ہیں۔ فلپس لندن میں ملازم ہیں۔ دوسرے صاحبزادے علی حامد ہیں۔ جو پاک فوج میں میجر کے عہدے پر فائز ہیں۔ ایک بیٹی شہناز کی شادی گائیڈس کیولری کے کرنل جعفر سے ہوئی ہے اور دوسری بیٹی شمع کی شادی ڈاکٹر ممتاز حسین سے ہوئی ہے۔ جو لندن میں پریکٹس کرتے ہیں۔

زندگی گزار

ان دنوں میجر جنرل (ریٹائرڈ) سید شاہد حامد صاحب راولپنڈی میں رہے ہیں۔ سید صاحب ایک نیک دل، خدا ترس اور پابند صوم و صلوٰۃ آدمی ہیں۔

خاندان حقیقت کی چند دوسری شخصیات

مولوی محمد حسین لندنی مولوی محمد حسین، محمد حسین لندنی کے نام سے معروف ہیں۔ یہ محسن کے سب سے بڑے لڑکے، اور خان بہادر سید جعفر حسین کے سب سے بڑے بھائی تھے۔ انگریزوں کے زمانے میں یہ صوبہ جات متحدہ یوپی کے پہلے مسلمان تھے جو اعلیٰ تعلیم کے لیے انگلستان گئے تھے۔ انگلستان سے مسافر لندن کے نام سے خطوط اور ڈائریاں بھی لکھتے رہے تھے جو اس زمانے کے اردو اخبارات میں شائع ہوتے تھے۔ لندن میں ایک روز یہ شاہی محل کے قریب سے گزر رہے تھے۔ محل میں اوپر کہیں مرمت وغیرہ کا کام ہو رہا تھا۔ ایک اینٹ ان پر آگری جس سے ان کی ٹانگ کی ہڈی ٹوٹ گئی۔ ملکہ وکٹوریہ نے جن کی رحم دلی مشہور زمانہ ہے، انہیں اپنا منہ بولا بیٹا بنا لیا۔ انہی کے خرچ پر لندن میں زراعت کی تعلیم حاصل کی۔

ہندوستان واپس آکر محکمہ زراعت میں ملازم ہوئے اور ترقی کرتے کرتے ڈپٹی ڈائرکٹر کے عہدے تک پہنچے۔ کان پور زراعتی کالج کے پرنسپل بھی رہے۔ تصنیف و تالیف کا شوق تھا فن زراعت پر کئی کتابیں لکھیں۔ جو شائع بھی ہو چکی ہیں۔ پاکستان و ہند کی لائبریریوں میں تلاش بسیار کے باوجود ان کی تصنیف کردہ کتب نہ مل سکیں۔ البتہ کتابوں کے بعض نسخے انڈیا آفس لائبریری میں موجود ہیں۔ یہ بڑے اچھے شاعر بھی تھے۔ ان کا کلام بھی اب دستیاب نہیں

ہو سکا۔ خوب صورت اور وجیہہ شکیل انسان تھے۔

محمد فضل امین | خان بہادر سید جعفر حسین کی سب سے چھوٹی صاحب زادی ستیدہ ممتاز جہاں بیگم، محمد فضل امین سے منسوب تھیں۔

مولوی محمد فضل امین اس صدی کے اوائل میں خیرآباد ضلع اودھ کے علما کے ایک نامور خاندان میں پیدا ہوئے۔ ان کے جد امجد علامہ فضل امام خیرآبادی تھے جن کی علمیت تقدس اور پاکیزہ شخصیت سے سرسید احمد خان بہت متاثر تھے۔ اور ان کا ذکر آثار الصنادید میں نہایت عقیدت و احترام سے کیا ہے مولانا فضل امام کا انتقال ۱۸۶۴ء میں ہوا۔ غالب نے ان کی تاریخ وفات کہی تھی:

یہ صاحب تصنیف تھے۔ فارسی سیکھنے کے لیے ان کی تالیف آمد نامہ ہے۔ علاوہ ازیں منطق میں مشہور تصنیف مرقات ہے۔ اور رسالہ میرزا ملا جلال اور افق المبین کے حواشی بھی لکھے تھے۔ دہلی میں صدر الصدور رہے۔

علامہ فضل امام کے بڑے صاحب زادے مولانا فضل حق خیرآبادی تھے جن کے نام اور کارناموں سے برصغیر کا ہر حریت پسند شخص بخوبی واقف ہے۔ یہ بھی اپنے زمانے کے جید عالم تھے۔ اور مومن و غالب اور معاصر مشاہیر شعرا، و ادبا سے ان کے گہرے تعلقات تھے۔

انہوں نے شاہنشاہ کو جہاد آزادی کے دوران ایک جمہوری کونسل کے ذریعے حکومت کرنے کا مشورہ دیا تھا۔ جو آئین علامہ فضل حق خیرآبادی نے بنایا تھا۔ وہ شائع ہو چکا ہے۔ اس میں پہلی بار دور ملوکیت میں ایک ہر دل عزیز عوامی حکومت کا منشور پیش کیا گیا تھا۔

بغاوت میں سرگرم حصہ لینے کی بنا پر انہیں برطانوی حکومت کی قید و بند کی صعوبتوں سے گزرنا پڑا۔ اور کالے پانی جلا وطن کر دیا گیا۔ [redacted]

[illegible] الثوریۃ الہندیہ اور قصائد فتنۃ الہند اُن کی وہ تصانیف ہیں جن سے بغاوت کے اسباب و واقعات پر روشنی پڑتی ہے۔

مولوی فضل حق خیرآبادی کا انتقال انڈیمان میں ہی ہوا۔ اس کے بعد بھی مدت تک برطانوی ہندوستان کے علاقوں میں ان کے اہل خاندان کے لیے حالات سازگار نہ تھے۔

چناں چہ فضل حق خیرآبادی کے چھوٹے بھائی نے جو ریاست پٹیالہ میں وزیر تھے وطن واپس آنے کا خیال ہی ترک کر دیا۔ یہی مولوی فضل امین کے دادا تھے۔ جو ریاست میں وزیر مالیات تھے۔ ان کے بیٹے ریاست میں جج کے منصب پر فائز تھے۔ انہی کے ہاں مولوی فضل امین آج سے تقریباً ستر اسّی برس قبل پیدا ہوئے۔

مولوی فضل امین نے ابتدائی تعلیم حاصل کرنے کے بعد علی گڑھ یونیورسٹی کا رُخ کیا جہاں تعلیم حاصل کرنے کی خواہش اس زمانے کے ہر نوجوان مسلمان کو ہوتی تھی۔ زمانہ طالب علمی میں علی گڑھ کے نامور طلبا میں ان کا شمار ہوتا تھا۔ ۱۹۱۲ء میں انہوں نے سردار اورنگ زیب خان سابق وزیر اعلیٰ صوبہ سرحد کو شکست دے کر علی گڑھ مسلم یونیورسٹی یونین کا انتخاب جیتا تھا۔ اور یونین کے نائب صدر ہوئے تھے۔

مولوی فضل امین کو انگریزی اور اردو دونوں زبانوں پر عبور حاصل تھا۔ اور وہ دونوں زبانوں کے بڑے اچھے مقرر تھے۔ یونیورسٹی کے اردو انگریزی مباحثوں میں انہوں نے مشہور ہیرلڈ کوکس اسپیکنگ پرائز وغیرہ جیتے تھے۔ یونیورسٹی رائڈنگ کلب کے ممبر تھے۔ اور گھڑسواری کے بھی کئی مقابلے جیتے تھے۔

جنگ بلقان کے زمانے میں مولوی فضل امین مسلم اسکول علی گڑھ کے طالب علم تھے۔ اس وقت ان کی عمر تقریباً بارہ تیرہ برس تھی لیکن جذبۂ حریت سے سرشار تھے۔ انہوں نے ایک

باغیانہ مضمون لکھ کر مولانا حسرت موہانی کے پرچے اردوئے معلیٰ کو بھیجا جس کی اشاعت کی پاداش میں مولانا حسرت موہانی کو قید و بند کی صعوبتوں سے گزرنا پڑا اور ان کا نادر کتب خانہ ساٹھ روپے میں نیلام ہوا لیکن حسرت موہانی نے مضمون نگار کا نام حکومت کو بتانے سے انکار کر دیا اور تمام تر ذمے داری اپنے اوپر لے لی تھی۔

عبدالرحمٰن پشاوری، مولوی فضل امین کے کلاس فیلو تھے۔ اور انہی کی ترغیب پر عبدالرحمٰن پشاور ہی ترکی گئے تھے۔ جہاں انہوں نے اعلیٰ خدمات انجام دیں اور ترکی میں ہی سکونت اختیار کر لی تھی۔ بعد میں عرصہ تک افغانستان میں ترکی کے سفیر کے فرائض بھی سرانجام دیئے تھے۔ وہیں ان کو گولی مار کر شہید کر دیا گیا تھا۔

مولوی فضل امین نے علی گڑھ یونیورسٹی سے ایم کا امتحان امتیاز کے ساتھ پاس کیا جب تعلیم سے فراغت پانے کے بعد گھر واپس لوٹے تو خاندان کے معاشی حالات دگرگوں ہو چکے تھے۔ اس کی وجہ ان کے والد خان بہادر سردار فضل متین جج ہائی کورٹ ریاست پٹیالہ کی قبل از وقت ریٹائرمنٹ تھی۔ مہاراجہ بھوپندر سنگھ اپنے چند سسرالی عزیزوں پر جھوٹے مقدمات چلا کر انہیں ذلیل و خوار کرنا چاہتا تھا۔ خان بہادر فضل متین نے انصاف کا دامن نہ چھوڑا اور مہاراجہ کے معتوبین کو باعزت بری کر دیا۔

ایک مطلق العنان حاکم کو یہ بات کیسے پسند آسکتی تھی۔ اس نے نہ صرف انہیں قبل از وقت ریٹائر کر دیا بلکہ ان کی وسیع و عریض اراضی کے کاشت کاروں کو شہ دے کر انہیں نا دہند کرا دیا۔ ان حالات نے خاندان کو مالی اعتبار سے تباہ کر دیا۔

لہٰذا مولوی فضل امین کو فوری طور پر ملازمت اختیار کرنا پڑی۔ اور سب سے پہلے ریاست حیدرآباد دکن میں سر علی امام کے پولیٹکل سیکرٹری ہوئے۔ سر علی امام کے ریاست چھوڑ

دینے کے بعد خود بھی وہاں سے چلے آئے۔ اور پھر ریاست جاورہ میں سکریٹری دربار کے عہدے پر مامور ہوئے۔ یہیں ۱۹۳۲ء میں چالیس برس کی عمر میں ان کا انتقال ہوا۔

مولوی فضل امین راسخ العقیدہ مسلمان تھے۔ اور صوم وصلوٰۃ کے سختی سے پابند تھے بارہ برس کی عمر سے تہجد پڑھتے تھے۔ ان کی دنیاوی زندگی نامساعد حالات میں گزری۔ کیوں کہ خوشامد، دنیاداری اور جوڑ توڑ ان کے مزاج کے خلاف تھا۔ مولوی فضل امین کے ہاں چار اولادیں ہوئیں۔ جن میں سے الطاف فاطمہ اور فضل قدیر ادبی حلقوں میں معروف ہیں۔

مولوی آفتاب عمر آفتاب عمر، مشہور جاسوسی ناول نگار ظفر عمر بی۔ اے کے چھوٹے بھائی تھے۔ علی گڑھ سے ایم اے، ایل ایل بی کیا تھا۔ میرٹھ کے نامور وکلا میں ان کا شمار ہوتا تھا۔ خان بہادر سید جعفر حسین کی منجھلی صاحب زادی اشفاق جہاں بیگم ان سے منسوب تھیں۔

مولوی آفتاب عمر جینیئس تھے۔ انہیں دنیاداری سے کوئی تعلق نہ تھا۔ گو پیشے کے لحاظ سے وکیل تھے لیکن ان کی تمام تر دل چسپی فنی کاموں کی طرف تھی۔ چناں چہ اپنے گھر میں ایک لیبارٹری بنا رکھی تھی۔ جس میں نت نئے تجربات کرتے رہتے تھے۔ ریڈیو کے کام کو اپنی ذاتی دل چسپی سے اس زمانے میں سیکھا تھا جب ابھی ہندوستان میں اس فن کے ماہرین کا وجود تک نہ تھا۔ ۱۹۳۲ء کے لگ بھگ ریڈیو کے بارے میں آسان زبان میں ایک کتاب "صدائے برق" لکھی تھی۔ جو شائع بھی ہوئی تھی۔ اس کتاب پر یوپی کی حکومت نے انہیں پانچ صد روپے کا انعام دیا تھا۔

آفتاب عمر پر دو بار از خود رفتگی کے شدید دورے پڑے۔ اور انہیں آگرہ کے دماغی ہسپتال میں داخل کرایا گیا تھا۔ قیام پاکستان کے بعد ترک وطن کر کے راولپنڈی

میں سکونت اختیار کر لی تھی ۔ وہیں ان کا انتقال ہوا ۔

تصنیف و تالیف کا بھی شوق تھا چنانچہ ایک ناولٹ "رنج و راحت" بھی لکھا تھا۔ بڑے ذہین طباع اور مخلص شخص تھے۔ سائنسی تجربات کے مشغلے نے زندگی بھر ساتھ نہ چھوڑا۔ مختلف چیزیں بناتے رہتے تھے۔

الطاف فاطمہ | مولوی فضل امین کی بیٹی ہیں۔ الطاف فاطمہ کے نام سے اردو ادب کا ہر قاری واقف ہے۔ یہ گزشتہ بیس برس سے افسانے اور ناول لکھ رہی ہیں۔ اب تک ان کے افسانوں کا ایک مجموعہ "وہ جسے چاہا گیا" کے عنوان سے شائع ہو چکا ہے۔ علاوہ ازیں دو ناول "دستک نہ دو"۔ اور "نشان محفل" بھی شائع ہو چکے ہیں۔

ان کی ایک تنقیدی کتاب "اردو میں فن سوانح نگاری کا ارتقا" کے عنوان سے بھی شائع ہو چکی ہے۔ اس کتاب کو اردو میں لکھی جانے والی "فن سوانح نگاری" پر پہلی کتاب کہا جا سکتا ہے۔ اس کے بعد ہی ڈاکٹر شاہ علی کی کتاب "اردو میں سوانح نگاری" منظر عام پر آئی ہے۔

الطاف فاطمہ نے افسانہ نگاری میں دھیمے لہجے کو اپنایا ہے ان کے افسانوں کا موضوع بھی گھر کی چار دیواری میں مقید عورتیں ہیں۔ اور انہوں نے پاکستانی عورت کی بڑی کامیابی سے اپنے افسانوں میں تصویر کشی کی ہے۔

الطاف فاطمہ ایک اچھی مترجم بھی ہیں۔ انہوں نے ہارپر لی کے ناول کا اردو ترجمہ "نغمے کا قتل" کے عنوان سے کیا ہے۔ ان کی ایک اور کتاب "روزمرہ آداب" ہے۔ اس کے علاوہ انہوں نے بچوں کے لیے ایک ناول "ایک تھا لڑکا" بھی لکھا ہے۔

الطاف فاطمہ لاہور کے ایک کالج میں اردو کی استاد ہیں۔

فضل قدیر فضل قدیر، پاکستان کے علمی و ادبی حلقوں میں جانی پہچانی شخصیت ہیں گزشتہ دس پندرہ برس سے حکومت پاکستان کے ماہ نامے "ماہ نو" کے مدیر رہ چکے ہیں۔ یہ رسالہ حکومت پاکستان کے جملہ شعبوں کی کارگزاریوں کی تفصیلات وغیرہ بھی دیتا ہے لیکن اس کے ساتھ ساتھ اس میں علمی و ادبی موضوعات پر گراں قدر مضامین، افسانے، انشائیے، نظمیں، غزلیں شائع ہوتی رہتی ہیں۔ ملک کے ممتاز ادیب و شاعر اس پرچے میں لکھتے رہتے ہیں۔ علاوہ ازیں اس پرچے میں علاقائی ادب و ثقافت اور فنون لطیفہ کی جملہ شاخوں پر نہایت اچھے مضامین شائع ہوتے رہتے ہیں۔ ظاہر ہے کہ جب تک اس کا مدیر، خود ایک صاحب ذوق اور ادب و فن اور ثقافت سے دلچسپی رکھنے والا نہ ہو تو یہ پرچہ صرف ایک عام سرکاری رسالہ بن کر رہ جاتا۔

ملک کے معیاری ادبی جرائد میں اس رسالے کا شمار ہوتا ہے۔ اور اس کے لیے اس کے مدیر کی کوششیں قابل قدر ہیں۔ دیگر اشاعتوں کے علاوہ فضل قدیر کی زیر ادارت اس مجلے کے غالب نمبر، اقبال نمبر، انیس نمبر، اور دبیر نمبر شائع ہو کر مقبول خاص و عام ہو چکے ہیں۔ اور اپنے موضوع پر ریفرنس کی حیثیت رکھتے ہیں۔

فضل قدیر خود بھی اردو کے اچھے افسانہ نگار ہیں۔ اگرچہ اپنی سرکاری مصروفیات کے سبب کم لکھتے ہیں۔ علاوہ ازیں انہوں نے انشائیے، فکاہیے، فیچر اور بچوں کے لیے بھی کتابیں اور کہانیاں لکھی ہیں۔ وہیٹی کی مختصر تاریخ امریکہ کا ترجمہ بھی کیا ہے جو شائع ہو چکا ہے۔ ابھی ان کے افسانوں کا کوئی مجموعہ شائع نہیں ہوا ہے۔

شجرۂ طیّبہ

۱۔ حضرت محمدؐ۔ خاتم النبیین، مالک قضاو قدر، مسرور کائنات، خلاصۂ موجودات حامئ دین ودنیا، سیّد المرسلین احمد مجتبیٰ، محمد مصطفےٰ صلی اللہ علیہ وسلم۔

۲۔ حضرت خاتون جنت فاطمہؓ امام المسلمین شمس المشارق والمغارب اسداللہ الغالب امیرالمومنین حضرت علیؓ امیر المومنین حضرت علی ابن ابی طالب رضی اللہ عنہ،

۳۔ حضرت امام حسینؓ۔ شہید دشت کربلائے معلّٰی، امام مظلوم، پیشوائے دین و دنیا وعقبیٰ، مقتدائی شہیداں، پیشوائے صابراں، جگر گوشۂ سیّدۃ النساء امام الساجدین، قافلہ سالار سادات رضی اللہ عنہ۔

۴۔ حضرت امام زین العابدینؓ۔ امام الساجدین، قافلہ سالار سادات۔ عباد و زہاد را مقدم، امام زین العابدین رضی اللہ عنہ۔

۵۔ حضرت امام محمد باقرؒ۔ دودمان رسالت، زبدۂ خاندانِ امامت، ستودۂ کون ومکاں، دینِ محمدی را ناصر ومعین، حضرت محمد باقر رضی اللہ عنہ۔

۶۔ حضرت امام جعفر صادقؓ۔ صادق الوقت، مخزنِ اسرارِ الٰہی، سلطانِ ملّت مصطفوی، برہانِ حُجّتِ نبوی، حضرت امام جعفر صادق رضی اللہ عنہ۔

۷۔ حضرت امام موسیٰ کاظمؓ۔ ہمدمِ محفلِ اُنس صمدیت، اختر برجِ ولایت، نیّرِ فلکِ امامت دینِ نبوی و موجدِ خاندانِ موسوی حضرت موسیٰ کاظم رضی اللہ عنہ۔

۸۔ حضرت سیّد ابراہیم رضاؓ۔ رضا بہ رب العالمین، فیاض غوارف معارف ربانی، وظائف کمالِ انسانی حضرت سیّد ابراہیم رضا رضی اللہ عنہ۔

۹۔ حضرت سیّد محمد اکبر موسویؓ۔ امام الواصلین و سید العارفین حضرت سیّد محمد اکبر موسوی رضی اللہ عنہ۔

۱۰۔ حضرت سیّد جعفر موسویؓ۔ درّۃ التاج رسالت، اختر برجِ امامت و عالمِ کمالات حضرت سیّد جعفر موسوی رضی اللہ عنہ۔

۱۱۔ حضرت سیّد محمد عزیز موسویؓ۔ وارثِ علوم نبوی، زبدۃ اہلِ شریعت و طریقت اسرارِ مرتضوی حضرت سید محمد عزیز رضی اللہ عنہ۔

۱۲۔ حضرت سیّد احمد موسویؓ۔ رہنمائے مومنین، قدوۃ السالکین و منبع الفیاض حضرت سیّد احمد موسوی رحمۃ اللہ علیہ

۱۳۔ حضرت سیّد محمد شہید موسویؓ۔ درۃ مملکتِ ولایت، عالم علوم احمدی، اقسام فیوض سرمدی حضرت سیّد محمد شہید موسوی

۱۴۔ حضرت سیّد عبداللہؓ الملقب رحمۃ اللہ۔ قطب الزماں، حامی کون و مکان، دُرِّ دریائے شریعت و طریقت حضرت سیّد عبداللہ ا

۱۵۔ حضرت سید امیر موسیٰؓ الملقب رحمۃ اللہ۔ فدا علی العالمین، وحید العصر، قطب الدھر،

اعجاز مظہر عیسٰی حضرت سید امیر موسیٰ

۱۶۔ حضرت سیّد امیر حسینؒ الملقب رحمۃ اللہ۔ نور ظہور اسلام امیر الوقت یعنی آں زماں

حضرت سیّد امیر حسین

۱۷۔ حضرت سیّد ابوالقاسمؒ الملقب رحمۃ اللہ۔ دلنواز، سلالہ خاندانِ نبوت، درد درج فتوت،

حاکم امورات دینی و دنیاوی سیّد ابوالقاسم

۱۸۔ حضرت سیّد امیر عزیزؒ الملقب رحمۃ اللہ۔ جاں باز، قاطع کفر و بدعت، ہادم شرک و

ضلالت حضرت سید امیر عزیز

۱۹۔ حضرت سیّد امیر حمزہؒ الملقب رحمۃ اللہ۔ کن فیکون، محی سُننِ نبوی قسام فیوض مرتضوی

حضرت سیّد امیر حمزہ

۲۰۔ حضرت سیّد امیر کلالؒ الملقب رحمۃ اللہ۔ امیر کلال، سلطانِ شریعت و طریقت و

برہان الحقیقت حضرت سید امیر کلالؒ خواجہ محمد بابا سماسی کے مرید و

خلیفہ تھے مقام ولادت سُوخار ۸ جمادی الاول ۷۷۲ھ کو بروز

جمعرات انتقال ہوا۔ (تاریخ الاولیا۔ داراشکوہ)

۲۱۔ حضرت سیّد امیر برہانؒ الملقب رحمۃ اللہ۔ مظہر کمالات، مخزن فیوضات خفی و جلی حضرت

سیّد امیر برہان

۲۲۔ حضرت سیّد امیر شاہؒ الملقب رحمۃ اللہ۔ حضرت شاہ حاوی الکمالات نبوی و جامع رموز

مرتضوی، فخر الملت حضرت سیّد امیر شاہ

۲۳۔ حضرت سیّد امیر علی شاہ الملقب رحمۃ اللہ پیشوائے گداو شاہ، رہنمائے ابرار، مقتدائے

روزگار حضرت سید امیر علی شاہ

۲۴۔ حضرت سیّد امیر جعفر شاہؒ الملقب رحمۃ اللہ۔ باباشاہ قطب الدہر یگانۂ زماں حضرت امیر جعفر رحمۃ اللہ علیہ ۔

۲۵۔ حضرت سیّد کلال شاہؒ الملقب رحمۃ اللہ۔ قطب الاقطاب الدہر غوث الزماں حضرت سیّد امیر کلال شاہ رحمۃ اللہ علیہ ۔

۲۶۔ حضرت سیّد میر احمد شاہؒ۔ الملقب رحمۃ اللہ۔ حاجی الحرمین مکّی و مدنی، خلاصۂ دودمان سادات حضرت سید میر احمد شاہ رحمۃ اللہ علیہ ۔

۲۷۔ حضرت سیّد امیر شاہ الملقب رحمۃ اللہ۔ وحید الزماں خلاصۂ دودمان الدہر حضرت سیّد امیر شاہ رحمۃ اللہ علیہ ۔

۲۸۔ حضرت سیّد میرک شاہؒ الملقب رحمۃ اللہ۔ حاجی الحرمین مقرب سلطان آں زماں، خاندان عظام حضرت میرک شاہ رحمۃ اللہ علیہ ۔

۲۹۔ حضرت سیّد عرب شاہؒ الملقب رحمۃ اللہ۔ مقرب سلطان، عارف معارف رموز محمدی، شاہی مقرب سلطان حضرت عرب شاہ رحمۃ اللہ علیہ ۔

۳۰۔ حضرت سیّد حسین شاہؒ الملقب رحمۃ اللہ۔ گوہر حقیقت، بحر شریعت و طریقت، حضرت سیّد حسین شاہ رحمۃ اللہ علیہ ۔

خان بہادر سیّد جعفر حسین

خان بہادر سیّد حامد حسین

(بائیں جانب سے) سید اکبر حسین، سید خواجہ احمد، سید جعفر حسین اور (کھڑے ہوئے) ظفر عمر زیدی

دو دوست

میجر جنرل (ریٹائرڈ) سید شاہد حامد اور ممتاز مسلم لیگی لیڈر قاضی محمد عیسیٰ لندن میں
اپنے زمانۂ تعلیم کے دوران۔

خان بہادر سید جعفر حسین پہلی قطار میں (دائیں جانب سے ساتویں نمبر پر) بیٹھے ہیں

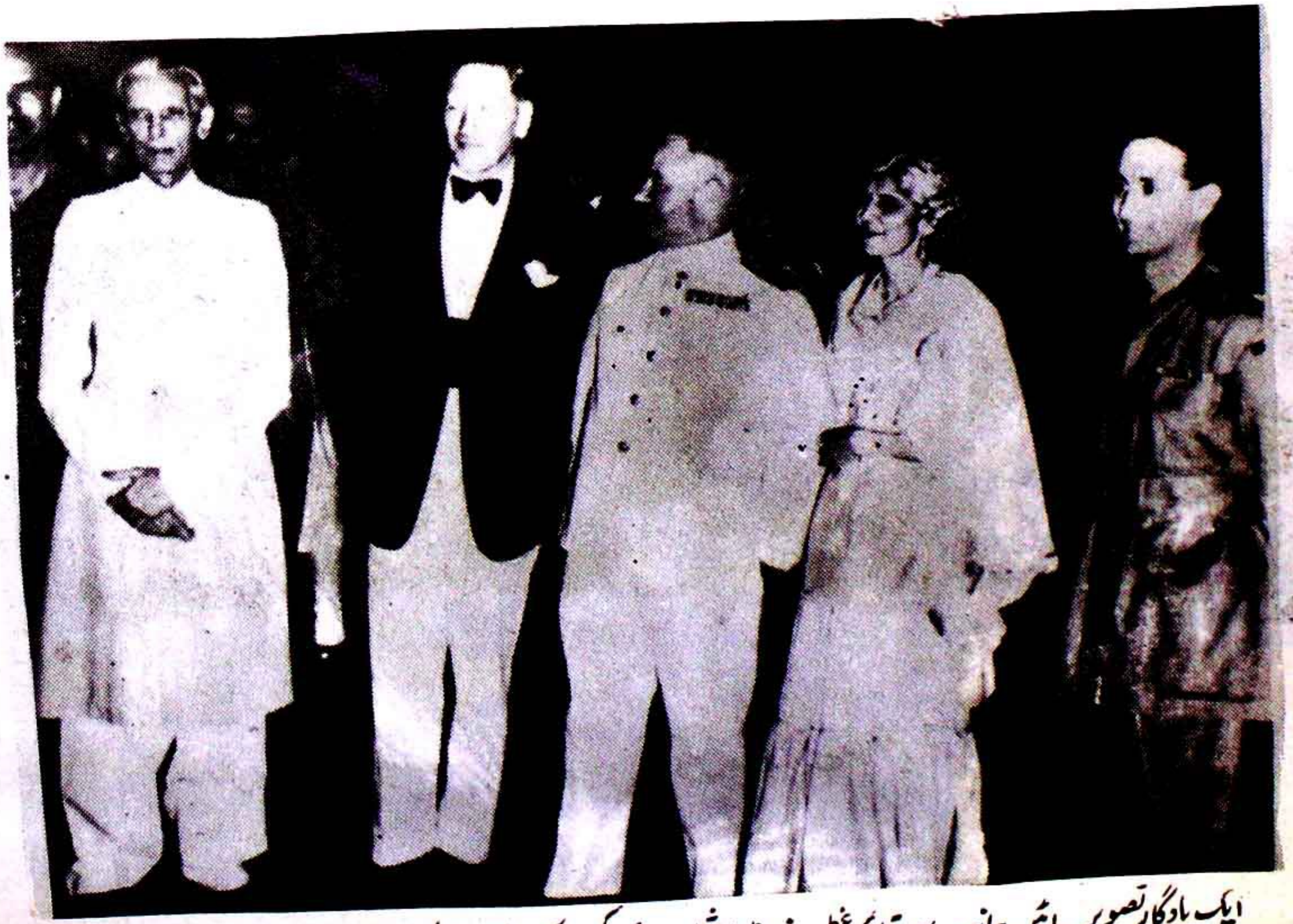

ایک یادگار تصویر۔ بائیں جانب سے قائداعظم، فیلڈ مارشل لارڈ ایکن لیک محترمہ فاطمہ جناح اور سید شاہد حامد

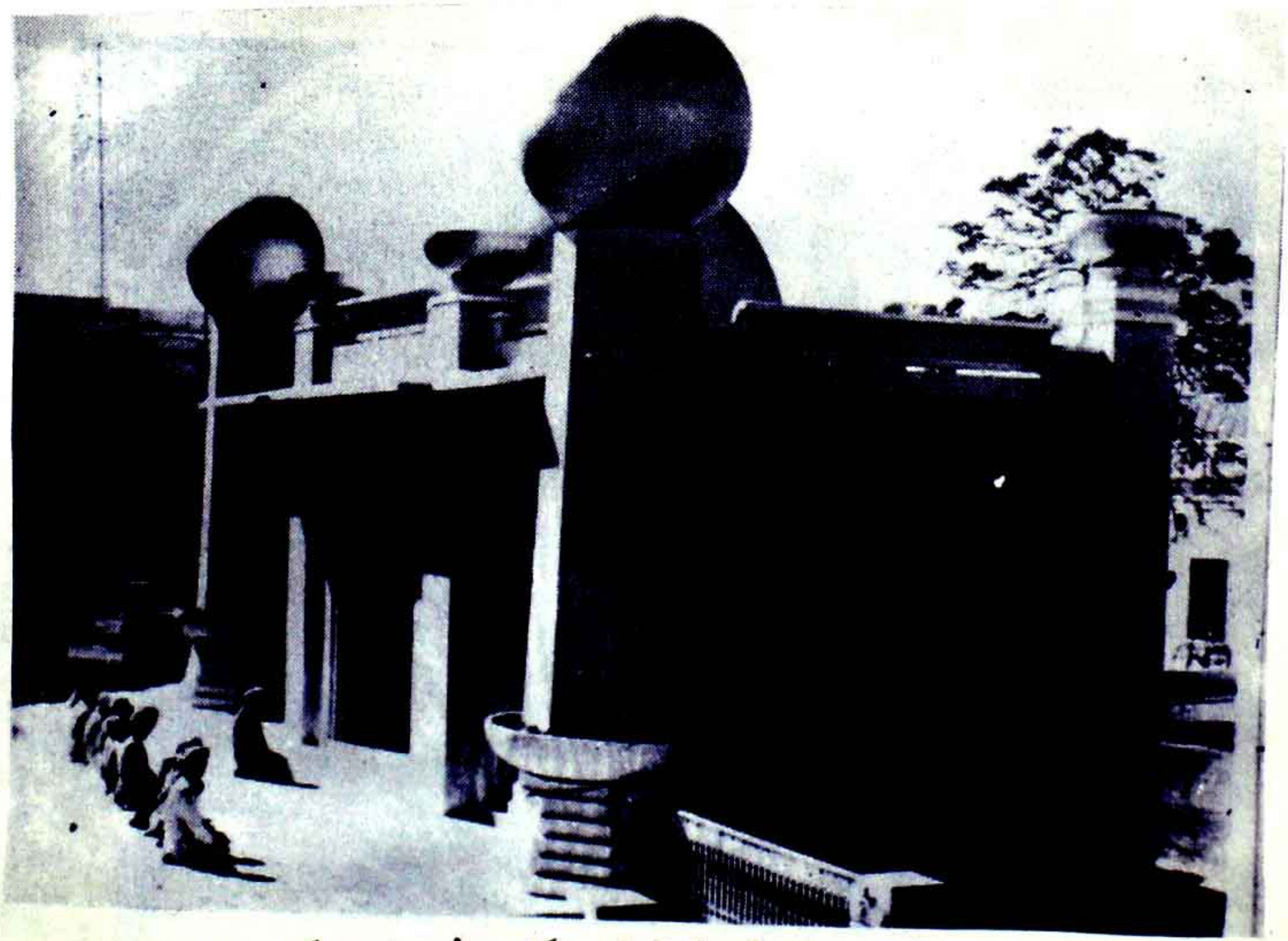

بھوپال میں خان بہادر سید حامد حسین کی تعمیر کردہ ایک اور خوب صورت مسجد

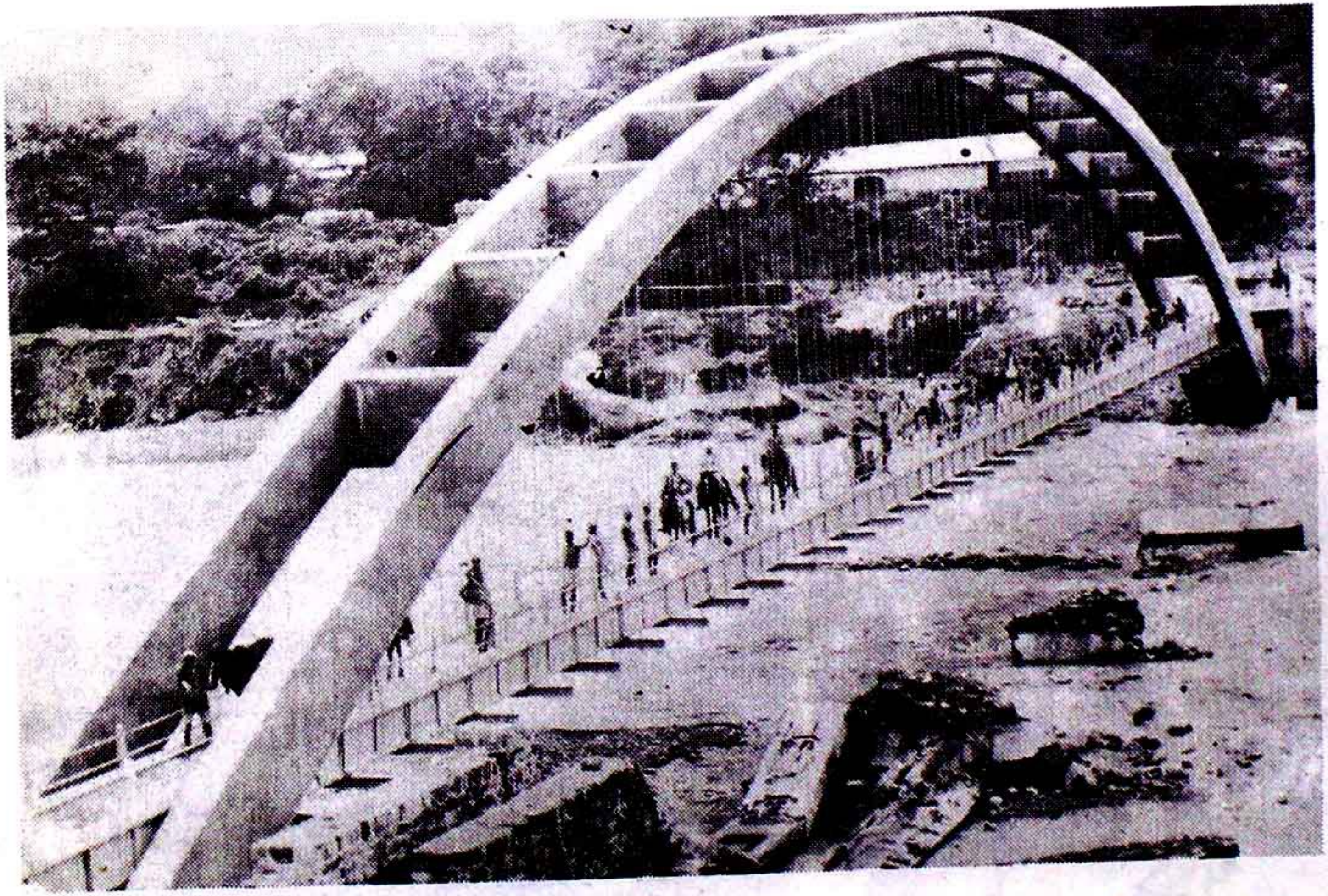

یوپی کی ترائی میں کاٹھ گوڈاؤن کے مقام پر خان بہادر سید حامد حسین کا پہلا تعمیراتی کارنامہ ۱۹۱۲ء

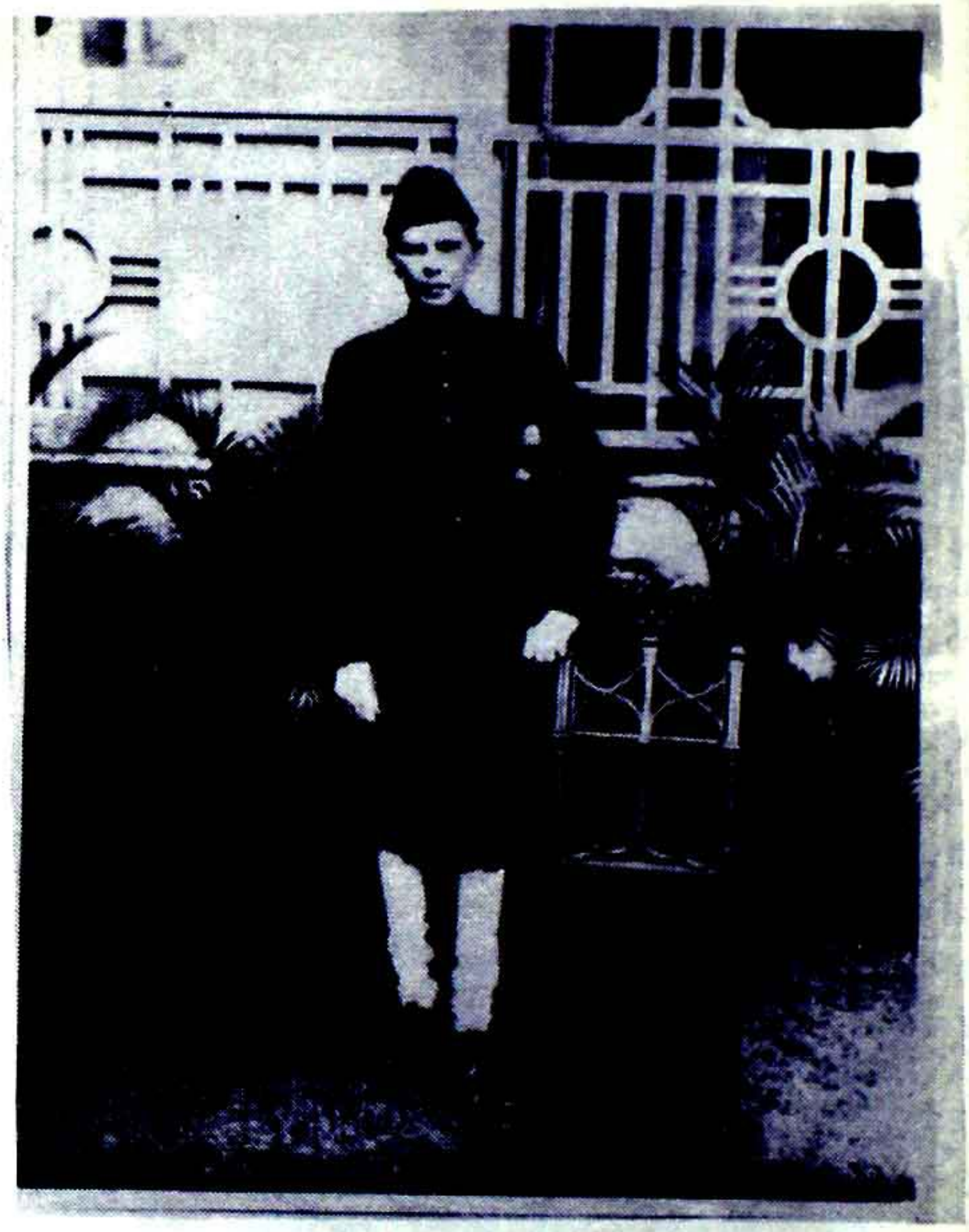

قائداعظم کی ایک یادگار دستخطی تصویر جو انھوں نے
میجر جنرل (ریٹائرڈ) سید شاہد حامد کو عطا کی تھی۔

خان بہادر سیّد حامد حسین اپنے عملے کے ہمراہ (بائیں جانب سے دوسرے نمبر پہ بیٹھے ہیں)

(بائیں جانب سے) میجر جنرل (ر) ٹائیگر ڈ) سید شاہد حامد اور مولوی آفتاب عمر

۱۹۳۴ء میں لندن میں ایک یادگار گروپ۔ وسط میں قائداعظم، محترمہ فاطمہ جناح،
علامہ اقبال اور سینڈ ہرسٹ ملٹری کالج میں زیرِ تعلیم سید شاہد حامد نظر آ رہے ہیں۔

سید رفیق حسین

قائد اعظم، لیفٹیننٹ کرنل سید شاہد حامد سے مصروف گفتگو ہیں

البشیر

ایڈیٹر:- محمد شیر الدین

نمبر (۳۰) | اٹاوہ یوم شنبہ ۱۱- جولائی سنہ ۱۹۳۶ء مطابق یکم- جمادی الاول سنہ ۱۳۵۵ھ | جلد (۱۳)

رسالہ البشیر میں خان بہادر سید جعفر حسین کے بارے میں لکھے جانے والے تعزیتی نوٹ کا عکس

نہایت افسوس کے ساتھ یہ خبر درج کیجاتی ہے۔ کہ خان بہادر سید جعفر حسین صاحب پنشنر ایگزیکٹیو انجینیر نے اسی برس کی عمر مین اس دنیائے فانی سے رحلت فرمائی۔ مرحوم بہت اچھے اوصاف کے آدمی تھے۔

انکی ابتدائی تعلیم اگرچہ بہت معمولی ہوئی تھی تاہم وہ اپنے شوق سے پرانے زمانے کی سب اور سیری کے امتحان کی تیاری کے لئے رڑکی کالج مین داخل ہوئے۔ اس ادنے درجے کے امتحان پاس کرنے کے بعد وہ ورافٹ مین ہوئے بعد ازان سب اور سیر مقرر ہوئے۔ پھر ترقی پاکر ضلعدار اور اس کے بعد ڈپٹی مجسٹریٹ مقرر ہوئے۔ ڈپٹی مجسٹریٹی کے بعد وہ ذمہ دار ایگزیکٹیو انجینیر مقرر ہوئے اگرچہ انکی تعلیم بہت معمولی درجے کی تھی۔

لیکن انجینیری سے انکو چونکہ خاص شوق تھا۔ لہذا اپنی شوق اور انہماک کی وجہ سے ان کا شمار اعلی درجے کے انجینیر مین کیا جاتا تھا میکینک کی اگرچہ انہون نے کوئی خاص تعلیم نہ پائی تھی۔ لیکن بوجہ شوق کے اس مین بھی انہون نے اعلی درجہ کا حاصل کرلی تھی۔ جب سے سرسید رحمۃ اللہ نے علی گڈھ کی تحریک شروع کی یہ شروع سے اس تحریک کے حامی رہے۔

سرسید کے معتقدین مین ان کا نمبر بہت زیادہ بڑھا ہوا تھا۔ انکے دل مین علی گڈھ کالج کی محبت اور اس کی ترقی کے متعلق غیر معمولی شغف موجود تھا۔ وہ جہان رہتے اور جہان جاتے۔ وہ اپنے حلقہ اثر مین لوگون کو سرسید کا مقلد بنانے اور علی گڈھ کی اعانت پر آمادہ کرتے تھے۔

غرضکہ مرحوم کی ذات سے علی گڈھ کالج اور آل انڈیا مسلم ایجوکیشنل کانفرنس کو اخلاقی اور مادی ہمیشہ فائدہ پہونچتا رہا۔ وہ علیگڈھ کالج کے پرانے ٹرسٹی تھے۔ اور جب کالج یونیورسٹی کے درجے پر پہنچا۔ تو اس کے کورٹ کے ممبر رہے۔

انہون نے یہ ارادہ کیا تھا۔ کہ علیگڈھ مین مستقل سکونت اختیار کرین اور اس غرض سے انہون نے علی گڈھ مین ایک کوٹھی جعفر منزل کے نام سے بنوائی تھی۔ لیکن بعض خانگی مجبوریون کی وجہ سے وہ علی گڈھ مین قیام نہ کرسکے۔ اور کوٹھی فروخت کرنے کو مجبور ہوئے۔

اسلامیہ ہائی اسکول اٹاوہ جب کہ ایک مکتب کی شکل مین تھا جب سے وہ اسکول کے ہمدرد اور معاون رہے۔ اسلامیہ ہائی اسکول اٹاوہ کی ترقی کے لئے انہون نے کئی مرتبہ اٹاوہ مین سکونت اختیار کرنے کا ارادہ بھی کیا۔ یہان آنکر کئی کئی ماہ تک لاوارے لیکن بعض خانگی مجبوریون کی وجہ سے انکو باہر جانے کی ضرورت پیش آئی۔ اگست ۱۹۳۵ء مین وہ آخری مرتبہ پھر اٹاوہ تشریف لائے۔ اور اس ارادہ سے آئے تھے۔ کہ "ون روپی فنڈ" کے ذریعہ سے اسلامیہ ہائی اسکول اٹاوہ کو انٹر کالج بنانے کے لئے ایک لاکھ روپیہ جمع کرین گے۔

چنانچہ انہون نے اس تجویز کو کامیاب کے بنانے کے لئے مختلف قسم کے رجسٹر تجویز کئے۔ لیکن اسکول کی بدقسمتی سے وہ ایک ماہ بھی کام نہ کرنے پائے تھے کہ سخت علیل ہو گئے۔ اس سخت علالت کی حالت بھی وہ لیٹے لیٹے کام کرتے تھے۔ یہان انکے مرض مین افاقہ ہو گیا تھا۔ تو ان لڑکے خان بہادر حامد حسین ایگزیکٹیو انجینیر انکی اور میری مرضی کے خلاف انکو زبردستی لکھنؤ لے گئے۔ اور بلرام پور اسپتال کے یورپین وارڈ مین انکو داخل کردیا۔

کئی ماہ تک اسپتال مین علاج ہوا۔ جب تک انکے ہاتھ مین لکھنے کی سکت رہی وہ "ون روپی فنڈ" کے متعلق اپنے خیالات اور تجاویز لکھکر بھیجتے رہے۔ جب اسپتال مین فائدہ نہ ہوا۔ تو وہ حامد حسین کے مکان مین اٹھ آئے۔ اور ہمیو پیتھک علاج شروع کیا۔

پہلے خبر آئی کہ انکو روز بروز آرام ہو رہا ہے۔ لیکن یکایک حامد حسین کا تار آیا۔ کہ مرحوم نے ۱۶ تاریخ کو اس دار فانی سے انتقال کیا۔ (انا للہ وانا الیہ راجعون)

مرحوم نہایت جفاکش محنتی آدمی تھے۔ مین نے اپنے تمام عمر مین سید جعفر حسین کی برابر کسی دوسرے شخص کو محنتی اور جفاکش نہ پایا۔ گرمی سردی مین وہ برابر مثل مزدورون اور قلیون کے کام کرتے تھے

باوجودیکہ وہ حقہ پینے اور پان کھانے کے عادی تھے۔ لیکن جب کام مین مشغول ہوتے تھے۔ تو نہ انکو حقہ پینے کا خیال ہوتا تھا

کھانے کا نہ اپنی بیماری کا خیال کرتے تھے۔ حتیٰ کہ سخت بیماری کی حالت
مین بھی وہ تندرست آدمی سے زیادہ محنت کرنے کے عادی تھے۔
مسلمانون کے افلاس کی ان کے دل پر ایک چوٹ لگی ہوئی تھی۔ وہ
اپنے غریب عزیزون اور دوسرے لوگون کی مالی امداد اس خاموشی کے ساتھ
کرتے تھے۔ کہ کسیکو کانون کان خبر نہ ہوتی تھی۔
یہی وجہ تھی۔ کہ باوجود معقول تنخواہ اور سادہ زندگی کے وہ ہمیشہ
تہی دست رہتے تھے۔ وہ ہمیشہ اس اوپیڑ مین رہتے تھے کہ
کیونکر مسلمانون کی حالت کو بہتر سے بہتر بنایا جائے۔ چنانچہ
سیکڑون ایسے نوجوانون کو جنھون نے بہت کم تعلیم حاصل کی تھی۔ انکو وہ
سب اور میری تعلیم دیتے تھے۔ اور اپنی کوشش سے بہت سے
ایسے نوجوانون کو نوکر بھی کرا دیتے تھے۔
چنانچہ آج ہمین بہت سے اچھے عہدون پر ہین۔ انکی یہ خدمت
ایسی تھی۔ کہ جس کی کسیکو کانون کان خبر بھی نہ ہوتی تھی۔ انگریزی
تعلیم یا علیگڈھ کالج کے جو لوگ مخالف تھے۔ وہ ہمیشہ کوشش
کرکے ان کے بچون کو مقامی اسکولون مین داخل کر دیتے تھے۔ یا علیگڈھ
کالج یا اسلامیہ ہائی اسکول مین تعلیم دلانے کے لئے انکے والدین کو
آمادہ کرتے تھے۔
میری اور ان کی دوستی کو پچاس برس گزر چکے۔ میرے ساتھ انکو جو
محبت تھی۔ وہ اعتدال سے بڑھی ہوئی تھی۔ انکو میرے ساتھ اسوقت

سے محبت ہوئی ہے۔ جب کہ انکی پوزیشن زمانہ کے اعتبار سے بہت
اچھی تھی اور مین ہر اعتبار سے پست اور ادنیٰ حالت مین تھا
[illegible] میرے ذات کے ساتھ نہ صرف محبت تھی۔ بلکہ میری ذات
سے ان کو ضرورت سے زیادہ حسن ظن اور حسن عقیدت تھی۔ اور یہ حالت
آخر عمر تک قائم رہی۔ ایسے زمانے مین [illegible] میرے ساتھ
محبت کرنے والے اور میرے نسبت اچھی رائے قائم کرنیوالے ایک
کے بعد دوسرے اٹھتے جاتے ہین۔ انکی موت کا مجھکو سخت صدمہ ہوا
ہے۔ اسی قسم کے اندوہناک واقعات کو زیادہ عمر پانے والا برداشت
کرتا ہے کہ اس کے آنکھون کے سامنے [illegible] عزیز اور دوست
[illegible] چلے جاتے ہین۔ اور جو عزیز یا دوست مرتا ہے اس کی جگہ لینے والا
کوئی دوسرا نہین ہوتا۔
مین خدا سے دعا کرتا ہون کہ اور کوئی صدمہ مجھکو برداشت نہ
کرنا پڑے۔ اور خدا سے مرحوم سید جعفر حسین کی مغفرت کی دعا کرتا
ہون جب سید جعفر حسین صاحب کی وفات کی خبر اٹاوہ پہونچی تو اسلامیہ
ہائی اسکول اٹاوہ کے طلبا اور اسٹاف کا ایک تقریبی جلسہ ہوا۔
ہیڈ ماسٹر صاحب نے مرحوم کے اوصاف بیان کئے۔ جمعہ کی نماز کے
بعد بورڈنگ ہاؤس کی مسجد مین قرآن خوانی کرکے مرحوم کی روح کو
ایصال ثواب پہنچایا گیا

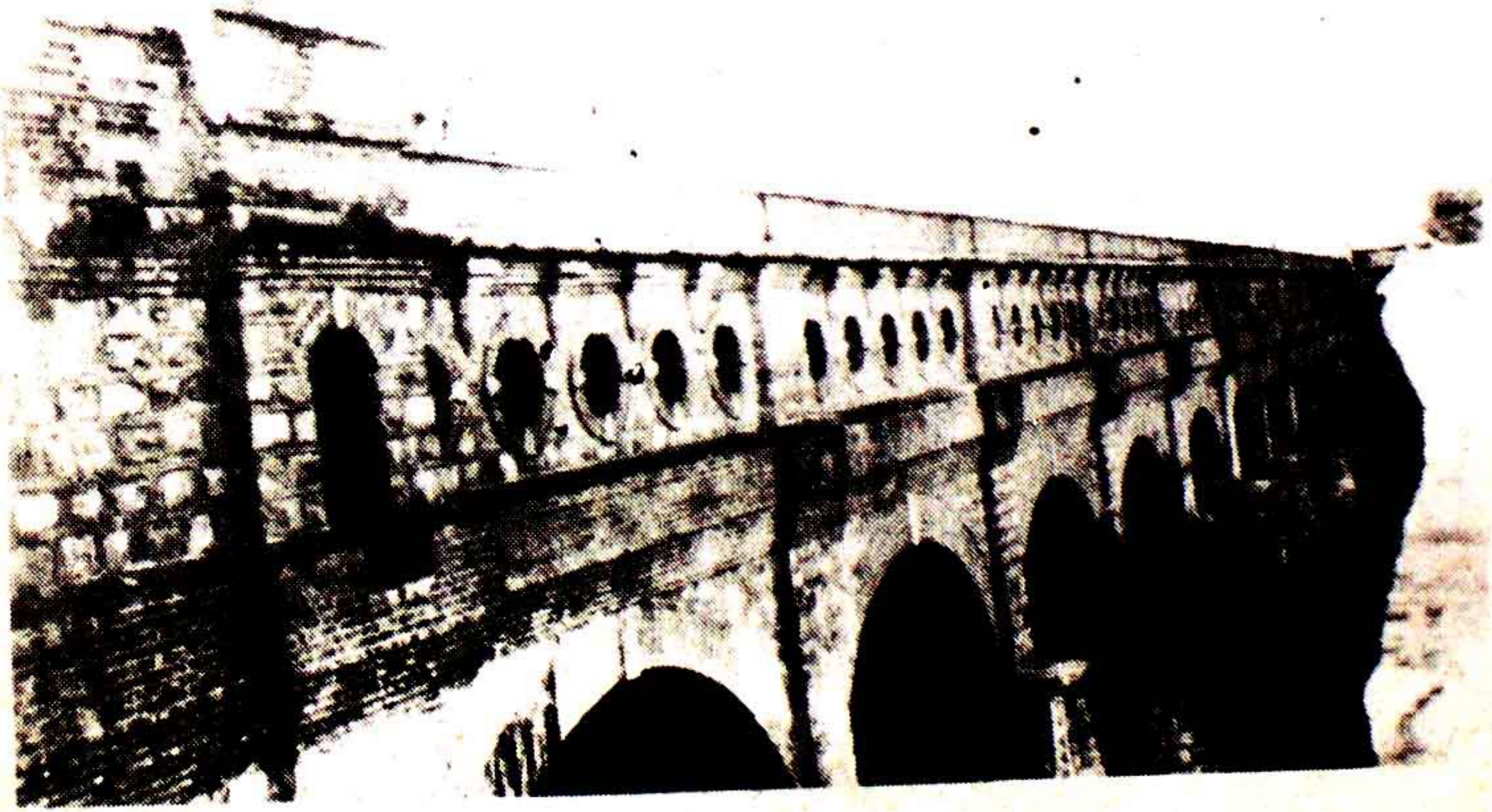

خان بہادر سیّد جعفر حسین کے تعمیر کردہ ایک پل کا منظر

Vice-Chancellor

Muslim University
Aligarh

Dated 5.6.55

My dear Colonel Shahid Hamid,

I received with great sorrow the sad news of the demise of your revered father. It is a great loss to the family. May God give you the strength to bear this loss and may He grant his soul peace in Heaven.

Yours sincerely,

Lt.Colonel
S.Shahid Hamid
Feroze Kothi,
Lucknow.

خان بہادر سید حامد حسین کے انتقال پر ڈاکٹر سر ضیاء الدین کے تعزیتی خط کا عکس

ایم. اے. کالج علی گڑھ کے سکریٹری نواب محسن الملک کے خط کا عکس، جس میں انھوں نے
یوپی کی حکومت سے خان بہادر سید جعفر حسین کی خدمات حاصل کرنیکی درخواست کی تھی

Copy of letter No 206 dated 28th September 1903.
From the Honorary Secretary M.A.O College
Aligarh, to the Private Secretary to His Honor
the Lieutenant Governor United Provinces Naini
Tal.-

Sir,

I shall be obliged if you will kindly lay the fol
lowing before His Honor the Lieutenant Governor
When His Honor visited Aligarh in August last
had occasion to bring to His Honor's notice the fact
that we were in need of a Mahomedan Gentleman
who maybe: Competent to efficiently superintend
the work of collecting Subscriptions in connection
with the Sir Syed Memorial Fund and also to Superin
the Building Department which badly want Watch
ful control and looking after. But the sort of man
that we want besides being competent and hard-
working, should also be inspired with an Enthusi

asm for the work and the interest of the College and should be one who may command the confid and Respect of the Community.

I had the honor to suggest to His Honor the Hon of Syed Jaffer Hussain, Deputy Magistrate, Educ Irrigation Department of these Provinces now o deputation to Egypt on State. In the light of the interest that he has always been taking in the wel of the College and the Credit with which he is resp to have already discharged his Official Duties, I a well as all my Colleagues, have every reason to be that he is the proper man for our present requirem Board being an Experienced and able Govt Offic Officer he possesses the Complete Confidence of the C Mussulmans. I may mention his recent services to College which he has rendered by starting, organiz and working the Scheme of the One Rupee Fund, it is solely due to his untiring energy and zeal over Rs 14000/- have already been Collected in Connection with the above mentioned Fund. I also take the liberty of mentioning that he is perfo serving and ready to undertake the College work provided the Government be pleased to allow h to do so. Therefore I beg to ask His Honor to

the transfer of Syed Jaffar Hussain's services to the College on terms that may be settled between him and the College Authorities which may be in Conformity with the Government Rules on the Subject

Syed Jaffar Hussain was deputed to Gwalior State for two years out of which he has already completed about 18 years. He is prepared to fully for his return provided the Government be pleased to sanction the transfer of his services to the College

I have the &c.

Of Mohsin ul Mulk.
Honorary Secretary.

No 243
Honorary Secretary's Office
M A O College
Dated Aligarh the 14th October 1903.

Copy forwarded to Syed Mir Jaffar Hussain Divisional Engineer, Gwalior State, Morar, for information.

Yrs
Honorary Secretary
M A O College, Aligarh.

Kindly Mercy House
Malleras
27th May 43

Dear Maria

I was extremely sorry to hear the news of your father's death. It was only yesterday that I read the news in the Dawn.

Mrs Jinnah joins me in sending you our deepest sympathy in your sad bereavement.

Yours sincerely
Fatima Jinnah

Page (5)

خان بہادر سید حامد حسین کے انتقال پر محترمہ فاطمہ جناح کے تعزیتی خط کا عکس

Gul-i-Raanu
Hardinge Avenue
New Delhi
5. 6. 45.

My dear Shahid,

I was terribly shocked to learn the tragic news of the sudden death of your father on my return from a tour of Assam and Bengal.

My wife and I send you all our deepest sympathy and condolences. May the departed soul rest in peace and may God give you all enough courage to bear this terrible loss!

Yours Sincerely,

Liaquat Ali Khan

خان بہادر سید حامد حسین کے انتقال پر نواب زادہ لیاقت علی خان کے تعزیتی خط کا عکس

8, Theatre Road,
CALCUTTA.
21st. June 1945.

My Dear Hamid,

I wired to Quetta conveying my sincerest sympathy and condolence at the great loss that you have suffered. I hope God will give you courage and patience to bear this loss.

Please give my compliments to Mrs. Hamid.

Yours sincerely,

خان بہادر سید حامد حسین کے انتقال پر خواجہ ناظم الدین کے تعزیتی خط کا عکس

قسطنطنیہ کامل - میرٹھ ۷۸۶
۲۴ مئی ۴۵ء

محمد اقبال مجددی
ذخیرہ لاہور

مکرمہ ابتسیم

کل کے "Dawn" میں یہ خبر انتہائی رنج و قلق سے پڑھی کہ خان بہادر نے اس دار فانی سے کوچ کیا۔ اس حادثہ نے جو کچھ آپ پر اثر کیا ہو وہ بالکل بجا ہے ان کے ہر دوست اور ملنے والے کے لئے بھی یہ خبر باعث اذیت ہے۔ مرحوم بڑی خوبیوں کے مالک تھے۔ میری دلی دعا ہے کہ خدا ان کو جنت الفردوس میں بلند رتبہ عطا فرمائے اور آپ کے اور مرحوم کے سب بچوں کے دلوں کا صبر و سکون۔

مشیت ایزدی کے آگے انسان مجبور و لاچار ہے۔ میں اور میرے خاندان کے سب لوگ دل سے آپ کے غم میں شریک ہیں۔

آخیر میں پھر خدا سے دعا ہے کہ وہ آپ سب کے دلوں کو صبر عطا فرمائے۔ آمین۔

فقط
والسلام
محمد اسماعیل خان

خان بہادر سید حامد حسین کے انتقال پر نواب سر محمد اسماعیل کے تعزیتی خط کا عکس

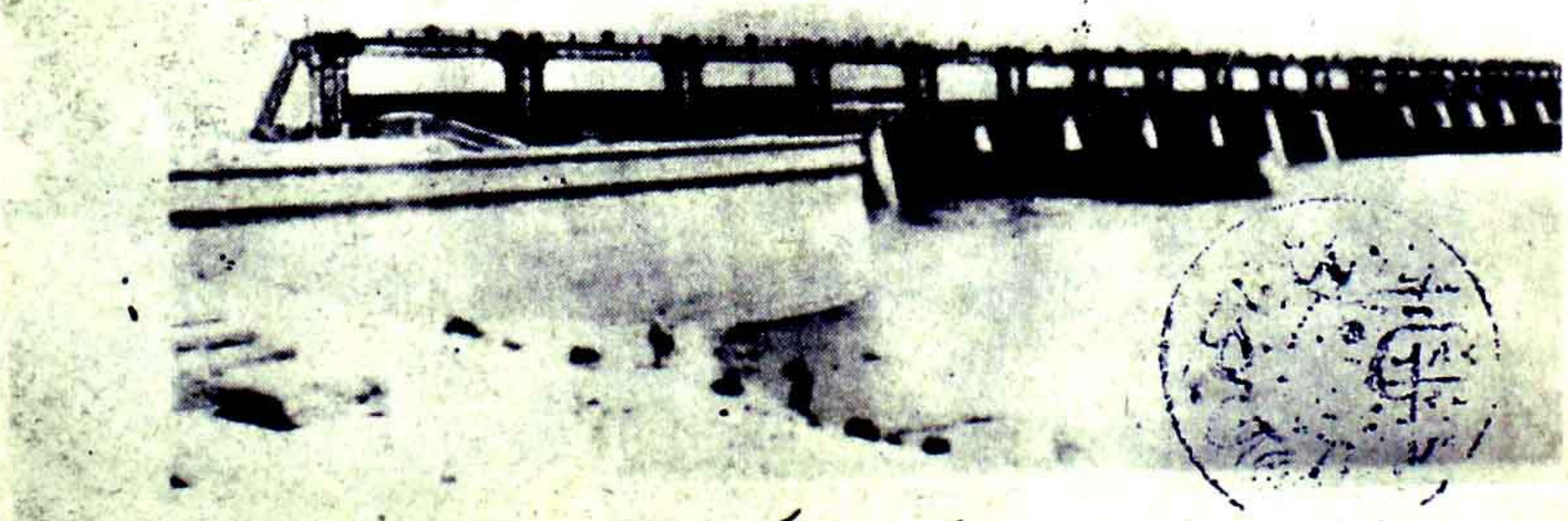

ساردا کینال ہیڈورکس بن باسا

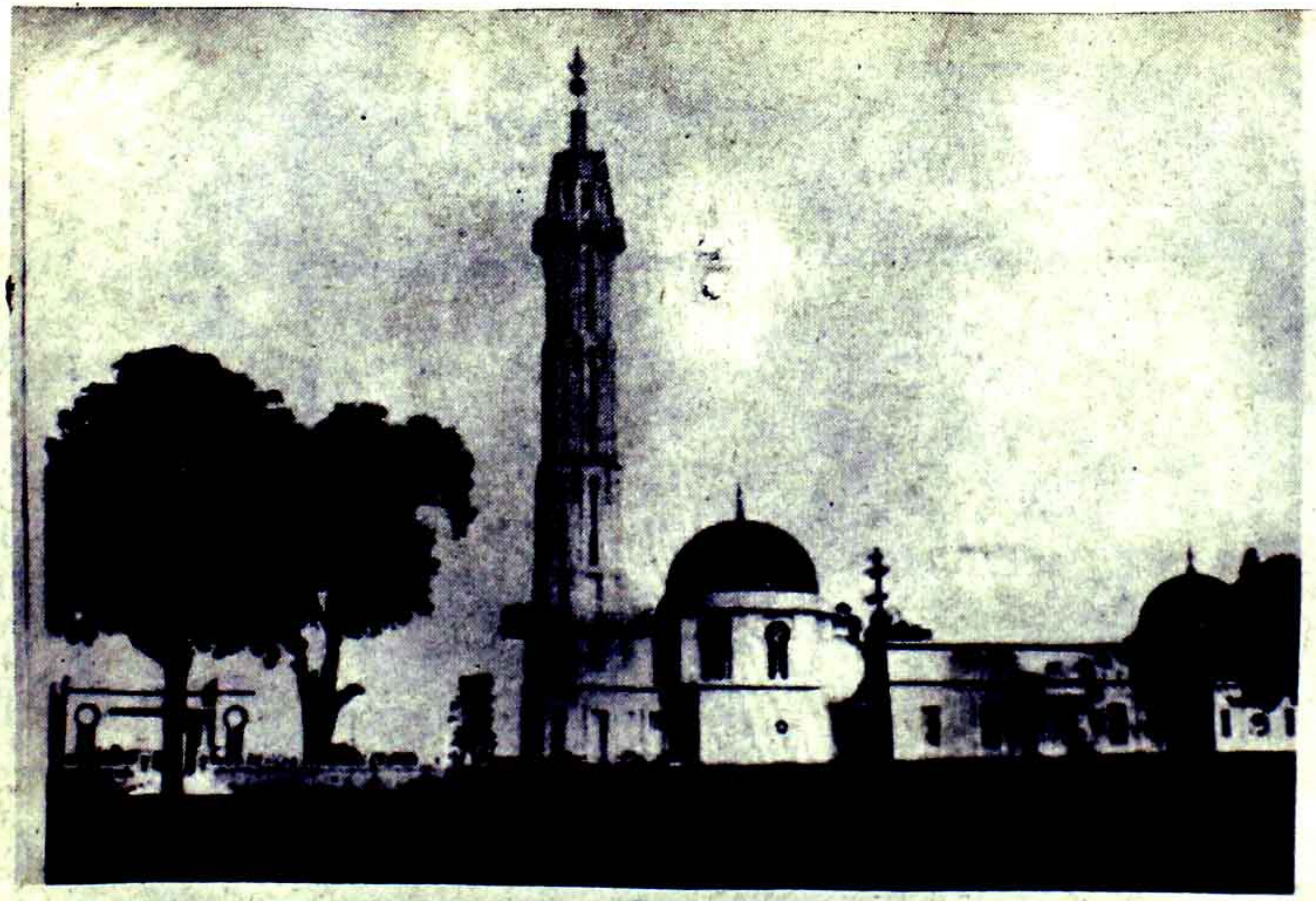

بھوپال کی ایک خوبصورت مسجد جس کا ڈیزائن اور تعمیر خان بہادر سید حامد حسین کے ہاتھوں ہوئی

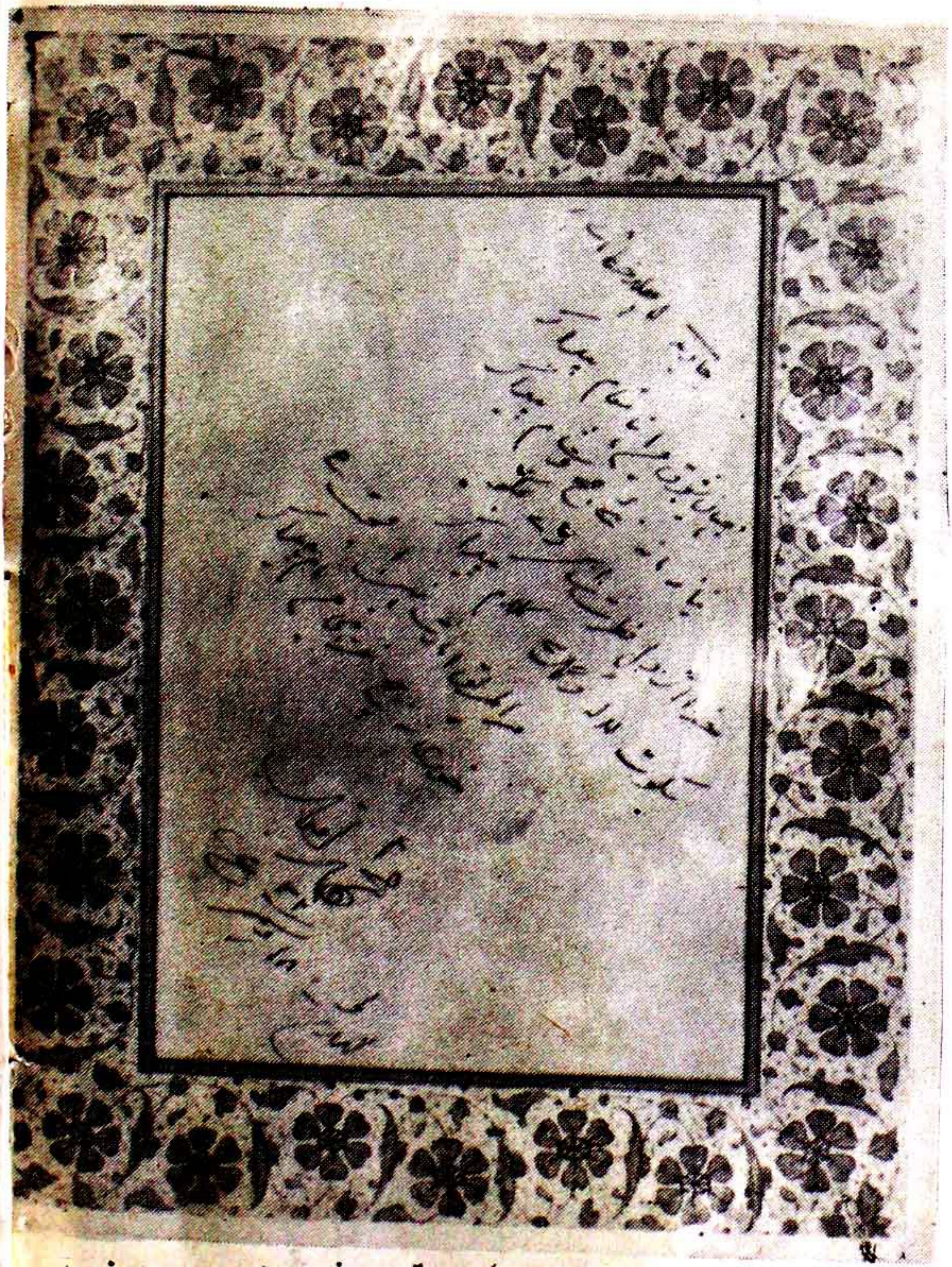

ڈاکٹر محمد اقبال کی ۱۸ دسمبر ۱۹۳۲ء کی ایک تحریر جو انھوں نے لندن میں سید شاہد حامد کو عطا کی تھی۔ بعد ازاں اقبال نے اس نظم کے ایک مصرعے میں ترمیم کر دی تھی۔